
گھر کے ہر فرد کے لیے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
جنوری 2017
نگرانِ اعلیٰ
معراج رسول
سال نو مبارک
شیریں حیدر کا نیا ناول "آمرت" (سالِ نو کا تحفہ)
علاوہ ازیں
مایہ ناز قلمکاروں کی دلکش تحریریں
Monthly PAKEEZA JAN - 2017 PRICE RS. 60/-
REGD. NO. MC-12

ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی

نگرانِ اعلیٰ: معراج رسول
مدیرۂ اعلیٰ: عذرا رسول
مدیرہ: انجم انصار
معاون: آمنہ حماد

MEMBER APNS
CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی



ماڈل: سدرہ حیات
میک اپ: روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر: موسیٰ رضا



قیمت فی پرچا (پاکستان) 60 روپے
قیمت فی پرچا (سعودی عرب) 12 ریال یا مساوی متحدہ عرب امارات
زر سالانہ (اندرونِ ملک) 800 روپے...... جلد: 44 شمارہ: 10 جنوری 2017

Happy New Year 2017

## اداریہ

مجھے کچھ کہنا ہے — مدیرہ 15

## سلسلے وار ناول

گم شدہ محبت — انجم انصار 18
امرت — شیریں حیدر 98
پہلی جیسی کہ دل ہے — رفعت سراج 164

## مکمل ناول

صورِ محبت — بنتِ سحر 192
چلو پھر سے مسکرائیں — بشریٰ سیّال 232

## ناولٹ

من جانباز م — سحر ساجد 58
یہ عشق ہے جاناں — نفیسہ سعید 127

## منی ناول

ہم کو عبث بدنام کیا — سیما رضا ردا 144

## افسانے

کچھ یہی ہے زندگی — رضوانہ پرنس 47
چند روپوں کی خاطر — ہاجرہ ریحان 87
گلاب رتوں کا ہم سفر — ثنا عمران 91
یہ میرے دکھ عجیب سے — طاہرہ اشفاق 161
فرق — اُمِ ایمان 183
میں وہ نہیں ہوں — سفینہ یاسمین 213
برکت — نگہت سیما 217

## خصوصی مضامین

شمع ہدایت — اختر شجاعت 259
باتیں بہار و خزاں کی — قارئین 266
[illegible] — شائستہ زرین 268
شادی کا احوال — قاری بہنیں 274

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی




## مستقل عنوانات


| | | |
|---|---|---|
| دین کی باتیں | ادارہ | 16 |
| بہنوں کی محفل | مدیرہ | 278 |
| پاکیزہ ڈائری | عظمیٰ آفاق سعید | 286 |
| جلترنگ | انجم انصار | 289 |
| میں اکثر گنگناتی ہوں | صغریٰ زیدی | 292 |
| خوش ذائقہ | پاکیزہ بہنیں | 295 |
| بزمِ پاکیزہ | پاکیزہ بہنیں | 297 |
| حسن نکھار کے لیے | مہ جبیں | 299 |
| روحانی مشورے | ادارہ | 300 |
| ہومیو کلینک | | 302 |


Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313, Fax: 35802551 E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

# ناسور

ایک ایسے نوجوان کی داستان جس کی زندگی خالی قبر کی طرح تھی جو اندھیروں کی راہ گزر پر روشن لمحوں کی آس لیے اپاہج راستوں پر گامزن تھا۔

سماج کے رستے ہوئے ناسوروں کو وہ بے نقاب کرنے نکلا اور پھر ہر دن، ہر پل اس کا ارضی ناخداؤں سے برسرپیکار رہنے میں بیتنے لگا۔

ایک ایسی طویل داستان جس کی ہر قسط آپ کو چونکا دے گی

**بہت جلد**

**ماہنامہ سرگزشت کے صفحات پر ملاحظہ کریں**

# مجھے کچھ کہنا ہے......!

اگر میں یہ کہوں کہ ہماری زندگی میں ناراضی کا موسم برسا برس چلتا ہے تو کچھ غلط نہیں ہوگا...... پڑوسیوں سے ہم ناراض ہیں...... اگر ہم افسر ہیں تو اپنے ماتحتوں سے ناراض...... رشتے داروں پر تو ہم نے اب ٹرسٹ کرنا ہی چھوڑ دیا ہے...... اور ہمارے دماغ میں یہ خناس بیٹھ گیا ہے کہ وہ ہماری خوشیوں سے جلتے ہیں...... والدین اپنی اولاد سے عاجز ہیں اور اگر ہم اولاد ہیں تو اپنے والدین سے شاکی ہیں...... ہمارے والدین نے تو ہمارے لیے کچھ کیا ہی نہیں ہے...... اور وہ ہماری بات سمجھتے ہی نہیں ہیں...... اگر شوہر ہیں تو بیوی سے ناراض...... اور اگر بیوی ہیں تو شوہر کے رویے سے نالاں ہر بیوی اپنے شوہر کو کچے کانوں کا نہ جانے کیوں کہا کرتی ہے...... جب وہ اس کی بات مانے تو ٹھیک اور اگر نہ مانے تو سسرال والوں نے سکھا پڑھا دیا...... اور وہ ان کے اشاروں پر چل رہا ہے...... غرض ناراضی کی تاویلیں اتنی زیادہ ہیں کہ گنی تک نہیں جاسکتیں...... اور اس پر ہی بس نہیں ہے اب شرفا کی عزت اچھال کر فخر محسوس کیا جاتا ہے۔ بدلہ لینا شرعی فریضہ سمجھا جانے لگا ہے۔ خطا کار اب غلطی پر نادم نہیں ہوا کرتے بلکہ اس کے لیے جواز تلاش کیا کرتے ہیں، ہم انسان تو ضرور ہیں مگر حیوانیت کا ایک طوفان اٹھا رکھا ہے...... شاید ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں کبھی موت آئے گی ہی نہیں...... جو مر رہے ہیں، انہیں مرنے دو...... مگر ہمارا وقت بہت دور ہے...... ہم یہ بات بھول بیٹھے ہیں کہ زندگی بہت مختصر ہے...... اور ہم سب نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے...... اور زندگی کی شام کب آجائے یہ کوئی نہیں جانتا...... تو خدارا...... ٹھنڈے دل سے یہ سوچیے اور دیکھیے کہ کیا ہماری وجہ سے ہمارے گھر میں سکون اور اطمینان ہے......؟ ہماری وجہ سے اہلِ محلہ بیزار تو نہیں......؟ ہماری وجہ سے ہمارے ساتھی تو ناخوش نہیں...... اور کیا ہم نے اپنے ابدی سفر پر جانے کی کچھ تیاری کی ہے؟ ان تمام سوالوں کو خود سے پوچھیے...... اور پھر اپنی زندگی اللہ کی رضا کے لیے گزاریے...... یقین کیجیے ٹینشن، ڈپریشن جیسی بیماریاں تو اڑن چھو ہو جائیں گی کہ وہ احساس ہر شخص کے لیے انتہائی طمانیت آمیز ہوتا ہے، جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے وجود سے کسی کو راحت اور آسودگی پہنچ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں بانٹنے والا بنائے...... آمین۔

اور یہی میرا پیغام بھی ہے، نئے عیسوی سال کی مبارک باد کے ساتھ۔

مدیرہ
انجم انصار

اور ہم (اپنی) نشانیاں اپنی طرح بیان کرتے ہیں اور اس لیے کہ یہ لوگ نہ کہیں کہ تم نے پڑھا ہے اور اس لیے کہ ہم ان لوگوں کے لیے جو جانتے ہیں دین کو ظاہر کردیں (۱۰۵) تم اس چیز کی پیروی کرو جو تمہارے پروردگار نے تمہاری طرف بھیجی ہے، سوا اللہ کے کوئی معبود نہیں اور مشرکین سے اعراض کرو (۱۰۶) اور (سمجھ لو کہ) اللہ چاہتا تو یہ لوگ شرک نہ کرتے اور ہم نے تمہیں ان پر نگہبان نہیں بنایا اور تم ان کے ذمے دار نہیں ہو (۱۰۷) اور تم ان (لوگوں) کو برا نہ کہو جنہیں یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں (اگر تم ایسا کرو گے) تو وہ بے ادبی سے بے سمجھے ہوئے اللہ کو برا کہیں گے اسی طرح ہم نے ہر گروہ کے لیے ان کے عمل کو زینت دی ہے پھر انہیں اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانا ہے پس انہیں جو کچھ وہ کرتے تھے اس (کے نتیجہ) سے آگاہ کرے گا (۱۰۸) اور یہ لوگ اللہ کی سخت قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی معجزہ آئے گا تو یقیناً وہ اس پر ایمان لائیں گے (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے) کہہ دو کہ معجزے تو اللہ ہی کے پاس ہیں اور (اے مسلمانو) تمہیں کیا معلوم ان کے پاس اگر معجزے آئیں گے تب بھی یہ ایمان نہ لائیں گے (۱۰۹) اور ہم ان کے دل اور آنکھیں الٹ دیں گے جس طرح یہ ہماری آیتوں پر پہلی مرتبہ ایمان نہیں لائے اور ہم انہیں ان کی سرکشی (کی حالت) میں چھوڑ دیں گے کہ یہ (اسی میں) سرگرداں رہیں (۱۱۰) اور (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر (ان کی خواہش کے موافق) ہم ان پر فرشتے (بھی) نازل کرتے اور مردے (بھی) ان سے باتیں کرتے اور (یہی نہیں بلکہ غیب کی) تمام چیزیں گروہ، گروہ ان کے سامنے پیش کردیتے (تو بھی یہ کافر) بے مشیت اللہ پر ایمان نہ لاتے لیکن ان میں کے اکثر (لوگ اللہ کی مشیت کو) نہیں جانتے (۱۱۱) اور اسی طرح ہم نے (ہمیشہ) شریر آدمیوں اور جنوں کو (آزمائش کے لیے) ہر نبی کا دشمن بنادیا تھا (وہ لوگوں کو) فریب دینے کے لیے ایک دوسرے کے دل میں بناوٹ کی بات ڈالتے ہیں اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو یہ (شریر) لوگ اس (کام) کو نہ کرتے پس تم ان کو..... کو اور ان کی افتراء پردازیوں کو (ان ہی کے حال پر) چھوڑ دو (ہم ان سے سمجھ لیں گے) (۱۱۲) اور یہ (سرگوشیاں) اس لیے (بھی کی جاتی ہیں) کہ جن لوگوں کو آخرت کا یقین نہیں ان کے دل اس طرف مائل ہوجائیں اور تاکہ اس کو پسند کریں اور تاکہ وہ (بھی وہی افعال) کریں جو یہ کررہے ہیں (۱۱۳) (کہہ دو کہ) کیا غیر اللہ کو میں حکم بناؤں حالانکہ اسی نے یہ واضح کتاب تم پر اتاری ہے اور جن لوگوں کو ہم نے (اس سے پہلے) کتاب دی ہے وہ (خوب) جانتے ہیں کہ بے شک قرآن تمہارے پروردگار کی طرف سے برحق نازل کیا ہوا ہے پس تم ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہوجانا

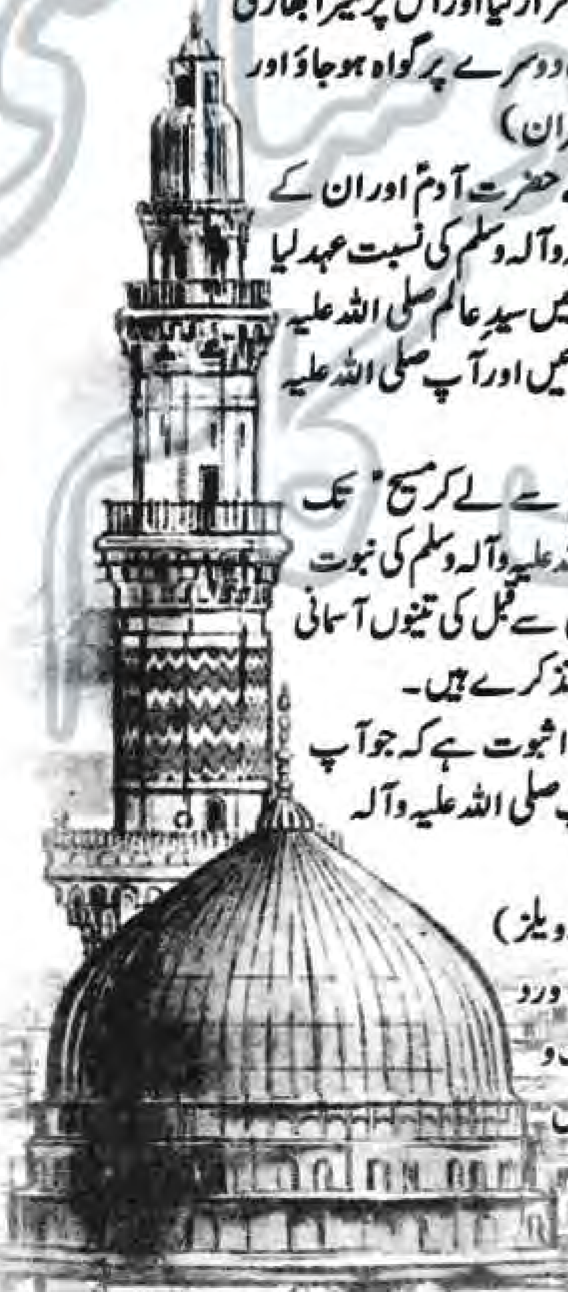


سورۂ انعام آیت نمبر ۱۰۵ تا ۱۱۴

# آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسمائے گرامی

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدِنِ الْمَشْھُوْدِ فِی الْبُلْدَانِ ط

افضل الانبیا ختمی مرتبت سید المرسلین، سرکارِ دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی اسمائے مبارک میں سے ایک نام **المشھود** بھی ہے۔ جن کے بارے میں تمام اہلِ کتاب گواہی دے چکے تھے اور اللہ نے ان سے آپ صلی علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں وعدہ لیا تھا۔



1۔**القرآن:** ترجمہ: ”اور یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب اور حکمت دوں پھر تمہارے پاس وہ رسول تشریف لائیں جو تمہاری کتابوں کی تصدیق فرمائیں تو تم ضرور بالضرور اس رسول پر ایمان لے آنا اور ضرور اس کی مدد کرنا...... فرمایا۔ کیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا بھاری ذمہ لیا۔ سب نے عرض کیا کہ ہم نے اقرار کیا تو فرمایا کہ ایک دوسرے پر گواہ ہو جاؤ اور خود میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں۔ (۸۱...... آل عمران)

2۔**الحدیث:** حضرت علی مرتضیٰ نے فرمایا کہ اللہ نے حضرت آدمؑ اور ان کے بعد جس کسی کو نبوت عطا فرمائی ان سے سید انبیاء محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت عہد لیا اور ان انبیا نے اپنی قوموں سے عہد لیا کہ اگر ان کی حیات میں سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت کریں۔

3۔**کتب سابقہ و انبیا کی شہادت:** آدمؑ سے لے کر مسیحؑ تک جتنے پیغمبر گزرے، خدا نے ہر ایک سے سید عالم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی تصدیق اور تائید کا پختہ قول و قرار لیا۔ قرآن پاک کے نزول سے قبل کی تینوں آسمانی کتب تورات، زبور، انجیل میں آپؐ .... کی رسالت کے واضح تذکرے ہیں۔

4۔**الرائے:** پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہی بڑا ثبوت ہے کہ جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سب سے زیادہ جانتے تھے وہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سب سے پہلے ایمان لائے۔

(out time of history۔ ایچ۔جی۔ ویلز)

5۔**الفضائل:** ۴۰۰ مرتبہ روزانہ اس اسم پاک کا ورد کرنے والا لوگوں میں ناموری حاصل کرے گا۔ عزت و شہرت و نیک نامی میں اضافہ ہوگا۔ جو کوئی اس اسم پاک کو روزانہ ایک سو مرتبہ پڑھنے پر مداومت رکھے تو اسے اجابت ظاہری و باطنی حاصل ہو۔



قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسماء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اقتباس

”صبو...... میں سمجھ رہا تھا تم کھو گئی ہو......اسی لیے میں تمہیں برسوں سے ڈھونڈ رہا تھا۔ جو جہاں بتا دیتا...... کہ اس نے تمہیں وہاں دیکھا ہے۔ میں وہیں پہنچ جایا کرتا تھا۔ مگر یہ بات تو مجھے اب پتا چلی ہے...... کہ تم کھوئی نہیں تھیں...... تم واقعی نہیں کھوئی تھیں۔ تم تو بدل گئی ہو۔ بالکل بدل گئی ہو...... تم جیسی تھیں، اب ویسی رہی ہی نہیں۔ ایسی صبا کو میں چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔ وہ تو مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔“

”ہاں بدل گئی ہوں...... بلکہ جان گئی ہوں...... کہ محبت کیا ہوتی ہے۔“

”نہیں...... نہیں...... تم جیسی لڑکی...... محبت سے بے بہرہ ہو کر محبت کو کیسے جان سکتی ہے۔ ہاں تم جان ہی نہیں سکتیں، بالکل نہیں...... کبھی نہیں...... مجھے تو تمہیں اب شروع سے یہ بتانا پڑے گا...... کہ میں تمہارا کیا ہوں اور تم میرے لیے کیا ہو...... اور ہمیں اپنی زندگی کو کس طرح شروع کرنا ہوگا۔“

”پلیز عامر...... اب تم میرا پیچھا چھوڑ دو...... اور جس کو جو سکھانا پڑھانا چاہو...... شوق سے پڑھاؤ مگر اب میں...... تم سے کوئی رابطہ رکھنے والی نہیں ہوں۔ اور نہ ہی تمہاری کسی گیدڑ بھبکیوں سے ڈرنے والی ہوں۔ میرا تعلق پریس سے رہا ہے...... اگر تم نے ندیم خان کے ساتھ کچھ بھی غلط کرنے کی کوشش کی ناں تو اس شہر میں کہیں بھی شکل دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔“

”اچھا...... ایسا ہوگا۔“ وہ مصنوعی خوف سے تمسخرانہ انداز میں بولا۔

”شاید اس سے بھی زیادہ......“

”چلو...... جو تم کر سکتی ہو وہ تم کر لو...... اور جو میں کر سکتا ہوں...... وہ میں کر لوں گا۔“

وہ چلتے وقت بڑی چاہت سے سیلوٹ دیتے ہوئے گزرا کہ میں کلس کر رہ گئی۔

☆☆☆

”امی دفع کریں آپ صبا کو...... اور بھاڑ میں ڈالیں اس منگنی کو...... کوئی ہم اپنے بھائی کی جان جوکھوں میں تھوڑی ڈالیں گے۔“ سیمن اپنی ماں کو سمجھا رہی تھیں۔

”ہاں دیکھو تو اس عامر کی بدمعاشی...... وہ گھر پر آ کر دھمکیاں دے کر گیا ہے۔“

”صبا میری...... اگر ندیم نے اس سے شادی کرنے کی کوشش بھی کی تو وہ اپنی جان سے جائے گا...... اب وہ کسی صورت بچ نہیں پائے گا۔“

”ساجدہ بیگم بھی اپنے بیٹے کے لیے خاصی پریشان تھیں۔

”وہ تو اچھا ہوا کہ اس وقت ندیم گھر پر نہیں تھا...... ورنہ بات کتنی بڑھ جاتی۔“

☆☆☆

ماں کی پریشانی کسی صورت ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

”اب عامر آئے یا وہ فون کرے تو صاف، صاف کہہ دیں کہ اس سے کہ اس معاملے میں ہمارا کوئی لینا دینا نہیں ہے تم صبا سے شادی کرو یا نہ کرو...... ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہوگا۔“

”اور لوگ جو پوچھیں گے کہ ندیم کی منگنی کیوں ٹوٹی تو پھر میں کیا جواب دوں گی؟“ ساجدہ بیگم کی پریشانی کا رنگ اب بالکل جدا تھا۔

”آپ کہہ دیجیے گا کہ منگنی تو ہوتی ہی ٹوٹنے کے لیے ہے۔ دنیا کی ٹوٹا کرتی ہیں، ہمارے بھائی کی بھی

ٹوٹ گئی۔''

''اپنے بھائی کو نہیں جانتی ہو کیا...... وہ ٹوٹنے دے گا کیا......؟''

''تو کیا پھر لچے لفنگوں سے لڑیں گے؟''

''تم جانتی نہیں ہو کیا...... وہ صبا کو کس حد تک پسند کرتا ہے، وہ تو واقعی لڑ بھی لے گا اس کی خاطر......''

''امی...... بدمعاشوں سے نہیں لڑا جاتا...... دیکھا نہیں آپ نے اس عامر کو...... اس کی آنکھوں میں کس قدر وحشت سی ٹپک رہی تھی۔''

''ہاں مجھے تو وہ پاگل ہی لگ رہا تھا۔''

''تو پھر پاگلوں کے معاملے سے دور ہی رہنا چاہیے ناں۔''

''بیٹا اپنی سی کوشش تو ضرور کریں گے۔ باقی دیکھا جائے گا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔''

☆☆☆

''اُفوہ...... فرید تم بھی حد ہی کرتے ہو۔ میں نے کب کہا تھا تم سے ایسا کرنے کے لیے۔'' ندیم خان نے فرید کی بات سن کر اپنا سر ہی تھام لیا۔

''تم نے ہی بتایا تھا ناں کہ عامر تمہارے گھر آ کر تمہیں گالیاں دیں اور سڑک پر کھڑے ہو کر دھمکیاں دیں۔''

''ہاں میں نے کون سا یہ سب سنا...... اور اکثر لوگ اپنی زبان سے بس خرافات نکالتے ہی رہتے ہیں...... تو اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ انہیں لاک اپ میں بند کروا دیا جائے۔''

''میں نے اپنے ایک دوست جو تھانے میں ہوتا ہے اسے کہا تھا کہ ذرا دو چار گھنٹے بند کر کے چھوڑ دینا تاکہ اسے پتا چلے کہ کسی شریف آدمی کو دھمکیاں دینے کی کوئی سزا بھی ہو سکتی ہے۔''

''اس طرح تو وہ مزید زخمی شیر بن گیا ہوگا۔'' ندیم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''تو پھر کیا دو چار روز کے لیے بند کروا دوں......؟'' فرید نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''ویسے بھی وہ ولن کا روپ دھار کر آیا ہے اس کو تو سخت سے سخت سزا ملنی چاہیے۔''

''یار اب زیادہ بکواس کرنے کو نہیں کہا تم سے...... کوئی ذرا سی بھی پرسنل بات شیئر کرنے کے قابل نہیں ہو تم۔'' ندیم کو غصہ بھی آ رہا تھا اور کوفت بھی۔

''ہم تو بھئی ایسے ہی ہیں...... آر یا پار...... والا معاملہ رکھتے ہیں۔'' فرید اسے مزید تپانے پر تلا ہوا تھا۔

ندیم کا یہ خیال تھا عامر...... اسے آج ہی ضرور فون کرے گا...... ورنہ گھر پر تو ضرور آئے گا۔

مگر عامر...... اس سے ملنے کے بجائے صبا کے گھر پہنچ گیا تھا۔ اور صبا سے کہہ رہا تھا۔

''میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم نے شاید کسی شریف شخص کا انتخاب کیا ہوگا...... مگر وہ تو پرلے درجے کا بدمعاش ہے۔ اس نے کرایے کے غنڈے بھیج کر مجھے حوالات میں بند کروا دیا...... اور جب میرے آفس کے ایڈمن وہاں پہنچے تو میری رہائی ہوئی ہے۔''

''آپ جو کسی کے گھر پر دھمکیاں دیتے رہے...... تو کیا ایسے کام شریفانہ ہوا کرتے ہیں؟''

''میں تو اسے بتانے گیا تھا کہ وہ درمیان سے ہٹ جائے...... اور میری صبا کو مجھ سے منحرف کرنے کی کوشش نہ کرے۔''

''کوئی شخص کسی کو منحرف کر سکتا ہے؟'' مجھے اب عامر کی باتوں پر غصہ آرہا تھا۔
''ہاں...... آخر اس نے تم کو مجھ سے چھیننے کی کوشش تو کر ہی لی ناں......''
''کوشش کیسی......؟ میری ان کے ساتھ شادی ہونے والی ہے۔''
''اگر ہماری ملاقات دو سال پہلے ہو جاتی......تو کیا ہماری شادی نہ ہو چکی ہوتی۔''
''پتا نہیں...... جب قدرت کو منظور ہی نہیں تھا تو کیسے ہو جاتی۔''
''شادی تو میری تم سے ہی ہوگی۔'' وہ نظریں نیچی کیے دھیمے لہجے میں بولا جیسے کوئی نتیجہ سنا رہا ہو۔
''عامر، آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں، مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ اگر ہمارے درمیان ندیم خان نہ بھی ہوتے تو شاید مجھے آپ کے بارے میں تب بھی کوئی مثبت فیصلہ نہیں کرنا تھا۔''
''اس وقت تمہاری آنکھوں پر اس کی جھوٹی محبت کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔تم صحیح اور غلط دیکھنے کے قابل ہی کہاں ہو۔''
مجھے یاد تھا وہ بچپن میں کم سخن تھا......اب تو کچھ زیادہ ہی بولنے لگا تھا۔ میں بولے چلی جاتی تھی اور وہ سنا کرتا تھا۔تب میں اس سے کہہ بھی دیا کرتی تھی۔
''عامر آپ گونگے کا گڑ کھا کر کیوں بیٹھے رہتے ہیں؟''
''تم بولتی ہو تو مجھے اچھا لگتا ہے۔''
''کیوں اچھا لگتا ہے؟''
''تمہاری مترنم سی آواز مجھے ایک طرح کی خوشی سی دیتی ہے۔'' اور اب اسے میرے بولنے پر اعتراض تھا۔وقت نے اس کی ذات میں تبدیلیاں کر دی تھیں یا پھر میں اب آگاہ ہوئی تھی۔
بات واقعی عجیب سی ہی تھی......جس کا میں برسوں سے انتظار کر رہی تھی......اور جس کے نام سے میری تنہائیاں آباد تھیں......اب اس کے آجانے کے بعد......میرے دل میں محبت کی ہر رمق ختم ہو گئی تھی۔
''کیا اس کی وجہ صرف اور صرف ندیم تھے......یا میرا مطمعِ نظر ہی تبدیل ہو گیا تھا۔''

☆☆☆

تبدیل تو شہلا کا سارا پروگرام ہو گیا تھا۔ جب ساجد نے فون کر کے کہا......کہ وہ اس کے فلیٹ پر آرہا ہے اور وہ اس کے ساتھ ہی لنچ کرے گا۔
اس وقت حارث......اس کے پاس بیٹھا آئندہ کا پروگرام ترتیب دے رہا تھا، وہ چاہ رہا تھا کہ ہفتہ دس دن کے اندر، اندر شہلا، ساجد کے ہاں کی جاب کو ختم کر دے۔
اور اب ساجد کی آمد کا سن کر وہ گھبرا سی گئی۔
''اب کیا کروں میں......؟'' وہ روہانسی سی ہو کر بولی۔
''آنے دو...... میں اپنی گاڑی......ان فلیٹوں کی بیک سائڈ پر جا کر کھڑی کر دیتا ہوں......اور لائبریری میں چلا جاتا ہوں......جب وہ چلا جائے گا تو میں آجاؤں گا۔''
''مگر میں نہیں چاہتی کہ وہ میرے فلیٹ پر آئے۔''
''تم اپنے پارلر کی جن لڑکیوں کو شام میں بلاتی ہو...... انہیں فوراً بلالو...... کلائنٹ نہ آئیں تو ایک

دوسرے کا ہی میک اپ کرتی رہیں۔''

''فلیٹوں میں کلائنٹس کا کال کبھی نہیں ہوتا...... ہاں یہ ترکیب اچھی ہے، اس سے مجھے دوسراہٹ رہے گی کہ میں فلیٹ میں تنہا نہیں ہوں۔''

اور ساجد اپنے دیے ہوئے ٹائم سے دو گھنٹے لیٹ آیا۔

''چلو لنچ کے لیے باہر چلتے ہیں......'' وہ آتے ہی بولا۔

''میں نے جو آپ کے لیے کھانا بنایا ہے...... وہ کون کھائے گا۔''

''ریئلی......'' وہ ہنسا۔

''چلو لے آؤ......'' اور جب وہ کھانا کھا رہا تھا تو چپ چاپ کھا رہا تھا...... ایک لفظ بھی بولے بغیر۔

''آپ کو کھانا اچھا نہیں لگا کیا؟'' شہلا نے پوچھا۔

''بازار کا کھانا تقریباً ایک جیسا ہی ہوتا ہے، اب اس کی کیا تعریف کروں۔'' اور شہلا کھسیا کر رہ گئی۔

''سر میں نے تو دراصل اپنے لیے کڑھی چاول بنائے تھے، میں نے سوچا...... آپ یہ سب کہاں کھاتے ہوں گے، اس لیے آپ کا فون آنے کے بعد یہ چائنیز فوڈ آرڈر کر دیا تھا۔''

''جاؤ کڑھی لے آؤ۔'' وہ اشتیاق بھرے لہجے میں بولا اور اس نے وہی کھائی...... اور خوب خوب تعریفیں کیں۔ اور کھانا کھانے کے بعد بھی مزید تین گھنٹے وہ بیٹھا...... اس کا صبر آزماتا رہا۔

''آج تم میری وجہ سے بور ہو رہی ہو ناں؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''نہیں، مجھے آپ کی باتیں اچھی لگ رہی ہیں۔''

''میرا تو خیال تھا کہ تم اپنا چھٹی کا دن اپنی کسی فرینڈ کے ساتھ گزارتی ہو گی۔''

''ہاں ایسا بھی ہوتا ہے اور نہیں بھی ہوتا...... میرا جو دل چاہتا ہے کرتی ہوں۔''

''تم کتنی اچھی ہو شہلا۔'' وہ اس کی باتیں سن کر بولا۔

''یہ تو مجھے نہیں پتا......'' وہ مسکرائی۔

''اچھا، اب میں چلتا ہوں اس امید کے ساتھ اب اپنا ہر فارغ دن تم اپنی کسی بھی سہیلی کے بجائے میرے ساتھ گزارو گی۔''

''آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟'' وہ جز بز ہو کر بولی۔

''میرا دل چاہتا ہے کہ تم پر اپنا حق جتایا کروں......'' وہ گاڑی کی چابی لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''ہر باس کا اپنے ورکرز پر حق ہوا کرتا ہے کہ وہ آفس آرڈرز کو پورا کریں۔''

''اب یہ آفس کہاں سے آ گیا......'' وہ اس کی چوٹی کھینچتا ہوا مسکرا کر باہر نکل گیا۔

واپسی پر اس نے دیکھ لیا تھا حارث کی گاڑی فلیٹوں کے پچھواڑے کھڑی ہوئی تھی۔

''مسٹر حارث، تم مجھے بے وقوف سمجھ رہے ہو مگر میں کچی گولیاں نہیں کھیلنے والا۔'' اب وہ از خود بڑبڑا رہا تھا۔ ''میں تو پہلے ہی دن شہلا کے پرس میں تمہاری تصویر دیکھ چکا تھا...... اور اس کو لفافے میں بھی میں نے ہی رکھا تھا۔ ایک ایسی لڑکی جس کو ایجنسی میں تم نے ملازمت کے بعد میرے آفس میں بھیجا ہو...... تو کیا میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس لڑکی کو تم نے کیوں بھیجا ہے۔'' وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔

''شہلا ایک اچھی لڑکی ہے...... اور یقیناً اس پر تمہاری نظرِ کرم بھی ہوگی مگر اب میں بھی دیکھوں گا...... کہ شہلا تم تک جاتی بھی ہے یا نہیں۔''

اب ساجد گاڑی میں بیٹھا ہنس رہا تھا۔ اور اسے حارث کے بارے میں سوچتے ہوئے اب واقعی رحم بھی آرہا تھا۔

☆☆☆

دونوں کے درمیان خاموشی تھی...... چائے کے کپ ٹھنڈے ہو چکے تھے۔

ندیم خان کے ہمراہ ان کی والدہ بھی موجود تھیں۔ عامر کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ بڑے ملتجی لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''آپ کو شاید زندگی میں اتنا کوئی خاص فرق نہیں پڑے جتنا کہ مجھے پڑے گا۔''

''مجھے بھی فرق پڑتا ہے، آپ ایسا کیوں محسوس کررہے ہیں کہ مجھے صبا سے کوئی محبت نہیں ہے۔''

''آپ کی تو جمعہ، جمعہ چار دن کی محبت ہے ناں...... مگر میری محبت کی عمر سالوں پر محیط ہے۔''

''میں نے اس کو ڈھونڈنے میں اپنی زندگی کے ماہ و سال لگا دیے اور آخر دل برداشتہ ہو کر دوسری جگہ شادی تو کر ہی رہے تھے ناں آپ۔''

''ہاں، اپنی ماں کے خیال سے میں ضرور کررہا تھا۔ مگر میں نے ہمیشہ ان سے کہا تھا کہ اگر مجھے میری صبا نظر آجائے گی تو میں کسی کو نہیں دیکھوں گا۔''

''اگر آپ کو صبا ہماری شادی کے بعد نظر آتی تو آپ پھر بھی تو صبر کرتے ناں......'' ندیم خان ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر بولا۔ اس لیے اب بھی صبر کرلیں۔

''ندیم بھائی، آپ مجھے جانتے نہیں ہیں، اگر میں اسے کسی دوسرے کا ہوتا دیکھ لیتا تو تب بھی مر جاتا...... اور اگر وہ مجھ سے شادی کے بجائے آپ سے شادی کرے گی تب بھی مر جاؤں گا۔''

''بیٹا، زندگی اتنی معمولی چیز نہیں ہے کہ اسے ان باتوں کے لیے ختم کردو۔ دنیا میں بے شمار کام ہیں، کیا ان کی اہمیت تمہاری نظر میں کچھ نہیں ہے۔'' اب ساجدہ بیگم اسے شفقت سے سمجھا رہی تھیں۔

''سب کی اہمیت ہے...... مگر میں کیا کروں...... کہ صبا مجھے اپنی زندگی نظر آتی ہے...... عام لوگ میرے اس رویے کو پاگل پن بھی کہہ سکتے ہیں۔ تو شاید میں پاگل بھی ہوں۔''

''شاید نہیں تم یقیناً پاگل ہو...... اور تمہیں واقعی علاج کی ضرورت ہے۔'' ندیم نے جیسے چڑ کر کہا۔

''میرا علاج تو آپ کے پاس ہے۔''

''بیٹا اگر صبا آپ سے بصد خوشی شادی کے لیے تیار ہے تو ہم ہٹ جاتے ہیں۔'' ساجدہ بیگم نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اور اگر وہ آپ سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ہے تو اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ زبردستی کا سودا تو نہیں ہے ناں......''

''صبا، اس شادی کے لیے اس وقت تیار ہوئی تھی جب اسے میں نظر نہیں آیا تھا۔ میری موجودگی میں وہ کسی دوسرے کے لیے سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔''

''تو پھر تم کیا چاہتے ہو؟'' ندیم نے الجھ کر پوچھا۔

''آپ کہیں دور چلے جائیں بلکہ اس کے لیے کہیں بھی کھو جائیں۔''

''بھائی میرا خیال ہے جتنی جلدی ہو سکے تم اپنا علاج کراؤ، مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے اور نہ ہی میں تمہاری کوئی بات ماننے کا اقرار کرتا ہوں۔''

''تو یہ کہیے ناں...... آپ میری موت کے خواہش مند ہیں۔''

''اگر آپ مرنا چاہتے ہیں تو شوق سے جا کر مریں۔ میرا آپ سے کسی قسم کا کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔''

''سر واسطہ تو آپ کا خود ہو جائے گا جب میں مرنے سے پہلے خط لکھ کر جاؤں گا...... کہ میری موت کے ذمے دار ندیم خان میں جنہوں نے میری محبت کو زبردستی چھین لیا ہے۔''

''ہاں، ہاں یہ دھمکیاں کسی اور کو دینا۔ میں تم سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔''

''ٹھیک ہے، آج سے دس دن بعد آپ کو میری موت کی خبر اور اپنی شہرت کی خبر ساتھ، ساتھ پتا چل جائے گی۔''

''ہاں، ہاں جاؤ۔ اور جو دل چاہے کرو......'' ندیم خان نے غصے سے کہا۔

اور عامر نے جاتے ہوئے ساجدہ بیگم کو سلام کرتے ہوئے کہا۔ ''معاف کر دیجیے گا کہ میں تو مروں گا ہی مگر آپ کا بیٹا صرف اپنی ضد کی وجہ سے بدنام ہوگا۔

آج کل کئی ٹی وی چینلز ایسی خبروں کی وجہ سے اپنی ریٹنگ بڑھایا کرتے ہیں۔''

''تم جاتے ہو یا بلاؤں پولیس کو؟'' ندیم خان نے برہمی سے کہا۔

تو وہ اپنے آنسو پونچھتا ہوا چلا گیا اور ساجدہ بیگم اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

☆☆☆

''ارے یہ سب دھمکیاں ہیں اور بس...... جو لوگ کچھ نہیں کر سکتے وہ ایسی باتیں کر کے اپنے آپ کو خوش کیا کرتے ہیں۔'' فرید اس سے بہت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

''مگر اس مسئلے کو کیونکر حل کریں...... یہ عامر تو جان کا جنجال ہو گیا ہے، پتا نہیں کس طرح سارے گھر والوں کے موبائل نمبرز معلوم کر لیے ہیں...... ان پر ایسے، ایسے دردناک میسجز بھیجتا ہے جیسے اسے معلوم ہو کہ وہ واقعی مرنے والا ہے۔'' ندیم خان کا لہجہ بیزار ہونے کے ساتھ دکھی بھی تھا۔

''اس طرح کے سائیکی لوگ خودکشی بھی کر لیا کرتے ہیں۔'' فرید...... اب ایسے واقعات گنوا رہا تھا کہ جو بہت پڑھے لکھے افراد نے صرف محبت کی خاطر اپنی زندگی کو گنوا دیا تھا۔ بات کہیں تک بھی جائے اور کیسی بھی ہو مگر میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا کہ میری شادی کی وجہ سے کوئی بھی شخص موت کو گلے لگا لے۔'' ندیم خان نے سوچتے ہوئے کہا۔

''تو پھر کیا تم صبا سے شادی نہیں کرو گے؟''

''ہاں، موجودہ صورتِ حال میں مجھے رک جانا چاہیے۔''

''دیکھ لو...... اس طرح تو اس کی ہمت اور بڑھ جائے گی۔''

''جو بھی ہو مگر میری ٹینشن تو اس وجہ سے بھی بڑھ رہی ہے کہ میری ماں اور میری بہن میرے لیے بہت پریشان ہیں۔''

''آنٹی کو تم سمجھاؤ۔ اس مابین میں اس کے آفس کے دوستوں اور باس سے ان حضرت کی معلومات حاصل کرتا ہوں کہ جو سائیکی ہوتا ہے وہ ہر معاملے میں ہونا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے، اس نہج پر بھی دیکھ لیتے ہیں۔'' ندیم خان کا لہجہ پھیکا سا تھا۔ جیسے اسے یقین ہو کہ وہ اب عامر کے حملوں کو کسی طور پر روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

☆☆☆

رئیسہ بیگم کا غصہ کسی صورت کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا...... اور وہ بولے چلی جا رہی تھیں۔

''عامر تو یہ کیا کر رہا ہے، آج بھائی جان گھر میں آ کر مجھے باتیں سنا کر گئے ہیں اور بھابی کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مجھے بے بھاؤ کی سنائیں۔ گھر آ کر آج پہلی مرتبہ انہوں نے یہاں پانی بھی نہیں پیا۔ ان کی بیٹی، تیرے اس باؤلے انداز کی وجہ سے بیمار ہو گئی ہے۔'' عامر گھر میں داخل ہوا تو رئیسہ بیگم نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

''بیٹا تو میرے کہنے سے ایک مرتبہ فرزانہ سے شادی کر لے...... بعد میں صبا سے بھی کر لینا۔ مگر میرے میکے میں میری بات تو نہ بگاڑ۔''

''امی آپ بھی کیسی باتیں کر رہی ہیں...... بعد میں اگر میں صبا سے شادی کر لوں گا تو کیا آپ کے بھائی بھابی آپ کا ساتھ دیں گے...... اس وقت وہ آپ سے یہی کہیں گے ناں کہ اگر تمہارے بیٹے کو صبا سے شادی کرنی ہی تھی تو پہلے ہی کر لیتا...... کم از کم ہماری بیٹی کی زندگی تو خراب نہیں کرتا...... تو اس لیے میں وہی کر رہا

ہوں جو صحیح ہے تاکہ آپ بعد میں وضاحتیں نہ دیتی پھریں...... کہ یہ یوں نہیں ویسا تھا اور ایسا تھا۔"

"بعض لوگ شاید اپنی زندگی کو جنجال میں خود ہی ڈالنا چاہتے ہیں...... جب صبا تم سے خود شادی کرنے کی خواہش مند نہیں ہے اور اس کا منگیتر اس کو چھوڑنا نہیں چاہتا...... تو تم خواہ مخواہ کسی کی شاداب زندگی میں کیوں آگ لگا رہے ہو۔"

"میں جو صبا کے انتظار کی آگ میں جلتا رہا ہوں تو اس لیے پہلے تو مجھے اپنی آگ بجھانی ہوگی۔ اور یوں بھی ہر شخص پہلے اپنے مفاد کو دیکھتا ہے اور بعد میں دوسروں کو...... یہ کوئی فلم نہیں ہے کہ ہیرو کسی دوسرے پر احسان کردے اور کہہ دے جا صبا چلی جا...... اور اپنی مرضی کی زندگی جی لے۔"

"اور میرا کیا ہوگا...... تم مجھے بھاڑ میں جھونک دو۔"

"امی میں نے جس کا پل، پل انتظار کیا ہے اس کو کسی دوسرے کا ہوتا ہوا کیسے دیکھ سکتا ہوں۔"

"تم یہ کیوں نہیں سوچ لیتے کہ وہ تمہیں ملی ہی نہیں۔"

"ہاں...... ملی تو وہ اب بھی نہیں ہے مگر مل تو جائے گی۔" یہ کہہ کر وہ رکا نہیں بلکہ تیزی سے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

☆☆☆

"امی میں سچ کہہ رہی ہوں...... آپ کچھ دنوں کے لیے خالہ کے پاس اسلام آباد چلی جائیں...... اور ہم ندیم بھائی کے آفس میں یہ کہہ دیں گے کہ وہ آپ کو لے کر دبئی چلے گئے ہیں...... اپنے بزنس کے حوالے سے...... اتنے عرصے میں دیکھ لیں گے کہ عامر کی صبا سے شادی ہوتی ہے یا نہیں اور اگر ہو جاتی ہے تو بہت ہی اچھا ہوگا۔" سبین نے ماں کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں بات تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو...... مگر کیا ندیم مان جائے گا۔"

"آپ انہیں سمجھائیں گی تو وہ ضرور مان جائیں گے مگر ان کو یہ ضرور بتا دیں کہ اصل حقیقت سے وہ صبا کو بھی باخبر نہ کریں...... تاکہ وہ بھی سکون سے کوئی فیصلہ کرے۔"

"پتا نہیں میری خوشیوں کو کس کی نظر لگ گئی ہے...... پہلے میرا بیٹا ہی شادی کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ تیار ہوا تو لڑکی نے انکار کر دیا...... اور جب وہ دونوں مانے تو حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ ایک پاگل شخص نے ہم سب کی زندگی ہی اجیرن کر دی ہے۔" ساجدہ بیگم کے خاموش آنسو بہہ رہے تھے...... جو سبین کے دل پر گر رہے تھے۔

ماں سے تو سبین مزید کچھ نہیں بولیں...... ہاں اپنے گھر آ کر انہوں نے بھائی کو فون کرتے ہوئے کہا۔

"ندیم بھائی اگر آپ چاہتے ہیں کہ امی پلنگ سے لگ جائیں یا کسی دن دل پکڑ کر اللہ کو پیاری ہو جائیں تو آپ صبا اور عامر کے ڈرامے میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیجیے...... اور کوشش کیجیے کہ ایسے واقعات بھی رونما ہو جائیں کہ کچھ ٹی وی چینلز بھی پیار کرنے والوں کے درمیان آنے والے ولن کی نشاندہی میں آپ کی تصویر بھی دکھانے لگیں۔ اور علاقے کے لوگوں کے انٹرویو بھی شروع ہو جائیں۔ ہمارے خاندان کے سیاق و سباق کے ساتھ۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟" ندیم نے زچ ہو کر کہا۔

''یہ بات میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ امی اب گھر میں بیٹھ کر صرف رویا کرتی ہیں......اور بے حد پریشان ہیں کہ کوئی آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔''

☆☆☆

''مجھے نہیں معلوم تھا...... عامر اس حد تک ضدی بھی ثابت ہوگا......اور آپ کا دشمن بھی بن جائے گا۔ لیکن اب اگر میری آپ سے شادی نہیں ہوتی ہے تو میں عامر سے بھی نہیں کروں گی...... کہ اس نے میرا دل بہت دکھایا ہے۔'' اس روز میں نے ندیم خان کو فون کرتے ہوئے کہا۔

''دل تو تم نے بھی اس کا دکھایا ہے......اور وہ یہی سمجھ رہا ہے کہ اس کی محبت پر میں قبضہ کر رہا ہوں۔''

''مجھے تو لگتا ہے کہ وہ کوئی پاگل شخص ہے۔''

''کوئی پاگل واگل نہیں ہے، فرید اس کے آفس سے بھرپور معلومات حاصل کر کے آیا ہے، بے حد مہذب، کم سخن اور اپنے کام سے کام رکھنے والا شخص ہے۔ تعلیمی ریکارڈ بھی بہت اچھا ہے اور سب سے بڑی بات کسی خاتون کی جانب آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا ہے۔ اس کے آفس والے تو یہاں تک کہہ رہے تھے...... ایک شریف شخص کو ہم لوگ خواہ مخواہ تنگ کر رہے ہیں اور اس کے جذبات سے کھیل رہے ہیں۔''

''آفس والوں کا بھی دماغ خراب ہوگیا ہے کیا؟'' میں نے کلس کر کہا۔

''اس کے آفس والوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ آج کے دور میں سچی محبت کرنے والوں کو ہی پریشان کیا جاتا ہے۔ انہیں ہر لحاظ سے نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ پہلے یہ کام لچے لفنگے زیادہ کیا کرتے تھے مگر اب شرفا بھی یہ کام کرنے لگے ہیں۔''

''اُف خدایا...... ہمارے بارے میں لوگ اس طرح بھی سوچنے لگے ہیں۔'' میرے مساموں سے پسینہ بہہ نکلا تھا۔ مارے شرم اور خفت کے برا حال تھا۔

''ہاں فرید بتا رہا تھا...... کہ عامر کے ایڈمن کہہ رہے تھے کہ اگر عامر نے اس سلسلے میں کوئی ہتکِ عزت کا مقدمہ کیا تو وہ عامر کا ساتھ دیں گے...... کہ اتنا اچھا شخص ہمارے آفس میں کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔ اور ہم سب اس کا ساتھ دیں گے۔''

☆☆☆

''جیسا کہ میرا گمان تھا آخر وہی ہوا ساجد، شہلا کو شہر سے باہر لے جانے میں کامیاب ہو چکا ہے......اور اسے شاید اس کی اور ہماری اصلیت کے بارے میں بھی یقیناً پتا چل چکا ہے۔ شہلا کا ایک سینڈل ٹول پلازہ سے پہلے موجود ہے......اور دوسرا اس سے آگے دس کلو میٹر کے بعد ہے...... وہ تو اچھا ہے آفس ورکر مسز رضی نے جو کلپ اسے تحفے میں دیا تھا......اور جو وہ حقیقت جانے بغیر اپنے بالوں میں لگا رہی ہے اس میں لگی ڈیوائس سے پتا چل رہا ہے کہ اس وقت وہ عمر کوٹ سے آگے جا چکی ہے۔''

ریحان اپنے ساتھیوں اور حارث کو ساتھ لیے یہ سب بتا رہا تھا۔

''میں اس کے پیچھے جاتا ہوں۔''

''وہ تو ہم جا ہی رہے ہیں مگر میں عمر کوٹ میں موجود اپنے لوگوں سے رابطے میں رہوں گا جو ساجد کی گاڑی پر بھرپور نظر رکھیں گے۔ مجھے ڈر ہے کہ ساجد اس کو کہیں نقصان نہ پہنچا دے۔''

''انشاء اللہ ایسا ہو ہی نہیں پائے گا...... اللہ ہماری مدد کرے گا۔''
''اور اگر کہیں اشتعال میں آ کر...... اس نے شہلا کو مار دیا تو میری تو دنیا ہی اجڑ جائے گی۔'' اب حارث پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔
اور ریحان وائرلیس پر اپنے ساتھیوں سے محو گفتگو تھا کہ آگے انہیں کیا کرنا ہے اور ساجد کو کس طرح گھیرنا ہے۔

☆☆☆

''آنٹی آپ بہت دین دار ہیں...... مگر آپ کو یہ معلوم نہیں کہ منگنی ایک وعدہ ہوتا ہے...... جس میں کہا جاتا ہے کہ یہ لڑکی تمہاری ہوئی اور اب ہم تمہارے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کریں گے...... آپ نے جب صبا کی منگنی میرے ساتھ کی تھی تو یہی وعدہ کیا تھا ناں...... اور جب تک ہم وہاں رہے...... آپ کے نزدیک میری اہمیت آپ کے ہونے والے داماد کی سی تھی...... اور میرے گھر میں بھی صبا کی حیثیت میری ہونے والی دلہن کی تھی۔'' عامر آ کر...... امی کے سامنے بڑی سنجیدگی سے بول رہا تھا۔
''بیٹا یہ میں کب کہہ رہی ہوں کہ ہم نے صبا کی منگنی تم سے نہیں کی تھی...... یا ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ مگر درمیان میں آنے والے برسابرس نے جہاں انسانوں کو ختم کر دیا...... تمہارے ابو نہیں رہے...... صبا کے پاپا نہیں رہے، اس کا معذور بھائی اللہ کو پیارا ہو گیا...... تم کہیں گم ہو گئے تو پھر ان وعدوں کی اہمیت کہاں رہ جاتی ہے۔''
''مگر میں تو آج تک اپنے اس کیے ہوئے وعدے پر قائم ہوں۔''
''مگر اس میں بھی دونوں فریقوں کا رضا مند ہونا ضروری ہے...... پہلے میں بچی تھی نا سمجھ تھی...... اس لیے بڑوں کی خوشی کو اپنی ہی خوشی سمجھتی رہی...... اب میں عاقل اور بالغ ہوں...... اور سب سے بڑھ کر کسی سے محبت کرتی ہوں اور اس محبت نے ہی مجھے یہ راہ دکھائی ہے کہ مجھے تم سے نہیں، ندیم خان سے شادی کرنی چاہیے۔'' میں نے آگے بڑھ کر کہا۔
''مگر ندیم خان کی بہن کا آج میرے پاس فون آ گیا ہے کہ وہ اپنی والدہ کو لے کر کہیں باہر جا رہے ہیں...... اور ان کا صبا سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔''
''مگر ندیم خان نے تو مجھے اپنے باہر جانے کی کوئی اطلاع نہیں دی۔'' میں نے بوکھلا کر کہا۔
''اس پر تمہارا یہ طرّہ ہے کہ ندیم خان تم سے محبت کرتا ہے؟'' عامر کے لہجے میں تمسخر مزین تھا۔
''کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر ندیم خان مجھ سے شادی نہیں کرتے تو مجھے آپ سے شادی کر لینی چاہیے...... تو بھی آپ غلط بات کہہ رہے ہیں۔'' میں نے اپنے آنسوؤں کو جو پلکوں کی باڑھ توڑ کر باہر آنے کو بے تاب ہو رہے تھے انہیں روک کر بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

☆☆☆

گاڑی تیزی سے حیدر آباد کی جانب بھاگ رہی تھی...... شہلا اس کے کاندھے سے سر لگائے غنودگی کے عالم میں تھی...... ساجد اسے جوس میں دوا ملا کر پلا چکا تھا...... یہی وجہ تھی کہ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں اور کس کے ساتھ کیوں جا رہی ہے۔
چیک پوسٹ آنے سے پہلے اس کی نظر اس کے سینڈل پر پڑی جس میں لگی ڈیوائس اسے نظر آئی تو وہ

چونک پڑا اور سینڈل اس کے پیروں سے نکال کر کھڑکی سے باہر پھینک دی۔

''یہ لڑکی جو بظاہر سیدھی سادی سی نظر آتی ہے، یہ بھی مجھے پاگل بنا رہی ہے۔'' ساجد نے پانی کی بوتل سے پانی لے کر اس کے منہ پر چھینٹا مارا...... تو شہلا نے مندی مندی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں۔'' کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

''اپنے گھر......'' وہ ہنسا۔

اچانک اس کی نظر اس کی دوسری سینڈل پر پڑی اس میں بھی ڈیوائس لگی ہوئی تھی۔ ساجد نے تیزی سے سینڈل اتاری اور کھڑکی سے باہر پھینک دی۔

''آپ نے میری سینڈل کیوں باہر پھینک دی؟''

''وہ اس میں سانپ تھا۔''

''مگر میں نے نہیں دیکھا سانپ......'' وہ بوکھلائی۔

''وہ اس کی ایڑی سی چمٹا ہوا تھا...... خواہ مخواہ تمہیں ڈس لیتا...... اس لیے اسے باہر پھینک دیا۔''

''مگر میرے پاس تو کوئی دوسری چپل نہیں ہے۔'' اب مکمل ہوش آنے پر وہ پریشان ہو رہی تھی۔

''پریشان نہ ہو میں تمہیں دلوا دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ جیسے مطمئن ہو گئی یا دوا کا اثر باقی تھا۔ اس کی آنکھیں پھر بند ہونے لگیں اور وہ تھوڑی دیر بعد اس کے کاندھے سے سر ٹکائے واقعی گہری نیند میں چلی گئی تھی۔

اور ساجد کی گاڑی کی رفتار اتنی تیز تھی جیسے وہ کوئی جہاز اڑائے جا رہا ہو۔

ریحان کا خاص ورکر...... اعظم اپنی بائیک پر ساجد کی گاڑی کا تعاقب کر رہا تھا۔ ریحان سے بھی رابطے میں تھا، اعظم گاڑی سے قصداً فاصلے پر تھا کہ اس پر شک نہ کیا جائے۔

ساجد کی گاڑی ایک بڑے رہائشی علاقے میں داخل ہو کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی یہ اسے کسی طرح بھی پتا نہیں چل پا رہا تھا۔

''سنو یہ حیدر آباد کا پوش علاقہ ہے جہاں بڑے، بڑے حویلی نما گھر ہیں مگر سڑک پر کافی سناٹا ہے...... ایسا لگتا ہی نہیں ہے کہ ان مکانوں میں کوئی رہتا بھی ہو۔'' اعظم بتا رہا تھا۔

اب ریحان مکانوں کے نمبر اور علاقے کی تفصیلات پوچھ رہا تھا۔ اور حارث کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کسی بوتل کے جن کی طرح وہاں پہنچ جائے۔ اور ریحان یہ سوچ کر پریشان تھا کہ یک دم سوئچ آف کیوں ہو گیا ہے اور اعظم کو یہ تکی تھی کہ ساجد اسے چکمہ دے کر گیا کہاں۔

☆☆☆

اور آج پھر وہ ندیم خان کے گھر پہنچ گیا تھا۔ اور ایسے وقت میں پہنچا تھا جب ندیم خان اپنے آفس میں تھا۔

''بیٹا تم کیوں مجھے ٹینشن دینے آ جاتے ہو۔'' ساجدہ بیگم نے اس سے نرم لہجے میں کہا۔

''آنٹی آج تو میں آپ کے پاس معافی مانگنے آیا ہوں...... آپ مجھے معاف کر دیجیے گا...... میری باتوں سے آپ کو دکھ پہنچا......''

## بابل کی وداعی

آج میں اپنے والد کے بارے میں لکھ رہی ہوں تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔ آج سے سترہ، اٹھارہ سال پہلے تک پاکیزہ میں آپ سب کے ساتھ قلمی رشتہ تھا۔ پھر 2004ء میں شازیہ سرفراز سے شازیہ انور بننے کے بعد پاکیزہ، سے قلمی رابطہ ٹوٹ کر زندگی کے چھوٹے بڑے مسائل میں الجھ کر بس کبھی کبھار پڑھنے کی حد تک محدود ہو گیا۔

پیاری بہنوں......! آج آپ کے بیچ اتنے سال بعد جس چیز نے مجھے لا کھڑا کیا وہ چند ماہ پہلے آنے والا نہ صرف میرا بلکہ ہم سب بہن، بھائیوں کی زندگی کا ایک بڑا حادثہ ہے۔ جو ہم پر قیامت بن کر گزرا ........ دل بے چین تھا کہ میں یہ دکھ آپ سے شیئر کروں جبکہ کچھ دکھ ہماری زندگی میں ایسے حاوی ہو جاتے ہیں کہ جو کسی کے بانٹنے سے بھی ختم نہیں ہوتے۔

کہتے ہیں، بیٹیاں اپنے بابل کے آنگن کی چڑیاں ہوتی ہیں۔ جنہیں ایک دن اڑ جانا ہوتا ہے اپنے اصلی گھر اور بابل اپنی دعاؤں میں ہمیں رخصت کر دیتے ہیں۔ مگر میں نے اپنی رخصتی کے بارہ سال بعد کچھ ماہ پہلے اپنے چار بہن، بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے پیارے بابل کی اصلی گھر وداعی کی۔ چار مئی رجب کی ستائیسویں شب تھی۔ رات جاگ کر اللہ تعالیٰ کو منانا تھا، اپنی زندگی سنوارنے کے لیے، اپنی اولاد کی خوشیاں کامیابیاں مانگنا تھیں مگر سستی یا تھوڑی نیند لے کر اٹھنے کے چکر میں سو گئے۔ میاں جی نے کہا بھی کہ بہت اہم رات ہے۔ ارسل، جویریہ اور ارحم جو ہماری کل کائنات ہمارے آنگن کے نو، دس اور گیارہ سال کے پھول ہیں انہوں نے بھی عبادت کی۔ ہم میں سے کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ ستائیسویں شب صبح ہمارے لیے کیا لائے گی، شب معراج گزری اور صبح فجر کے بعد جب میاں جی صبح آفس کے لیے تیار ہو رہے تھے جب ایک خبر سن کر یقین نہیں آرہا تھا کہ ایسا ہو گیا ہے۔ اس کے آگے کا حال کیا ہو سکتا ہے وہ سمجھ سکتا ہے جو جو اس صورتِ حال سے گزرا ہے۔ بہر حال جب ہم اپنے گھر سے اپنے میکے پہنچے۔ وہاں پہنچ کر ہمیں جو سب پتا لگا اس پر ہمارے ساتھ ابو کی ہر اولاد کو بہت فخر ہوا۔ 1993ء میں ہماری فیملی سکھر سے کراچی شفٹ ہوئی تھی ابو سکھر میں MCB میں 18 گریڈ کے آفیسر تھے۔ انہوں نے اپنی پروموشن سے 3 ماہ پہلے اپنے لیفٹ ہینڈ میں درد رہنے کی وجہ سے ریٹائرمنٹ لے لی انہیں کچھ ماہ بعد شاید وائس پریزیڈینٹ کا عہدہ ملنے والا تھا۔ کراچی آکر ابو نے کتابوں کی دنیا سے ناتا جوڑا...... جو لوگ ان کے انڈر کام کرتے تھے وہ ان سے بھی آگے نکل گئے بڑے عہدوں پر پہنچ گئے کہ ابو کو کچھ سائن کرانے بھی ان کے پاس جانا پڑتا سب بہت عزت ان کو دیتے مگر ابو کہتے تھے پیسے سے دنیا بدل جاتی ہے۔ میرے ابو نے اپنی زندگی میں بہت نشیب و فراز دیکھے۔ وہ کتابوں کے شیدائی اور رسیا تھے، چلتی پھرتی ڈکشنری، کتابوں سے انہوں نے اپنا کمرا بھر رکھا تھا۔ علم کا وہ خزانہ تھے جن سے ہم بدنصیب صحیح طور پر مستفید نہ ہو سکے۔ ابو نے اپنی زندگی میں بہت صدمے برداشت کیے۔ اپنی دو بیگمات اور اولاد کے مرنے کے دکھ سہے۔ چونکہ میرے بچپن میں میری امی کا انتقال ہو گیا تھا اور پانچ چھوٹے بچوں کو پالنا ایک اکیلے مرد کا کام نہیں تھا تو

”تم صرف اپنی فکر کرو...... اور اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے ...... میں اور میرا بیٹا آئندہ چند روز میں یہاں سے جا رہے ہیں، کب واپس آئیں گے؟ اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ تم اپنی شادی کے بعد اس شہر سے کہیں اور چلے جاؤ تو زیادہ بہتر رہے گا...... کیونکہ ہم لوگ اپنی بیٹی، اس کے بچوں اور اپنے دوسرے بیٹے سے ملنے تو یہاں ضرور واپس آئیں گے...... اس لیے یہ وعدہ نہیں کروں گی کہ میں کراچی آنا اور یہاں رہنا بھی چھوڑ سکوں گی۔“

دوسری والدہ کو لانا پڑا اور دوسری والدہ ہمارے لیے سگی ماں سے بھی بڑھ کر ثابت ہوئیں پھر ہمارے بچوں کی نانی بننے کے بعد وہ بھی انتقال کر گئیں۔ ابو نے ہمیں دوستوں کی طرح پالا...... میٹرک تک وہ ہمارے امتحانوں کے زمانے میں بھی آخر تک ہمارے آگے پیچھے گھومتے کہ یہ بھی ایک نظر دیکھو پیپر خالی مت چھوڑنا ہم جھنجلاتے۔ سندھی، انگلش سب وہ سکھا دیتے، ٹیوشن کی ضرورت نہیں پڑنے دیتے تھے۔ ابو بڑے چھوٹے سب کے دوست تھے سب کو ہی فیض پہنچاتے تھے۔ روحانی رشتہ جب ان کا اللہ سے جڑا تو ایسا جڑا کہ وہ کبھی اللہ کے ذکر سے خالی نہیں رہے۔ ہر محفل میں اللہ کا ذکر کرتے لوگوں کو کھرا کھرا جھاڑ دیتے چاہے کسی کو برا لگتا۔ بہت لوگ ان سے گھبراتے بھی تھے کیونکہ وہ ٹوکنے سے نہیں جھجکتے تھے۔ لوگوں کی قرآن پاک کی غلطیاں محفل میں نکالتے تھے۔ وہ رمضان میں افطار پارٹیاں وغیرہ نہیں پسند کرتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ عبادت کی راتوں کا زیاں ہوتا ہے، عبادت میں خلل پڑتا ہے۔

انہوں نے ہمیں اتنے لاڈوں اور آسائشوں میں پالا کہ آج ہمیں راتوں کو بھی چین سکون نہیں آتا کہ ہم انہیں وہ سب نہ دے پائے جس کے وہ اصل حقدار تھے۔ والدین بخشش کا ذریعہ ہوتے ہیں، ان کے جانے کے بعد ہمیں اصل پہچان ہوتی ہے کہ ہم نے کیا کھویا کیا پایا؟ اب میں اپنے ابو کے بارے میں اختتامی سطریں روتے ہوئے لکھ رہی ہوں۔ شب معراج میں جب وہ فجر پڑھنے مسجد روانہ ہوئے تو ان کو اس دن نماز پڑھانے کا موقع ملا، بتایا گیا کہ انہوں نے سورۂ فتح جو کہ بڑی سورہ ہے وہ شروع کی تھی اور دوسری رکعت کے لیے جب وہ اٹھے تو ایک دم چپ ہو گئے کسی نے پیچھے سے یاد دلانے کی صورت میں الحمدللہ کہا تو بتاتے ہیں کہ ابو نے پورا الحمدللہ رب العالمین کہا اور ایسے انداز میں آرام سے پیچھے کسی کی گود میں گرے جیسے کسی نے ان کو باقاعدہ بٹھایا ہو اور جن بزرگ کی گود میں دم توڑا وہ بھی بہت اللہ والے بندے تھے اور ان سے ابو کا کافی ملنا، دوستی وغیرہ تھی۔ ابو کی تدفین میں لوگ دور، دور سے آئے۔ لوگوں نے ان کی موت پر بہت رشک کیا۔ میں اپنے پیارے ابو کے لیے جتنا لکھوں کم ہے۔

چند جملے اشعار کی صورت میں ہر وقت میری زبان پر رہتے ہیں جب بھی وہ یاد آتے ہیں یہ گنگنا کے ان کا تصور کرتی ہوں۔

کتنے نازوں سے پالا تھا تو نے ہمیں
ہر طرح سے سنبھالا تھا تو نے ہمیں
ہائے ہم سے جدا ہو گیا تو
سب کی یادوں میں بس رہ گیا تو
کتنی مقدس موت نے تجھے لیا اپنی آغوش میں
تو چلا بھی گیا اور زمانہ دیکھتا رہ گیا

تحریر: شازیہ سرفراز، کراچی

”آنٹی یہ آپ کی محبت ہے کہ آپ نے ایک تہی دست شخص کی محبت کو سمجھا...... ورنہ جس کی محبت نے مجھے خود اپنی ذات سے دور کر دیا تھا اب وہ مجھ سے شادی کرنے پر رضامند تک نہیں ہے۔“

”یہ تمہارا مسئلہ ہے، اس بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتی...... مگر جس کے جو نصیب میں ہوتا ہے وہ اس کو ضرور ملا کرتا ہے۔“

”مگر میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھول پاؤں گا۔“ ساجدہ بیگم نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اس وقت انہیں اپنے بیٹے ندیم خان کو ہر پریشانی سے بچانا تھا۔ اس لیے وہ اسے بہانے سے اپنے ساتھ اسلام آباد لے کر جا رہی تھیں۔

جہاں انہیں اپنی ایک عزیزہ کی عیادت بھی کرنی تھی...... اور کچھ دن اپنی بہن کے پاس بھی رہنا تھا...... جو ایک عرصے سے انہیں اپنے پاس بلا رہی تھیں۔

☆☆☆

ساجد کو واقعی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا پیچھا کیا جا رہا ہے اس لیے اس نے قصداً ایک پوش سوسائٹی میں گاڑی ڈال کر اور اس کے پچھلے راستے سے باہر نکال کر وہ آگے والی لین میں داخل ہو گیا تھا۔

شہلا کو اب ہوش آ گیا تھا...... اور وہ اسے حیران نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

اس کا موبائل جب اس کے پیروں کے پاس گرا دیکھا تو ساجد نے اسے اٹھا کر سوئچ آف کر دیا تھا...... بلکہ اس کی سم بھی نکال لی تھی۔

''آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟'' اپنے موبائل کے ساتھ یہ حرکت دیکھ کر وہ قدرے برہمی سے بولی۔

''وہی جو کرنا چاہیے تھا...... وہی کر رہا ہوں۔'' وہ مسکرایا۔

اب وہ قدرے ایک الگ تھلگ بنے ہوئے مکان کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ گاڑی کے ہارن سن کر واچ مین نے دروازہ کھولا...... اور گاڑی پہلے سیدھی اور پھر ایک ٹرن لے کر بیس منٹ میں چلتی چلی گئی۔

گاڑی رکتے ہی وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر مکان کے ایک ہال میں داخل ہوا۔

''یہ آپ مجھے کہاں لے آئے ہیں؟''

''جہاں تمہیں آنا ہی تھا۔''

''میری سینڈل کہاں چلی گئیں......'' اس نے اپنے ننگے پیروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے اسی کے منہ پر مار دیں جنہوں نے اس میں ڈیوائس لگائی تھی۔''

''آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' وہ بوکھلا گئی۔

''وہی جو تم سن رہی ہو۔'' ساجد نے ایک زوردار طمانچہ اس کے گال پر مارا۔ ''مجھے بے وقوف بنا رہی تھیں ناں تم!''

''نہیں تو۔'' وہ اپنے خون رستے پھٹے ہوئے ہونٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے گلوگیر لہجے میں بولی۔

''ساجد ایسا بے وقوف شخص نہیں ہے، جسے تم جیسے لوگ بے وقوف بنا سکیں۔ مونا مجھے لوٹ کر فرار ہوئی تھی اس کی سزا تو مجھے حارث کو دینی ہی تھی۔ مگر مجھے نہیں پتا تھا کہ حارث کے ساتھ، ساتھ مجھے دوسری مونا کو بھی سزا دینی ہو گی۔''

''مگر میں نے آخر کیا، کیا ہے؟'' اس وقت وہ کسی خوف زدہ ہرنی کی طرح نظر آ رہی تھی۔

☆☆☆

''میڈم آپ کو شاید غلط فہمی ہوئی ہے...... عامر جیسا مہذب شخص ہمارے آفس میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔'' خالہ کے شکایت بھرے فون کے جواب میں عامر کے آفیسر انہیں سمجھا رہے تھے۔

''اس شخص نے ہماری زندگی دوبھر کر دی ہے...... دھمکیاں علیحدہ دے رہا ہے۔ اور آپ بجائے اس کے خلاف کوئی ایکشن لیں، الٹا مجھے سمجھا رہے ہیں۔''

خالہ کا لہجہ خاصا برہمی لیے ہوئے تھا۔

''میڈم اب ذاتی معاملات تو آفس میں نہیں لائے جاتے...... اور نہ ہی اس کا ذمے دار کوئی آفس ہو سکتا ہے مگر عامر کے بارے میں یہی رائے ہے کہ وہ ایک انتہائی نفیس شخص ہے...... جب آپ اچھے برے کو نہ پہچان سکیں تو پھر کیا کرتے ہوں گے۔'' خالہ نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

اور مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ عامر کہیں ندیم خان کو نقصان نہ پہنچادے۔ اور جب اپنے خوف کا ذکر میں نے ندیم خان سے کیا تو وہ ہتھے سے ہی اکھڑ گئے۔

''کیا چاہتی ہو تم...... میں چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھ جاؤں۔ گھر سے باہر نہ نکلوں......''

''یہ میں نے کب کہا ہے...... مگر بلا ضرورت نکلنے کی کیا ضرورت ہے......''

''ہاں تم کہتی ہو...... گھر سے کم نکلو...... امی کہتی ہیں، میں کراچی چھوڑ کر کہیں روپوش ہو جاؤں۔''

''ایک پاگل شخص نے سب کو ہی پاگل بنا ڈالا ہے۔''

''امی کہہ رہی ہیں کہ مجھے کچھ عرصے کے لیے یہاں سے کہیں چلے جانا چاہیے۔''

''آنٹی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' کچھ سوچ کر اس نے کہا۔

''تم سے کم از کم اس بزدلی کی مجھے توقع نہیں تھی۔'' وہ شکایتی لہجے میں بولے۔

''میں ڈر رہی ہوں، اس لیے ایسا کہہ رہی ہوں۔''

''ہماری شادی کے بعد وہ کر ہی کیا سکتا ہے؟''

''اگر وہ خودکشی کرنا چاہتا ہے تو شوق سے کر لے...... اکثر لوگ کر لیا کرتے ہیں...... اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔''

''ایسی بات نہ کرو......'' ندیم خان کا آہنی لہجہ...... جیسے ریزہ ریزہ ہو گیا۔

''کیا آپ کو خوف ہے اس بات کا...... کہ اس کی موت سے آپ پر کسی بدنامی کا چھینٹا...... نہ جائے؟'' دل میں آئی بات میرے ہونٹوں پر بھی آ گئی تھی۔

''یہ بات نہیں ہے۔''

''پھر کیا بات ہے؟ کس وجہ سے آپ کی بولتی یہاں آ کر بند ہو جاتی ہے...... آپ پر آخر کیا فرق پڑے گا، اس کے مرنے کا؟''

''اس کی موت سے اس کی ماں پر فرق پڑے گا ان کی پوری ہستی بکھر کر رہ جائے گی۔''

''اور ہاں مجھ پر...... یہ اثر ضرور ہوگا کہ میں ساری زندگی اس تاسف میں رہوں گا ایک شخص کی زندگی کا زیاں میری وجہ سے ہوا۔''

''تو آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کی مجھ سے شادی نہ ہونے کے بعد میں جھٹ سے عامر سے شادی کر لوں گی؟''

''اگر میں نہیں سمجھتا تو نہ سہی...... مگر عامر کے ذہن میں تو یہی بات ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ اب میں کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔''

''میں نے یہ بات پہلے بھی تم سے کہی تھی کہ یہ فیصلہ تم نے ہی کرنا ہے اور سوچ بچار کے بعد کرنا ہے۔''

''اور میں بھی یہ بات بارہا آپ کو سمجھا چکی ہوں اس لیے عامر سے تو میں کبھی شادی نہیں کرنے والی اگر

عامر نے مجھے تماشا بنایا ہے تو آپ نے بھی......'' اب میں رو رہی تھی اور ندیم خان انتہائی تاسف سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

ان کے موبائل پر کوئی میسج آیا تو اس پر ایک نظر ڈال کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''اچھا صبا اب اجازت دو۔''

''کیا آپ ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں؟'' میں نے گلوگیر لہجے میں ان سے پوچھا۔

''اللہ نہ کرے......'' ان کے لبوں سے نکلا......

اور میں بے اختیار ان کے ہاتھوں کو تھام کر پھر پھوٹ، پھوٹ کر رو رہی تھی۔ شاید یہ میرے دل کا خوف تھا...... کہ جب بھی وہ رخصت ہوا کرتے...... میں یہی سمجھا کرتی کہ اب میں ان کو کبھی نہیں دیکھ پاؤں گی مگر وہ قصداً ہنسے تو میں بھی جبراً مسکرانے لگی۔

☆☆☆

گو کہ یہ سب اتفاقی واقعات تھے۔ سین آپا کا کوئی پرس چھین کر بھاگ گیا تھا۔ سین آپا کے یہاں کی نئی گاڑی پر کسی نے بڑا سا ڈینٹ ڈال دیا تھا۔ اور ندیم خان کی والدہ شہناز بیگم کو مال میں کسی نے دھکا دے دیا تھا...... جس سے وہ گرتے، گرتے بچی تھیں...... یا ان کا پاؤں مڑا تھا۔ مگر ان تمام واقعات کی جڑ عامر کو سمجھا جا رہا تھا۔

''ان سب کے پیچھے وہی ہے...... وہ ہم سب کو ڈرانا چاہتا ہے۔ اگر وہ نہ ہوا تو اس کے لوگ ہوں گے۔ اس ٹائپ کے لوگوں کے احباب بھی ان ہی جیسے ہوتے ہیں۔''

یہی وجہ تھی کہ جب عامر ہمارے گھر آیا تو خالہ نے اسے بے نقط سنائیں۔

''تم جو محبت کرنے کا دعویٰ کرتے ہو اتنے گر چکے ہو کہ لوگوں کو پریشان کرتے پھر رہے ہو۔ تم سے اگر میں یہ سوال کروں کہ تم نے قصداً روپوش ہو کر میری بیٹی کی زندگی کیوں اجیرن کی تھی......'' امی بھی غصے سے پوچھ رہی تھیں۔

میں نے انتہائی نفرت سے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ یہاں سے چلا جائے۔ مجھے یہ یقین ہی نہیں ہے کہ میں نے اس جیسے انسان کو چاہا ہوگا۔

اور وہ چپ چاپ اٹھ گیا۔ کچھ بولے بغیر، کوئی وضاحت دیے بغیر...... مگر اس کی آنکھوں میں ایک شکایت ضرور تھی۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ تم میری محبت کے بارے میں ایسا کیوں سوچ رہی ہو۔

''میں تو آپ سب سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ سب الزامات کی کوئی ٹوکری لیے بیٹھے ہوں گے۔'' چلتے سے اس نے امی اور خالہ کو دیکھا...... اور کھسیا کر بولا تھا۔

اس کے جانے پر ہم سب نے ہی سکون کی سانس لی تھی۔

''جھوٹا کہیں کا...... ہم الزامات کی ٹوکری لے کر بیٹھے ہیں...... یا تم ہی اتنے کرمنل ہو گئے ہو۔''

مگر آدھے گھنٹے کے بعد ہی میرے موبائل پر اس کا میسج آ گیا۔

''پیاری صبا......

میری اپنی صبا......

یقین کیسا......

گمان کیسا......

عروج کیسا......

زوال کیسا......

سوال کیسا......

جواب کیسا......

محبتیں تو محبتیں ہیں......

محبتوں میں حساب کیسا......

اور مجھے غصہ ہی تو آ گیا......

''ہونہہ مجنوں کہیں کا...... اپنی ہر بات صحیح سمجھتا ہے اور موردِ الزام دوسروں کو ٹھہراتا ہے...... جیسے اس سے بڑھ کر کوئی سچا ہی نہیں......''

اور میں نے اس کو کوئی جواب دینے کے بجائے اس کا میسج ہی ڈیلیٹ کر دیا۔ مگر کافی دیر تک...... میرے ذہن میں اس کے جملے گھومتے رہے......

''محبتیں تو محبتیں ہیں

محبتوں میں حساب کیسا''

☆☆☆

''میں آپ کے ساتھ نہ اسلام آباد جا سکتا ہوں اور نہ ہی کہیں اور...... ندیم نے ماں کو جانے کے لیے تیار دیکھا تو کہا۔

''بیٹا میں تو تمہاری وجہ سے یہاں سے کچھ عرصے کے لیے ہٹ جانا چاہتی ہوں۔''

''امی، زندگی کسی سے ڈر کر نہیں گزاری جاتی۔''

''مگر کسی سے لڑ کر بھی تو نہیں گزرتی...... خواہ مخواہ اپنے دشمن پالنے کا فائدہ بھی کیا ہے؟''

''میں تو عامر سے نہیں لڑ رہا...... اور کچھ عرصے کے لیے شادی بھی ملتوی کر دی ہے۔''

''تم یہاں رہو گے...... تو صبا سے رابطے میں رہو گے۔''

''وہ تو میں کہیں بھی رہوں گا تو رابطے میں رہوں گا۔'' وہ بے اختیار کہہ بیٹھا۔

''بیٹا میں تمہاری جان جوکھوں میں نہیں ڈال سکتی۔''

''تو پھر میں کیا کروں...... بھاگتا پھروں؟ اس خبطی کی وجہ سے۔''

''بیٹا کچھ ہی دنوں کی تو بات ہے، میرا کہنا مان لو گے...... تو میرا سکون تو تباہ و برباد نہیں ہوگا۔''

''اگر ایسی بات ہے تو آپ...... سبین آپا کے گھر چلی جائیں اور میں اپنے آفس سے ملحقہ فلیٹ میں چلا جاتا ہوں...... تاکہ اپنے آفس تو جاتا رہوں۔''

''تم باہر نہیں گھومو گے۔''

''نہیں، اب تو خوش ہیں ناں آپ......''

''ٹھیک ہے...... مگر یہاں سے آج ہی اپنا بریف کیس اور بیگ لے کر نکل جاؤ۔''

''اور کوئی حکم؟''

’’صبا کو بھی یہ نہیں پتا چلے کہ تم کراچی میں ہی ہو۔‘‘
’’اچھا......!‘‘ وہ کچھ سوچ کر...... قدرے برہمی سے لفظ چبا کر بولا۔
’’بیٹا......اپنے مخالف کو کبھی کمزور نہیں سمجھا کرتے۔‘‘
’’مگر اپنے آپ کو کمزور اور بزدل سمجھنا چاہیے...... اور کہیں چھپ کر بھی رہنا چاہیے...... اور باہر کے لوگوں سے کسی قسم کے رابطے میں بھی نہیں رہنا چاہیے۔ اور حد تو یہ ہو کہ اپنی منگیتر کو بھی اپنے بارے میں جھوٹ بتانا چاہیے کہ کہیں وہ ہمارے مخالف کے ساتھ مل کر مجھے نقصان پہنچا دے۔‘‘ ندیم خان نے تمسخرانہ لہجے میں جیسے تقریر کر ڈالی اور اور وہ دل مسوس کر رہ گئیں۔

دوسری جانب عامر...... اپنے کمرے میں خاموش سا بیٹھا ہوا تھا صبا کے اکھڑ رویے نے اسے صدمہ پہنچایا تھا۔ سارے افسانوں اور ناولوں میں تو یہ لکھا ہوتا ہے کہ عورت کی محبت مرد کے مقابلے میں زیادہ قوی ہوتی ہے۔ مرد اس مقام تک پہنچ ہی نہیں پاتا اور اب صبا اس کی محبت کا مذاق اڑا رہی تھی۔

اس کی بچپن کی باتوں کو وہ نا سمجھی کی باتیں کہہ رہی تھی اور جب بھی وہ اس کے پاس جا رہا تھا، وہ ہر دن اس کی تذلیل کر رہی تھی۔ وہ تو میرے دل سے کبھی نکل ہی نہیں پائی اور میں اس کے دل میں تو کیا...... کہیں آس پاس بھی نظر نہیں آتا۔

اس کی نظروں میں تو جیسے بے گانگی سی گھلی ہوئی ہے۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم پھنسا کر سر کے نیچے رکھے اپنے بیڈ پر لیٹا سوچ رہا تھا۔

صبا کا اور اپنا موازنہ کر رہا تھا۔

تیز بارش میں کبھی سرد ہواؤں میں رہا
اِک تیرا ذکر تھا جو میری صداؤں میں رہا
کتنے لوگوں سے میرے گہرے مراسم تھے مگر
تیرا چہرہ ہی فقط میری نگاہوں میں رہا

☆☆☆

زندگی میں اکثر دل دکھانے والے سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں، یہی کچھ سوچ کر ندیم خان اپنے آفس سے ملحقہ فلیٹ میں شفٹ ہو گئے تھے۔

آفس کے ماحول میں خاصی تبدیلی آ چکی تھی...... فرزانہ، کوثر اور تنویر کسی پروڈکشن ہاؤس میں چلے گئے تھے...... ناعمہ اور صبا کی مشترکہ دوست سیما نے یہ اخبار جوائن کر لیا تھا...... اور انہیں بڑا تعجب تھا کہ صبا نے اپنی جاب پر آنا چھوڑ رکھا ہے...... اور ہر قسم کا رابطہ منقطع کیا ہوا تھا۔ اور وہ ہر قسم کے سوال و جواب سے اسی لیے بچی ہوئی تھی۔

فرید خان نے جب بین الاقوامی شخصیات کے انٹرویوز کی کوریج کے لیے رضا کو دبئی بھیجنا چاہا تو ندیم خان نے خود جانے کی حامی بھر لی۔

’’تمہیں تو کبھی باہر کی کوریج کے لیے جانا پسند ہی نہیں تھا......‘‘ فرید کو اس کے اقدام پر واقعی حیرت تھی۔
’’مگر اب پسند ہے اس کے بعد ملائشیا بھی جانا چاہوں گا......‘‘
’’اپنے آپ سے کیوں بھاگ رہے ہو...... یہ کسی مسئلے کا حل تو نہیں ہے ناں......‘‘

''ماں کا حکم ہے اور میں حکم عدولی نہیں کر سکتا...... اس اثنا میں عامر اپنی سی جو کرنا چاہے کر لے......''

''وہ بگڑم کا ناچ بھی ناچ لے، اب صبا اس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھے گی۔'' فرید نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''مگر پھر بھی ہمیں عامر کو ٹائم تو دینا چاہیے ناں...... تاکہ وہ بھی اپنی سی کرے...... اور اسے یہ غلط فہمی بھی نہ رہے کہ کسی نے اس کی محبت پر قبضہ کرلیا ہے۔'' ندیم کا لہجہ دھیما سا تھا۔

''اب عامر جیسے لوگوں کو ہر لحاظ سے پاگل کہا جاتا ہے اور تم ایک پاگل کے آگے اپنے گھٹنے ٹیک رہے ہو۔''

''میں تو عامر سے کچھ بھی نہیں کہہ رہا...... بس اسے ٹائم دے رہا ہوں تاکہ اس کی غلط فہمی دور ہو جائے۔''

''اور اس بات میں کتنی حقیقت ہے کہ وہ تمہاری اور صبا کی شادی کے بعد تمہیں تنگ نہیں کرے گا؟''

''پھر تو میں اسے دیکھ ہی لوں گا۔''

''میرے یار، جو کام تمہیں چھ ماہ بعد کرنا ہے وہ اب کیوں نہیں کر لیتے؟''

''فرید تمہاری ہر بات صحیح ہے اور میرا دل بھی یہی کہتا ہے کہ مگر کیا کروں...... میں اپنی ماں کو کسی قسم کے تفکرات میں نہیں ڈال سکتا۔''

منتظر میرے زوال کے ہیں
میرے اپنے بھی کیا کمال کے ہیں

''تم کیا سمجھتی تھیں حارث کی محبوبہ بن کر میری دوست بن کر رہو گی...... میرے بارے میں انفارمیشن

...... حارث اور اس کے باؤلے دوست ریحان کو پہنچاؤ گی اور رہی یہ بات کہ تمہیں ایسے مضبوط ثبوت مل جائیں گے کہ حارث کو وہ غلط چیک میں نے ہی بھیجا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی بینک کی انتظامیہ نے اسے بے پروا منیجر کا خطاب دے دیا تھا اور اس کی پروموشن بھی روک دی گئی تھی اور پھر میں نے بھی کام کوئی ہلکا نہیں کیا تھا...... لکھا ہوا چیک دو روز کے بعد خود ہی سادہ ہو گیا تھا...... اور حارث جیسا گھاگ شخص بھی میرے جھانسے میں آ گیا۔''

''مگر آپ کا کیا فائدہ ہوا...... ایسے شخص کو نقصان پہنچا کر جس کا مونا سے کسی قسم کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ وہ تو ان کے ہاں رینٹ پر آئی تھیں۔''

''ہاں مجھے معلوم ہو گیا سب...... مگر مونا اس سے بہت پیار کرتی تھی اور یہ اسے آپا کہا کرتا تھا...... اور وہ یقیناً مجھ سے لوٹے ہوئے پیسوں میں انہیں بھی کچھ نہ کچھ نواز کر گئی ہو گی۔ اس کے جاتے ہی انہوں نے مکان کی دوسری منزل بنوائی شروع کر دی تھی۔''

''آج کل کوئی کسی کو کچھ نہیں دیا کرتا...... یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔'' شہلا نے اس سے کہا۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو تم...... جیسے حارث سے محبت کرنے کی وجہ سے تم نے مجھے اعتماد نہیں دھوکا دیا، میرے اشاروں پر اس لیے چلتی رہیں کہ حارث کے لیے کام کر رہی تھیں۔''

''میں تو آپ کے ہاں صرف جاب کرنے آئی تھیں اور بس......''

''اور اب میں...... تمہیں کسی قابل نہیں چھوڑوں گا...... نہ حارث کے قابل...... اور نہ جاب کے قابل...... تمہاری حکایت دل...... کی ہر موومنٹ تمہارے اس بیہودہ آفس میں پہنچے گی...... جس میں کام کرنے والے لوگ اپنے آپ کو افلاطون سمجھ رہے ہیں۔''

''پلیز مجھے گھر جانے دیں۔'' شہلا منمنائی۔

''ہاں گھر تو تم ضرور جاؤ گی...... مگر اپنے منہ پر کالک مل کر......'' وہ بے رحمی سے ہنسا۔

اور عین اسی وقت فائرنگ شروع ہوئی۔ اتنی تیز...... کہ ساجد کو یوں لگا جیسے کوئی اس کے گھر میں آ کر گولیاں برسا رہا ہو۔

''میرا خیال ہے باہر کوئی ہنگامہ ہو رہا ہے۔'' ساجد نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

''پولیس آ گئی ہے شاید......'' شہلا نے کہا۔'' اتنی فائرنگ کون کر سکتا ہے؟ پولیس کیسے آ سکتی ہے؟ ریحان کا باپ بھی نہیں جان سکتا تھا کہ تم مکان کے تہ خانے میں ہو۔''

''اچھا...... پھر میرا خیال غلط ہو گا۔''

فائرنگ پھر ہوئی تو ساجد قدرے گھبرایا۔

''میں ذرا اپنے ملازموں سے کہتا ہوں کہ کوئی آئے تو کہہ دینا یہاں گھر میں کوئی نہیں رہتا۔''

اور جب اس نے یہی جملے انٹر کام پر اپنے ملازم خاص سے کہے تو اس نے جواباً کہا۔

''صاحب ہمارے پڑوس میں ریڈ پڑا ہے...... بہتر ہو گا کہ آپ یہاں سے نکل جائیں۔'' ساجد نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

''تم نیچے کھانا بھیجو...... میں کچھ دیر بعد یہاں سے آگے چلا جاؤں گا۔''

''سر، آپ فوراً نکل جائیں، علاقے کے حالات تسلی بخش نظر نہیں آ رہے......'' ملازم کا لہجہ تفکر آمیز تھا۔

تب ساجد کے چہرے پر ایک دم پریشانی سی چھا گئی۔

☆☆☆

پریشان تو امی بھی ہو گئی تھیں...... جب عامر روزانہ ہمارے فلیٹوں کے سامنے اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا رہتا......اور اس کی نظریں کمرے کی کھڑکی کی طرف جیسے گڑی ہی رہتیں۔

یہی وجہ تھی کہ کھڑکی کھولنا تو کجا اب میں اپنے کمرے کے پردے بھی نہیں ہٹاتی تھی گھر سے باہر نکلنا تقریباً چھوڑ دیا تھا۔

''خیریت تو ہے، کہاں جا رہی ہیں آپ؟'' ایک شام امی کو لے کر جب ڈاکٹر کے پاس جا رہی تھی تو وہ پتا نہیں کہاں سے سامنے آ گیا اور بولا۔

''ایسے ہی واک پر نکلے ہیں ہم۔'' میں نے چڑ کر کہا۔

''گاڑی پر واک کیا کرتی ہو۔'' مجھے گاڑی میں بیٹھتا دیکھ کر وہ بولا۔

''میری مرضی، میں جیسے دل چاہے کروں......''

''ٹھیک ہے بھئی...... مجھے تو آنٹی کا چہرہ اترا اترا سا لگا تو پریشان ہو گیا تھا۔''

''آپ اپنی پریشانیوں کو حل کیا کریں...... دوسروں کے معاملات میں دخل نہ دیں تو بہتر ہوگا۔'' امی کے بیٹھنے کے بعد...... میں نے اسے دیکھتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

''اب اگر ندیم تمہیں چھوڑ کر چلا گیا ہے تو چلو وہ تو اسے جانا ہی تھا۔''

''ندیم کے چلے جانے کے بعد بھی میں تم سے بات تک نہیں کرنا چاہوں گی۔'' گاڑی اسٹارٹ کر کے میں زن سے تیزی سے لے گئی۔ اسپیڈ اتنی تیز تھی کہ ٹائر تک چیخ اٹھے تھے۔

اس شخص کا نام تو پریشانی ہونا چاہیے تھے...... جب تک میری یادوں میں آباد رہا...... میں از خود پریشان سی رہی...... اور کبھی کوئی مثبت فیصلہ نہ کر سکی۔ اور اب اس کے آنے کے بعد میری ہنستی مسکراتی دنیا میں ایک طوفان آ گیا تھا۔

ندیم خان کی فیملی اس کی حرکتوں کی وجہ سے الگ نالاں تھی۔ میں علیحدہ برہم تھی۔

☆☆☆

''کیا ہوا......'' شہلا نے اس سے پوچھا۔

''کچھ نہیں، تم ایک بڑا سا دوپٹا اوڑھ لو......اور اپنا چہرہ چھپا لو...... یہاں بے پردہ خواتین کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔''

''کیا ہم کہیں.......ہے ہیں؟'' اس نے ڈرتے، ڈرتے پوچھا۔

''ہاں، میرا بڑا، چا گیسٹ ہاؤس ہے......تھوڑے فاصلے پر......وہاں جا کر کھانا کھاتے ہیں۔''

شہلا اس کے کہنے پر اپنے آپ کو دوپٹے میں اچھی طرح لپیٹ کر جب اس کے ساتھ باہر آئی......تو پولیس بڑی تعداد میں تھی۔

''ایک شریف شہری کے گھر میں بغیر وارنٹ کے آپ کیسے داخل ہوئے ہیں۔'' ساجد ان کو دیکھ کر غصے میں بولا۔

''آپ جیسے لوگوں کے کرتوت اب منظر عام پر آئیں گے۔'' اعظم نے کہا۔

''بغیر ثبوت کے بکواس مت کرو۔'' ساجد دہاڑا۔
''سر ہمارے پاس اس کی باتوں کا ٹیپ موجود ہے۔ آپ اسے گرفتار کرلیں۔'' اعظم نے کہا۔
''باہر دوسری گاڑی میں ریحان موجود یہ سب دیکھ رہا تھا۔
''جس کے کہنے پر تم نے یہ جھوٹا جال پھیلایا، اس کو بھی میں دیکھ لوں گا۔'' ساجد، اعظم کو دیکھ کر نفرت سے بولا۔
''آیئے ہمارے ساتھ۔'' پولیس کے جوان اب اسے اپنے ساتھ جانے کو کہہ رہے تھے۔
''مگر کس جرم میں......''
''آپ ایک لڑکی کو اس کی مرضی کے بغیر لے کر دوسرے شہر کیسے آگئے؟''
''کیا میں اپنی سیکرٹری کے ساتھ کہیں نہیں جاسکتا۔''
''مگر مجھے تو آپ کوئی مشروب پلا کر لے آئے ہیں......اور میں تو یہ تک نہیں جانتی کہ اس وقت میں کہاں پر ہوں۔'' شہلا نے آگے بڑھ کر کہا۔
''آپ ہمارے ساتھ چل رہے ہیں۔'' پولیس کے جوان بے حد مہذب انداز میں اسے اپنے ساتھ لے جاتے ہوئے بولے۔
اور اس کے جاتے ہی ریحان اپنی گاڑی سے اترا......اور شہلا سے بولا۔
''آپ ہماری گاڑی میں آجائیں......اللہ کا شکر ہم بروقت پہنچ گئے۔''
''پھر بھی آپ یہ سب حارث کو مت بتایئے گا۔'' شہلا اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔'' وہ خواہ مخواہ بات کو کیا سمجھیں گے؟''
اور جب گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھی تھی......حارث کو اس میں بیٹھے دیکھ کر پریشان سی ہوگئی۔
''سنیے......اس میں......میرا کوئی قصور......وہ مجھے بے ہوش کر کے لایا تھا۔''
اور حارث نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔
''کچھ مت کہو......تمہاری ساری پریشانیوں کا ذمے دار صرف میں ہی تھا۔ اور اب ایسا بالکل نہیں ہوگا۔''
گاڑی اب تیز چل رہی تھی اور شہلا نے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں اور اس کے اندر...... گو ایک سکون ضرور تھا مگر اس کی آنکھیں چھما چھم برس رہی تھیں۔

☆☆☆

اگلے دن کے اخباروں میں ساجد کے بارے میں خبر لگی ہوئی تھی کہ'' ایک نفسیاتی مریض گرفتار جو لوگوں کو ایذائیں پہنچا کر خوش ہوا کرتا تھا......جعلی چیک کے ذریعے اس نے کئی نوجوانوں کو پریشان کیا تھا...... اسی طرح خوب صورت لڑکیوں کو اپنے پیسے کی چمک دمک دکھا کر انہیں نقصان پہنچایا کرتا تھا۔'' یہ ریحان کے اپنے تعلقات تھے کہ ان تمام معاملات میں شہلا کا نام کہیں نہیں تھا۔

☆☆☆

نگر میں دہل سی گئی تھی......اور عامر کو یوں دیکھے چلی جارہی تھی جیسے کوئی تہی دامن کسی کو دیکھا کرتا ہے......اور وہ مسکرا رہا تھا......شاید اپنی کامیابی پر......

(جاری ہے)




# کہہ رہی ہے زندگی

رضوانہ پرنس

"ارے اماں، آپ نے ابھی تک چائے نہیں پی، دیکھیے بالکل ٹھنڈی ہوگئی ہے یہ تو۔" عمیر نے چپ چاپ بیٹھی ہوئی اپنی اماں کو بہت پیار سے متوجہ کیا۔

وہ بے اختیار چونک گئیں۔

"ارے مجھے یاد ہی نہیں رہا۔" بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے جلدی سے کپ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو عمیر ہنس دیا۔

"رہنے دیں اماں، اب یہ چائے پینے کے قابل

نہیں رہی۔ میں دوسری بنا دیتا ہوں۔''

''رہنے دو بیٹا! ابھی مجھے چائے کی طلب نہیں ہو رہی جب دل چاہے گا تو خود ہی بنا لوں گی۔'' ان کے جواب پر عمیر نے غور سے اُن کے چہرے کی جانب دیکھا۔ کافی اُلجھی، اُلجھی سی لگ رہی تھیں وہ۔

''کیا بات ہے اماں سب ٹھیک تو ہے ناں؟'' وہ فکر مند سا ہو کر ان کے نزدیک بیٹھ گیا اور دروازے سے اندر آتی ہوئی ماہین وہیں ٹھٹک کر رک گئی۔ عمیر اور اماں کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی لیکن ماہین کا تو رواں رواں سماعت بن کر ان کی طرف متوجہ تھا۔

''کچھ نہیں بیٹا، آج میں اپنی الماری ٹھیک کر رہی تھی تو اتفاق سے میری نظر اپنے پاسپورٹ پر پڑی، نکال کر دیکھا تو اسے ایکسپائر ہوئے چھ ماہ گزر چکے ہیں۔'' اماں نے اپنی پریشانی بتائی تو عمیر بے ساختہ ہنس دیا۔

''اُفوہ اماں، آپ نے تو ڈرا ہی دیا تھا، میں سمجھا پتا نہیں کیا بات ہے۔'' عمیر کے ہنس کے کہنے پر اماں نے خفگی سے اسے گھورا۔

''اے لو بھلا اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے، میرا پاسپورٹ ختم ہو گیا ہے اور تمہیں کوئی فکر ہی نہیں ہے۔ دو سال پہلے تمہارے چھوٹے ماموں اور دوسرے عزیزوں سے ملنے انڈیا گئی تھی واپس آ کر دوبارہ پاسپورٹ دیکھا ہی نہیں بس ویسے ہی الماری کی دراز میں پڑا رہا۔ ذرا دیکھو تو سہی عمیر یہ پانچ سال کا عرصہ کیسے پر لگا کر اڑ گیا پتا ہی نہیں چلا۔'' ان کے آخری جملے پر عمیر نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ...... مجھے بھی یہ کل کی بات لگ رہی ہے۔ جب پانچ سال پہلے میں آپ کے ساتھ پاسپورٹ آفس گیا تھا۔ ویسے اماں اس بار میں آپ کا دس سال کی معیاد والا پاسپورٹ بنواؤں گا تا کہ آپ کافی عرصہ اطمینان سے رہیں۔''

عمیر کی بات پر اماں نے ایک سوچتی ہوئی سی نگاہ اس پر ڈالی۔

''اچھا ایسا ہوتا ہے؟ لیکن بیٹا سنا ہے اس کی فیس زیادہ ہوتی ہے۔

''اوہو...... اماں چند ہزار کا فرق ہوتا ہے لیکن دس سال کے لیے سکون تو رہتا ہے ناں۔'' ماہین کو ماں بیٹے کی یہ گفتگو ذرا جو بھائی ہو۔

''اونہہ...... ان بڑی بی کا بس چلے تو بیٹے اور بہو کے منہ کا نوالہ بھی چھین کر خود کھالیں۔'' اس نے تلملاتے ہوئے سوچا اور کھولتے ہوئے ذہن کے ساتھ واپس پلٹ گئی۔

آہٹ کی آواز پر اماں نے بے اختیار دروازے کی جانب دیکھا۔

''میرے خیال میں ماہین دروازے سے واپس لوٹ گئی ہے، اسے تمہارا، میرے پاس دو گھڑی بیٹھنا بھی گوارا نہیں ہوتا۔ جاؤ بیٹا ورنہ گھنٹوں اس کا موڈ آف رہے گا۔'' اماں کا لہجہ بہت دل گرفتہ سا ہو گیا تھا۔

''اُفوہ اماں، آپ ہمیشہ ماہین کے لیے نیگیٹو ہی سوچتی ہیں، ایسا کچھ بھی نہیں ہے، اسے بھی آپ سے یہ ہی شکایت ہے کہ آپ اسے محض بہو سمجھتی ہیں، بیٹی کی نگاہ سے کبھی نہیں دیکھا اسے۔'' عمیر نے کچھ بُرا مان کر انہیں ٹوکا تو وہ طنزیہ سی ہنسی ہنس دیں۔

''بیٹا یہ سچ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ماں کے پیروں کے نیچے جنت ضروری رکھی ہے لیکن طاقت شاید بیوی کے پیار میں ڈال دی ہے کہ زیادہ تر بیوی کا پلڑا ہی بھاری رہتا ہے۔''

''میری بات کا غلط مطلب مت لیں اماں، میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ آپ اور ماہین پیار و محبت سے رہیں۔'' عمیر نے کچھ کھسیا کر اماں کی جانب دیکھا۔ ''ساس، بہو والے ماحول سے میرا دل گھبراتا ہے اور یہ ہی بات میں ماہین کو بھی سمجھاتا رہتا ہوں۔ پلیز اماں میری محبت پر ایسے شک تو مت کریں۔'' اس نے کچھ ایسی اداسی سے ماں کی جانب دیکھا کہ انہیں بے اختیار اپنے لاڈلے اور اکلوتے بیٹے پر پہلے پیار اور پھر ترس بھی آ گیا۔

''عمیر میرا بچہ تمہاری محبت ہی تو میرے جینے کا

سہارا ہے۔ پس کبھی، کبھی الجھ کر الٹا سیدھا بول دیتی ہوں، تم دل پر مت لیا کرو۔'' انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ مطمئن سا ہو کر کھڑا ہو گیا۔

''ٹھیک ہے اماں، میں پرسوں آفس سے چھٹی لے لوں گا اور ہم لوگ صبح سویرے ہی پاسپورٹ آفس کے لیے نکل جائیں گے ورنہ کافی رش ہو جاتا ہے۔'' اماں کا چہرہ عمیر کی بات سن کر ایک دم کھل سا گیا۔ لبوں سے جیسے دعاؤں کا چشمہ ابل پڑا۔

''جیتا رہے میرا بچہ، خوش رہے، آباد رہے، اللہ کامیابیوں کے بے شمار در تمہارے لیے کھول دے، میرے بیٹے۔'' ان کی آواز نہ جانے کیوں بھرا سی گئی۔

''اوہو اماں کچھ دعائیں پاسپورٹ بن جانے کے بعد کے لیے بھی چھوڑ دیں۔'' عمیر نے شرارت سے انہیں دیکھا اور مسکراتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

''تم کیا جانو بیٹا کہ ہر ماں کے پاس دعاؤں کا اتنا بڑا خزانہ ہوتا ہے کہ بچے دعائیں لیتے ہوئے تو تھک سکتے ہیں لیکن ماں دیتے ہوئے کبھی نہیں تھک سکتی۔'' انہوں نے دل ہی دل میں بیٹے کو مخاطب کر کے کہا اور وضو کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں کہ مغرب کی نماز کا وقت بھی تو ہو گیا تھا۔

☆☆☆

سفینہ بی بی ایک قناعت پسند خاتون تھیں جن کی زندگی اپنے شوہر اور اکلوتے بیٹے عمیر کے گرد ہی گھومتی رہتی تھی۔ ارباز ایک کمپنی میں چھوٹی سی پوسٹ پر ملازم تھے۔ پوسٹ بے شک بڑی نہیں تھی لیکن کمپنی اتنی تنخواہ ضرور دیتی تھی کہ بس سکون سے گزارہ ہو جاتا تھا۔ انہیں محدود رقم میں بھی گھر خوش اسلوبی سے چلانا آتا تھا۔ عمیر ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی پیدائش کے وقت کچھ ایسی پیچیدگیاں ہو گئی تھیں کہ وہ پھر کبھی دوبارہ ماں نہیں بن سکی تھیں تو جیسے ان کی ساری دنیا عمیر میں ہی سمٹ آئی تھی۔ چاہنے والا شوہر اور پیارا سا بیٹا ان کی کل کائنات تھے۔ ان کا سارا میکا پڑوسی ملک میں تھا۔ وہ ایک بار اپنے ماں، باپ کے ساتھ پاکستان اپنے عزیزوں سے ملنے آئی تھیں اور پھر واپس ہندوستان نہیں جا سکیں کہ ان کے ماموں نے اپنے بیٹے کا رشتہ جو دے دیا تھا۔ والدہ اپنے بھائی کو انکار نہ کر سکیں ویسے بھی ارباز ان کا بھانجا ہونے کے علاوہ بہت شریف، تہذیب یافتہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ یوں چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق وہ ارباز کی دلہن بن گئیں اور ان کے والدین واپس لوٹ گئے۔ کتنا پھوٹ، پھوٹ کر روئی تھیں وہ اپنے اماں، ابا کو رخصت کرتے ہوئے لیکن پھر ماموں، ممانی کی شفقت اور شوہر کی محبت نے میکے کی یاد کو کافی حد تک بھلا دیا اور وہ اپنی نئی زندگی میں مگن ہو گئیں۔

شادی کے ایک سال بعد ہی ماموں نمونیے کا شکار ہو کر چل بسے ممانی نے ان کی جدائی کا کچھ ایسا اثر لیا کہ چھ ماہ کے اندر ہی وہ بھی میاں کے پیچھے چلی گئیں۔ مالی وسائل اتنے نہ تھے کہ سفینہ بی بی کے والدین پاکستان دوبارہ آتے۔ یوں رو دھو کر زندگی پھر اپنے ڈگر پر چل پڑی تھی۔ ابھی عمیر پانچ برس کا ہوا ہی تھا کہ ایک بھیانک ایکسیڈنٹ نے ارباز کو کچھ ایسے اچانک ان سے چھینا کہ وہ صدمے سے ساکت رہ گئیں۔ ارباز کی جدائی کا شدید غم اور پھر اس پر مستزاد آنے والے کٹھن حالات کا سوچ کر وہ غم اور پریشانی سے نڈھال تھیں۔ ایسے میں اللہ نے کمپنی کے مالک کے دل میں رحم ڈالا ویسے بھی وہ ارباز کے کام اور ایمان داری کے بہت معترف تھے اور اب ان کی بیوہ کے حالات سے باخبر ہونے کے بعد انہوں نے سفینہ بی بی کے لیے فرم کی طرف سے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا لیکن اس کے علاوہ بھی سفینہ بی بی نے سلائی کڑھائی کا کام بھی شروع کر دیا تھا کہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا چھوٹی، چھوٹی سی خوشیوں کے لیے ترس کر زندگی گزارے۔ وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے، ان کا لاڈلا بیٹا ایک خوب صورت نوجوان کے روپ میں ڈھل کر ان کی تمام ریاضتوں کا ثمر بن گیا تھا۔ بہت اعلیٰ تعلیم تو وہ اسے اپنے حالات کی بنا پر نہیں دلا پائی تھیں لیکن پھر بھی اسے اتنی اچھی ایجوکیشن ضرور

دلانے کی کوشش کی تھی کہ اسے بہتر ملازمت مل سکے اور یہ بھی عمیر کی خوش قسمتی تھی کہ اسے اپنے مرحوم باپ کی کمپنی میں ہی اکاؤنٹنٹ کی جاب مل گئی۔ بیٹے کے برسر روزگار ہوتے ہی سفینہ بی بی کے دل میں بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کا ارمان جاگ گیا لیکن عمیر کی ضد تھی کہ وہ پہلے انہیں ان کے بھائی، بہن اور دیگر عزیزوں سے ملنے لے کے جائے گا اسے اپنی ماں کی قربانیوں کا احساس تھا جو اپنے والدین کے مرنے پر بھی نہیں جا سکی تھیں۔ اور جب اس نے انہیں وہاں جانے کے لیے ٹرین پر بٹھایا تھا تو اپنی اماں کے چہرے پر بکھری ہوئی خوشی اسے ایک روشنی بن کر اپنے دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد بھی کتنے دنوں وہ ایک سرشاری کے عالم میں رہی تھیں اور اپنی ماں کے لبوں سے اپنے لیے نکلتی دعاؤں کو وہ ایک آیت کی طرح اپنے دل میں اتار لیتا تھا۔

پھر کچھ عرصے بعد اماں نے اس کے لیے چاند سی دلہن تلاش کر ہی لی تھی۔ ماہین بھی ان کی طرح ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ پانچ بچوں کے ساتھ اس مہنگائی کے دور میں اس کے والدین بہت مشکل سے گزارہ کر رہے تھے ایسے میں عمیر کا رشتہ ان کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھا کہ اماں نے جہیز لینے سے بھی منع کر دیا تھا۔ انہیں بس محبت اور ایثار سے گندھی ایک سلیقہ مند پیاری سی لڑکی اپنے بیٹے کے لیے چاہیے تھی جو ان کے گھر کو جنت بنا دے لیکن جسے وہ میٹھا ہی سمجھ کر اپنے گھر لائی تھیں وہ ایسا کھٹا نکلا کہ وہ بجھ کر رہ گئیں۔ رشتوں میں الفت خلوص اور عزت نہ ہو تو رشتے بوجھ بن جاتے ہیں اور ماہین بھی ان لڑکیوں میں سے تھی جو شادی کے بعد صرف اور صرف شوہر کا ساتھ اس کی رفاقت چاہتی ہیں، ساس کے رشتے کو اس نے محض ایک بوجھ کے مانند لیا تھا۔ عمیر کے سامنے تو اماں کے ساتھ بظاہر وہ ایک اچھی بہو کے طور پر نظر آتی تھی لیکن اس کی غیر موجودگی میں اس کا رویہ اماں کے ساتھ بہت سرد مہری لیے ہوتا۔ زیادہ تر وہ اپنے کمرے میں ہی رہتی، اماں کا بہت دل چاہتا کہ دونوں ساس، بہو بیٹھ کر ڈھیر ساری باتیں کریں۔ کچن میں مل جل کر ہنستے بولتے اپنی بہو کے ساتھ کام کرنے کا خواب تو بہت عرصے سے ان کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں لیکن اس خواب کی تعبیر نے انہیں ایک اذیت ہی دی تھی۔ وہ اکثر عمیر کے جانے کے بعد ماہین کے کمرے میں خود ہی چلی جاتیں۔ کبھی عمیر کے بچپن کی باتیں، کبھی شوہر کے ساتھ گزارے لمحات کے قصے وہ اپنی بہو کے ساتھ شیئر کرنے کی کوشش کرتیں لیکن پھر کچھ ہی دیر میں وہ ماہین کے چہرے پر بکھری بیزاری کو محسوس کرتے ہوئے کچھ دل گرفتہ سی ہو کر وہاں سے اٹھ جاتیں۔ البتہ ماہین کا وہی سرد رویہ عمیر کی واپسی کے وقت ایک نیا ہی روپ بدل لیتا۔ ہنستی کھلکھلاتی سجی بنی سی ماہین ایک دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اپنے شوہر کا استقبال کرتی تو وہ جیسے نہال سا ہو جاتا۔ کچھ ہی دیر میں وہ گرما گرم چائے بنا کر لے آتی، پہلے تو اماں ہی اپنے بیٹے کے لیے چائے بنایا کرتی تھیں کہ وہ بچپن سے ان کے ہاتھ کی بنی چائے پینے کا عادی تھا لیکن اب یہ ذمے داری ماہین نے لے لی تھی۔ سفینہ بی بی ماں کے علاوہ ایک عورت بھی تھیں انہیں یہ بات اپنے دل پر لگتی محسوس ہوئی تھی کہ اب ان کے بیٹے کو اپنی ماں کے ہاتھوں کی بنی ہوئی چائے کی طلب ہی نہیں رہی تھی۔

وہ دونوں میاں، بیوی کچھ دیر اماں کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتے لیکن اس وقت بھی عمیر کی پوری توجہ اپنی نئی نویلی دلہن ہی کی طرف رہتی۔ کچھ دیر بعد جب ماہین اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی تو جیسے عمیر کا سارا دھیان بس اپنے کمرے کی طرف ہی مبذول ہو جاتا۔ ماں کی بوڑھی کمپنی میں کچھ وقت گزار کر وہ بہانے سے اٹھ کر ماہین کے پیچھے چلا جاتا۔ وہ دل مسوس کر رہ جاتیں۔ وقت کتنا بدل گیا تھا۔ شادی سے پہلے عمیر آفس سے آ کر کتنی دیر ان کے پاس بیٹھتا تھا۔ دونوں میں دنیا جہاں کی باتیں ہوا کرتیں لیکن اب تو جیسے وہ مارے باندھے ہی ان کے پاس بیٹھتا تھا وہ بیٹے سے شکایت کر کے اپنا مان نہیں گنوانا چاہتی تھیں۔ بس کبھی کبھی بے اختیار

آنکھیں چھلک جاتیں شاید ان ہی لفظوں سے آنسو بنتے ہیں جو ادا نہیں ہوتے لیکن دل پھر بھی اپنے بچے سے.. بدگمان نہیں ہوتا.... عمیر اب بھی ان کے کھانے، پینے ان کی صحت، ان کی دوائیوں کا پہلے ہی کی طرح خیال رکھتا تھا اور یہ ہی سوچ کر وہ اپنے آپ کو تسلی دیتی رہتیں کہ ماہین نے اپنے حسن اپنی خوب صورت ناز و ادا سے ان کے بیٹے کی آنکھیں ضرور خیرہ کی ہیں لیکن ماں کی محبت وہ اس کے دل سے نہیں نکال سکی۔ اور یہ حقیقت بھی تھی۔ نئی نئی شادی کا خمار کچھ کم ہوا تو عمیر کو اماں کے چہرے پر بکھری اداسی اور ان کی تنہائی کا احساس بھی ہونے لگا۔

''ماہین میرے خیال میں آج ہم لوگ شام اماں کے ساتھ ہی گزاریں، تین دن سے ہم مسلسل باہر جارہے ہیں، بیچاری اماں بور ہوتی ہوں گی۔'' ماہین کی اپنی فرینڈ کے گھر جانے کی فرمائش پر عمیر کے جواب نے اس کا موڈ آف کردیا۔

''عمیر، مائیں تو بچوں کی خوشی میں خوش ہوتی ہیں، ہمارے یہ گھومنے پھرنے کے دن ہیں، ہم تو کہیں ہنی مون پر بھی نہیں گئے کہ آپ کا بجٹ اس کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ کم از کم چھوٹی موٹی تفریح کی خوشی تو مجھ سے مت چھینیں۔'' ماہین کی حسین آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ میں اماں کی اداسی کہیں چھپ گئی اور پچھلی شاموں کی طرح وہ شام بھی اماں نے اپنے گھر میں بکھرے سناٹوں کے ساتھ گزاری حالانکہ رات واپسی پر تلافی کے طور پر عمیر کافی دیر ان کے پاس بیٹھا اپنی باتوں سے ان کا دل بہلاتا رہا تھا لیکن ایک عجیب سی اداسی جیسے ان کے دل کے اندر تک اتر گئی تھی۔ کتنے دنوں بعد آج شام عمیر نے ان سے پکوڑے بنانے کی فرمائش کی تھی۔ وہ کتنی چاہ سے بیسن گھول رہی تھیں جب کچن میں آکر کچھ ہچکچاتے ہوئے عمیر نے انہیں پکوڑے بنانے سے منع کیا تھا۔

''اماں مجھے معلوم نہیں تھا کہ ماہین کی دوست نے ہمیں چائے پر انوائٹ کیا ہے۔'' ماں کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو محسوس کرتے ہوئے اس نے صفائی دینے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اس کی بات سنی ان سنی کرتی ہوئی خاموشی سے سنک میں لگے نلکے سے ہاتھ دھو کر کچن سے باہر نکل گئیں۔ عمیر کو ان کی خفگی کا احساس ہوگیا تھا تبھی تو واپسی پر وہ کتنی دیر ان کے پاس بیٹھا ان کا موڈ ٹھیک کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اور یہ بات بھی ماہین کو خاصی ناگوار گزر رہی تھی۔

''تو یہ ہے عمیر تو انہیں ایسے منا رہے ہیں جیسے پتا نہیں کتنی بڑی زیادتی کردی ہے ہم نے ان کے ساتھ۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ پھر ایسے ہی چھوٹی، چھوٹی باتیں اماں کے دل میں بڑے بڑے گھاؤ ڈالتی رہیں جسے کبھی عمیر اپنی محبت سے بھر دیتا اور کبھی ان زخموں پر نادانستگی میں نمک بھی چھڑک دیتا۔ عمیر ہی تو ان کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھا لاکھ چاہنے کے باوجود بھی وہ اس سے زیادہ دیر خفا نہیں رہ پاتی تھیں البتہ فطری طور پر، بہو سے ان کا دل برا ہوتا جارہا تھا۔ جس کا رویہ انہیں ہر پل یہ احساس دلاتا رہتا گویا عمیر صرف اس کا ہے اماں کا تو جیسے کوئی حق ہی نہیں ہو۔ اس دن عمیر جب ان کی دوائیاں خرید کر گھر آیا تو موقع پا کر اس کی غیر موجودگی میں ماہین نے بظاہر ہنس کر اماں سے کہا تھا۔

''اتنی مہنگی دوائیاں اپنی محدود تنخواہ میں عمیر بیچارے کیسے افورڈ کرتے ہیں۔ اللہ ایسا بیٹا ہر ماں کو دے۔'' اس کے میٹھے لہجے میں چھپے طنز کی کڑواہٹ اماں نے اچھی طرح سے محسوس کی تھی۔ الفاظ کسی بھی تعلق یا رشتے میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں، رشتوں کے جڑنے اور بکھرنے میں ان کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ اماں کا چہرہ غصے اور خفت سے سرخ ہوگیا' بے اختیار دوائیوں کا پیکٹ اٹھا کر ماہین کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے ان کا لہجہ اونچا ہوگیا۔

''جاؤ بی بی اپنے شوہر کو یہ دوائیاں واپس دے دو۔ اب میرے لیے زہر ہیں یہ۔'' ماہین کو ان کے اس ری ایکشن کی توقع نہیں تھی۔ گھبرا سی گئی۔ جانتی تھی کہ

عمیر، ماں کی دوائیوں کے لیے کتنے حساس ہیں، فوراً ہی آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔

''اماں آپ میری ہر بات کا غلط مطلب کیوں لیتی ہیں، میں تو عمیر کی تعریف کررہی تھی کہ وہ آپ کا کتنا خیال کرتے ہیں۔'' لیکن اماں غصے میں آکر اس کی طرف سے پیٹھ کر کے لیٹ گئیں...... ماہین روتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ آنسو تو اماں کی آنکھوں سے بھی بہہ رہے تھے، انہیں بہت پہلے اپنی پڑوسن خالہ کی کہی ہوئی باتیں بے اختیار یاد آرہی تھیں۔ پتا نہیں تھا کہ ان کی باتیں آج اماں کو اپنے دل کی آواز بھی محسوس ہونے لگیں گی، وہ کہا کرتی تھیں۔

''ماں اپنے بچے کو نو ماہ پیٹ میں رکھتی ہے، اس کے پیدا ہونے کے تکلیف دہ عمل کو سہتی ہے اسے پال پوس کر کسی قابل بناتی ہے لیکن یہ کیسا قانون قدرت ہے کہ بیوی آکر چند ہی دنوں میں ماں سے بھی اونچا مقام حاصل کرلیتی ہے۔ بیٹے کی زندگی محبت، گھر، پیسوں ہر چیز پر اس کا تسلط ہوجاتا ہے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے، جس سے کوئی ماں یا بیٹا نظر ہی نہیں چرا سکتے۔'' خالہ کا کہا ہوا وہ کڑوا سچ آج انہیں شدت سے یاد آرہا تھا۔

اماں نے اس بار ماہین کی باتوں کا کچھ زیادہ ہی اثر لے لیا تھا۔ عمیر کے لاکھ کہنے پر بھی وہ دوا کھانے پر راضی نہیں ہورہی تھی۔ ادھر ماہین کو الگ شکوہ تھا کہ اماں اس کو ہمیشہ غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ بیوی کے آنسو اور ماں کی خفگی نے مل کر جیسے عمیر کو ذہنی طور پر بالکل تھکا دیا تھا۔

''اماں پلیز دوا کھالیجیے، ورنہ مجھے نروس بریک ڈاؤن ہوجائے گا۔'' اس نے ہتھیلی پر رکھی دوا اور دودھ کا گلاس ان کی طرف بڑھاتے ہوئے اتنے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا کہ ان کا دل بے اختیار تڑپ گیا۔ کتنی دیر سے وہ انہیں منانے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کے اس جملے نے جیسے انہیں دہلا دیا۔ بہو کے رویے، اس کی باتوں کا بدلہ وہ اپنے بیٹے ہی کو اذیت دے کر بھلا کیوں لے رہی تھیں۔ انہوں نے گھبرا کر اس کے ہاتھ سے گلاس اور دوا لے لی۔ لیکن اس واقعے کے بعد ان کا دل ماہین کی طرف سے کافی برا ہوگیا تھا طبیعت میں بھی بیزاری عود آئی تھی اور ماہین جو پہلے ان سے کھنچی، کھنچی رہتی تھی اب مزید دور ہوگئی تھی۔ بظاہر دونوں ایک اچھی ساس، بہو کے روپ میں دنیا کو نظر آتی تھیں لیکن حقیقت میں ایک سرد مہری سی قائم تھی ان دونوں کے درمیان...... جسے عمیر محسوس کرنے کے باوجود بے خبر نظر آنے کی کوشش کرتا کیونکہ جانتا تھا کہ محض اس کے خیال سے وہ دونوں زبانی کھٹ پٹ سے دور رہتی ہیں۔ عمیر کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ ان کے دلوں میں چھپی نفرت اور کدورت مٹانے میں کامیاب ہوجائے گا لیکن آج جب وہ اماں سے پاسپورٹ کے بارے میں بات کر کے کمرے میں آیا تو ماہین کو بیڈ پر آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹا دیکھ کر اسے کچھ حیرانی سی ہوئی، وہ تو اس کی شوخ و چنچل اداؤں اس کی کھنکتی ہوئی ہنسی کا دیوانہ تھا۔ اسے اپنا یہ کمرا اب جنت کے مانند محسوس ہونے لگا تھا جس میں اس کی دلہن جیسے ایک حور کے روپ میں اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ اس کی منتظر ہوتی...... اگر کبھی اماں کی کسی بات کی وجہ سے اس کا موڈ کچھ آف بھی ہوتا پھر بھی اس کی مخمور آنکھوں میں اپنے لیے چھپے حسین جذبے عمیر کو صاف نظر آجاتے لیکن آج تو وہ اس سے بات کرنے کی بھی روادار نہیں لگ رہی تھی۔

''کیا ہوا ماہین پلیز مجھے بتاؤ، جانتی ہو ناں تمہاری خاموشی، تمہاری خفگی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔'' عمیر نے اس کا نرم و نازک ہاتھ تھام کر بہت محبت سے پوچھا۔

''عمیر کل پہلی تاریخ ہے، میں نے پورے ماہ اس کا کتنی شدت سے انتظار کیا ہے آپ نہیں جانتے۔'' وہ بے اختیار رو دی تب جیسے ایک ہی لمحے میں عمیر کو اس کی اداسی اس کی خفگی کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ پچھلے ماہ ہی کی تو بات تھی جب طارق روڈ پر ایک شاپ کے بڑے سے شوکیس میں سجی سنہرے بالوں والی ڈمی کے جسم پر

نیوی بلیو بے حد نفیس کام کے لشکارے مارتے سوٹ کو دیکھ کر بے اختیار ہی ماہین کے قدم تھم گئے...... کتنی حسرت سے اس نے اس خوب صورت ڈریس کو دیکھا تھا۔ عمیر کا تو دل ہی کٹ کر رہ گیا تھا لیکن فی الحال ابھی اس کی جیب اجازت نہیں دے رہی تھی کہ وہ اپنی جانِ جاں کے لیے یہ ڈریس خرید سکتا لیکن اس نے اتنا ضرور کیا کہ اس لمحے فوراً ہی ماہین سے یہ وعدہ کرلیا کہ اگلے ماہ وہ اسے ہر حال میں ایسا ہی ڈریس ضرور دلوائے گا۔ ماہین کے چہرے پر اس کے وعدے نے جو خوشی بکھیری تھی اس کے لیے تو وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔

لیکن آج جیسے اسی سوٹ کی جھنجھلاہٹ آنسو بن کر ماہین کی آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ وہ ایک لمحے کو کچھ بول ہی نہیں سکا۔ سمجھ گیا کہ ماہین نے اس کی اور اماں کی باتیں سن لی ہیں، وہ بھی تو جذبات میں اماں سے پرسوں پاسپورٹ کے لیے انہیں لے جانے کا وعدہ کر آیا تھا اور جانتا تھا کہ اماں نے اس وعدے کو دل پر لکھ لیا ہوگا۔ محدود تنخواہ میں دونوں کی خواہشات کو ایک ہی ماہ میں پورا کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ اُف اپنی جلد بازی میں وہ خود اپنے آپ کو کس دوراہے پر لے آیا تھا۔

''دیکھو ماہین پلیز! تم ہی میری مجبوری سمجھ سکتی ہو، اماں تو اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیں گی۔ خدا کی قسم اگلے ماہ میں اپنی جان کو ہر حال میں وہ ڈریس خرید کر دوں گا۔'' اس نے بڑی لجاجت سے کہتے ہوئے ماہین کا ہاتھ تھامنا چاہا جسے اس نے بڑی بے دردی سے جھٹک دیا۔

''مجھے اب آپ کے کسی بھی وعدے سے کوئی دلچسپی نہیں رہی، سب جھوٹ اور بکواس ہے۔ جو حقیقت ہے وہ صرف آپ کی اپنی ماں سے محبت ہے اور بس......'' وہ شدتِ جذبات سے رودی۔

''ایسی بات نہیں ہے۔ ماہی میری زندگی، جانتی ہو ناں اماں آج کل کتنی حساس ہورہی ہیں۔ بس اسی وجہ سے مجبور آ مجھے......''

''ہاں، ہاں آپ بس ان کی خوشی دیکھیے اور مجھے

## انمول موتی

☆ زندگی کی ٹھوکریں بہترین ذریعہ تعلیم ہیں۔

☆ سورج کو نمایاں ہونے کے لیے تاریکی درکار ہے۔

☆ اس دوست کا گلہ کر رہے ہو جو دھوکا دے گیا گلہ اپنی عقل سے کرو جو دھوکا دینے والے کو اپنا دوست سمجھتی ہے۔

☆ جھوٹ بول کر جیت جانے سے بہتر ہے سچ بول کر ہار جاؤ۔

☆ دل اور اعتماد کانچ کے مانند ہوتے ہیں جو ٹوٹنے کے بعد جڑتے نہیں۔

☆ کسی کو پالینا محبت نہیں بلکہ کسی کے دل میں جگہ بنالینا ہے محبت ہے۔

☆ دنیا میں سب سے اچھا انسان وہ ہے جو اپنی غلطی تسلیم کرلے۔

☆ مخلص دوست یقیناً آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتے ہیں۔

☆ پر کمزور ہوں تو اونچی اڑان سے نقصان بھی ہوسکتا ہے۔

☆ یہ نہ دیکھو کہ بات کون کر رہا ہے بلکہ یہ دیکھو کہ بات کیا کہہ رہا ہے۔

پسند: بیگم عبدالجبار، رومی انصاری، چوہنگ

جہنم میں ڈالیے۔ ارے میں اپنے چند ہزار کے سوٹ کا بھی سوچ کر پریشان تھی کہ مہینہ کیسے گزرے گا لیکن آپ اماں سے فرما رہے تھے کہ ان کا پانچ سال کے بجائے دس سال کا پاسپورٹ بنوائیں گے' چند ہزار سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مجھ سے عشق کے تو اتنے دعوے ہیں لیکن اس وقت میرا ذرا بھی خیال نہیں آیا تھا آپ کو۔'' وہ عمیر کی بات کاٹ کر زور سے چلائی تھی۔

عمیر نے گھبرا کر دروازے کی جانب دیکھا۔ شکر ہے اماں اپنے پاسپورٹ کی خوش خبری سنانے پڑوس میں چلی گئی تھیں۔

''دیکھو ماہین، صرف ایک ماہ کی ہی تو بات ہے تم خواہ مخواہ کا ایشو بنارہی ہو۔'' عمیر نے زچ ہوکر کہا۔

''نہیں، یہ ایک ماہ کی بات نہیں، پاسپورٹ بننے

کے بعد اب ان کا اپنے میکے جانے کا دل چاہے گا اور آپ ان کی اس فرمائش کو بھی نہیں ٹال سکیں گے۔ ارے آپ کی اماں جیسی ماؤں کو تو اپنے بیٹوں کی شادیاں ہی نہیں کرنا چاہیے۔'' کچھ زیادہ ہی تلخ ہو رہی تھی وہ۔ عمیر کو بھی غصہ آ گیا۔

''تم حد سے بڑھ رہی ہو ماہین۔ اماں کے بارے میں ایسی بات کہتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔'' عمیر کے ترش لہجے پر وہ روتی ہوئی باتھ روم میں گھس گئی۔

پہلی بار عمیر نے اسے منانے کی بالکل بھی کوشش نہیں کی۔ کتنا ہرٹ ہوا تھا وہ ماہین کے اس رویے سے۔ اگر وہ اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکا تھا تو اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ اس کی محبت اس کی چاہت جھوٹی تھی... اور اماں کے لیے اس نے کتنے غلط اور خراب جملے بولے تھے۔ وہ جتنی چاہ سے اپنی بہو بیاہ کر لائی تھیں یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ اور پھر کتنی ہی بار اس نے ماہین کے فیور میں بول کر اماں کی خفگی مول لی تھی کیا اسے یہ یاد نہیں تھا۔ عمیر جتنا سوچتا اتنا ہی اس کا غصہ بڑھ رہا تھا۔ کافی دیر بعد سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ماہین باتھ روم سے باہر آئی تو عمیر کمرے میں موجود نہیں تھا۔ اماں پڑوس سے واپس آ چکی تھیں اور عمیر شاید اسے سنانے کو اونچی آواز میں اماں سے پرسوں کا پروگرام فائنل کر رہا تھا۔ ماہین کا دل ایک بار پھر بھر آیا تھا۔ تبھی عمیر کمرے میں داخل ہوا اور اسے دوبارہ روتا ہوا دیکھ کر جیسے اس کی برداشت کی حد ختم ہو گئی، وہ بے اختیار اس کے نزدیک آیا۔ ضبط کرنے کی کوشش میں اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''ماہین میں نہیں جانتا تھا کہ تم اتنے چھوٹے دل کی عورت ہو کہ محض ایک سوٹ کی خاطر میری محبت، میری وفا میرے جنون کو دو کوڑی کا کر کے رکھ دو گی۔ ماہین پتا نہیں کیوں تم اچانک میرے دل میں مر گئی ہو اور تمہاری اس موت نے مجھے بھی جیتے جی مار دیا ہے۔'' عمیر کے لہجے میں دہکتے انگاروں کی سی حدت تھی

اور شاید اس کے خاموش آنسوؤں کی آمیزش بھی تھی۔ ماہین ساکت سی اسے دیکھتی رہ گئی۔ کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ ہونٹوں پر ٹوٹ کر رہ گئے حالانکہ دل چیخ، چیخ کر کہہ رہا تھا کہ عمیر بات صرف سوٹ کی نہیں تھی میری اس خوشی کی تھی جس کے انتظار میں پورا مہینہ میں نے دن گن، گن کر گزارے تھے لیکن پہلی تاریخ آنے سے صرف ایک دن قبل آپ نے کتنی بے دردی سے میری وہ خوشی چھین کر اماں کی گود میں ڈال دی۔ میرے متعلق ایک لمحے کو بھی نہیں سوچا۔ وہ یہ سب عمیر سے کہنا چاہتی تھی لیکن وہ تو اس کی طرف دیکھنے کا بھی روادار نہیں تھا۔ دوسرے دن بھی وہ ماہین سے بات کیے بغیر بنا ناشتا کیے آفس چلا گیا اور وہ بھی منہ لپیٹے اپنے کمرے میں پڑی رہی۔ اماں نے واضح طور پر بیٹے اور بہو کے درمیان ٹینشن محسوس کیا۔

''اونہہ، ماہین نے یقیناً میرے پاسپورٹ بنوانے پر عمیر سے جھگڑا کیا ہو گا۔'' ان کی سوچ بس اسی جگہ آ کر ختم ہو گئی۔ مزید انہوں نے نہ بیٹے کی الجھن کو جاننا چاہا اور نہ ہی بہو کے اترے ہوئے چہرے کو اہمیت دی۔ انہیں تو اس بات کی خوشی تھی کہ ان کا بیٹا بیوی کی مخالفت کی پروا کیے بغیر ان کا دس سال کے لیے پاسپورٹ بنا رہا ہے۔ پھر وہ عمیر کے ساتھ جا کر پاسپورٹ کا فارم داخل کروا آئیں۔ اس دن ان کی خوشی دیدنی تھی واپس آ کر ماہین کے سامنے عمیر کو دعائیں دیتے ہوئے وہ تھک نہیں رہی تھیں اور ماہین کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اسے ٹارچر کرنے کے لیے ایسا کر رہی ہیں۔ وہ گھر جو خوشیوں اور مسکراہٹوں سے معمور تھا۔ وہاں پر صرف ٹینشن، آنسو، نفرت، بغض اور رنجشوں کا بسیرا تھا۔ عمیر کو آفس سے گھر واپس آنے کے تصور سے ہی گھبراہٹ محسوس ہونے لگی تھی۔ ماں کو خوشی دینے کی کوشش میں وہ اپنا سکون لٹا بیٹھا تھا۔ زندگی کتنی بے کیف سی ہو گئی تھی۔ ایک بیڈ روم میں ہوتے ہوئے بھی دونوں ایک دوسرے سے کتنا دور، دور تھے۔ اب تو اماں کو بھی گھر میں بکھرے عجیب سے سناٹے سے

وحشت ہونے لگی تھی۔ دن میں نہ سہی شام کو عمیر کے آفس سے آنے کے بعد گھر میں کتنی خوب صورت سی رونق اتر آتی تھی۔ ماہین کا سجا بنا روپ، اس کی کھلکھلاتی ہنسی، عمیر کی فرمائشیں اس کی دلچسپ باتوں کا سلسلہ سب کچھ جیسے سناٹوں میں ڈھل گیا تھا۔ اب تو وہ بہت دیر، دیر سے گھر آنے لگا تھا اماں کے ہاتھ کے پکائے کھانوں کو بنا تعریف کیے بہت خاموشی سے کھا کر اِدھر اُدھر کی رسمی باتیں کر کے جلدی ہی سو جاتا۔ ماہین زیادہ تر اس کے آنے سے قبل ہی سو جاتی تھی۔ دونوں میں برائے نام بات چیت رہ گئی تھی۔ اماں دل ہی دل میں کڑھنے لگیں۔

''مجھے پتا ہوتا کہ میرا پاسپورٹ میرے بچے کے لیے باعث آزار بن جائے گا تو میں کبھی اس سے پاسپورٹ بنوانے کی بات نہ کرتی۔'' انہوں نے بڑی آزردگی سے سوچا۔ اب آہستہ آہستہ پاسپورٹ بننے کی خوشی ایک ملال میں ڈھلتی جا رہی تھی۔ ماں تھیں ناں بیٹے کی پریشانی اس کے دکھ کو محسوس کر کے اب انہیں بہو کے سامنے اپنی سرخروئی پر فخر کا احساس بھی نہیں ہو رہا تھا۔

اس دن ماہین کے پاپا اقبال صاحب اپنی بیٹی کی خیر خیریت لینے ان کے گھر چلے آئے کہ کافی دنوں سے ماہین نے میکے کا چکر نہیں لگایا تھا ورنہ ہفتے میں ایک بار دونوں میاں، بیوی ہنستے مسکراتے ہوئے ان لوگوں سے ملنے ضرور آتے تھے۔ یہاں آ کر بیٹی کے ستے ہوئے چہرے نے بنا کہے ہی انہیں بتا دیا کہ کچھ گڑ بڑ ضرور ہے۔ صالحہ ان کی بیوی نے پہلے ہی انہیں آگاہ کر دیا تھا کہ ماہین آج کل فون پر کافی الجھی، الجھی سی لگ رہی ہے۔ اماں کہیں میلاد میں گئی ہوئی تھیں سو باپ، بیٹی کو آرام سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔

اقبال صاحب کے استفسار پر ماہین کی آنکھیں بے اختیار جھک گئیں۔ بہتے آنسوؤں کے ساتھ وہ اتنے دنوں سے دل میں چھپی بھڑاس نکالتی چلی گئی۔ اقبال صاحب خاموشی سے اسے سنتے رہے۔

''پاپا انہیں میری فیلنگز کا ذرا بھی احساس نہیں، بس اپنی اماں کی خوشی نا خوشی کی فکر رہتی ہے انہیں۔'' اس نے روتے ہوئے شکایتی نظروں سے باپ کی جانب دیکھا۔

''بیٹا، بات اتنی بڑی نہیں ہے جتنی تم محسوس کر رہی ہو، اگر عمیر نے تم سے کیا ہوا وعدہ نبھانے کے بجائے ماں کی خواہش کو زیادہ ترجیح دی ہے تو پتا نہیں کتنی بار اس نے اپنی ماں کے موڈ کو نظر انداز کر کے تمہاری خوشی کو بھی پورا کیا ہوگا۔ ماہین اس وقت تم کو اپنی ساس کے دل پر گزرنے والی اذیت کا احساس ہوا؟ بیٹا انسان جو تکلیف خود نہ برداشت کر سکے اسے دوسروں کو بھی نہیں دینا چاہیے۔'' ماہین کو اپنے پاپا کی یہ سچی مگر کڑوی نصیحت اچھی نہیں لگی، اقبال صاحب نے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو محسوس کرتے ہوئے پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''میری بچی محبت تو کسی کی خوشیوں پر اپنی خوشی قربان کرنے کا نام ہے۔ آج اگر تم عمیر کے ساتھ مل کر اس کی ماں کی خوشی میں شریک ہو جاؤ گی تو عمیر کے ساتھ، ساتھ تمہاری ساس کے دل میں بھی تمہاری عزت اور محبت مزید بڑھ جائے گی۔ زندگی بہت مختصر ہے بیٹا، اسے نفرتوں اور رنجشوں کی نذر کر دو گی تو بعد میں سوائے پچھتاوے کے کچھ باقی نہیں بچے گا۔'' وہ بڑے رسان سے اسے سمجھا رہے تھے لیکن ماہین کے ذہن میں بھڑکتے غصے اور نفرت کے شعلوں میں ان کی تمام نصیحتیں جل کر بھسم ہوتی رہیں۔

☆☆☆

اماں تخت پر خاموش بیٹھی کسی گہری سوچ میں غلطاں تھیں...... آج ان کے پاسپورٹ ملنے کی تاریخ تھی...... عمیر صبح انہیں بتا کر گیا تھا کہ وہ آفس سے جلدی چھٹی کر کے ان کا پاسپورٹ لیتا ہوا گھر آئے گا لیکن نہ جانے کیوں وہ خوشی جو پاسپورٹ جمع کرواتے ہوئے ان کے دل میں کھلکھلا رہی تھی آج ان کے دل کے کسی کونے میں ہنہواڑتے اداسی کے آنچل میں منہ چھپائے بیٹھی تھی۔ ان کی نظروں میں بار،

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



بار اپنے بیٹے کا کملایا ہوا سا چہرہ گھوم رہا تھا۔ کتنا ٹوٹا ہوا سا لگ رہا تھا وہ گھر سے نکلتے وقت...... کتنے دنوں سے ایک سرد جنگ چل رہی تھی۔ ماہین اور عمیر کے درمیان آج بھی وہ اسے خدا حافظ کہنے دروازے تک نہیں آئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اماں نے فون پر اسے اپنی کسی سہیلی سے بات کرتے ہوئے سنا تھا اور تب ہی انہیں اصل معاملے کا علم ہوا تھا۔ کچھ دیر وہ سر پکڑے بیٹھی رہیں اور پھر تھکے، تھکے قدموں سے بہو کے کمرے میں چلی آئیں۔

''ماہین دیکھو بیٹا مجھے ذرا بھی معلوم ہوتا کہ عمیر نے تمہیں سوٹ دلوانے کا وعدہ کیا ہے تو میں اپنا پاسپورٹ بعد میں بنوالیتی لیکن یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے جسے تم اپنی انا کا مسئلہ بنالو۔ میری بچی یاد رکھو بلاوجہ کی انا اور حسد کی آگ میں جلنے والے ہمیشہ جہنم کے دروازے پر رہتے ہیں۔ سکون اور خوشی جیسے لفظ ان سے کہیں کھو جاتے ہیں' وہ اسے سمجھائے جا رہی تھیں اور اماں کے سمجھانے پر وہ بھڑک ہی تو اٹھی۔

''اماں یہ ہی نصیحت آپ کو خود اپنے آپ کو دینی چاہیے۔ میں نے وہ ظالم خوشی آپ کے چہرے پر دیکھی تھی جب آپ نے مجھے اداس اور روتا ہوا دیکھا تھا۔'' اماں نے بڑے تحمل سے اس کی بات سنی۔ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلتے ہوئے رنجیدگی سے اسے دیکھا۔

''تمہارے کہنے سے پہلے ہی میں اپنے آپ کو بہت سرزنش کر چکی ہوں، بیٹی یہ سچ ہے کہ یہ احساس مجھے بہت خوش گن لگ رہا تھا کہ میرا بیٹا تمہاری مخالفت کے باوجود میرا پاسپورٹ بنوا رہا ہے لیکن اب مجھے اپنی خود غرض خوشی پر شرمندگی محسوس ہو رہی ہے جس نے میرے بیٹے اور بہو کی زندگی میں زہر گھول دیا ہے۔ کاش عمیر نے جلد بازی میں آکر پاسپورٹ نہ بنوایا ہوتا تو......'' اماں کی بات کو کاٹتے ہوئے ماہین نے بھڑک کر انہیں دیکھا۔

''رہنے دیں اماں، یہ بناوٹی باتیں...... ارے اگر آپ کے پاسپورٹ کے بجائے میرا سوٹ آجاتا ناں تو آپ نے جو ہنگامہ کھڑا کرنا تھا اس کا سوچ کر ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔'' اس کی تلخ بات پر اماں کو بھی غصہ آگیا۔

''تو تم نے کیا کم ہنگامہ مچا رکھا ہے...... کب سے گھر میں منحوسیت پھیلائی ہوئی ہے۔ میرا بچہ مرجھا کر رہ گیا ہے۔ اللہ اسے خیریت سے گھر واپس لائے۔ ماہین خدا کے لیے ہم ماں بیٹے کو معاف کر دو۔'' انہوں نے بے اختیار اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر بے حد الجھ کر کہا تو ماہین نے ناگواری سے منہ پھیر لیا۔ اماں کچھ دیر خاموش بیٹھی رہیں پھر ٹھنڈی سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''بیٹا میں چائے بنانے جا رہی ہوں۔ عمیر بھی آتا ہی ہوگا...... آج ہم سب ساتھ مل کر چائے پئیں گے، تم اپنا دل صاف کر کے پہلے کی طرح ہنستے مسکراتے اس کا استقبال کرنا...... زندگی کو خوب صورت اور بدصورت بنانا انسان کے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے۔'' اماں مصالحتی لہجے میں کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

کچن سے کھٹر پٹر کی آوازیں ماہین کو مزید الجھانے لگیں۔

''اونہہ...... آج تو عمیر کے آنے پر کچھ زیادہ ہی اہتمام ہو رہا ہے، بھئی پاسپورٹ جو لے کر آرہے ہیں وہ اپنی چہیتی اماں کا۔'' اس نے کلس کر سوچا تھا تبھی اماں کے مسلسل اسے پکارنے پر بہت بیزاری سے اٹھ کر وہ باہر آئی یہاں چائے کی پیالیاں ٹرے میں سجائے اماں اس کی منتظر تھیں اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی کال بیل کی تیز آواز نے دونوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

''میرا عمیر آگیا۔'' اماں کے منہ سے بے ساختہ نکلا...... وہ بہت تیزی سے دروازے کی جانب بڑھیں۔ دفعتاً جلدی میں ان کا پیر نزدیک رکھی میز سے ٹکرایا اور وہ اپنا توازن سنبھالنے کی کوشش میں سر کے بل زمین پر آگریں گرتے گرتے ان کا سر قریبی رکھی میز کے کونے سے ٹکرایا تھا۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ

پہلے تو ماہین کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا پھر وہ بھاگ کر اماں کے نزدیک آئی۔ کال بیل مسلسل بج رہی تھی۔ ماہین نے جھک کر اماں کو اٹھانا چاہا لیکن ایک لمحے کو وہ پوری جان سے کانپ کر رہ گئی۔ اماں کی کھلی ہوئی.... بے نور آنکھیں بتا رہی تھیں کہ سب کچھ ختم ہو گیا...... ایک لمحے کو تو جیسے ماہین سکتے کے عالم میں بیٹھی رہ گئی۔ اب باہر آنے والا دروازہ زور، زور سے پیٹ رہا تھا۔ پھر اسے عمیر کی آواز آئی جو اسے اور اماں کو آوازیں دے رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھی۔ دروازہ کھولتے ہی عمیر تیزی سے اندر داخل ہوا۔

”کیا ہوا تم لوگ دروازہ کیوں نہیں کھول رہے تھے؟“ یہ کہتے ہوئے اس کی نظر سامنے زمین پر گری ہوئی اماں پر پڑی۔ ”اماں!“ وہ چیختا ہوا ان کے پاس بھاگا۔ اس نے دروازے کے باہر سے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ کوئی گرا ہے کہ آواز کچھ ایسی ہی اسے محسوس ہوئی تھی۔ ماہین بھی سپید چہرے کے ساتھ اس کے پیچھے چلی آئی۔ عمیر دیوانوں کی طرح اماں کو پکار رہا تھا۔ ان کا چہرہ تھپتھپا رہا تھا لیکن اماں کی ساکت آنکھوں میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ عمیر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ان کی آنکھوں کو بند کیا اور انہیں بانہوں میں اٹھا کر سامنے رکھے ہوئے ان ہی کے تخت پر لٹا دیا۔

”عمیر آپ کی بیل کی آواز سن کر اماں تیزی سے اٹھیں تو ان کا پیر......“ وہ روتے ہوئے بتا رہی تھی لیکن عمیر نے چیخ کر اسے آگے بولنے سے روک دیا۔

”خاموش ہو جاؤ...... اس وقت میں تمہاری صورت دیکھنا چاہتا ہوں اور نہ ہی آواز سننا چاہتا ہوں۔“ وہ روتے ہوئے تیز قدموں سے باہر ڈاکٹر کو بلانے کے لیے نکل گیا جس کا کلینک چند قدم کے فاصلے پر تھا حالانکہ وہ جان چکا تھا کہ اب اس کی ماں ہمیشہ کے لیے جا چکی ہے لیکن ایک موہوم سی امید پھر بھی اسے سہارا دے رہی تھی۔ عمیر کے جانے کے بعد ماہین نے سہمی ہوئی نظروں سے سامنے لیٹی ہوئی اماں کی جانب دیکھا جو آنکھیں موندے ہوئے جیسے بہت پرسکون نیند سو رہی تھیں۔ ٹرے میں رکھی چائے کی پیالیاں دیکھ کر اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ کتنی خوشی، خوشی وہ چائے بنا کر لائی تھیں اور کتنے پیار سے اسے آوازیں دے رہی تھیں اور جواباً وہ کتنی بیزاری سے باہر آئی تھی۔ پھر اچانک ہی اس کی نگاہ زمین پر گرے ہوئے اس لفافے پر پڑی جو اندر آتے ہوئے عمیر کے ہاتھ میں تھا۔ لفافے کے اندر سے جھانکتے ہوئے پاسپورٹ کو دیکھ کر وہ ایک دم ہی بے قراری سے رو پڑی۔ جس پاسپورٹ کی وجہ سے اس نے اپنے گھر کو اتنے دنوں سے جہنم بنایا ہوا تھا اس کی اب نہ کوئی اہمیت رہی تھی اور نہ کوئی کام...... اماں کتنی خوش تھیں کہ ان کا دس سال کے لیے پاسپورٹ بن رہا ہے لیکن انہوں نے یہ کبھی سوچا نہیں تھا کہ دس سال کی یہ گارنٹی صرف پاسپورٹ کی حد تک ہے ان کی زندگی کی معیاد تو بس آج ہی تک کی تھی۔ ماہین نے بے بسی سے ہاتھ ملے...... کتنے پیار سے اماں اسے سمجھا رہی تھیں۔ اپنی غلطی کا اعتراف کر رہی تھیں۔ اور پھر وہ اپنی آنکھوں میں اس کے دیے ہوئے آنسو لے کر چلی گئیں۔ ماہین نے روتے ہوئے بے اختیار ان کے پاؤں پر اپنا سر رکھ دیا۔ تبھی عمیر ڈاکٹر کو لیے اندر داخل ہوا۔ ”اتنے دنوں تک مجھے اور میری ماں کو ذہنی اذیت دینے کے بعد اب تمہارا رونے کا کوئی حق نہیں بنتا۔ دور ہٹو......“ اتنا سرد لہجہ تھا اس کا کہ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

ڈاکٹر نے اماں کی موت کی تصدیق کر دی جو سر کے اندرونی حصے میں گہری چوٹ لگنے کے باعث ہوئی تھی۔ عمیر بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ لمحوں میں گھر لوگوں سے بھر گیا۔ ماہین کے گھر والے بھی آ گئے تھے۔ اس کے پاپا نے تاسف بھری نظروں سے کچھ فاصلے پر آنسو بہاتی اپنی بیٹی کو دیکھا جس کے چہرے پر بکھری بے بسی بتا رہی تھی کہ غم کی اس شدید گھڑی میں وہ اپنے شوہر کو اپنی تسلی اور محبت کے حصار میں لینے کا حق کھو چکی ہے اور اب اسے عمیر کے دل میں اترنے کے لیے ایک عمر کی تپسیا چاہیے ہوگی۔

ناولٹ

# من جانبازم

سحر ساجد

چوتھا حصہ





بجلی زور کی چمکتی تھی، کڑکتی تھی۔ بادل گڑگڑا رہے تھے ہوا کے جھکڑ درختوں کو رکوع کی حالت میں جھکنے پر مجبور کرتے تھے۔ گرد کا ایک طوفان تھا جو ہوا نے اٹھا رکھا تھا اور ایسے میں وہ تھی۔ مومنہ مجیب عالم......لان کے وسط میں یوں سکون سے بیٹھی کہ جیسے اردگرد کچھ وقوع پزیر نہ ہو رہا ہو۔ ہوا کے تھپیڑے اس کے جسم سے ٹکراتے مگر اس پر اثر انداز ہوتے دکھائی نہ دیتے تھے۔ عجب بے بس سا انداز تھا اس کا......ایسے میں گل نے اسے دیکھا

وہ حیران ہوئیں اسے اٹھانے کے واسطے اس کے پاس آئی تھیں، وہ کیوں اتنے طوفان میں اس طرح سے بیٹھی تھی ان کے کانوں نے کیا سنا تھا، کیا سن لیا تھا......؟ وہ چند لمحے تکلیف سے اسے دیکھتی رہیں اور پھر اس کا بازو پکڑ کر زبردستی اسے اندر لے گئی تھیں۔ اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے وقتی دکھ یا غصہ سمجھتے ہوئے"۔ اسے پائلٹ ہی بننا تھا "۔وہ بھول کیسے سکتی تھی۔ گل نے اس کی کسی بات پہ بالکل بھی دھیان نہیں دیا تھا اور کتنا غلط کیا



تھا۔ یہ انہیں وقت بتانے والا تھا۔

☆☆☆

if I die in a war zone
box me up & send me home
put my medals on my chest
tell my mom I did my best
tell my dad not to bow
he won't get tension from me now

سعد ایک جانباز کی لکھی نظم پڑھتے ہوئے مسلسل آخری فقرے کو دُہرائے جا رہا تھا۔

"میں وہ سپاہی ہوں جو مرنے کے لیے پیدا ہوا۔"

وہ لان میں گول، گول چکر کاٹتے ہوئے سائیکل چلا رہا تھا جبکہ مومی پاس ہی لان چیئر پہ سستی سے بیٹھی تھی۔ وہ لاشعوری طور پر سعد کو دیکھ رہی تھی۔ وہ نظم نہیں سن رہی تھی مگر سعد کو دیکھتے ہوئے کانوں میں پڑنے والے الفاظ یک دم واضح ہونے لگے۔ الفاظ کان میں اتر کر اس کے ذہن میں گونجنے لگے۔

tell my brother to study perfectly,
keys of my bike will be his, permanently
tell my sis not to be upset
her bro will not rise after this sunset
tell my love , not to cry.....
because! I am a soldier
born to die....

اب وہ چیل کی طرح سعد پر جھپٹی تھی۔ اس نے دھکا مار کر اس کو گرایا تھا اور پھر کالر سے پکڑ کر اس کو اٹھایا تھا۔

"you are not born to die... سمجھ آئی تمہیں؟ تم مرنے کے لیے پیدا نہیں ہوئے سمجھے!" وہ چیخی تھی۔

"تم سولجر نہیں ہو... سمجھ آئی تمہیں..." وہ غرائی تھی۔

"تم کچھ بھی نہیں ہو، تم صرف مومی کے بھائی ہو اور بس!"

وہ ہر دفعہ "سمجھ آئی تمہیں" کہہ کر اسے کالر سے پکڑ کے ایک جھٹکا دیتی تھی۔ سائیکل کی رفتار اتنی تیز نہ تھی..... سعد یک دم گرا تھا۔ سو ڈر زیادہ گیا تھا اور اوپر سے مومی کا عجیب انداز...... وہ اونچا، اونچا رونا شروع ہو گیا۔

"خبردار جو آئندہ تم نے یہ نظم پڑھی...... سمجھے تم!"

اس نے سعد کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا تھا وہ اور سہا، زور، زور سے رونے لگا تھا۔ اور وہ روتا ہوا اندر بھاگ گیا تھا۔ مومی اب خود ہانپ رہی تھی۔

"I am a soldier born to die"

الفاظ تھے کہ اس کے کانوں میں گھسے جا رہے تھے۔ اسی ردھم کے ساتھ کہ جس ردھم سے سعد پڑھتا رہا تھا اس نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے......

"I am a soldier born to die"

مگر یہ منحوس الفاظ......

"اسٹاپ...... اسٹاپ اِٹ......" وہ دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے تکلیف سے دُہری ہو کر چیخ اٹھی تھی۔

☆☆☆

سب اپنی، اپنی زندگیوں کے کاموں میں الجھ چکے تھے، ایک زبردست سے جھٹکے کے بعد سنبھل کر سب ہی اپنی روٹین لائف گزار رہے تھے کہ یہ گزارنا ہی پڑتی ہے۔

جیسے پانی کسی ندی میں...... ایک ہموار رفتار کے ساتھ بہتا ہے اور بہتا ہی چلا جاتا ہے...... لگا تار شروع...... شروع کرتا وہ بہتا رہتا ہے۔ جو بھی اس میں ایک بڑا سا پتھر آن گرے تو کیا وہ پانی کے بہاؤ کو روک دے گا نہیں بالکل نہیں لیکن یہ کہ وہ روانی باقی نہیں رہتی۔ پھر پانی بہاؤ کے رستے ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔ اِدھر اُدھر سے دائیں بائیں سے اس کا کام بس بہنا ہے...... اور وہ بہتا ہی رہے گا تو زندگی بھی اپنی بقا کے رستے ڈھونڈ ہی لیتی ہے۔ اسے بھی چلنا ہوتا ہے، چلنا پڑتا ہے، رکاوٹیں، سختیاں، جھٹکے یہ تو آتے ہی رہتے ہیں تو ان سب نے بھی وہ رستہ ڈھونڈ ہی لیا تھا کہ جس کے ذریعے زندگی بہتی ہے...... چلتی ہے۔ مگر وہ ویسی نہیں تھی جیسے پہلے تھی، رواں دواں، خوش باش...... سعد اسکول جاتا تھا، عائلہ اور گل گھر کے بکھیڑوں میں...... حسیب عالم وہ بھی چند روز کے تعطل کے بعد پھر سے آن ڈیوٹی تھے۔

تو مومی...... وہ کیا کرتی تھی...... اس کے تو ایگزامز تھے ناں...... تو کیا وہ پڑھتی رہتی تھی؟

''مومنہ......؟'' ماں نے پکارا تھا۔

اور اس نے نظریں اٹھا کر ماں کو دیکھا۔

''تم ایگزامز کی تیاری کیوں نہیں کر رہیں؟ فیل ہونے کا ارادہ ہے کیا؟''

وہ چند لمحے ماں کا چہرہ دیکھتی رہی۔

''مجھے نہیں پڑھنا......'' اس نے اس طوفانی رات کو بھی انکار کیا تھا مگر گل اسے وقتی بات سمجھی تھیں اور اب بھی بے خوف ہو کر سیدھا ماں کی آنکھوں میں دیکھ کر اس نے جواب دیا۔

اس جواب نے گل کے لبوں کو حرکت کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ وہ حق دق رہ گئی تھیں۔

''کیا کہا تم نے؟'' انہوں نے چاہا کہ وہ ٹھیک ٹھیک جان لیں کہ مومی کیا کہہ رہی ہے۔

''مجھے نہیں پڑھنا۔'' رک، رک کر بے حد واضح اور صاف لہجے میں جواب دیا۔ پہلے سے بھی زیادہ بے خوف انداز میں......

''تمہارا باپ تمہیں پائلٹ بنانا چاہتا تھا مومی......'' انہوں نے شاکڈ ہو کر کہا۔ یوں جیسے اسے یاد دہانی کروانا چاہتی ہوں۔ مومی کی آنکھوں اور لبوں پر یک دم ایک طنزیہ تاثر ابھرا۔

''تو......؟''

''تو......!'' مومی کے ''تو'' میں سوال تھا...... گل کے ''تو'' میں حیرانی تھی۔

''کس کے لیے پڑھوں......؟ کس کے لیے ممی؟'' دو قدم آگے آ کر ماں کی حیران آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اور گل کی تو جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔

''تو کیا وہ اپنی زندگی برباد کر دینے کا ارادہ باندھ چکی تھی؟ تو کیا اسے بقا کا کوئی رستہ نہیں ملا تھا؟ تو کیا اب وہ ایسے جیے گی......؟ ایسے......؟'' ایسے کئی سوالات ان کے دماغ میں گردش کر رہے تھے۔

''مومی......'' گل نے بے حد پیار سے اس کا ہاتھ پکڑا۔ مگر لہجے میں پیار سے زیادہ خوف جھلکتا تھا۔

''ایسے نہیں کرتے بیٹا...... یوں زندگی برباد نہیں کرتے۔'' وہ اسے سمجھا رہی تھیں۔

''میرے لیے پڑھو...... مجھے بن کر دکھاؤ پائلٹ...... میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ جب میری بیٹی جہاز اڑائے گی...... جب اس کے سینے پر یہ اعزاز سجے گا کہ پاکستان کی پہلی خاتون پائلٹ میری بیٹی ہوگی ہاں میری مومنہ......'' وہ شاید عجیب جذباتی کیفیت کا شکار ہوئیں شاید وہ اس کا حوصلہ بڑھانے کی ملی جلی کیفیت میں تھیں۔

مومنہ ماں کو دیکھے جا رہی تھی۔

''مجھ سے نہیں پڑھا جاتا ممی...... میرے سر میں درد ہوتا ہے۔'' سپاٹ سا لہجہ...... جیسے کوئی اثر ہی نہیں ہوا ہو۔ گل چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئیں۔

''چلو ابھی تو ٹائم ہے چند دن اور ریسٹ کر لو...... پھر پڑھ لینا۔'' اس نے ماں کو دیکھا...... چند لمحے دیکھتی رہی بالکل ہی بے تاثر... بے رونق آنکھوں کے ساتھ اور پھر وہاں سے ہٹ گئی۔

انہیں لگا کہ وہ مان جائے گی...... وہ چند دن کے بعد سے پھر سے ویسی ہی زندگی شروع کرے گی جیسی کہ اس کمرے میں چکر کاٹتے، کیمسٹری کے نوٹس کا رٹا لگاتے ہوئے...... چلو ویسی نہ سہی مگر وہ آخر کار مان جائے گی۔ وہ سب کچھ حقیقت پسندانہ رویے سے قبول کرلے گی بالکل اسی طرح جس طرح وہ سب نارمل زندگی کی طرف واپس آ رہے تھے۔ وہ سب جیتے ضرور تھے مگر اک مفلوج زندگی...... وہ سانس لیتے تھے...... اور کتنی مشقت سے لے پاتے تھے کاش کہ کوئی دیکھتا...... دیکھ پاتا...... جانتا...... جان پاتا...... تو انہیں لگا کہ مومی بھی ایسا ہی کرے گی۔ باپ کا دیکھا گیا خواب وہ پورا کرے گی...... پڑھے گی پی اے ایف کو جوائن کرے گی اور پائلٹ بنے گی۔

ہاں...... اصولاً تو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا کہ شہید کی بڑی خواہش تھی اور شہید کی بیٹی کو وہ پوری کرنی چاہیے تھی...... ضرور کرنی چاہیے تھی کیونکہ اس کی اپنی بھی تو وہی خواہش تھی، شہید کی بیٹی بھی وہ بیٹی تھی جو کہتی تھی۔ ''بابا آپ مجھے ایسا فون لیں دیں ناں کہ جس میں تصویر بھی آتی ہو...... آپ جہاں، جہاں جائیں گے، میں آپ کو دیکھا کروں گی بابا......''

اور اب...... کیا غضب ہوا تھا کہ اب بابا نظر نہیں آتے تھے وہ کہیں نظر نہیں آتے تھے۔

ایک ہلکی سی گڑگڑاہٹ کی آواز فضا میں ابھری۔
کوئی جہاز تھا جو اسلام آباد ائرپورٹ پر لینڈ کرنے کے لیے زمین کے قریب سے قریب تر ہورہا تھا۔ مومی نے وہ آواز سنی......
اور وہ ٹھہر گئی...... یوں جیسے آواز نہ ہو جادو ہو...... گڑگڑاہٹ کی آواز بلند سے بلند ہورہی تھی...... وہ باہر لان میں آئی اور سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ وہ کسی ائر لائن کا مسافر طیارہ تھا۔ وہ سر اٹھائے...... چند لمحے اس جہاز کو دیکھتی رہی۔
''اللہ کرے کہ یہ ابھی گر جائے...... پھٹ جائے یا تباہ ہو جائے۔''
لاشعوری طور پر بالکل ہی لاشعوری طور پر اس کے ذہن میں یہ سوچ ابھری تھی اور اس نے چاہا کہ یہ ابھی کہ ابھی ہو جائے جب سے باپ شہید ہوا تھا تو اس کا دل چاہتا تھا کہ سارے بچے، دنیا کے سب بچے یتیم ہو جائیں۔ اس سوچ کے پیچھے بھی وہی جذبہ کارفرما تھا۔ وہ گردن اٹھا کر اس طیارے کو دیکھتی رہی اور پھر یک دم تیزی سے چھت پر جانے والی سیڑھیوں کی طرف مڑی تھی...... وہ، دو سیڑھیاں پھلانگ کر چڑھتے ہوئے وہ چھت پر آگئی تھی اور چھت پر چھوٹے بڑے کنکر، پتے کوڑا چننے لگی اس نے اپنی قیمص کا دامن ان چیزوں سے بھر لیا تھا جو کہ ٹھوس تھیں اور بڑی تیزی سے اس نے یہ کام کیا تھا۔ جھولی بھر کر وہ اٹھی اور آسمان کی طرف دیکھا۔
طیارہ اب عین اس کے سر کے اوپر تھا۔ اس نے ویسے ہی گردن اٹھا کر جہاز کو دیکھتے ہوئے جھولی سے پہلا پتھر اٹھایا...... ذرا پیچھے ہٹ کر پوری قوت سے اپنی بھرپور طاقت لگا کر جہاز کی طرف نشانہ باندھ کر پتھر پھینکا تھا۔ پتھر ایک حد تک بلندی کی طرف گیا اور پھر بالآخر زمین کی طرف واپس گرنے لگا۔
مومی کی نظریں اس پہلے پتھر پر نہیں تھیں...... اس کا ہاتھ تب تک جھولی سے دوسرا پتھر نکال کر اسے بھی جہاز کی طرف اچھال چکا تھا...... نظریں مسلسل جہاز پر ٹکی تھیں اور پھر تو جیسے وہ پاگل ہو گئی تھی۔ کوڑا، پتھر، پتے

کچھ ادھر کچھ ادھر گرنے لگے۔ عائلہ نے لان میں کچھ گرنے کی آواز سنی...... وہ دوڑ کر باہر آئیں اسی اثنا میں ایک اور پتھر لان میں گرا۔
''بھابی۔'' اس نے جیٹھانی (گل) کو آواز دی۔
گل کے آنے تک ایک آدھ پتھر اور لان میں گر چکا تھا۔ وہ چھت سے آرہے تھے...... اتنی دیر میں عائلہ یہ جان چکی تھی کہ یہ کہاں سے آرہے ہیں۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو حیرانی سے دیکھا...... اور پھر تیزی سے چھت کی طرف بڑھیں جیسے ہی سیڑھیوں کا اختتام ہوا اور وہ دونوں منجمد ہو کر وہیں رک گئیں۔
مومی پوری قوت سے ساری طاقت لگا کر آسمان کی طرف پتھر پھینک رہی تھی۔ ان دونوں نے حیرانی سے اس عمل کو دیکھا پھر برق رفتاری سے آسمان کو اور......
''یا خدا...... یا میرے اللہ......''
وہاں ایک جہاز تھا جو آگے بڑھ چکا تھا۔ مومنہ کے ہاتھ کا زاویہ بھی اب ترچھا تھا۔ گل تو منہ پر ہاتھ رکھ کر ڈھے پڑنے والے انداز میں دیوار کے ساتھ جا لگیں جبکہ عائلہ... وہ ایک لمحے کے لیے ساکت ہوئی تھیں پتھر اب سامنے والے گھر کی طرف جارہے تھے۔ اب کہ عائلہ بھی تیزی سے حرکت میں آئی تھیں۔
''مومی......'' انہوں نے ہاتھ مار کر مومی کی جھولی سے پتھر گرائے۔ مومی نے طیش سے چچی کو دیکھا اور پتھر اٹھانے کو جھکی۔
''پاگل ہوگئی ہو مومنہ...... بس کرو اب......''
انہوں نے مومی کو روکنا چاہا مومی نے پھر سے طیش میں آکر...... عائلہ کو جھٹک کر پتھر اٹھانے چاہے تھے۔ یک دم اس کی نظر ماں پر پڑی۔
برف جیسا سفید چہرہ...... اور بے نور سی آنکھیں...... اس کا طیش کچھ اور بڑھا تھا۔
اس نے ہاتھ میں پکڑا پتھر غصے سے سامنے دیوار پر دے مارا اور پھر دھڑ دھڑ کرتی سیڑھیاں اتر گئی تھی۔ پر عائلہ وہیں پر سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھیں اور گل وہ اب تک اسی حالت میں تھیں۔

برف جیسا سفید چہرہ...... اور بے نور سی آنکھیں۔
''یہ کب ٹھیک ہوگی؟'' اور وہ اسی حالت میں سوچ رہی تھیں۔

☆☆☆

وہ بڑی تندہی سے سعد کو کام کروا رہی تھی...... مگن ہوتی اور ارد گرد سے بے نیاز ہو کر...... یہ مجیب عالم کی شہادت کے چھ ماہ بعد کی بات تھی...... مومی کے چچا حسیب عالم، گل اور عائلہ چچی لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ شام کا وقت تھا۔ سردی کا موسم رنگ دکھا رہا تھا۔ ایک صوفے پر گل ذرا فاصلے پر مومی اور مومی کے پیروں کے پاس کارپٹ پر دھرے فلور کشن پر بیٹھا سعد...... ہوم ورک کی کاپی پر جھکا صاف، صاف ہینڈ رائٹنگ میں لکھ رہا تھا۔ مومی عین سر کے اوپر تھی۔ ذرا سی گندی ہینڈ رائٹنگ پر ایک دھپ پڑتی تھی۔ مومی کو بھی کبھار ہی اسے پڑھانے کا شوق چڑھتا تھا......

''مومی چائے۔''

گل نے اسے کپ پکڑایا۔

اس نے دیکھے بغیر کپ پکڑا تھا...... سارا دھیان سعد کی طرف تھا۔

''مومنہ......!'' ایک بے حد پیار بھرا لہجہ ابھرا۔ اس کا دھیان ہٹا...... سعد نے فائدہ اٹھایا اور تیزی سے انک ریمور... اٹھا کر چند لفظ مٹائے اور نہیں دوبارہ لکھا تھا۔ مومی تو انک ریمور بھی استعمال نہیں کرنے دیتی تھی۔

''بیٹا یہ سال تو آپ کا ضائع ہو گیا...... نیکسٹ ائیر کا کیا پلان ہے آپ کا؟'' حسیب چاچو نے گل کے کہنے پر اس سے بات شروع کی تھی۔

مومی نے ہاتھ میں پکڑا کپ...... سامنے ٹیبل پر پٹخنے کے انداز میں رکھا۔ چاچو کو دیکھا اور پھر ماں کو......

''آپ مجھے بس یہ بتا دیں کہ مجھے کتنی دفعہ آپ لوگوں کو بتانا پڑے گا کہ مجھے اب نہیں پڑھنا...... کچھ نہیں کرنا...... مجھے ایسے ہی رہنے دیں...... اللہ کا واسطہ ہے۔'' انتہائی گستاخ لہجہ اور اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگائے۔

گل شرمندہ ہو کر رہ گئیں...... عائلہ نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھپتھپایا...... حسیب عالم پُرسکون تھے انہیں مومنہ سے ایسے ہی رویے کی توقع تھی۔

''مومنہ آپ اپنی زندگی برباد کر رہی ہیں۔'' بارعب لہجہ سنا گیا۔

''ہاں، مجھے کرنے دیں۔'' وہ ہی بدتمیز انداز......

''کیسے کرنے دیں......؟ آپ چاہتی ہیں کہ آپ گلے میں پھندا لگا کر جھول جائیں اور ہم سب دیکھتے رہیں؟''

وہ ہونٹ بھینچ کر چپ ہوئی۔

''ٹھیک ہے...... ابھی آپ پڑھنا نہیں چاہتیں...... تو مت پڑھیں...... اپنی دوستوں سے ملیں...... کسی کو فون کر لیا کریں۔ کسی کے گھر چلی جایا کریں...... سارا دن گھر میں پڑی کیا کرتی رہتی ہیں آپ؟'' بے حد دوستانہ سا انداز تھا چاچو کا...... جیسے اس کی بدتمیزی کا اثر ہی نہیں ہوا تھا۔

''میں ایسے ہی رہنا چاہتی ہوں چاچو...... ایسے ہی...... مجھے کسی سے ملنا ہے نہ اسٹڈی کرنی ہے...... مجھے کچھ نہیں کرنا۔'' ٹھنڈے لہجے میں سخت، سخت بولتے ہوئے وہ یک دم اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اب کہ حسیب عالم نے بے اختیار اپنا ماتھا مسلا......

''فار گاڈ سیک میرا پیچھا چھوڑ دیں۔'' ایک آخری وار کرتے ہوئے وہ غصے سے وہاں سے چلی گئی تھی...... ایک دفعہ پھر وہ سب بے بس نظر آنے لگے۔ ان چھ ماہ میں ہر وہ طریقہ آزما لیا گیا تھا جو کہ سولہ سال کے کسی بھی نوجوان پہ آزمایا جا سکتا تھا۔ غصہ، پیار، ڈانٹ...... سمجھا کر بھی دیکھ لیا...... اور رو کر بھی ماں نے سمجھا لیا تھا۔ امتحانوں کی ڈیٹ آئی اور گزر گئی۔ اور ان کی کوشش یہ تھی کہ کم از کم اسے اگلے سال امتحان میں بیٹھنے پر آمادہ کیا جا سکے۔

وہ سولہ سال کی تھی...... وہ ان سے قابو نہیں ہو پا رہی تھی...... وہ یوں کہ اس کے سارے ڈر، سارے شوق، ساری دلچسپیاں اور ساری توانائیاں جاتی رہی تھیں اسے اب کچھ نہیں کرنا تھا...... کچھ بھی نہیں...... شاید اس نے ہمت ہار دی تھی۔

''غم'' ایسے بھی منایا جاتا ہے بھلا؟'' دکھ'' ایسے بھی گلے سے لگایا جاتا ہے بھلا؟ مگر جو مومی کے ساتھ ہوا...... وہ

دکھ اور غم سے بڑا تھا۔

وہ باپ کا ہاتھ پکڑ کر چلنے والوں میں سے تھی۔ وہ اس بچے کی طرح تھی جو چلتے ہوئے بار، بار مڑ کر اپنے باپ کو دیکھتا ہے اور جب وہ مڑ کر اسے دیکھتا ہے تو باپ کی مسکراہٹ، آنکھوں کی چمک اسے آگے بڑھنے کا کہتی ہے...... اسے اکساتی ہے۔ اسے حوصلہ دیتی ہے کہ ہاں...... میں ہوں، میری دو آنکھیں ہیں، جو تمہیں آگے بڑھتا دیکھنا چاہتی ہیں۔

ہاں...... میرے ہیں وہ دو لب کہ جب تم وننگ لائن کو کراس کرو تو وہ کھل کر مسکرا اٹھیں گے۔ ہاں یہ ہیں میرے وہ دو بازو جن میں تم خوشی سے جوش سے ہنستے ہوئے ''بابا میں نے کرلیا'' کہتے ہوئے آسماؤ گے۔ اور میرے یہ دو بازو تمہیں بھینچ لیں گے۔

اور ان بازوؤں کی گرمی تمہیں چیخ، چیخ کر بتائے گی کہ آج تمہارا باپ کتنا خوش ہے...... کتنا سکھی ہوا ہے تو موی کے ساتھ جو ہوا وہ ''غم'' اور ''دکھ'' سے بڑھ کر تھا۔

اس کے ہاتھ کو تھامنے والا ہاتھ کھو گیا۔ اسے اپنی پشت پر دو آنکھوں کی تپش نہیں ملتی تھی کہیں نہیں تھے وہ لب جو اس کی کامیابی پر کھل کر مسکرا اٹھتے۔

گم ہو چکے تھے وہ بازو...... کہ جن کی حرکت سے وہ اپنے لیے توانائی کشید کرتی تھی۔

اس دن مجیب عالم کا جہاز اِک دھماکے کے ساتھ پرزہ، پرزہ ہو کر نہیں پھٹا تھا...... اس دن موی کا حوصلہ اس کی توانائی کچھ کر دکھانے کا جذبہ یہ سب پھٹا تھا اور پرزے پرزے ہو کر ختم ہو گیا تھا کچھ نہیں بچا تھا اس کے پاس۔

''یہ کب ٹھیک ہوگی؟'' گل کا سوال خود اپنے آپ سے ہی تھا۔ اور ''کب'' کا جو سوال تھا اس کے جواب کا وقت کسی نے نہ دیا۔

مومنہ روز بروز عجیب ضدی، غصیلی اور پتا نہیں کیا سے کیا ہوتی گئی۔ کم از کم وہ...... وہ نہیں تھی جو مجیب عالم کی موی تھی اور جیسا مجیب عالم اسے دیکھنا چاہتے تھے۔ گل ایک بار پھر اسی تکلیف سے گزر رہی تھیں اور اِک اور ہی موی کا جنم ہو رہا تھا۔ اس کے بے حد خوب صورت لمبے کمر تک آتے کالے بال تھے جسے اس نے خود ہی کاٹ ڈالا تھا... آڑے ترچھے جیسے بھی خود ہی...... وہ بے حد عجیب ہو گئی تھی۔ کام کرنے پر آتی تو سارا گھر اپنے ذمے لے لیتی اور چارپائی توڑنے پر آتی تو ہل کر ایک گلاس پانی بھی نہ پیتی۔ غرضیکہ وہ برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ کھانے پر آتی تو بنا کسی کا لحاظ کیے کھائے چلی جاتی اور نہ کھانے پر آتی تو سارا، سارا دن چائے کے ایک کپ پر گزار دیتی۔

مومنہ مجیب عالم بہت مشکل ہو گئی تھی۔ تو کیا اسے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا؟ بٹھا کر سمجھانے والا کوئی نہیں تھا؟ ڈانٹ کر، ڈرا کر حتیٰ کہ پیار سے سمجھانے والا کوئی نہیں تھا؟ یقیناً تھے...... مگر وہ سب اسی وجہ کے ہاتھوں مجبور تھے جو ان حرکتوں کے پیچھے کارفرما تھی۔ اس کا غصہ، دکھ کسی طرح، کسی طریقے سے باہر نکلتا...... یہ ہی کافی تھا مگر اس کا تو اظہار بھی عجب تھا۔ وہ نارمل بھی نہیں رہی تھی۔

گل نے اگلے سال اسے پھر سے مجبور کیا کہ وہ امتحان دے۔ چلو پائلٹ نہ ہی سہی مگر اپنی تعلیم تو مکمل کرے مگر......

''آپ کو سمجھ کیوں نہیں آتا کہ مجھے نہیں پڑھنا...... جان کیوں نہیں چھوڑ دیتے آپ لوگ میری۔'' وہ حلق کے بل چلّائی تھی۔ اور گل نے طیش میں آکر اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ اس کا چہرہ گھوما...... وہ ایک لمحے کے لیے ٹھہری اور پھر چہرہ سیدھا کر کے ماں کو دیکھا۔

''لیں اِدھر بھی ماریں۔'' اس نے دوسرا گال آگے کیا۔ ''اس پر بھی ماریں اور اس سے ماریں۔'' اس نے پاؤں کا جوتا اتار کر پیر کی ٹھوکر سے آگے کیا۔ ''جو چیز ہاتھ میں ملتی ہے اس سے ماریں می...... مگر میں نہیں پڑھوں گی...... کبھی نہیں......'' ہٹ دھرم انداز، بے خوف لہجہ...... گل نے اِک عالم بیچارگی میں اسے کھینچ کر سینے سے لگایا۔ اس کا گال جو ماجہاں پر ہاتھوں کی انگلیاں ثبت تھیں۔

''موی یوں مت کرو...... می کو تکلیف ہوتی ہے۔'' اسے گلے سے لگائے وہ سرگوشی کی سی آواز میں بولیں۔

''مومی کو تو تکلیف بھی نہیں ہوتی ممی۔'' گل کے سینے میں منہ چھپائے وہ بولی تھی۔ کیسا سپاٹ سا انداز تھا اس کا......

اور بس وہ آخری دن تھا کہ جب کسی نے اس سے کہا کہ اسٹڈی مکمل کرلو...... پڑھ لو... پھر اسے آزاد چھوڑ دیا گیا...... اس کی حرکتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا...... جیسا وہ ہونا چاہتی تھی...... اسے ویسا ہی ہو جانے دیا کہ اس کا علاج جب بھی اترنا تھا آسمانوں سے ہی اترنا تھا۔

دنیا والوں کے بس کی بات کہاں تھی اب سولہ سال تک اس نے ایک منظم زندگی گزاری تھی سولہ سال کے بعد ایک دھماکا ہوا اور مرکز سے اس کا تعلق ٹوٹ گیا اور وہ یوں ہوگئی کہ جیسے خلا میں ڈولتا کوئی وجود...... بے مقصد...... بے توازن، کبھی دائیں تو کبھی بائیں۔ بے توازن و بے سمت......

☆☆☆

سعد نے اس دن کے بعد سے وہ سولجر والی نظم نہیں دُہرائی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ مومی واقعی ماچس کی تیلی ابھی لا کر اس کے ہونٹوں پر رکھ دے گی۔ اس نے کہا بھی تو یہی تھا کہ ''اب کے پڑھی تو منہ جلا دوں گی۔'' وہ بچہ تھا، ڈرایا جاسکتا تھا ڈر گیا تھا۔ بات بس یہیں پر ختم نہیں ہوئی تھی۔ ایک دن مومی نے اسے اسٹکس کے جہاز بناتے بھی دیکھ لیا۔ اس دن دھکا دیا...... آج تھپڑ دے مارا اور جہاز توڑ ڈالے۔

مومی بہت بری ہوگئی تھی۔

وہ روتا ہوا ماں کے پاس گیا تھا۔

''ممی، مومی بہت بری ہیں۔'' وہ منہ بسور کر بولا۔

''کیوں، کیا ہوا؟'' گل نے اسے یوں روتا دیکھ کر گود میں بٹھا کر آنسو صاف کیے۔

''مجھے مارتی ہیں، کہتی ہیں کہ یہاں ماچس کی اسٹک سے آگ لگا دیں گی۔'' وہ انگلی ہونٹ پر رکھ کر بتانے لگا۔

گل بے اختیار الجھیں۔ انہیں غصہ بھی آیا مگر وہ ٹال گئیں کوئی سوال جواب نہیں کیا۔ سعد کو بہلا پھسلا کر چپ کروا دیا۔ وقت تھوڑا سا اور آگے سرکا۔

سعد اب بڑا ہو رہا تھا۔ اتنا کہ سوال پر سوال کرنے لگا تھا، پوچھنے لگا، چیزوں پر غور کرنے لگا، وجہ تلاش کرنے لگا۔

''مومی آپ پڑھتی کیوں نہیں؟ آپ رسالپور نہیں جائیں گی؟''

''کیا آپ کو پائلٹ نہیں بننا؟''

''نہیں، مجھے پائلٹ نہیں بننا...... نہ مجھے اور نہ تمہیں سمجھے......؟'' مومی نے صرف تیسرے سوال کا جواب دیا۔

''کیوں......؟'' مومی نے ایک نظر اسے دیکھا۔

''ائیر فورس سب کو مار دیتی ہے...... تم نے دیکھا ناں اس نے بابا کو بھی......''

''مومی......!'' ایک سخت آواز پہ مومی بے اختیار چپ ہوئی۔

''سعد......'' وہی سخت آواز......

سعد چونک کر متوجہ ہوا۔

''اندر جاؤ......'' اور وہ اٹھ کر چلا گیا۔

''تم اسے کیا سبق پڑھا رہی ہو مومی......؟'' گل نے اب کہ اس کے سامنے آکر سختی سے پوچھا۔

''وہی جو پڑھانا چاہیے۔'' بے لچک لہجہ، ڈھیٹ انداز۔

''تم ہوتی کون ہو اس کے بارے میں فیصلہ کرنے والی۔ ماں نہیں ہو تم اس کی...... وہ میں ہوں اور میں اسے تمہارے ہاتھوں خراب نہیں ہونے دوں گی، سن لو......'' وہ کہہ کر جانے کے لیے مڑ گئیں۔

''آپ بھی سن لیں، سعد پائلٹ نہیں بنے گا۔ کبھی نہیں...... میں خود کو مار ڈالوں گی مگر یاد رکھیے گا اسے پائلٹ نہیں بننے دوں گی۔ وہ پائلٹ نہیں بنے گا۔'' گل کے کانوں میں اس کے خراش زدہ گلے کی آواز آرہی تھی مگر وہ ہونٹ بھینچے آنسو کو سختی سے آنکھوں میں روکے چلتی جا رہی تھیں۔

''سن لیں ممی...... سن لیں......'' اور وہ پیچھے چیختی چلی جا رہی تھی۔

سعد کے ساتھ مومی والا معاملہ نہیں ہوا تھا...... حادثے کا اثر ہوا...... مگر وہ اتنا شدید نہیں تھا...... وہ بابا کو بس ضرور کرتا، روتا بھی تھا لیکن وہ مومی کی طرح نہیں

ہوسکتا تھا کہ وہ ایک بچہ تھا۔ اس نے جلدی کمپرومائز کرلیا تھا۔ اور اب موی کہتی تھی کہ جہاز مت بناؤ، پائلٹ نہیں بنا تمہیں...... وہ جب موی کو یہ کہتے سنتا تو حیران ہوتا...... الجھ جاتا، ماں سے سوال کرتا۔

اور گل......؟

اس نے پہلی بار یہ کب سنا تھا کہ سعد پائلٹ بنے گا۔ شاید لاشعور کی کسی عمر میں...... وہ جب شعور کی عمر میں پہنچا تو اسے یہ ہی معلوم تھا کہ اسے کچھ اور نہیں کرنا اسے تو بس پائلٹ ہی بننا ہے۔ یہ اس کے وجود میں built in تھا۔ جیسے کسی پروگرام کی طرح فکس کردیا گیا تھا۔ وہ موی نہیں تھا...... وہ سعد تھا۔

موی نے بڑی کوشش کی کہ اس کا برین واش کیا جا سکے اور گل...... یہ وہ ہی تھیں جنہوں نے یہ ہونے نہیں دیا تھا۔ اس دن کی گفتگو کے بعد سے وہ سعد کا سایہ بن گئیں۔ اسے اکساتی کہ ہاں...... بناؤ جہاز...... اڑاؤ جہاز کہ تم کو صرف اور صرف پائلٹ ہی بننا ہے۔ پی اے ایف کا جنگجو پائلٹ......

گل کے پاس اس کے ہر سوال کا جواب تھا۔

وہ پوچھتا۔ موی پڑھتی کیوں نہیں۔"

وہ کہتیں۔ "وہ بیمار ہے۔"

وہ پائلٹ نہیں بنے گی؟"

"نہیں؟"

"کیوں......؟"

"وہ بیمار ہے تو...... جہاز کیسے اڑائے گی؟" اور سعد، موی سے دور ہونے لگا...... اپنی عمر کے شروع کے چند سالوں کے بعد سے وہ موی کے زیرِ تسلط ہی زیادہ رہا تھا۔ مگر اب گل ایسا نہیں چاہتی تھیں۔

اس نے خود کو برباد کرلیا...... وہ سعد کو برباد نہ کرتی...... مگر اسے پی ایف سے ضرور متنفر کردیتی اور گل نے یہ ہونے نہیں دیا۔ سعد کے اندر فکسڈ پروگرام کو کرپٹ ہونے نہ دیا...... گل، سعد کو ہر صورت پائلٹ کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھیں کہ یہ اس کے شہید باپ کی شدید آرزو تھی اور یہ محض اس لیے تو نہیں تھا کہ مجیب عالم کی آرزو تھی...... مجیب عالم کے نام کو زندہ رکھنے کا ایک ذریعہ یہ بھی ایک طریقہ بھی تھا۔

☆☆☆

فضا ہیلی کاپٹروں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے لرز رہی تھی ان ہیلی کاپٹروں سے ذرا اوپر...... آسمان سے کہیں نیچے وہ چیل اب بھی اپنی کریہہ آواز نکالتے ہوئے گھوم رہی تھی۔

دن گرم تھا...... ریسکیو آپریشن جاری تھا...... مسخ شدہ جسم اٹھائے جا رہے تھے۔ وہ موت کا دن تھا...... ابھی تک کے اعداد و شمار تو یہ ہی بتاتے تھے۔ زندگی اور موت...... مابین ان کے فاصلہ کتنا...... سالوں کا؟ صدیوں؟ ہزار سال کا یا ہزاروں سال کا؟ لمحے کا یا لمحوں کا؟ اِک ساعت کا؟ ایک پل کا؟ کتنا؟ موت ہر وقت ہمارے سروں پر منڈلاتی رہتی ہے...... وہ ہماری تاک میں ہوتی ہے۔ گھات لگا کر بیٹھی ہوتی ہے...... کہ کب دبوچ کب پکڑ سکے۔

سمجھتے ہم یہی ہیں کہ موت ہزاروں سالوں کے فاصلے پر ہے۔ لیکن ہوتی وہ محض پلک جھپکنے کے فاصلے پر ہی ہے...... وہ جو خوش گپیاں مار رہے تھے...... وہ جو ہنس رہے تھے۔ وہ جو گھر لوٹنے کی امید میں تھے...... سکون کے دنوں میں لوٹنے والے تھے...... کیا ہوا؟ کیا معاملہ ہوا......؟

"کیا محض اِک پلک جھپکنے کی ساعت جیسا معاملہ نہ ہوا؟" مسکراہٹ اچک لی گئی...... آنکھوں کا نور...... بے نور ہوا...... لب ساکت ہوئے اور جسم مردہ...... وقت نے محض اک بار پلک ہی تو جھپکی تھی اور سارا منظر بدل گیا۔ الٹ دیا گیا...... تو فضا ہیلی کاپٹروں کے پروں کی تھرتھراہٹ سے لرزتی تھی۔

اِک اور جوان رسے کی مدد سے نیچے نشیب میں اترتا دکھائی دے رہا تھا۔

ایک اور باڈی نظر میں آئی تھی۔ اگر باڈی زندہ ہوتی تو اسے بیلنس میں جکڑ کر ہیلی کاپٹر سے ہی اسپتال پہنچایا جاتا اور اگر وہ سانس سے عاری ہوتی...... تو......؟ فوجی جوان کے دونوں بوٹوں نے زمین کو چھوا اِک

دھپ کی آواز آئی...... خاکستر باڈی...... وہ تیزی سے باڈی کی طرف بڑھا اور ہیلی کاپٹر ان کے سروں کے اوپر منڈلاتا تھا۔ اس کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سے فضا لرزتی تھی اور ان سب سے اوپر...... ایک چیل اپنی کریہہ آواز نکالتے ہوئے گھومتی تھی۔ وہ ایک گرم ترین دن تھا......

☆☆☆

وقت سرکا اور سرک کر اس مقام تک آیا کہ جب سعد کو کیڈٹ اسکول میں داخلہ لینا تھا۔

موی نے غدر مچا دینا چاہا مگر ہوا کیا۔

"تم سوچ سکتی ہو کہ سعد تمہارا کس طرح سے اثر قبول کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے نہیں پڑھنا...... کیونکہ موی نہیں پڑھتی، وہ کہتا ہے اسے بھی اسکول نہیں جانا کیونکہ موی بھی کالج نہیں جاتیں۔ تم کیا چاہتی ہو موی؟ اپنی زندگی تو تم نے برباد کر ہی لی اب اور کیا چاہتی ہو؟ بھائی کی زندگی بھی خراب کرو گی۔ وہ کیڈٹ اسکول پائلٹ بننے نہیں جا رہا موی، وہ وہاں پڑھنے جا رہا ہے...... کچھ ہوش ہے تمہیں کہ اس کی کمپنی کس طرح کی ہو چکی ہے؟ کبھی توجہ دی تم نے اسے، دل ہوا تو ہنس بول لیا، موڈ نہ ہوا تو سعد کون ہے؟ مجھ سے لکھوا لو موی تمہیں کل کو سعد گلی میں کھڑا سگریٹ پیتے ہوئے ملے گا...... اور اس سے ذرا اور آگے چلو تو کوئی لٹیرا، ڈاکو بن کر ملے گا......" گل غصے سے نہیں بے حد تحمل سے سرد، کٹیلے لہجے میں بات کر رہی تھیں۔

اس کے پاس ماں کی کسی ایک بات کو بھی رد کر دینے کا جواز نہیں تھا کسی ایک بات کو بھی...... سعد اس کا پیارا لاڈلا بھائی اس سے دور ہو چکا تھا۔ یہ اب...... اس لمحے...... اس پل میں یک دم کسی انکشاف کی طرح اس پر وارد ہوا تھا...... اسے واقعی میں سعد کے حوالے سے کسی بھی قسم کی معلومات نہیں تھیں، یہ ایک تدبیر تھی جو گل نے کچھ عرصہ پہلے اختیار کی تھی۔ سعد اب ساڑھے بارہ سال کا تھا۔

پچھلے ساڑھے تین سال اس کے کیسے دوست تھے؟ کلاس میں کیا پوزیشن تھی؟ وہ کیسا پڑھ رہا تھا؟ موی کو تو پتا ہی نہیں چلا۔ اور سعد وہ بھی تو اب اس کے پاس نہیں آیا کرتا تھا۔ اس سے سوال نہیں کرتا تھا۔ وہ زیادہ تر ممی کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔ کبھی اس کا موڈ ہوتا تو وہ کہہ دیتی۔ "آؤ سعد تمہیں پڑھاؤں۔" سعد ممی کی طرف دیکھتا چپکے سے...... ممی بھی چپکے سے اشارہ کر دیتی۔ "جاؤ پڑھ لو۔" مگر موی...... وہ اسے پڑھا نہ پاتی...... اسے سعد کی کورس کی کتابیں سمجھ میں ہی نہیں آتیں...... فرسٹ ائیر میں تعلیم چھوڑ دی تھی...... ساڑھے تین سال سے کتابوں کا منہ نہ دیکھا...... اب کیا پڑھاتی سعد کو...... وہ چند لمحے سمجھنے کی کوشش کرتی، اکتا جاتی اور سعد کو اٹھا دیتی۔ ایسے میں ممی نے اسے ٹیوٹر لگوا دیا تھا۔ سو سعد سے یہ تعلق بھی ٹوٹا۔

موی کی ضد یہ نہ تھی کہ سعد پڑھے نہیں...... ضد بس یہ تھی کہ اسے پائلٹ نہیں بننا۔ اور اب ماں کی باتیں۔ اتنے سالوں سے آنکھوں پر پڑا ہوا پردہ یک دم اچک لیا گیا تھا۔ اس نے عرصے بعد اب با ہوش انسانوں والا کوئی احساس محسوس کیا تو اس کی عقل نے کام کیا......

"سعد کی کمپنی اچھی نہیں ممی؟" بے یقین ہو کر پوچھا گیا۔

"نہیں......" یک لفظی ترنت جواب......

"میں کیڈٹ کالج صرف اس لیے اسے بھیج رہی ہوں کہ وہ گروم ہو سکے...... ڈسپلن سیکھ سکے...... موی! وہ میرا اور تمہارا سہارا ہے۔ بولو ہے کہ نہیں؟" اور موی...... وہ چپ کی چپ رہ گئی، سوچنے لگی اور حساب لگانے لگی اور پھر اٹھ کر چلی گئی۔

گل نے بے ساختہ ایک شکر بھری سانس لی تھی۔

یہ سب باتیں محض جھوٹ کا پلندہ تھیں...... سعد اس سے دور ضرور ہوا تھا مگر ویسا نہیں ہوا تھا جیسا گل نے اسے پورٹرے کیا تھا۔ وہ وقت سے پہلے اور ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ گل نے اس کے "جنون" کو مرنے نہیں دیا تھا۔ اسے پائلٹ ہی بننا تھا...... وہ جانتا تھا، وہ پڑھتا رہتا۔ اس کی روٹین سخت تھی...... صبح اسکول، اسکول سے آ کر ایک گھنٹا آرام...... پھر ٹیوٹر آ جاتا، ٹیوٹر جاتا تو تھوڑی دیر بعد قاری صاحب آ جاتے ایسے میں شام ہو جاتی۔ اور شام کا

وقت فیملی ٹائم...... سب لاؤنج میں ہوتے...... کبھی موی بھی ہوتی...... ورنہ اکثر وہ اپنے کمرے میں بند ہوتی۔ اس کی کوئی دوست تھی نہ کوئی اور کام...... نیٹ پر بیٹھ کر بیکار کے کام کرتی رہتی۔ گھٹیا، تھرڈ کلاس موویز دیکھتی رہتی۔ یا پھر کوئی نیا شوق چراتا تو اس کے حوالے سے نیٹ سے انفارمیشن لیتی رہتی...... اور شوق چڑھنے کی بھی خوب کہی...... کیا شوق تھے بھلا اب اس کے۔

کوکنگ ریسپیز دیکھنا، کھانے گارنش کرنے کے مختلف طریقے...... رس ملائی، گلاب جامن گھر پر کیسے بنائیں جائیں؟ معلوم نہیں کیا، کیا...... ہر چند دنوں کے بعد اس کے سر پر ایک نیا شوق سوار ہو چکا ہوتا اور ایسے میں گھر والوں کی شامت...... تو وہ جب اپنے کسی نہ کسی شوق کے حوالے سے نیٹ پر بیٹھ کر معلومات حاصل کر رہی ہوتی تھی تو عین اسی وقت سعد گھی کے کمرے میں موجود اپنے PC پر ویڈیو گیم کھیل رہا ہوتا تھا۔ وہ ہی ویڈیو گیمز جو وہ بچپن سے کھیل رہا تھا۔ سعد اسی روٹین میں مصروف ہوتا گیا، وقت کے ساتھ، ساتھ لاشعوری طور پر ایڈجسٹ ہوتا گیا بالکل اسی طرح سے جیسے بڑے ہونے پر بچپن کے کھیل، بچپن کی چیزیں، کھلونے، دوستیاں چھوٹ جاتی ہیں اور ہمیں پتا بھی نہیں چلتا...... تو بالکل اسی طرح سے سعد کو بھی پتا نہیں چلا کہ وہ موی سے دور ہو رہا ہے اور نہ موی کو...... وہ دونوں ہی اپنے، اپنے مشاغل میں الجھے رہے۔ اور وہ وقت بھی آیا کہ جب سعد کا ایڈمیشن پاکستان ائیر فورس پبلک اسکول لوئر ٹوپہ مری میں ہونا تھا...... اور وہاں سے اسے ایف ایس سی کر کے ہی نکلنا تھا۔ اس کے بعد سیدھا پی اے ایف رسالپور...... گل کی تدبیر کیڈٹ کالج تک تو کام کر گئی تھی...... آگے کیا ہونا تھا...... یہ تو وقت نے ہی بتانا تھا۔

☆☆☆

اور جس دن سعد گیا...... اسے لگا کہ وہ کچھ اور خالی ہو گئی ہے...... زندگی تھوڑی اور بے مقصد ہو گئی ہے...... وہ کتنی فضول تھی ناں...... سارے جہان والوں سے زیادہ...... کیوں تھی زندگی؟ کیا تھی زندگی......؟ یہ ختم کیوں نہیں ہو جاتی...... ایک ہی جھٹکے میں...... ایک ہی وار میں...... وہ شرط لگا کر کہہ سکتی تھی کہ ایسے کوئی اور نہ جیتا ہو گا...... لیکن...... سوال یہ کہ اگر سانس لینے کو جینا کہا جاتا ہے تو ہاں، سائنسی اعتبار سے تو سانس لینے کو ہی حیات کی علامت سمجھا جاتا ہے لیکن ایک چیز ہوتی ہے...... روح...... ایک ہوتا ہے دل...... دل، روح کو زندہ رکھتا ہے اور روح زندہ ہو تو دماغ چلتا ہے تو اگر دل مر جائے...... اس کو موت لاحق ہو جائے تو...... تو؟ تو کیا ہوتا ہے...... تو وہ ہی ہوتا ہے جو موی کے ساتھ ہو رہا تھا۔ سمجھ لیں کہ وہ ہو کر بھی نہیں تھی اور لفظوں کی زبان میں کہو تو اسے Spell of cold کہتے ہیں سائنس معلوم نہیں کیا کہتی ہو گی۔

وہ کیا کیفیت، کیا حالت ہو گی جہاں پہ پہنچ کر انسان ہر احساس سے عاری ہو جائے...... دکھ، تکلیف، رنج، آنسو، خوشی، ہنسی کچھ تو، کچھ تو بچتا ناں اس میں...... کچھ تو...... چلو آنسو ہی سہی...... وہ ہی بچ جاتے...... وہ پی ہی لیتی...... اور یہ آنسو...... کیا یہ نعمت نہیں ہوتے؟ جو بہہ کر، پھسل کر آنکھوں کے رستے نکل کر کیسا سکون پہنچاتے ہیں دل کو اور وہ...... اس کے تو سالوں سے سارے آنسو پتا نہیں کہاں تھے؟ نہ نکلتے تھے نہ سکون بخشتے تھے۔ جم گئے تھے شاید جل جاتے تو اچھا ہوتا...... کہ منجمد ہونا زیادہ تکلیف دہ تھا۔ اور سالوں بعد ایک اور کام ہو گیا اور ایسا ہوا کہ سمجھیں اس نے مہر ثبت کر دی...... مرے ہوئے کو تھوڑا اور مار دیا گیا اور بس...... طیارے کے بلیک باکس سے ملنے والی معلومات پہ مبنی یہ رپورٹ آ گئی تھی۔ کسی فنی خرابی کی بنا پر انجن میں آگ بھڑکی تھی...... پائلٹ اور کو پائلٹ طیارے کو سنبھالنے کی کوشش میں لگے رہے مگر ناکام ٹھہرے اور جس پل وہ ناکام ہوئے وہ پل عین آبادی کے اوپر آیا تھا...... اور وہ تو محافظ تھے انہی کے کہ جن کے گھر اُن کے طیارے کے نیچے تھے...... اور یوں محفوظ مقام تک لے جانے کی کوشش میں طیارہ فضا میں ہی پھٹ گیا تھا وہ چاہتے تو نکل سکتے تھے جان بچا سکتے تھے مگر...... تو بس مرا ہوا تھوڑا سا اور مر گیا...... زندگی

سے کچھ اور خالی ہو کر رہ گیا...... وہ کیا چیز ہوتی ہے جو بیماری سے انسان کو اٹھنے پر مجبور کر دیتی ہے کیا دوا......؟ نہیں...... یہ وِل پاور (قوتِ ارادی) ہوتی ہے اپنی ہمت...... تو اسی اصول کی بنا پر جس انسان میں زندہ رہنے کی خواہش ہی نہ بچی ہو تو......؟ اسے تو اصولاً مر ہی جانا چاہیے...... اور وہ مومی...... وہ اب تک کیا کر رہی تھی زمین کے اوپر...... کوئی تو جذبہ تھا تو جو اسے یوں جینے پر آمادہ رکھے ہوئے تھا...... اور زندگی یہ بڑی عجیب شے ہے۔ کبھی کبھار یہ اپنے اوپر لاگو ہونے والے سارے قوانین سے، سارے اصولوں سے منحرف ہو کر بقا کا بڑا ہی عجیب اور ماورائے عقل راستہ تلاش کر لیتی ہے تو سمجھ لیجیے مومی کے ساتھ بھی یہی ہوا...... اس کو زندہ رکھا...... تو محض اک جذبے نے اور وہ جذبہ کیا تھا؟

''نفرت......''

پی اے ایف سے نفرت ...... فوج سے نفرت ...... فوجیوں سے نفرت تو محبت کی کہانی ختم ہوئی...... نفرت کا قصہ شروع ہوا چاہتا ہے۔ اور دیکھیے کہ کہاں تک جاتا ہے۔ وہ زندہ تھی...... محض اس لیے کہ اسے سعد کو پائلٹ بننے نہیں دینا تھا...... اسے سعد کو ایک عام سویلین شہری بنانا تھا...... اس کے خیال میں رشتوں کی قربانی کا دور بس مجیب عالم تک تھا گل تک تھا...... اور اب کوئی نہیں...... کوئی بھی نہیں...... کوئی اور شہید نہیں ہوگا مومنہ مجیب عالم کے خاندان میں...... کسی اور کے لیے لفظ یتیم نہیں بولا جائے گا...... کوئی اور ایسی عورت، بیوہ نہیں ہوگی کہ جس کا بچہ کل کو جوان ہو کر بھری جوانی میں شہید ہو کر ماں کے سامنے لاش کی صورت میں آئے۔ اس نے گویا آپ ہی آپ یہ فیصلہ صادر کر دیا تھا......

☆☆☆

اگر جو کبھی آپ کو مائیکرو اسکوپ جیسی بصارت حاصل ہو جائے اور آپ دنیا کو اس ایک مقام سے اس ایک جگہ سے دیکھ سکیں کہ جہاں سے پوری دنیا کے انسان آپ کے زبردست مشاہدے کے زیرِ نظر ہوں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہر انسان...... دنیا کا ہر انسان جو ''میری زندگی''...... ''میری زندگی'' کی گردان، گردانتا رہتا ہے اور یہ جو اس کی ''میری زندگی'' ہوتی ہے ناں یہ اس کی ہرگز ...... ہرگز بھی نہیں ہوتی۔

یہ کبھی اس کے بیٹے کی ہوتی ہے...... کبھی بیٹی کی...... کبھی ماں کی تو کبھی باپ کی...... کبھی بہن، بھائیوں کے نام پر بیتی ہوئی اور کبھی spouse (جیون ساتھی) کے گرداب میں الجھی ہوئی...... تو یہ میری زندگی ...... میری بھلا کب ہوئی؟ تو گل کو بھی پچھلے تین، چار برسوں سے یہ احساس کھائے جاتا تھا کہ ان کی زندگی تو وہ تھا جو کہ اب نہیں تھا...... اور وہ جواب تھی...... وہ بھی ان کی اپنی زندگی کب تھی......؟ یہ تو کبھی مومی میں سانس لینے لگتی تھی تو کبھی سعد کے نام پہ دھڑکنے لگتی۔

تو ''میری زندگی'' کسی انسان کی اس کی اپنی زندگی کب ہوتی ہے؟ وہ شخص جس میں کبھی آپ کی سانسیں اپنی پوری شدت سے سانس لیتی رہی ہوں...... وہ بھلایا جا سکتا ہے؟ نہیں ناں......!

گل کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا...... وہ یادیں نہیں تھیں...... وہ زندگی تھی...... زندگی کا ایک حصہ...... ایک اٹوٹ انگ...... وہ بھلا کیسے بھلایا جا سکتا تھا۔ اور زندگی کا وہ حصہ یادوں کی صورت کسی چڑھتے ہوئے منہ زور دریا کی طرح گل کو غرق کر دینے کے لیے آتا...... دھوئیں کی شکل میں بکھرتا...... اور کسی ماورائی چیز کی طرح ان کے اندر حلول کر جاتا...... وہ پرانی البمز کھول لیتیں...... مجیب عالم کے کپڑے نکال لیتیں، خواہ مخواہ میں ان کے جوتوں کی گرد جھاڑتی رہتیں...... ہینگر میں سجے سوٹ کی ٹائی ٹھیک کرنے لگتیں، وہ تحفے نکال کر دیکھنے لگتیں جو مجیب عالم وقتاً فوقتاً انہیں دیتے رہے تھے...... الماری کھول کر ان کے کپڑوں میں بسی خوشبو کو محسوس کرتیں۔ جس کو وقت اڑا دینا چاہتا تھا...... مگر وہ الماری کے پٹ مضبوطی سے بند کر کے اس خوشبو کو قید کر کے رکھ دینا چاہتی تھیں۔

ایسے ہی دن وہ مجیب عالم کا یونیفارم نکالے بیٹھی تھیں۔ یہ ان کی جوانی کا یونیفارم تھا۔ شاید تب کا جب وہ بائیس

بیس سال کے ہوں گے...... اس یونیفارم کو بیڈ پر رکھے...... اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ان کے ذہن کو جیسے ایک نئے خیال نے چھوا......

"یہ سعد پہنے گا...... تب...... جب وہ پہلی بار جہاز اڑائے گا...... ہاں...... اسے یہ ہی پہننا چاہیے...... وہ یہی پہنے گا...... بالکل ٹھیک...... یہی......" اور جب وہ یونیفارم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسی سوچ کے زیر اثر... بڑبڑا رہی تھیں تو سینے کے بائیں حصے میں ایک لہر اٹھی تھی۔ اور اٹھ کر بائیں بازو میں سرعت سے پھیلی تھی...... ان کا چلتا ہاتھ رکا...... انہیں ایک جھٹکا لگا...... اور سیدھے ہاتھ نے ایک دم سینے کے بائیں حصے کو جکڑ لیا تھا۔ یہ تکلیف دہ تھا...... بہت...... تکلیف دہ تھا...... انہوں نے کھل کر ایک گہری سانس لینی چاہی لیکن فضا میں جیسے اچانک ہی آکسیجن کی کمی ہوگئی تھی۔

انہوں نے سمجھا شاید یہ ہارٹ برن ہے...... مگر...... نہیں...... وہ اس سے کہیں زیادہ تکلیف دہ تھا۔ وہ بے اختیار اٹھ کر دروازے تک آئی تھیں...... انہوں نے چاہا کہ وہ کسی کو آواز دیں۔ ان کے ہاتھ نے دروازے کے پٹ کو چھوا مگر وہ بے توازن ہوئیں اور پٹ کو دھکا لگا اور پٹ زور سے جا کر دیوار سے ٹکرایا...... آواز اتنی شدید تھی کہ لاؤنج میں عائلہ چونک اٹھیں۔

اور گھر پر کون تھا اس وقت؟ موی، عائلہ، گل اور بس...... موی نے کچھ کہا......؟ عائلہ کو یہ ہی گمان گزرا...... گل نے دروازے کا سہارا لے کر خود کو کمرے سے باہر نکالنا چاہا لیکن عائلہ نے دور سے انہیں یوں بے حال ہوتے دیکھ لیا...... کسی ناگہانی کا احساس پوری شدت سے حملہ آور ہوا...... وہ دوڑیں۔

"بھابی......" آواز کسی چیخ سے مشابہہ تھی۔ اور جب تک وہ پہنچیں گل زمین پر ڈھے چکی تھیں۔ "بھابی......"

ایک دوسری چیخ نما آواز ابھری...... جس نے موی کی سماعتوں کو جا لیا تھا۔

وہ ہارٹ برن نہیں تھا...... وہ اٹیک تھا۔

☆☆☆

حادثہ کبھی کبھار طاقت کا وہ قطرہ ثابت ہوتا ہے جو کسی کی زندگی میں ٹپکتا ہے اور تمام حسیات کو اپنی عظیم طاقت سے بحال کر کے اس مقام تک لے آتا ہے کہ جہاں پہ پہنچ کر وہ حسیات ٹھیک ٹھیک اپنے وہ ہی فعل سر انجام دینے لگتی ہیں کہ جو فعل سر انجام دینے کے لیے وہ تخلیق کی گئی ہوتی ہیں۔ وہ چیخ نما آواز موی کی سماعتوں تک آئی اور سیدھا جا کر اس کی چھٹی حس پہ حملہ کیا تھا۔

وہ اس وقت اپنے کمرے میں موجود کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی کوئی مووی دیکھ رہی تھی۔ اس کے اعصاب نے فوری کام کیا اور وہ دوڑ کر باہر آئی تھی۔

اگلا منظر دیکھ کر کیا اسے سکتہ ہو جانا چاہیے تھا؟ کیا اسے رک کر وہیں منجمد ہو جانا چاہیے تھا؟ بدحواس ہو جانا چاہیے تھا یا کہ رونا دھونا شروع کر دینا چاہیے تھا؟

تو وہاں اس مقام پر حادثہ ایک قطرہ ثابت ہوا...... جس کی عظیم طاقت نے موی کو مجبور کیا کہ وہ فوری کال کرے...... ایمبولینس بلائے اور دوسری کال حاجو کو کرے۔

وہ دوڑ کر ماں تک نہیں گئی تھی...... وہ ٹیلی فون اسٹینڈ تک آئی تھی۔

اس کا ماں کے پاس جانا، ان کی زندگی نہیں بچا سکتا تھا، یہ کام ٹھیک وقت پر درست جگہ کی گئی ایک کال کر سکتی تھی...... کیونکہ گل کو عائلہ نے سنبھال لیا تھا۔ سو اس نے وہی کیا جو اس حادثے کی صورت میں کرنا چاہیے تھا......

اور اگلے چند لمحوں تک گل سی ایم ایچ (کمبائنڈ ملٹری اسپتال) میں منتقل ہو چکی تھیں۔ حادثہ اگر ایک طرف حواس چھین سکتا ہے...تو اپنے اندر حواس بحال کر دینے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔ دونوں کیفیات میں فرق صرف شدت کا ہے۔

☆☆☆

وہ...... وہ اٹیک انجائنا کا تھا...... شدید ہارٹ اٹیک نہیں تھا۔ یہ تو ہونا تھا......

انسان تھیں، کب تک اور کہاں تک برداشت کرتیں...... تو پھر یہ تو ہونا ہی تھا۔ وہ کمرے میں منتقل

ہو چکی تھیں۔ ہاتھ کی انگلی پر لگا کلپ دل کی دھڑکن بتا رہا تھا۔ وہ نیم دراز تھیں۔ رشتے دار، احباب آجا رہے تھے..... غرض کہ ایک تانتا بندھ چکا تھا۔ موئی گل کے کمرے کے باہر دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی مسلسل اپنے...... ناخن چبا رہی تھی۔ یہ اس کا اپنے آپ کو کنٹرول کرنے کا ایک انداز تھا۔

ممی کی طبیعت کی وجہ سے وہ لحاظ کیے ہوئے تھی۔ ورنہ ان دھڑا دھڑ آنے والے مہمانوں کی طبیعت وہ صاف کر چکی ہوتی۔ اسے رہ، رہ کر غصہ آ رہا تھا......

''ممی کو آرام کی ضرورت ہے مگر یہ لوگ.....'' وہ پیر پٹختے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ لوگ مریض کی حالت کا لحاظ کیے بنا..... جوق در جوق چلے آ رہے تھے..... ٹھیک ہے تیمارداری کرنا بنتا ہے..... فرض بھی ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ کی تیمارداری مریض کے لیے ایک کوفت بن کر رہ جائے..... وہ بے آرام ہو کر اور زیادہ مریض ہو جائے......

''چاچو.....'' وہ کمرے کے اندر جاتے حسیب عالم کو دیکھ کر بولی تھی۔

''آپ کیوں کھڑی ہیں یہاں موی.....؟'' وہ حیران ہوئے۔

''یہ لوگ کب جائیں گے؟ پچھلے آدھے گھنٹے سے یہ آنٹی مسلسل ممی سے باتیں کیے جا رہی ہیں۔''

''موی.....!'' چاچو نے بے اختیار تنبیہی آواز میں بات کو کاٹا......

''آپ ان کو بھیج رہے ہیں یا پھر میں.....'' وہ ذرا جو بات کو خاطر میں لائی ہو۔ نری بیزاریت بھری ہوئی تھی لہجے میں۔

''اچھا میں دیکھتا ہوں۔'' چاچو نے اسے ٹالا...... مگر وہ بھی موی تھی۔

''آنٹی پلیز..... ممی کو ریسٹ چاہیے..... ڈاکٹر نے انہیں زیادہ بولنے سے منع کیا ہے۔'' صرف پانچ منٹ اور انتظار کیا تھا اس نے..... یک دم سب ہکا بکا رہ گئے تھے۔

اور موی جب یہ بات ان آنٹی کو کہہ رہی تھی تو وہ ماں کی طرف تو نہیں دیکھتی تھی..... اور اس نے ماں کی طرف تب سے نہ دیکھا تھا کہ جب وہ ڈھے کر فرش پر پڑی تھیں۔ وہ آنکھ بچاتی رہی..... گریز کرتی رہی، بچتی رہی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جب وہ گل کے روم میں داخل ہوئی تھی۔ ورنہ وہ وہیں باہر دیوار سے لگ کر کھڑے ہو کر آنے جانے والوں کے چہرے سے..... اپنے لیے اطمینان کشید کرتی رہی تھی۔ سعد، ماں کے پہلو سے لگا بیٹھا تھا..... اور ایک وہ تھی..... دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کے بل دیوار سے پشت ٹکائے وہ خاموش کھڑی رہی تھی۔

اگر وہ آنٹی نہ ہوتیں تو وہ کمرے میں نہ جاتی لیکن اسے جانا پڑا۔ وہ آنٹی منہ سے زبردستی کا اخلاق جتاتی وہاں سے چلی گئی تھیں۔

کمرے میں اب ناگوار سی خاموشی تھی موی سر جھکائے کھڑی تھی اور پھر اس نے پیروں کا رخ بدلا جو پھر سے باہر لے جانا چاہتے تھے۔

''موی.....'' گل نے اپنی نحیف آواز میں اسے پکارا تھا۔ وہ یکلخت رک گئی..... جیسے کہ اب حرکت ہوئی تو جرم ہو گا۔

''ادھر آؤ.....'' اس نے ایک گہری سانس لی...... اپنے پیروں کے رخ کو بدلا اور آہستہ سے مڑ گئی..... مگر نظر اٹھا کر ماں کو نہ دیکھا۔

''آجاؤ شاباش.....'' گل نے مادرانہ شفقت سے اسے پچکارا۔

وہ آہستگی سے نرم چال چلتی ان تک آئی۔

انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سرہانے بٹھالیا۔

وہ خاموشی سے بیٹھ گئی..... جھکی نظریں، جھکا سر..... حد سے زیادہ کنفیوزڈ کہ اب کیا کرے؟ تو موی جذبات کے اظہار سے بھی محروم ہو چکی تھی۔ گل نے نرمی سے اس کا سر اپنے سینے سے لگایا......

اچانک کوئی چیز ناک کے نتھنوں سے ہوتی ہوئی اس کے پورے جسم میں تیزی سے تیکھی مرچ کی طرح لگتے

ہوئے پھیلی تھی۔ اس نے اپنے بازوؤں کو حرکت دی اور ماں کے وجود کے گرد لپیٹ لیے آنکھیں موند لیں اور جان لیا کہ سکون تو وہاں ہی تھا ہاں وہیں کہ جہاں وہ آنکھیں بند کیے سر ٹکائے ہوئی تھی۔ اس وجود کی گرمی...... اور حدت میں بولتی ہوئی ممتا اور شفقت اور اس شفقت سے رکھے ہوئے جسم کو ملتی ہوئی ٹکور...... یہ کیا تھا؟ جس کو اس نے سالوں بعد محسوس کیا تھا...... کون سا جذبہ تھا یہ اور پھر وہ وہیں سر ٹکائے پڑی رہی...... اس انداز میں کہ کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ اسے وہاں سے اٹھاتا۔

☆☆☆

اس نے بازو کی پوری طاقت لگا کر ریکٹ گھمایا اور شٹل اڑتی ہوئی نیٹ کے دوسری طرف موجود کھلاڑی کی طرف گئی تھی۔

آگے سے ردعمل شدید تھا۔

وہ بھاگ کر دوسرے کونے میں گئی اور پھر سے ریکٹ کی مدد سے ایک بھرپور طاقت لگا کر شٹل کو نیٹ کے دوسری طرف اچھال دیا۔

اب کی بار وہ چوک گیا۔

''اچھا کھیلنے لگی ہیں آپ۔'' اس کے انداز میں توصیف تھی۔

مومی نے گردن اکڑا کر ایک نظر اپنے بھائی پر ڈالی تھی۔ وہ اب لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لیے ریکٹ کو اپنے گھٹنے پر ہلکا، ہلکا مار رہی تھی، سعد نیٹ کے نیچے سے ہو کر اس کی طرف آیا تھا۔

''یہ سیٹ آپ کا ہوا۔'' اس نے مومی کے دوپٹے سے پسینہ صاف کیا جو اس نے گلے سے دوسرے بازو کے نیچے ترچھی شکل میں باندھ رکھا تھا۔

''سعد...... گندے......'' وہ تلملائی۔

''ممی نے تمہیں اس لیے لوئر ٹوپہ بھیجا تھا کہ تم ایسی گندی، گندی حرکتیں سیکھ کر آؤ......'' وہ بگڑی۔

''ہاہاہا......'' سعد نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔

''کبھی جو ممی آ کر دیکھیں ناں ذرا اپنے گرونڈ بیٹے کی حرکتیں......'' وہ اب بھی برہم تھی۔

''کیا ہو گیا ہے مومی آپ کو...... ذرا سا پسینہ ہی تو تھا۔'' چڑانے والا انداز......

مومی نے کینہ توز نظروں سے اسے دیکھا اور پھر جھک کر جاگرز کے تسمے باندھنے لگی۔

سعد کو جو ایسی کارروائی کی توقع تھی...... مگر مومی...... وہ مڑا اور وہاں پڑی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر جا کر گر پڑنے والے انداز میں بیٹھا۔ وہ ابھی تک کیاری کے پاس جھکی جاگرز کے ساتھ مصروف تھی۔

''ڈیٹ شیٹ آ گئی تمہاری؟'' سعد کی پشت پر آواز ابھری۔ وہ اس کے پاس آتے ہوئے بول رہی تھی۔

''ابھی تک تو نہیں آئی۔'' اس نے جھک کر پیروں کے پاس پڑی پانی کی بوتل اٹھانا چاہی تھی اور ...... دو ہاتھ اس کے پیچھے سے اس کے منہ پر آئے اور پھر پورے زور سے کسی چیز کو اس کے منہ پر ملنے لگے تھے۔

وہ بے ساختہ بڑبڑایا تھا۔

''مومی کیا کر رہی ہیں؟'' اس نے اچھل کر کھڑے ہو کر دور ہونا چاہا تھا مگر...... ان دو ہاتھوں نے یہ ہونے نہیں دیا تھا۔

''مومی......!'' اب کی بار وہ بلبلایا۔

''ہاہاہا......'' ایک فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا...... اور وہ قہقہہ مومی کے حلق سے ہی بلند ہوا تھا۔

''کیا ہے سعد...... ذرا سی مٹی ہی تو ہے......'' اور وہ ذرا سی مٹی سعد کے منہ پہ یوں لتھڑی ہوئی تھی کہ سعد اب سعد نہیں دکھتا تھا۔ مومی نے خاص طور پر کیاری کی تر مٹی کو چنا تھا۔

''آپ......'' وہ اپنا آپ چھڑا کر غرایا۔

مومی اب بڑے سکون سے کھڑی دونوں ہاتھوں سے مٹی جھاڑ رہی تھی۔

"tit for tat" وہ اسی سکون سے، مسکراتے ہوئے ایک ابرو اچکا کر بولی تھی۔

سعد کو اور تپ چڑھی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا تاکہ وہ مٹی سے گندی کوئی چیز ڈھونڈ سکے...... مگر وہاں... فی الوقت گیلی مٹی ہی واحد گندی چیز میسر تھی۔ وہ مڑ کر تیز، تیز

قدم اٹھاتا کیاری کی طرف گیا...... دونوں ہاتھ کیاری کی نم مٹی میں ڈالے...... دونوں مٹھیوں میں مٹی کو بھرا اور... بھرپور انداز میں اٹھ کر پلٹا لیکن...... لیکن موی وہاں سے غائب تھی۔ تو وہ یہ توقع کر رہا تھا کہ موی...... وہیں کھڑی اس کو خود پر حملہ کرنے کی تیاری کرتے ہوئے دیکھتی رہے گی...... اور جب وہ بھرپور تیاری سے آئے گا تو وہ تب بھی گویا بڑے آرام سے وہیں کھڑی ہوگی۔

"میں کون؟ گدھا......" مٹی کو پھینک کر وہ بڑبڑایا تھا۔ اور غصے سے ناک کے نتھنے پھلائے فوں فاں کرتا ہوا اندر کی طرف بھاگا تھا۔

اندر ایک اور دھچکا منتظر تھا اور وہ دھچکا ممی سے سامنا ہونے کی صورت میں آیا تھا۔

"سعد......!" انہوں نے چیخ کر اسے پکارا۔

"تم...... تم دیکھو تو سہی ذرا...... تم کیا بچے ہو؟ یہ سیکھتے ہو تم اسکول میں؟ اس لیے تمہیں بھیجا تھا وہاں؟ میرے اللہ...... میٹرک میں ہو تم اور حرکتیں دیکھو اپنی؟"

"ہا......" اس نے ایک گہری سانس لی...... ممی کا لیکچر پلس ڈانٹ......

"موی......" اس نے دانت پیس کر زیرلب کہا تھا۔

موی ہمیشہ خلافِ توقع کام کرتی تھی...... وار کرتی تھی...... اور یہ پہلی دفعہ نہیں ہوا تھا۔ یہ پچھلے چند سالوں سے ہوتا ہی آیا تھا...... تب سے جب سے ممی کو انجائنا کا اٹیک ہوا تھا۔ اس کی سرکشی...... غصہ جارحیت، بھڑا بھڑ جلتی بغاوت...... یہ سب جیسے انجائنا کے ایک اٹیک کے منتظر تھے اور پھر ان جذبات نے کروٹ لی، وہ ہی جذبات جنہوں نے موی کے اندر نفرت کو جنم دیا تھا اور نفرت ایک واحد جذبہ آسمان کو چھونے والا شعلہ بن کر بھڑکتی رہی تھی...... شعلہ مدھم ہوا...... لو میں بدلا مگر بجھا پھر بھی نہیں...... بس لو یک دم چنگاری بن کر خوف کی تہہ میں سلگتی رہی۔

خوف......؟ ہاں...... خوف...... ایک انجائنا کے اٹیک نے موی کے اندر نفرت کو مدھم کر کے خوف کو جگہ دے دی تھی۔ اس طرح سے کہ نفرت محض اک سلگتی چنگاری تھی۔ ہاں خوف کی راکھ میں دبی چنگاری...... کہ ممی کو کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا اور بالکل اچانک وہ بھی ایک جیتے جاگتے وجود سے ایک تابوت میں رکھے جانے والا جسم بن سکتی تھیں۔

خوف، سیاہ اندھیرے جیسا خوف...... کالی تاریک رات جیسا خوف...... جو کالے دھوئیں کی طرح موی کی نس نس میں پھیل گیا تھا۔ وہ بیک وقت ان دو جذبوں کا شکار ہوئی تھی...... دو مختلف مگر منفی جذبے...... نفرت اسے اکساتی مگر خوف اس کا منہ بند رکھتا...... وہ ممی کو پھر سے کسی اسپتال کے آئی سی یو میں نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ نہیں۔ وہ ایسا ہرگز، ہرگز نہیں چاہتی تھی۔ اور اگر ممی نہ رہیں تو؟ اور اس تو کے بعد خوف...... اپنے بڑے، بڑے ناخنوں والے پنجے پھیلاتا اور موی کو جکڑ لیتا۔

بابا کے ساتھ بھی تو یہی ہوا تھا...... اچانک، یک دم ایسا کہ جس کے بارے میں ان کو کبھی نہیں سوچنا تھا۔ بابا کو ہمیشہ ان کے ساتھ ہی رہنا تھا ہمیشہ...... لیکن...... ہوا کیا......؟

تو موی نے جان لیا سمجھ لیا کہ کسی بھی پل کسی بھی لمحے میں...... زندگی کی کسی بھی ساعت میں ناگہانی آسکتی ہے اور یہ زندگی کو پلٹ کر رکھ دیتی ہے۔ تو نفرت اسے اکساتی اور خوف اس کا منہ بند کر دیتا اور اسی خوف نے ایک یہ کارنامہ سرانجام دیا کہ وہ سعد کے قریب سے قریب تر ہوتی گئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ گل کی بیماری نے ان دونوں کو ہی ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا۔ وہ دونوں پھر سے اسی مدار میں آگئے اور اسی مرکز کے گرد طے شدہ راستے پہ گھومنے لگے...... وہ مرکز کہ جس کا نام گل تھا۔

☆☆☆

ہنیا کے چہرے پر پھیلی سراسیمگی دیکھ کر حیدر نے اپنی مسکراہٹ کو قابو کرنا چاہا...... مگر ناکام رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات یک دم بدلے تھے۔ "میرے خدا تو وہ پوز کر رہا تھا۔" ہنیا نے شاکڈ ہو کر سوچا تھا۔

"کیپٹن حیدر علی......!" حیدر نے مسکراتے ہوئے دہرایا...... تین لفظ اس کے منہ سے نکلے...... ہوا نے انہیں اٹھایا اور اس ہال کے گوشے، گوشے تک پھیلا دیا یوں کہ ہنیا کو وہاں موجود ہر شخص یہی تین لفظ بولتا ہوا سنائی

دیا۔ ہر قہقہے میں، ہر مسکراہٹ میں، ہر سرگوشی میں، ہر بات میں یہی تین لفظ عیاں تھے۔ حتیٰ کہ چمچ، کانٹے جب ٹکراتے تو وہ بھی یہی آواز پیدا کرتے تھے اور کھنک کی صورت گونجتے تھے۔

''کیپٹن حیدر علی، کیپٹن حیدر علی!'' اس نے سامنے موجود شخص کو دیکھا...... وہ اب نرم تاثرات کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ اِک گرم لہر نے اس کے پورے وجود کا چکر کاٹا اور اس طرح سے کاٹا کہ ماتھے پر پسینہ آ گیا تھا۔ وہ بری طرح سے گھبرا اٹھی تھی۔

ہائیں...... یہ کیسا ردِعمل تھا...... اس نے تو سوچا تھا کہ جب وہ لمحہ...... وہ لمحہ جو کہ کسی فوجی کے منہ سے الفاظ کی صورت آزاد ہو کر اس کی زندگی میں آنا تھا تو جب وہ آئے گا تو اسے ایک عدد ہارٹ اٹیک ضرور ہوگا...... چلو ہارٹ اٹیک نہ سہی تو خوشی اتنی شدید ہوگی کہ وہ اچھل کر بے ساختہ ایک چیخ مار دے گی... ہنس پڑے گی، قہقہہ لگائے گی اور مسرت کے ایک نئے مفہوم کو جان لے گی مگر یہ کیا تھا؟ اس نے حلق سے تھوک نیچے کر کے گلے کو تر کرنا چاہا۔ ایک گہری سانس لے کر خود کو سنبھالنا چاہا دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر کہنیاں ٹیبل پر رکھیں...... ہونٹوں پر زبان پھیر کر دماغ کو حاضر کرنا چاہا لیکن ناکام ٹھہری...... وہ اپنے بچاؤ کی ہر کوشش میں ناکام ٹھہری تھی۔ وہ دراصل ایک عظیم حیرت کی زد میں تھی کہ یہ اس کے ساتھ آج ہی اسی وقت ہونا تھا؟ گو کہ وہ ایک اسی لمحے کی مدت سے منتظر تھی مگر یہ انتظار ناگہانی طور پر ختم ہوا تھا۔ اَن ہونی جب ہونے پر آتی ہے وہ اسی طرح سے حواس سلب کرنے کا باعث بنا کرتی ہے۔

اس کو سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ ... کیسے ری ایکٹ کرے...... کچھ بولے؟ کچھ کہے، مسکرائے، ناراض ہو، سنجیدگی کا مظاہرہ کرے یا بے پروائی کا؟ وہ فی الوقت اپنی سمجھ کو غیر حاضر پاتی تھی۔

اس کے گمان تک میں نہیں تھا کہ آج صبح جب وہ اپنی ملازمہ کو یہ ابھی زیب تن کیے جانے والا لباس استری کرنے کے لیے دے رہی تھی تو وہ کس ''لمحے'' سے ملنے کی تیاری کر رہی تھی...... اور جب وہ تیار ہو رہی تھی جب بال سلجھائے، جب ہاتھوں میں چوکور شیپ والے کڑے پہنے جب جوتا پہنا تو یہ سب وہ کس لیے کر رہی تھی۔ اپنے یقین کے مطابق تو وہ حیدر کو انکار کرنے کی تیاری میں تھی۔ لیکن کیا ہوا...... یہ کیا ہو گیا تھا؟ تو...... وہ سب اس ایک لمحے کے لیے تھا جس کے لیے اس نے اِک مدت انتظار کیا تھا؟ تو پھر حواس سلب کیوں نہ ہوتے...... کیسے نہ ہوتے۔ اس نے یک دم اپنی جگہ چھوڑی تھی۔

اس کا منہ کھلا...... ہونٹ ذرا سے ایک دوسرے سے الگ ہوئے...... یوں لگتا تھا جیسے کچھ کہنا چاہتے ہیں یا کچھ کہنے لگے ہیں...... اور پھر یک دم اس نے ہونٹوں کو بھینچ لیا...... چہرے پر ایک دفعہ پھر نا سمجھی در آئی۔ اضطراب رقم ہوتا دکھائی دیا۔ اس نے سر جھٹکا...... قدم آگے کو بڑھائے، وہ تیز تیز چل کر اس ہال سے باہر نکل جانا چاہتی تھی مگر آدھے راستے میں رک گئی کیوں......؟

اس کے دل نے کہا واپس مڑ جاؤ...... قدم پیچھے کو مڑے...... ذہن نے کہا کہ یہ کیا حرکت ہے؟ اٹھنا ہی نہیں تھا؟ اور وہ پھر سے چل دی۔

جلدی سے عجلت بھرے انداز میں سیڑھیاں اتریں اور سڑک کنارے جا کر یک دم ساکت ہو کر رہ گئی۔ اس کے حلق میں سے پھر کچھ نیچے اترتا ہوا دکھائی دیا۔

بیگ کے اسٹریپ پر ہاتھ رکھے وہ ایک گم صم سی کیفیت میں تھی۔ سامنے سڑک پہ ہارن کی پاں، پاں گونجتی اور گاڑیاں زن سے گزر جاتیں...... اس کی پشت پر لوگوں کا شور تھا، کھانا کھانے کی مختلف آوازیں تھیں اسے سب سنائی دے رہا تھا مگر یوں جیسے کہ کہیں بہت دور سے آوازیں آ رہی ہوں...... اس کے بالکل پاس سے ایک گاڑی پاس کرتے ہوئے زن سے گزر گئی۔ گاڑی کے گزرنے سے ہوا ایک جھٹکے کی صورت اس کے وجود سے ٹکرائی اس کا دوپٹا لہرایا، بال اڑے اور وہ جیسے زمانہ حال میں آن پہنچی...... اس نے مڑ کر سیڑھیوں کی جانب دیکھا۔ وہ دھندلکے اندھیرے کی زد میں تھیں۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا...... یہ ملگجا دھندلکا اندھیرا اُدھر ہی سے اتر کر آ رہا تھا۔ بیگ کے

# پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

| | | | |
|---|---|---|---|
| عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عُشنا کوثر سردار | اشفاق احمد |
| نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی |
| فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایتُ اللّٰہ التمش |
| قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابر راجہ | ہاشم ندیم |
| نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | مُمتاز مُفتی |
| نگہت عبدُاللّٰہ | سباس گُل | عنیزہ سید | مُستنصر حُسین |
| رضیہ بٹ | رُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیمُ الحق |
| رفعت سراج | اُمِ مریم | نایاب جیلانی | ایماے راحت |

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

اسٹریپ پر گرفت مضبوط ہوئی۔

"کیا کرے......؟" ایک لمحے کے لیے سوچا گیا۔

لیکن یادرکھیے کہ ہنیا ذوالفقار وہ لڑکی ہے جو کرتی پہلے اور سوچتی بعد میں ہے۔ تو ایک لمحے کے لیے جو سوچا گیا تو اس سوچ نے اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کردیا...... فیصلہ کرنے کی زحمت کون کرے؟

وہ مڑی...... تیز، تیز سیڑھیاں اسی طرح سے چڑھتی گئی کہ جس طرح سے اتری تھی۔

بیگ کے اسٹریپ پہ ہاتھ رکھے...... چیزوں کے درمیان میں تیز، تیز چلتے ہوئے وہ اسی جگہ دوبارہ واپس آئی تھی جہاں حیدر بڑے سکون سے بیٹھا ایک اور ڈرنک سے انصاف کررہا تھا۔

"کارڈ......!" اس نے ایک ہانپتی ہوئی آواز سنی اور پھر نظر نے ایک چڑھی ہوئی سانس والے وجود کو دیکھا تھا۔

"کارڈ......" اب کہ وہ درشتی سے بولی۔

وہ سکون سے مسکرایا پاکٹ سے کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا...... اور اس سارے عمل میں مسکراہٹ زیرلب رہی۔

ہنیا نے ایک جھپٹا مار کر کارڈ پکڑا اور پھر پہلے سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ وہاں سے چلی آئی تھی۔

سانس چڑھی ہوئی تھی اور وہ سڑک کے کنارے مٹھی میں دبے کارڈ کے ساتھ کھڑی تھی۔ ذرا سا آگے ہو کر اس نے ٹیکسی کو ہاتھ دیا...... یہ یاد کیے بغیر کہ ثنا کو اسے پک کرنے آنا تھا...... اسی ہانپتے ہوئے انداز میں اس نے ڈرائیور کو پتا بتایا اور فوراً سے پہلے دروازہ کھول کر بیٹھ گئی تھی۔ جب تک ٹیکسی اس کے گھر کے راستے پر چلتی رہی وہ دم سادھے سانس روکے مٹھی میں کارڈ کو زور سے دبائے بیٹھی رہی۔ گھر پہنچ کر وہ سیدھی اپنے کمرے میں گئی تھی...... تیزی سے دروازہ کھولا...... جھٹکے سے بند کیا اور پھر دروازے سے پشت ٹکا کر اس نے سکون کی پہلی سانس لی......

یوں جیسے وہ چوری کر کے بھاگی تھی اور اب کسی محفوظ مقام پر آگئی۔ مٹھی میں دبا کارڈ یک دم ہی چبھنے لگا۔ اس نے آہستگی سے مٹھی کو سامنے کیا بند ہاتھ کی مٹھی کو ہلکے سے کھولا...... انگلیاں سیدھی ہوئیں اور ایک مڑا تڑا کارڈ اس کے سامنے تھا۔

اور وہ آج کے دن کی پہلی مسکراہٹ تھی جو اس کے ہونٹوں پر آئی تھی۔

وہ...... وہ ایک وزیٹنگ کارڈ نہیں تھا۔ ایک جگنو تھا، جس کو اس نے وقت کے ہاتھوں سے چھین کر اپنی مٹھی میں قید کرلیا تھا اور وہ...... وہ کیا کر بیٹھی تھی...... کیا کردینے لگی تھی۔

مسکراہٹ گہری ہوئی پھیلی اور پھیل کر آنکھوں تک جا پہنچی۔

اس نے یک دم مٹھی دوبارہ بند کرلی۔ بیگ کو کندھے سے اتار کر سمت دیکھے بغیر پھینکا۔

ہائی ہیل جوتا اتار کر کدھر گرایا...... معلوم نہیں تھا اور خود......

وہ اب بیڈ پر پشت کے بل کھڑے کھڑے گری تھی۔ یوں کہ کمر بیڈ پر اور ٹانگیں لٹکتی ہوئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے کارڈ کو سیدھا کیا اور آنکھوں کے سامنے لاکر دیکھنے لگی۔

"کیپٹن حیدر......" اس نے پڑھا......

"کیپٹن حیدر علی!" دوبارہ پڑھا...... "کیپٹن حیدر علی!" پھر پڑھا اور پڑھتی گئی...... یوں جیسے کہ وہ پاگل ہو...... یا ہورہی ہو...... اور پھر دونوں بازوؤں کو دائیں بائیں گرا کر وہ کھل کر ہنسی۔

ایک بے اختیار قہقہہ گونجا...... زندگی سے بھرپور قہقہہ...... پھر یک دم ہونٹ بھینچ لیے...... کارڈ پھر سے آنکھوں کے سامنے کرلیا۔ یوں جیسے کہ وہ پاگل ہو یا ہورہی ہو...... اور وہ کارڈ نہیں تھا...... وقت کے ہاتھوں سے چھینا ہوا ایک جگنو تھا...... جگنو تھا جگنو......

☆☆☆

وہ ایک لمبے عرصے سے وزیرستان میں تعینات رہا تھا...... اس کے بعد چھٹی ملی تو لمبی چھٹی ملی تھی۔ لائبریری میں وہ گنز اور کرمنالوجی سے متعلق لٹریچر پڑھنے جایا کرتا تھا۔ گنز...... وہ ہی جو اُس کی پہلی محبت تھی۔ وہ کمانڈو تھا

کسی لڑکی کی باری بعد میں آتی تھی...... پہلی گن ہی تھی۔
یہ انہی چھٹیوں کی بات تھی کہ جب اس کا سامنا ہنیا سے لائبریری میں ہوا تھا۔ وہ فوجیوں کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ وہ بھی فوجی تھا...... جو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر آپریشن کیا کرتا تھا...... زخمی ہوتا تھا...... مہم پہ چھید کھاتا تھا۔ وار سہتا تھا ذرا سی بات نے ہرٹ کیا تھا...... نہیں...... غصہ دلایا تھا۔
وہ اسی عوام کے لیے خوار ہوتے ہیں...... ابنارمل زندگی کے دن گزارتے ہیں...... سختیاں برداشت کرتے ہیں اور پھر...... پھر ایک دن تابوت میں بند ہو کر آجاتے ہیں...... کبھی نہ اٹھنے کے لیے...... سو جواب خود بخود اس کے منہ سے ابلا تھا۔
لیکن ہوا کیا......؟ اِک حادثہ ہو گیا...... اِک نظر کمال بھی کرتی ہے۔ اک چہرہ سب کچھ تہ و بالا بھی کر کے رکھ دیتا ہے اس نے جان لیا تھا کون کہتا ہے کہ فوجی رومینٹک نہیں ہوتے...... PMA میں ٹریننگ کے دوران لڑکی دیکھنے کو نہیں ملتی...... افیئر چلانے کا سوال تک نہیں پیدا ہوتا۔ پھر اس کے بعد سیدھا محاذ پہ وہاں سے کب واپسی ہو کچھ پتا نہیں...... اور جنس مخالف سے کشش نیچرل ہے...... فطرت ہے تو پھر فوجی کیسے رومینٹک نہ ہو...... فلرٹی بھی ہوتے ہیں...... ہمیں سڑو اس لیے لگتے ہیں کہ وہ اصول پسند ہوتے ہیں...... اور اصول عام آدمی کی زندگی میں کہیں بہت بعد میں آتا ہے اور فوجی کی زندگی میں سب سے پہلے...... تو پھر فوجی رومینٹک ہوتے ہیں اور ضرور ہوتے ہیں۔ اسے بھی ایک لڑکی اچھی لگی اور حد سے زیادہ اچھی لگی...... اتنی لگی کہ وہ دل کو مجبور پاتا تھا اس کی خوش قسمتی یہ تھی کہ جب چھٹیاں ختم ہوئیں تو پوسٹنگ آرڈر راولپنڈی کے ہی تھے۔
وہ ہنیا کو جانتا تھا نہ واقفیت تھی البتہ ثنا سے ضرور آمنا سامنا ہو گیا تھا۔ اور بس...... سب کچھ سیدھا، سیدھا جا رہا تھا کہ اچانک ثنا نے اس سے کہا کہ ہنیا آپ سے شادی پہ رضامند نہیں ہوگی...... یہ بات اس نے حیدر کے ہنیا سے ملاقات کرنے کے جواب میں کہی تھی۔

انسان کو محبت ہو اور پھر اس محبت کے دکھ نہ اٹھانے پڑیں۔ یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟ اس نے بھی یہ ہی سوچا تھا۔ وہ ثنا کے منہ سے یہ بات سن کر پہلے حیران ہوا اور پھر پریشان...... وہ یک دم چپ ہوا تھا۔
''کیوں......؟'' اِک وقفے کے بعد اس نے پوچھا تھا۔ اور اس کیوں کا جواب دیتے ہوئے ثنا نے خود کو احمق ترین اس دنیا کا سب سے احمق ترین انسان محسوس کیا تھا۔
اس نے کچھ شرمندگی سے حیدر کو بتایا اور حیدر...... وہ حیران تھا قسمت کیا چاہ رہی تھی بھلا کیا...... وہ بس مسکرا کر رہ گیا۔
بتایا ثنا کو بھی نہیں......
بتانا اس کو ہی تھا...... اسی بے وقوف کو جو کسی بھی طرح سے اس قابل نہیں تھی کہ اسے حیدر سے محروم کر دیا جاتا۔
اور پھر...... پھر وہ لمحہ آیا کہ جب اس کی آنکھوں نے اس بے وقوف کو یک دم گھبرا کر اٹھتے دیکھا...... اور ذرا سے وقفے کے بعد اس کے کانوں نے ایک آواز سنی...... ایک درشت آواز......
''کارڈ......'' اور پھر اس نے جھپٹا مار کر کارڈ چھینا تھا۔ وہ کھل کر ہنس دیا تھا۔
اب اس کے بعد...... اگر یہ بتایا جائے کہ آگے معاملات کیا ہونے یا کیسے طے ہونے تو یہ نری بے عقلی بات ہوگی۔
آگے کے معاملات طے ہونے ہی تھے۔ کیسے نہ ہوتے...... ہنیا کو کسی فوجی سے محبت کرنی تھی اور دیکھو ذرا الٹا کام ہو گیا...... وہ فوجی خود اس کے پاس آیا جو اس پر عاشق تھا تو آگے کے معاملات تو طے ہونے ہی تھے...... ضرور ہی ہونے تھے اور کیسے نہ ہوتے۔

☆☆☆

ان دونوں کے سروں سے ایک صبح کاذب کا پرندہ بولتا ہوا گزرا......
ہنیا نے چونک کر سر اٹھایا اور اوپر دیکھا...... صبح کی تازہ نم ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی۔ بالوں کی لٹوں کو

چھوا اور انہیں ہلنے پر مجبور کردیا۔ ہنیا نے سر نیچے کرتے ہوئے پھر سے سامنے دیکھا۔ افق پر سورج طلوع ہونے کی اطلاعات تھیں۔ سرخی پھیل رہی تھی۔

کل رات ہی منگنی کا فریضہ سرانجام دیا گیا تھا۔ اور آج وہ اسے جھیل پر طلوعِ ہوتی صبح دکھانے لایا تھا۔ یہ اس کی زندگی کے مسحور کن نظاروں میں سے سب سے مسحور کن نظارہ تھا۔

واک کے بہانے وہ اسے ساتھ لے کر آیا تھا۔ یہ بتائے بغیر کہ وہ کدھر جا رہے ہیں...... ہنیا گاڑی میں بھی نیند سے ڈولتی رہی کہ کل رات کا فنکشن ختم ہوئے ابھی چند گھنٹے ہی تو گزرے تھے اور وہ دیکھ، دیکھ کر مسکراتا رہا۔ یوں جیسے کسی بچے کی کیوٹ سی حرکتوں پر مسکرایا جاتا ہے۔

وہ منسوب ہو چکے تھے۔ زندگی کی یہ صبح ایسی تو نہیں ہونی چاہیے تھی جیسی ہر روز ہوتی ہے...... بالکل بھی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ کچھ نیا، تھوڑا سا، ذرا سا۔ تو وہ اسے ساتھ لے آیا۔ جھیل کی نم ہوا، صبح کی سپیدی ......تاحدِ نگاہ شفاف پانی اور جہاں پانی اور آسمان ایک کنارہ بن گئے تھے۔ وہاں پیلاہٹ میں بدلتی ہوئی...... اس سے بڑھ کر اور کوئی خوب صورت نظارہ......؟ ہر طرف خاموشی تھی...... سکوت تھا...... پرندوں کی آوازیں تھیں...... ہاں سورج پھر سے غروب ہونے کے لیے طلوع ہو رہا تھا۔ وہاں اِک نئی زندگی کی شروعات ہو رہی تھی۔ اس نے ترچھی نظروں سے حیدر کو دیکھا...... لبوں پر مسکراہٹ بے قابو ہوئی۔

وہ دونوں کہنیاں ریلنگ پر ٹکائے ذرا سا جھک کر وہ نظارہ دیکھ رہا تھا اور یوں دیکھ رہا تھا جیسے اکیلا ہو وہ وہاں اس نظارے کو دیکھنے والا پرندوں کی چہچہاہٹ بلند ہو رہی تھی......

"جھوٹ کیوں بولا تھا مجھ سے؟"

"ہاں......" وہ چونکا...... زاویۂ نگاہ بدلا۔

"کیا بھلا......؟"

"جھوٹ کیوں بولا تھا مجھ سے؟"

حیدر نے اب کی بار رخ بدلا اور کمر ریلنگ سے ٹکا کر دونوں بازو سینے پر باندھے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کس جھوٹ کی بات کر رہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان ابھی تک صرف ایک ہی جھوٹ تھا۔

اس نے مسکرا کر ہنیا کو دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے ریلنگ پکڑے سامنے دیکھ رہی تھی۔ اس کا رخ جھیل کی طرف تھا۔

"تب اگر تمہیں یہ بتا دیتا کہ میں آرمی سے ہی ہوں تو تمہیں میری بات جانبداری لگتی...... تم کبھی غیر جانبدار ہو کر نہ سوچتیں...... نہ سمجھتیں۔ میری دلیل کو بھی تم جانبدارانہ سمجھتیں سو جھوٹ ناگزیر تھا۔" اس نے کندھے اچکا کر کہا۔

"اب جیسے میں مان لوں گی ناں......" اس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"ہاں، اب تم مان لو گی کیونکہ کچھ باتیں جب وہ کہی جا رہی ہوں...... کچھ چیزیں جب وہ وقوع پزیر ہو رہی ہوں تب ٹھیک طرح سے سمجھ میں نہیں آتیں...... ان کو وقت دینا پڑتا ہے۔ جیسے کہ اب تم یہ سمجھ سکتی ہو کہ وہ لائبریری ہر ایک کے لیے کیوں نہیں ہے۔" چہرے کی مصنوعیت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکی تھی۔

وہ ہنس پڑی تھی۔

"ٹھیک کہا...... ایسا ہی ہے۔" اس نے اعتراف کیا۔

حیدر نے اسے چلنے کا اشارہ کیا ہنیا بازو سینے پر باندھے سر جھکائے اس کے ساتھ چلنے لگی تھی۔

"میرا خیال تھا کہ تم اس دن...... یہ جاننے کے بعد کہ میں ایک فوجی ہوں...... یقیناً مجھ پہ شاؤٹ کرتیں...... غصہ ہوتیں...... لیکن تمہارا ری ایکشن غیر متوقع تھا۔" وہ دونوں ہاتھ ٹراؤزر کی پاکٹ میں ڈالے چل رہا تھا۔

ہنیا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"ہاں...... غیر متوقع تھا...... وہ غیر متوقع دن کی ایک بے حد غیر متوقع بات تھی...... اس دن کے آغاز سے لے کر وہاں ہوٹل کی میز کے گرد رکھی کرسی پر بیٹھنے تک...... آپ کے آنے تک...... میں نے ایسا سوچا تک نہیں تھا...... گمان تک نہیں کیا تھا...... میں...... اس دن

وہاں انکار کرنے آئی تھی لیکن......" ہنیا نے آنکھیں بند کر کے سر جھٹکا۔ "یہ بات مجھے ساری عمر یاد رہے گی...... میں بھول ہی نہیں سکتی......اور جب، جب یہ بات مجھے یاد آیا کرے گی......تب تب ویسی ہی گرم لہر...... بالکل ویسی ہی گرم لہر میرے اندر اٹھا کرے گی جیسی کہ اس دن اس کارڈ پہ لکھے مکمل نام کو پڑھنے کے بعد اٹھی تھی...... میرے اندر سے یہ خوف کبھی نہیں جائے گا کہ میں کیا کر دینے لگی تھی۔" وہ ساتھ، ساتھ چل رہے تھے۔ وہ بول رہی تھی۔

وہ سن رہا تھا...... ایک مکمل منظر......

"اور تمہیں ایسا لگتا ہے کہ میں یہ ہونے دیتا......؟ میں تم کو یہ کرنے دیتا؟ میں تم کو بھلا یہ اجازت دیتا......" وہ بڑے مان سے کہہ رہا تھا۔ "کہ تم حیدر سے خود کو محروم کر دو......" اور وہ رک گئی...... ٹھہر گئی۔ اس کے ٹھہرنے پہ وہ بھی رک گیا تھا۔ ہنیا نے اس کی آنکھوں میں دیکھا...... براہ راست اور حیدر نے ایک نمی کی تہہ کو یک دم اس کی آنکھوں میں ابھرتے دیکھا۔

"تھینک یو......" پھر اس نے ہنیا کی بھرائی ہوئی آواز سنی۔ وہ جانتا تھا کہ شکریہ کس چیز کا تھا۔ کس بات کا تھا۔ کس بات کا اظہار تھا...... بے ساختہ وہ مسکرایا۔

"ویلکم مادام......" سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا جھک کر کہا گیا۔

"اس وقت ٹشو تو میسر نہیں ہے تو......" پھر سیدھا ہو کر کہتے ہوئے...... اس نے ہاتھ کا انگوٹھا اس کے چہرے کے پاس لے کر اشارے سے پوچھا۔

"اوہ پلیز......" بلش ہو کر کہتے ہوئے وہ یک دم دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔ اور اس سے بھی زیادہ جلدی سے اس نے خود ہی آنکھوں سے باہر آنے والی نمی کو صاف کیا تھا۔ حیدر نے واپس پاکٹ میں ہاتھ ڈال کر اب کہ مسکراہٹ ضبط کی مگر وہ پھر بھی چھلک پڑی...... اور وہ دونوں پھر سے ساتھ، ساتھ چلنے لگے تھے۔ وہاں صرف ان کے قدموں کے چاپ کی آواز تھی اور وقت کی ساعتوں پہ یہ آواز نقش ہو رہی تھی...... ثبت ہو رہی تھی...... وہ ان مٹ نقوش تھے جو کہ نقش ہو رہے تھے۔ ثبت ہو رہے تھے۔

تو وہ تھی ہنیا ذوالفقار جس کو کسی ایک فوجی پر مرمٹنا تھا۔ اور وہ تھا حیدر...... اس کا وہ ہی فوجی کہ جس پر اسے مرمٹنا تھا۔ زندگی مکمل تھی۔

☆☆☆

"تم نے اپنی مرضی سے فیصلہ کر لیا...... میں نے مان لیا مگر میں کچھ زیادہ خوش نہیں ہوں۔" وہ دونوں راولپنڈی کے ایک پوش رہائشی علاقے کی مین سڑک کے فٹ پاتھ پہ جاگنگ کر رہے تھے۔ شام کا وقت تھا دونوں ہی گھٹنوں تک آتی شارٹس اور ٹی شرٹ میں ملبوس تھے۔

"اوہ...... کم آن پاپا...... وہ میری پسند ہے۔" وہ بے اختیار جز بز ہوا تھا۔

"اسی لیے تو چپ ہوں ورنہ کرنل امام کی بیٹی......" کرنل صاحب کی سانس ذرا سی پھولی ہوئی تھی...... سو لفظوں کا ردھم خراب ہو جاتا تھا۔

"پاپا پلیز......" اب کی بار وہ رک گیا۔ "وہ سویلین ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اچھی بیوی ثابت نہیں ہو سکتی؟ اچھی بیوی کا مطلب کسی کرنل کی بیٹی ہی نہیں ہوتا پاپا......" وہ چڑ گیا تھا۔

"چڑتے کیوں ہو...... بات ہی تو کر رہا ہوں۔ اب اپنی رائے کا اظہار بھی نہ کروں۔" وہ ذرا سا آگے نکل گئے تھے...... اس کی آواز پہ رکے اور پلٹ کر اس تک آتے ہوئے بولے تھے۔

"مجھے بس اتنا خدشہ ہے کہ وہ آسانی سے تمہاری ڈسپلین لائف کو ایکسیپٹ نہیں کر پائے گی...... اور پھر جیسی تمہاری جاب ہے تو......؟"

اس کے منہ کے بگڑتے زاویے کو دیکھ کر کرنل صاحب نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"let's jog" اور پھر یہ کہتے ہوئے وہ آگے نکل گئے۔ وہ چند لمحے ان کی پشت دیکھتا رہا اور پھر تیزی سے ان کے برابر آیا تھا۔

"کیا کبھی آپ نے محبت کی ہے؟" ان کے برابر آ کر اس نے بے ترتیب لہجے میں پوچھا۔ آواز جاگنگ کی وجہ سے ہموار نہیں تھی۔

"مجھے تو جو کچھ ہے تمہاری ممی سے ہی ہے...... چلو تم اس کو محبت کہہ لو......"

"کبھی کر کے دیکھیں پاپا...... بلیو می اچھے ذائقے کی چیز ہے۔"

"تم گھر چلو، تمہاری ممی کو بتاتا ہوں کہ اس کا شیر جوان بیٹا مجھے کیسے، کیسے مشورے دے رہا ہے۔"

"ہاہاہا......" اس نے کھل کر قہقہہ لگایا۔

"وائے ناٹ شیور......" اس نے کندھے اچکائے۔ اور پھر وہ دونوں جاگنگ کرنے لگے تھے۔

☆☆☆

اس کے ہاتھ میں کمپاؤنڈ بو تھی اور وہ آرچری ڈپارٹمنٹ میں تھے۔ حیدر اسے وزیٹر کے طور پر ساتھ لے کر آیا تھا۔ عموماً وزیٹرز کلب کے اس حصے میں سب کو جانا allowed نہیں تھا مگر وہ حیدر کی منگیتر تھی...... بے حد اشتیاق سے bow کو پکڑ کر نشانہ لگانے کی کوشش شروع کی گئی تھی مگر نا کام ٹھہری تھی اور اب وہ چڑ رہی تھی۔

"مجھ سے نہیں ہوتا۔" وہ اکتائی تھی۔

"اوہ کم آن ہنیا...... تمہیں کوشش کرنی چاہیے۔" حیدر حیران ہوا۔

"نہیں ہوتی ناں......" اس نے بیزاری سے کہا۔

حیدر نے کندھے اچکائے...... تیر کمان میں سیٹ کیا ایک آواز آئی اور ٹھک...... arrow (تیر) سب سے اندر والے سرخ دائرے میں موجود نقطے کے بالکل قریب جا کر پیوست ہوا...... اتنے میں پھر ایک آواز آئی اور ٹھک...... اب کہ ایرو عین نشانے پر جا لگا۔ وہ اس سے چند قدم پیچھے کھڑی دیکھ رہی تھی۔ بے ساختہ اس نے تالی بجانے کو ہاتھ اٹھائے۔

"واؤ......" وہ اس کے برابر آئی۔ "تم یہاں مجھے متاثر کرنے لائے ہو؟" حیدر کو چھیڑا۔

"واٹ......؟" وہ اچنبھے سے مڑا۔

"اکثر مردوں کی سائیکی ہوتی ہے ناں کہ وہ اپنی محبوبہ، گرل فرینڈ کو متاثر کرنے کے لیے......"

"اوہ پلیز اسٹاپ اٹ......" اس نے بات کاٹی۔

"بھلا میں اس سے...... اس سے تمہیں متاثر کروں گا۔" bow کو ہاتھ میں پکڑ کر نشانے کے لیے سیٹ کرتے ہوئے وہ بے حد شاکڈ ہو کر بولا۔

"یہ بچوں کا کھیل ہے میڈم......" اس نے bow واپس رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"تو کیپٹن......! پھر آپ یہاں بڑوں والی، کون سی گیم کھیلنے آتے ہیں؟" اس کے پاس آ کر دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بھوؤں کے درمیان ایک بل ڈال کر بے حد مشکوک لہجے میں پوچھا گیا...... خفگی بھی تھی مگر مصنوعی، حیدر نے اس کی خفا آنکھوں میں دیکھا...... پھر نظریں ہٹائیں...... بے ساختہ پھیلنے والی مسکراہٹ کو روکنا چاہا...... اور پھر وہ دونوں ہنس پڑے۔

"آؤ چلو دکھاؤں تمہیں بڑوں والی گیم......" یہ کہتے ہوئے وہ وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ ہنیا نے پیروی کی۔ وہ دونوں چلتے ہوئے باتیں کرتے ہوئے شوٹنگ ایریا کی طرف آئے تھے۔

"ایکسکیوز می!"

"سوری سر، میڈم اس طرف نہیں جا سکتیں۔" وہ ایکسکیوز می کہہ رہے تھے اور پھر انہوں نے بے حد مؤدب انداز میں باوردی ملازم کو کہتے سنا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میڈم اس طرف نہیں جا سکتی مگر......

"یار دیکھو...... یہ جو میڈم ہیں ناں انہیں شدید قسم کا شک ہے کہ میں یہاں کوئی بڑوں والی گیم بھی کھیلنے آتا ہوں...... تو میں انہیں دکھانے جا رہا ہوں کہ میں کون سی گیم کھیلنے آتا ہوں...... نئی، نئی منگنی ہوئی ہے یار سمجھا کرو...... مائنڈ کر گئی تو......" وہ ملازم کے گلے میں بازو ڈال کر اسے سائڈ پہ لے جا کر بولا تھا۔

"سر! لیکن rule تو rule ہے ناں......" حیدر نے فوراً اس کے گلے سے بازو ہٹایا۔ ایک ابرو اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر اپنا آفیشل کارڈ نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے کیا۔

"کیپٹن حیدر علی...... فرام اسپیشل سروسز گروپ......" اس کی آواز یک دم کرخت اور سرد ہو گئی۔

ملازم نے بے ساختہ ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''اوکے، اوکے سر......'' وہ فق رنگت کے ساتھ بولا۔ حیدر نے اس کا شانہ تھپتھپایا اور واپس مڑ آیا۔

''مادام......'' اور پھر جھک کر ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر دوسرے ہاتھ سے ہنیا کو آگے چلنے کا اشارہ کیا۔

ہنیا نے مسکرا کر اسے دیکھا اور پھر آگے بڑھ گئی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ skeet shooting کی طرف جا رہے تھے۔ وہ چند ہی قدم چلی تھی کہ اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی تھی۔

''میں آگے نہیں جاؤں گی......'' یک دم وہ سراسیمہ ہو کر بولی تھی۔

''کیا ہوا......؟'' وہ حیران ہوا۔

''وہ......وہ......رائفل......''

''ہاں رائفل......تو؟'' اس کا ڈرنا حیدر کی سمجھ سے باہر تھا۔

ہنیا نے تھوک نگلا، دیدے پھاڑے، سر گھمایا...... نظریں دوڑائیں وہ میدان منہ کھول کر بتا رہا تھا کہ وہ کس مقصد کے لیے ہے۔

بے اختیار اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری تھی۔ یہ کافی...... بڑوں والا کام تھا۔

shooting guns bullets یہ سب آج تک اس نے فلمز میں ہی دیکھا تھا۔ اسے خوفزدہ کر دینے کے لیے فائرنگ کی آواز ہی کافی تھی۔ کجا کہ یہاں سامنے عین اس کی آنکھوں کے سامنے شوٹنگ ہونے والی تھی۔

''میں آگے نہیں جاؤں گی......'' وہ ایک دفعہ پھر سے گھبرا کر بولی۔

''کیوں؟'' وہ حیرانی سے بولا۔

اب وہ اسے کیا بتاتی کیوں......؟

''آپ جائیں...... میں یہاں سے ہی دیکھوں گی......''

وہ گہری نظروں سے اس کی بدلتی رنگت کو دیکھتا رہا۔

''شیور......؟''

''یس شیور......''

وہ آگے کو بڑھا...... پھر یک دم رک گیا...... انہی قدموں پر پلٹا اور پلٹ کر اس تک آیا تھا۔

''ویٹ آ منٹ...... تمہیں شوٹنگ سے ڈر لگ رہا ہے؟'' ہنیا نے نظریں چرائیں۔

''او رئیلی ہنیا......؟ تمہیں شوٹنگ سے ڈر لگ رہا ہے؟ تمہیں پتا ہے کہ تم کس سے منسوب ہو؟'' اسے جھٹکا لگا تھا۔ وہ کم از کم اس ایک بات کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

''میرے بیڈ کی سائڈ ٹیبل کی دراز میں ہر وقت ایک 9mm کا پستول پڑا رہتا ہے......وہ بھی لوڈڈ...... اور تمہیں شوٹنگ سے ڈر لگتا ہے؟'' یہ اس کے لیے اچھی فیلنگز نہیں تھیں کہ اس کی منگیتر اس قدر ڈرپوک تھی۔

''اب......'' وہ جھجکی۔ ''اب لگتا ہے ڈر تو آخر کیا کروں......؟'' وہ زچ ہوئی۔

''اس میں اتنا ڈرنے والی کیا بات ہے یار......؟ اسکیٹ شوٹنگ ہے یار...... آؤ چلو......'' پھر اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''حیدر پلیز......'' بے ساختہ وہ دو قدم پیچھے ہٹی تھی اور حیدر اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

''اوکے فائن......'' یہ کہہ کر وہ کچھ تیزی سے آگے بڑھا تھا اس نے رائفل اٹھائی، لوڈ کی ائیر پلگ کانوں میں چڑھائے اور زور سے بولا۔

''چلاؤ......'' ملازم نے skeet فائر کی تھی۔ اور ایک زوردار ٹھاہ کی آواز آئی۔ skeet (وہ گول چیز جو نشانے کے طور پر ہوا میں اڑانے میں) کے پرخچے اڑ گئے تھے۔

ہنیا بری طرح سے ڈری اس نے آنکھیں بند کر کے کانوں پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک اور اسکیٹ فائر ہوئی...... اور پھر سے زوردار ٹھاہ...... ہنیا کے جسم کو اس ٹھاہ پہ جھٹکا لگ جاتا، وہ نہیں جانتی تھی کہ اس نے کتنی بار فائر ہونے کی آواز سنی تھی۔ اور کتنی بار جسم نے جھٹکا کھایا تھا۔ وہ بس کانوں پر ہاتھ رکھے آنکھیں میچے کھڑی رہی...... اور لرزتی رہی۔ یہ اب ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا اور قریب تھا کہ وہ رو پڑتی...... لیکن اس نے وہاں سے ہٹ جانا زیادہ مناسب سمجھا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا کوئی نہ کوئی نشانہ چوک

جائے گا اور سیدھا آ کر اسی کو ہٹ کرے گا۔ حالانکہ اسکیٹ تو سامنے اڑتی تھی جبکہ وہ سائڈ پر کھڑی تھی اور وہاں alerts لگے تھے کہ شوٹنگ ایریا میں سامنے کوئی نہیں آسکتا تھا۔ وہ مڑی اور تقریباً بھاگتی ہوئی وہاں سے پلٹی تھی۔ حیدر کو ملازم نے اشارے سے بتایا تھا۔

حیدر نے مڑ کر دیکھا اور اس کی نظروں نے اس کو وہاں سے جاتے دیکھا۔ حد ہی ہوگئی تھی بلکہ ناگوار بھی گزرا تھا۔ ائیر پلگ اتار کر وہ کچھ بیزاری سے اس کے پیچھے گیا تھا۔ جو آگے چلتی جا رہی تھی بالآخر وہ اسے پارکنگ میں ملی۔ ایک دفعہ پھر سے وہ حیران ہوا اور اسے اب غصہ آیا تھا۔

گاڑی سے ٹیک لگائے...... دونوں ہاتھ سینے پر باندھے سرخ چہرے کے ساتھ کھڑی تھی۔ رونا بس آیا ہی چاہتا تھا۔ حیدر نے کچھ فاصلے سے رک کر اسے دیکھا۔ اب کی بار غصہ آیا نہ وہ خفا ہوا...... بس ہنسی آگئی تھی...... کیسی ڈرپوک لڑکی ملی تھی اسے۔ جینز کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے، سر جھکائے مسکراہٹ دباتے ہوئے وہ گاڑی تک آیا تھا۔ ہنیا کا منہ کچھ اور پھول گیا...... کچھ کہے بنا حیدر نے لاک کھولا...... ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔

ہنیا نے طیش سے دروازہ کھولا اور دھپ سے فرنٹ سیٹ پر آبیٹھی......

''چلیں......'' اسٹیرنگ کو تھامے ہوئے مقدور بھر احتیاط سے پوچھا گیا، سر کو ذرا سا آگے بڑھا کر کیونکہ وہ رخ موڑے ہوئے تھی۔

''شرم تو نہیں آئی آپ کو......؟'' یک دم رخ اُدھر موڑا گیا اور فائر کی طرح حملہ داغا گیا۔

وہ بے ساختہ پیچھے کو ہوا۔

''کس بات پر......؟'' کندھے اچکا کر پوچھا گیا...... حیرانی شدید تھی۔

''میں وہاں اکیلی کھڑی embarrass ہوتی رہی، ڈرتی رہی اور آپ دھڑا دھڑ فائر کرتے رہے......''

''تم پہ تو نہیں کیا تھا......؟'' دنیا کا سب سے معصوم ترین انسان اس وقت اگر کوئی تھا تو وہ حیدر ہی تھا۔

''حیدر پلیز......'' آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اور حیدر نے شکر کیا کہ وہ اسے پاسبان شوٹنگ رینج نہیں لے کر گیا تھا۔

''یہ بھی بڑوں والی گیم سمجھیں!'' شرارت سے کہتے ہوئے اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔

ہنیا کو اور زیادہ غصہ آیا۔ اس کے ساتھ ایک مسئلہ تھا...... وہ ہی لڑکیوں والا بے حد عام اور کامن مسئلہ...... احساسات چاہے کچھ بھی ہوں...... خوشی، غصہ، بے بسی، درد، جھنجلاہٹ، بیزاری، افسردگی، مایوسی غرض کہ کچھ بھی ہو...... رونا سب سے پہلے آتا ہے...... اور رہ گیا غم، دکھ، درد، وغیرہ تو یہ احساسات تو خیر بھی کو رلاتے ہیں...... مگر بات یہ کہ لڑکیاں ان احساسات کے علاوہ بھی رونا جانتی ہیں جیسے کہ وہ...... گاڑی کلب کے گیٹ سے باہر نکلی اور مین سڑک پر آئی۔ اور ایک زوردار......

''شوں......'' حیدر کا پاؤں بریک پہ پڑتے، پڑتے رکا...... اسے محسوس ہوا کہ یہ شوں کی آواز ایک وہم تھی، نظر انداز کر دیا تھا مگر چند ہی سیکنڈز کے بعد اک درد بھری ہچکی......

بریک پہ پاؤں اب بھی وہ نہیں رکھ سکا تھا کیونکہ وہ مرکزی سڑک پر تھے اور یک دم بریک لگایا جا نہیں سکتا تھا۔ اس نے گاڑی سائڈ پر کرتے ہوئے روکی تھی۔

''تم رو رہی ہو؟'' شاک سے پوچھا گیا۔

جواباً ہنیا نے رخ کچھ اور دروازے کی جانب موڑا اور شوں، شوں کی آواز میں شدت آئی تھی۔

چند لمحے وہ بدترین حیرت کا شکار ہو کر اسٹیرنگ کو دونوں ہاتھوں سے تھامے...... بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔

''یہ بھی کوئی رونے والی بات تھی؟''

ماتھے پہ بل بے ساختہ نمودار ہوئے...... ابھی تھوڑی دیر پہلے والی شگفتگی رخصت ہو چکی تھی...... اس نے ہاتھ بڑھا کر پیچھے سے ٹشو کا ڈبا اٹھایا اور ڈیش بورڈ پر اس کے سامنے رکھ دیا...... کچھ بھی کہے بنا...... کوئی بلاوجہ رونے پہ مصر ہو تو کیا، کیا جا سکتا ہے۔

حیدر نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے مین روڈ پر دوبارہ لے آیا۔ گاڑی میں محض اس کے سسکیاں بھرنے

کی آواز تھی۔ اور وہ بے حد خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

''ہنیا پلیز...... اب بس بھی کرو......'' چند لمحوں بعد کچھ بیزاری سے کہا گیا۔

ہنیا کے دل پر چوٹ لگی...... یعنی کہ پروا ہی نہیں رونا کچھ اور امڈ کر آیا۔

''آئی سوئیر...... مجھے نہیں پتا تھا کہ تم خوب صورت ہونے کے ساتھ، ساتھ بزدل اور ڈرپوک بھی ہو......'' سنجیدگی سے کہا گیا جملہ...... ہنیا کے تاثرات یک دم فریز ہوئے...... آنسو جہاں تھے وہیں تھم گئے تھے۔ اس نے حیرت سے مڑ کر حیدر کو دیکھا...... وہ سنجیدگی سے سامنے دیکھتے ہوئے ڈرائیو کر رہا تھا...... اس کے یوں مڑ کر دیکھنے پر حیدر نے ذرا کی ذرا اسے دیکھا...... پھر نگاہیں ونڈ اسکرین پر گاڑیں۔ ہنیا نے غصے سے ہاتھ میں پکڑا ٹشو پیپروں میں گرے سیلے ہی سات آٹھ ٹشوز کے اوپر گرایا...... حیدر کا بالکل بھی دھیان نہیں تھا اس طرف......

''میں کوئی کمانڈو نہیں ہوں، نہ ہی فوج میں کیپٹن......'' شاید تواں ٹشو نکال کر آنکھیں صاف کی گئیں۔ ''سویلین ہوں بھئی...... اور پر سے لڑکی بھی......''

''میں نے لڑکیوں کو بھی گن چلاتے ہوئے دیکھا ہے......'' وہ بولا

''شوٹنگ کرتے دیکھا ہے...... یہ اتنی بڑی بات تو نہیں جو تم بچوں کی طرح بی ہیو کر رہی ہو......'' وہ سیریس تھا...... اس کا چہرہ یہی بتا رہا تھا اور اس کی یہ سنجیدگی ہنیا کو تپا رہی تھی۔

''اگر اتنی ہی بچی لگتی ہوں ناں...... تو کر لیتے کسی شوٹر لیڈی سے انگیجمنٹ......'' رندھی ہوئی آواز میں کہا گیا۔

''اوہ...... گاڈ......'' حیدر نے بے ساختہ جھرجھری لی تھی...... یہ کیا تھا اب بات کدھر سے کدھر جا رہی تھی۔

''میرا یہ مطلب تو نہیں تھا ہنیا......'' کچھ بیزار سا انداز......

''تو اور کیا مطلب تھا......؟'' رونا چاہے جتنا بھی آ رہا ہو پر وہ جواب ضرور دے رہی تھی۔ ''میں وہاں کھڑی ڈر رہی تھی...... میری جان نکل رہی تھی...... اتنا نہیں ہوا کہ شوٹنگ چھوڑ کر میرا حال ہی پوچھ لیتے بس وہاں کھڑے دھڑ ادھڑ......'' اور پھر اس کی آواز بھرا گئی جملہ چھوڑ کر ہچکیاں بھرتی رہی......

''دھڑ دھڑ ا ففف...... فا...... فائر کرتے رہے۔'' الفاظ یوں منہ سے ادا ہو رہے تھے جیسے پانی کے تیز بہاؤ سے بہ مشکل سروائیو کر کے ابھر رہے ہوں......

حیدر کو تو یہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔

''ذرا سا بھی احساس نہ کیا......'' وہ جملے داغ رہی تھی اور حیدر سیٹ کی بیک پر کہنی ٹکائے الٹے ہاتھ سے سر کو تھامے سیدھے ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالے اس کو سن رہا تھا۔

وہ روتی جا رہی تھی اور ساتھ، ساتھ بولتی جا رہی تھی۔ اور ایک تیسرا کام بھی ہو رہا تھا اسی رفتار سے کہ جس رفتار سے پہلے دو کام سرانجام دیے جا رہے تھے۔

جی ہاں...... دھڑ دھڑ ا ٹشو گرانے کا، حیدر اس کی صلاحیتوں کا معترف ہو چکا تھا...... گاڑی سڑکوں پر رینگتی ہوئی ہنیا کے گھر کی جانب گامزن تھی اور ہنیا روتی جاتی تھی...... بولتی جاتی تھی اور ٹشو گراتی جاتی تھی...... مگر حیدر ایک ہاتھ سر پر رکھے...... ایک ہاتھ سے ڈرائیو کرتے ہوئے اسے بس سن رہا تھا۔ نظریں سامنے جمی تھیں۔

''اب کہہ دیں کہ میرے رونے سے...... میری باتوں سے آپ کے سر میں درد ہو رہا ہے۔''

اس جملے پر یک دم نظریں سامنے سے ہٹ کر اس تک گئیں...... اس نے ایک گہری سانس بھری، ہاتھ سر سے ہٹا لیا اور اب وہ دونوں ہاتھوں سے اسٹیئرنگ تھامے تھا۔

''اب پچھتا رہے ہوں گے ناں کہ کس سے شا......'' وہ گڑبڑائی......

''وہ منگنی کر لی......''

''شٹ اپ ہنیا......'' اور بس اسی ایک بات کی ہی تو کسر رہ گئی تھی۔

''اسٹاپ اٹ ناؤ!'' اس نے اتنے غصے سے کہا تھا کہ وہ دہل کر رہ گئی تھی اور اس نے شاکڈ ہو کر حیدر کو دیکھا...... یہ کیا ہونے جا رہا تھا...... کیا......؟ آنسو یکا یک تھم گئے تھے۔

(باقی آئندہ)

# چند روپوں کی خاطر

ہاجرہ ریحان

"مرنے کا شوق ہے بہت...... تو مرو پھر......"

یہ کہہ کر اس نے پستول میرے ماتھے سے لگا دی اس کی پستول کہیں پہلے بھی آگ اگل کر آچکی تھی کہ پستول کی نال حد سے زیادہ گرم ہو رہی تھی...... گو کہ میں موت سے بس چند قدم پر تھی پھر بھی مجھ سے وہ گرمی برداشت نہیں ہو سکی اور میں نے اپنا ماتھا نالی سے ذرا سا علیحدہ کر لیا...... پستول اس حد تک قریب تھی کہ مجھے دستے پر لکھی سنہرے حروف میں وہ عبارت نظر آنے لگی....





بے اختیار میں نے دل ہی دل میں اسے دُہرایا۔

’’Python 351‘‘ اور پھر جلدی سے توبہ توبہ کی۔ ’’میں موت کے اتنے قریب ہو کر بھی کچھ نہ کچھ فضول ہی پڑھ رہی ہوں..... کلمہ پڑھو.....‘‘ میں نے دل کو ہدایت دی..... میں نے ابھی کلمہ شروع ہی کیا تھا کہ پستو والے نے لبلبی دبا دی..... ٹک..... ایک آواز آئی اور بس..... پستول والا خود بھی گڑبڑا گیا..... انگریزی فلمیں دیکھ، دیکھ کر اتنا تو اندازہ ہو ہی گیا تھا مجھے... کہ پستول جام ہو چکی تھی..... گولی اٹک گئی تھی..... پھر بھی پستول کا خوف مجھ پر طاری ہو چکا تھا اور ٹانگیں کپکپا رہی تھیں..... اس کے ساتھی نے اس کے کان میں کچھ کہا..... پستول واپس اس کی شرٹ کے اندر کہیں گم ہو گئی۔

’’کیا یاد کرو گی جاؤ معاف کیا.....‘‘ یہ کہہ کر وہ دونوں جس بائیک سے آ کر تیزی سے میرے سامنے کھڑے ہوئے تھے، اسی تیزی سے نکل گئے..... اب میرے اردگرد کافی بھیڑ جمع ہو گئی تھی، یہ سارے لوگ اس سے پہلے بس تماشا دیکھ رہے تھے۔ کسی اخبار والے کو قصہ سنانے کے لیے۔

’’صرف چند روپوں کی خاطر اپنی جان دینے چلی تھیں۔‘‘ میرے پیچھے کسی نے کہا۔ میں کپکپاتی، ڈگمگاتی آ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

’’یہ کیا بے وقوفی کی تھی میں نے؟‘‘ کئی دفعہ خود سے سوال کر چکی تھی اور آج تو جیسے میں نہ ہی دنیا کو سمجھ پا رہی تھی نہ ہی اپنے اردگرد لوگوں کی زبان ہی مجھے سمجھ آ رہی تھی۔

’’میں بہادر نہیں ہوں، ایک ڈرپوک انسان ہوں۔‘‘ مگر آج بات بہادری کی نہیں تھی..... آج تو بس میں وقت سے آزاد ہو کر ماضی، حال، مستقبل کو اپنے اردگرد تیرتے ہوئے محسوس کر رہی تھی..... وقت اب کچھ بھی نہیں..... صرف ایک لفظ..... لفظ جو مجھ سے آج کھو گئے..... میں الفاظ ڈھونڈتی رہی..... یہ جو ابھی ہوا..... اور جو میں آج دیکھ کر، سن کر بلکہ سہہ کر آ رہی ہوں..... ان کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں؟ کوئی پوچھے گا تو کیا بتاؤں.....؟

ائرپورٹ پر کھڑے، کھڑے مجھے شدید غصہ آنے لگا تھا۔

’’تو میں بس مُہرے کی طرح استعمال کی جانے والی شے ہوں۔‘‘ میں نے نفرت سے بھرے جذبات کے ساتھ سوچا..... کب نہ کب اس کی لاش ملی کب نہ کب پہچان ہوئی اور کب نہ کب تمام معاملات طے کر کے مجھے حکم دے دیا گیا کہ ائرپورٹ سے اس کی میت کو حاصل کر کے گھر لے آؤں..... کیونکہ میرے بڑے بھائی کے دوست سول ایوی ایشن ٹریفک کنٹرولر ہیں..... اور ائرپورٹ سے لانے اور گھر تک میت پہنچانے میں بھی جو خرچہ تھا اس تک کو بچانا مقصود تھا..... مجھے واقعی کوئی مشکل نہیں ہوئی..... بلکہ بہت زیادہ ہی وی آئی پی سروس دی گئی..... شمیم بھائی، بڑے بھیا کے دوست اس وقت بڑے بھیا جیسا ہی کچھ سلوک کر رہے تھے، وہ خود میرے ساتھ کھڑے تھے..... میرے سر پر ہاتھ رکھے کب سے دلاسے دے رہے تھے۔ مگر ان کو کیسے پتا چلا کہ میں دکھی ہوں..... میری آنکھوں سے تو ایک آنسو تک نہیں نکلا..... شاید وہ مجھے دلاسوں کے درمیان سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس وقت مجھے دکھ سے نڈھال نظر آنا چاہیے۔ یہی بات ہے ناں..... ہم صرف دنیا کو دکھانے کے لیے چہرے پر غم سجا لیتے ہیں..... مگر میں اس وقت دکھی سے زیادہ بدحواس تھی..... کیونکہ مجھے اچانک جن باتوں کا پتا چلا تھا اس تمام معلومات کو کسی طرح کوئی شکل دے کر خود کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

جہاز جیسے ہی آ کر رکا..... اس کے ساتھ پینل جوڑ دیا گیا..... میں نے دل میں سوچا اب تمام مسافروں نے اپنے موبائل فون آن کر لیے ہوں گے، وہ اپنے گھر والوں کو، دوستوں کو فون کر کے بتا رہے ہوں گے کہ ان کا جہاز بخیر و خوبی اتر چکا ہے، تمام ہی مسافر اب کھڑے ہو کر ایک دوسرے کا جائزہ لے رہے

ہوں گے......تو یہ تھے ہم سفر...... کیا ان مسافروں کو پتا ہوگا کہ وہ کسی کی میت بھی ہم سفر کے طور پر اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں...... میں نے توبہ، توبہ کی...... کیا ہدایات دی تھیں امی نے...... ہاں کلمہ پڑھتی رہوں......ہم رن وے پر ایک ایمبولینس کے ساتھ کھڑے تھے......ایمبولینس کو اشارے سے جہاز کے قریب جانے کی اجازت مل گئی...... میت کو ایمبولینس میں رکھوادیا گیا اور پھر مجھے بھی اس پر سوار کرادیا گیا ......شمیم بھائی نے آخری بار کچھ سرسری سے جذباتی کلمات کہے اور میں روانہ ہوگئی...... میں نے اس کی طرف (میت کی طرف) ایک دفعہ بھی نہیں دیکھا...... اور مجھے یقین تھا کہ مرنے کے بعد وہ بھی مجھے نہیں دیکھ پارہا ہوگا......ویسے بھی اس کو ایک لکڑی کے تابوت میں بند کر کے لایا گیا تھا...... پہلی دفعہ میری سسکی نکلی......ایک خواہش جاگی۔

”اے کاش میں آخری بار دیکھ سکوں......اس کو گلے لگا سکوں۔“ مگر پھر میرے جذبات گڈمڈ ہوگئے اس نے میری خاطر تو جان نہیں دی...... کیا ضرورت تھی شادی کے چند مہینوں بعد ہی اتنے بڑے پروجیکٹ میں ہاتھ ڈالنے کی...... وہ تین چینیوں کے ساتھ ان کی مدد کرنے شہداد پور گیا تھا۔ سوئی گیس کی کمپنی میں کام کرتے اسے چند ہی سال ہوئے تھے وہ جونیئر انجینئر تھا......مگر شہداد پور جانے کے لیے کوئی سینئر تیار نہیں تھا لہٰذا اس کو بھیجا گیا...... اس نے جانے سے پہلے صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ چند ہی ہفتوں میں لوٹ آئے گا...... اور اگر کامیابی ہوئی تو اس کے گریڈ کے بڑھ جانے کا کافی امکان ہے۔ میں اچھی طرح سے جانتی تھی کہ وہ کیا چاہتا ہے......بس اتنا کہ اسے اپنے نام کے ساتھ جونیئر انجینئر کا لفظ اچھا نہیں لگتا تھا...... یہ لفظ مٹانے کے خاطر وہ خود مٹ گیا...... یہ لفظ تو بہت ہی ظالم ہیں۔

میں چند دن سسرال میں گزار کر میکے آگئی...... جہاں رہتے ہوئے مجھے پتا چلا کہ اس کو ان تین چینیوں سمیت اغوا کرلیا گیا ہے۔ سسرال والوں نے ہدایات

دیں کہ ابھی سسرال نہ آؤں، ان لوگوں کو حکومت کی طرف سے ہدایات تھیں کہ اس معاملے پر کسی سے بات نہ کریں اور نہ ہی اخبار والوں کو بتائیں...... میں نے ایک دو دفعہ کوشش کی کہ سسرال چلی جاؤں...... مگر ہر بار مجھے سختی سے ہدایات دے دی جاتیں کہ مجھے بالکل بھی سامنے نہیں آنا...... ان کے گھر پر بہت سے لوگوں کی نظر ہے، وہ کون لوگ تھے، ان کا کیا مقصد تھا، مجھے خود نہیں پتا چل رہا تھا...... اور نہ ہی میری عقل ہی اتنی تھی...... میرے میکے میں بھی سوائے امی کے کون تھا...... سب بھائی، بہن باہر رہتے تھے اور ملک کے روز بروز بگڑتے حالات سے واقف تھے اور ایسے میں جب ہمیں ہدایات دی گئیں کہ سسرال نہ جاؤں تو سب نے ضد پکڑ لی......

''وہ صحیح کہہ رہے ہیں، وہاں جانا ٹھیک نہیں...... بس چپ کر کے امی کے پاس رہو اور دعا کرتی رہو......''

کیا معلوم تھا کہ اس ایک بات کے پیچھے کیا چال چلی جارہی تھی...... تقریباً تین ہفتے تک اسی کشمکش میں گزار لیے اور اچانک ساس کا فون آگیا کہ وہ مل گیا ہے...... مار کر پانی میں بہادیا گیا تھا...... جس کے بعد اس کی شناخت کے لیے ساس گئی تھیں...... اور اب تمام کاغذی کارروائی کے بعد ہمارے حوالے کیا جارہا ہے۔

''تم جا کر لے آؤ۔'' میں بدحواس سی ائرپورٹ پہنچ گئی...... جہاں پر اس کا دوست بھی موجود تھا...... اور تب مجھے پتا چلا کہ میں کیسی ڈرپوک انسان ہوں۔

''بھابی آپ نے بہت بڑی غلطی کی، آپ کو سسرال میں ہی رہنا چاہیے تھا...... آپ کو پتا ہے انجینئرز کی لائف انشورنس کتنی زیادہ ہوتی ہے...... پھر جو حکومت نے دیا اور ساتھ میں چینی کمپنی نے بھی دیا ہے...... ان لوگوں نے تو سرے سے اس کو کنوارا ہی ظاہر کیا...... آپ کہاں غائب ہوگئی تھیں؟'' وہ کہتا چلا جارہا تھا اور میں کچھ سمجھ نہیں پارہی تھی...... آخر کار میرے منہ سے نکلا......

''اصل میں امی کی طبیعت بہت خراب ہے اور میں یہ سب نمٹا کر جلد از جلد گھر جانا چاہتی ہوں۔'' اس کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''تو کیا...... تو کیا آپ تدفین میں نہیں ہوں گی؟''

''یہ کتنا انوکھا سوال ہے۔'' میں نے دل میں سوچا...... ''جب وہ کنوارا ہی ہے تو میں کس حیثیت سے اس کی تدفین میں شامل ہوجاؤں؟''

ائرپورٹ سے باہر نکل کر میں ایمبولینس سے اتر گئی...... اس کا دوست جو آگے بیٹھا ہوا تھا...... اتر کے میرے قریب آگیا۔

''میں کیا کہوں...... شاید غلطی میری بھی ہے ان سب نے یہی کہا تھا کہ اگر اس کو شادی شدہ ظاہر کیا گیا تو پھر آپ کو تمام جگہ آگے کرنا پڑتا اور وہ لوگ آپ کو ان سب تکلیفوں سے بچانے کی خاطر یہ کر رہے ہیں...... میں تو اس وقت بہت زیادہ خود کو بے وقوف سمجھ رہا ہوں، یہ میں نے کیا، کیا...... کس چالاکی سے ان لوگوں نے سب کچھ ہتھیالیا ہے کہ ہم تمام دوست ان کا آلۂ کار بنے رہے، ہمیں آپ کو تلاش کرنا چاہیے تھا......'' وہ روہانسا ہورہا تھا۔

میں اس کو دلاسا دے کر پارکنگ کی طرف لوٹ گئی...... بات پیسوں کی نہیں تھی، ہمارا خاندان اچھا خاصا تھا اور میں خود بھی پڑھی لکھی ہوں بات اگر پیسوں کی نہیں تھی تو پھر کیا تھی؟ میں پھر لفظ ڈھونڈ رہی تھی...... مجھے گھر واپس جانے کی جلدی تھی...... راستے میں یاد آیا کہ امی کی چند دوائیاں لینی ہیں اور بینک جانا پڑے گا...... بس وہیں اے ٹی ایم سے نکلتے ہوئے یہ دونوں یعنی پستول والا اور اس کا ساتھی میرے آگے آکر کھڑے ہوگئے...... انہوں نے پیسے مانگے تھے...... پرس چھیننا چاہا تھا...... میں نے صاف انکار کردیا...... بات پیسوں کی نہیں تھی۔

گاڑی میں بیٹھ کر تمام شیشے اندر سے لاک کر کے میں حواس بحال کرنے کی خاطر سر اسٹیئرنگ پر رکھ کر بیٹھ گئی...... میرے کانوں میں بار، بار ایک ہی جملہ گونج رہا تھا۔

''چند روپوں کی خاطر......''

☆☆☆

"ٹرین" انتظار... ہجر و وصل کا استعارہ......
ملن وجدائی کا اشارہ... خوابوں کی رہ گزر..... من کے
اندر کا سفر...... پگڈنڈیوں، پلوں، پہاڑوں، پتھروں کو
اپنے مضبوط پہیوں سے روندتی، تیز ہواؤں سے..
سرگوشیاں کرتی...... سبزہ زار، ہریالی، کھیت کھلیان،
باغات سے گزرتی تا حدِ نظر پھیلے نیلے آسمان کی وسعتوں
سے باتیں کرتی......
"ٹرین......!" اس کے لیے ایک جادوئی کشش،

# گلاب رتوں کا ہم سفر

ثنا عمران



ایک انجانا دلفریب احساس، ایک انوکھا تجربہ، ایک سہانا سفر ہوتی......! وہ کھڑکی میں چہرہ ٹکائے، باہر کے دلکش نظاروں کو من کی دنیا میں اتارتی...... لیکن تشنگی پھر بھی... برقرار رہتی۔

ہر سال...... ننھیال کی جانب کا سفر اس کے احساسات و جذبات کو نئی دلکشی سے، نئی روشنی سے، نئے احساسات سے دوچار کراتا...... وہ ٹرین کی کوک، چھکا چھک...... طلوع ہوتے سورج کے حسین نظارے، مختلف اسٹیشن پر ہجوم کے چہروں پر لکھی ملن و جدائی، خوشی و غم کی داستانیں پڑھتی...... زندگی کے مختلف رنگوں کو کھوجتی......

ایسا ہی ایک ٹرین کا سفر ''کیف السحر......'' کی زندگی میں ایک خوشگوار موڑ لایا تھا ہر سال کی طرح نانا، نانی کے گھر کچھ دنوں کے قیام کے لیے ٹرین کے سفر کی شیدائی کیف السحر کو ایک منظر نے منجمد کر دیا...... ٹرین کسی خرابی کے باعث ایک سبزہ زار وادی میں رکی تھی...... چاروں طرف ہریالی اور کچھ دور جھیل...... وہ کھڑکی میں سے اس منظر کی خوب صورتی کو آنکھوں میں اتار رہی تھی۔ جب نظر ایک طرف اٹھی تو اس منظر کے سحر نے اسے گرفت میں لے لیا۔

سنہری سی شام تھی...... افق پر سورج ڈوب رہا تھا۔ اس کی نارنجی شعاعیں جھیل کنارے، پتھر کے ٹیلے پر بیٹھے اس نوجوان پر پڑ رہی تھیں...... جو دنیا و مافیہا سے بے خبر، ہاتھ میں ایک کتاب پکڑے مگن تھا...... اسے نہ تو کم ہوتی سورج کی... روشنی کا احساس تھا نہ ارد گرد کھڑے لوگوں کا...... جو ٹرین کی خرابی کے باعث نیچے اتر کر خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

سورج کی کرنیں، اس نوجوان کے چہرے اور کتاب کو عجیب سی تابناکی بخش رہی تھیں...... جیسے کسی روشنی نے اسے حصار میں لے لیا ہو۔ سنہری شام، ڈوبتا سورج، سبک رفتار ٹھنڈی ہوا...... تا حدِ نظر پھیلا سبزہ اور جھیل کنارے بیٹھا کتاب کے ہمراہ نوجوان...... منظر مکمل تھا۔

کیف مبہوت تھی...... ذرا کی ذرا اس نوجوان نے نظر اٹھائی تو کیف نے فوراً نگاہ ہٹالی، وہ شام کے اس سہانے منظر کی دلکشی کو رگِ جاں میں اتار رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ٹرین نے وسل دی۔ نوجوان بدستور کتاب میں مگن......

دوسری اور تیسری وسل کے بعد ٹرین چلنے لگی۔ اس وقت نوجوان چونکا اور دوڑ کر اسی ڈبے میں سوار ہو گیا۔ کیف اپنی امی کے ساتھ تھی...... ابھی کافی سفر باقی تھا۔

''کس چیز نے اسے مبہوت کیا تھا؟'' اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

''کتاب سے والہانہ شغف نے؟ شام کے سہانے منظر کی مکمل خوب صورتی نے؟ یا نوجوان کے چہرے کو حصار میں لیتی سورج کی شعاعوں نے؟'' وہ سمجھ نہ سکی...... بس اس منظر کی اسیر ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد اسے خوشگوار حیرت ہوئی جب وہی نوجوان ان کے سامنے والی سنگل سیٹ پر آ کر پھر سے کتاب میں محو ہو گیا...... وہ بھی ادبی کتابوں کی شیدائی تھی...... اور ہمیشہ ٹرین میں اس کے ہمراہ رسائل، کتابیں ہوتیں۔

سو اس ہم ذوق کے شغف سے متاثر ہونا تو بنتا تھا ناں...... رات اپنے پر پھیلا رہی تھی...... ٹرین اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ اس نے بھی ناول انعام یافتہ کہانیوں کا مجموعہ نکالا اور مطالعے کے سفر پر روانہ ہو گئی۔

ٹرین کا سفر اگر اپنے اندر بے پناہ کشش سمیٹے ہوئے تجربات و مشاہدات، انتظار پھر ملن و جدائی کے لمحات...... کی کیفیات سے مزین ہوتا ہے تو مطالعے کا سفر بھی انسان کو اپنے جادوئی حصار میں قید کر لیتا ہے......

انسان ایک ایسے جہان میں جا پہنچتا ہے جہاں الفاظ کے پیراہن میں ڈھلے کردار غم و خوشی، دکھ، سکھ، غم، ہجر، وصل کی دنیا میں سانس لیتے محسوس ہوتے ہیں۔

وہ بھی محو ہو گئی کچھ دیر بعد نوجوان نے وہ کتاب اپنی سیٹ پر رکھ دی اور وہاں سے چلا گیا۔ اس نے ٹائٹل پر نظر ڈالی ''نکلے تیری تلاش میں'' مستنصر حسین تارڑ کا سفر نامہ تھا۔

''آ...... ہاں...... کافی صاحبِ ذوق لگ رہا

# وقت

چاہتوں کے دل فریب گداز میں پل پل رنگ بدلتی فسوں خیز کہانی ...... ماں پر ہونے والے اندوہناک ظلم کا انتقام لینے پر تلا ہوا نوجوان اندر کی شرربار آگ میں جل رہا تھا۔ اسے حالات نے قہربار اور صف شکن بنا دیا تھا۔ ظلم کی چنگاریاں اس کے وجود میں ہولناک شعلوں کا روپ دھار چکی تھیں۔ وہ دشمنوں کو خاک و خون میں نہلا کر ساری رکاوٹوں کو روندتا جا رہا تھا پھر اس کی شناسائی ایک سیمیں بدن، غنچہ دہن، شیریں سخن دوشیزہ سے ہوئی اور کیوپڈ کا تیر چل گیا۔ عزت سے رسوائی اور پھر سرخ روئی کے اس روح فرسا سفر میں وقت اس کے ساتھ تھا۔

سنسنی اور تحیر میں لپٹی دل گداز داستان

بہت جلد

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

کے صفحات پر ملاحظہ کریں

ہے۔'' اس نے سوچا...... تھوڑی دیر بعد آ کر اس نوجوان نے دوسری کتاب شاپر سے نکالی۔ کیف نے ترچھی نگاہ سے ٹائٹل دیکھا۔ امجد اسلام امجد کی شاعری کا مجموعہ تھا۔ کافی دیر سے وہ ایک ہی صفحے پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

''واہ کیا انہماک ہے، کیا استغراق ہے۔'' گو کسی پر نظر رکھنا اخلاقی لحاظ سے درست نہیں...... لیکن کیف کو عادت تھی مشاہدے کی...... اور جہاں بات ہو کتابوں کی تو وہ عاشق تھی مطالعے کی...... سو کتابوں پر گاہے گاہے نظر ڈال لیتی ...... ادبی حس بیدار تھی بلکہ پھڑک رہی تھی...... جسے اس نے ڈانٹ کر قابو کیا ہوا تھا۔

''بیٹا...... ایک گلاس پانی دینا......'' امی کی آواز پر وہ چونکی...... اس کی والدہ سو رہی تھیں...... اب جاگیں تو پانی مانگا۔

''اوہ امی! پانی ختم ہو گیا ہے...... اگلے اسٹیشن سے خرید لوں گی۔'' کیف اور اس کی امی کی آواز اس نوجوان کے کانوں میں پڑی تو اس نے فوراً اپنی پانی کی بوتل پیش کر دی۔

''آنٹی...... فی الحال یہ لے لیجیے...... میرے پاس مزید دو بوتلیں موجود ہیں......'' کیف نے اس شرط پر لی کہ واپس لوٹا دے گی۔

تھوڑی دیر بعد وہ نوجوان اس کی والدہ سے ایسے باتوں میں مگن ہو گیا جیسے برسوں سے جانتا ہو۔ اس کا نام شاہان تھا۔ وہ بھی اس کی باتوں سے کافی متاثر نظر آ رہی تھیں۔ انہیں ایک بہترین سامع مل گیا تھا...... وہ بھی ان کی باتوں پر نہایت فرمانبرداری سے سر ہلا کر تائید و توصیف کر رہا تھا، وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھیں کہ نہایت ہی مہذب اور شریف بچہ ہے۔

اُدھر کیف السحر بظاہر بے نیازی سے بیٹھی تھی پر نگاہ کتاب پر تھی دل ہی دل میں ہنس رہی تھی کیونکہ شاہان کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ نیند میں جانے والا ہے۔ بہ مشکل اپنی جمائیوں کو روک رہا تھا...... اِدھر امی کی نیند بھاگ چکی تھی۔

''یہ نگوڑ ماری سحر تو کبھی میری باتوں پر دھیان نہیں دیتی بس جب دیکھو ہاتھ میں کتاب...... رسالہ اور جواب ہوں، ہاں ...... یہ دیکھو کیسا تابعدار، شریف، مہذب بچہ ہے۔ کتنی دل جمعی سے میری باتیں سن رہا ہے۔'' وہ سوچے جا رہی تھیں۔ بالآخر کتنی باتیں کرتیں انہیں پھر نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا جبکہ وہ شاہان نامی جوان ابھی تک جاگ ہی رہا تھا۔

''اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو میں یہ کتاب پڑھ سکتا ہوں؟'' نوجوان کی آواز آئی تو وہ ایک دم چونکی...... وہ اس کی سائڈ میں رکھی کتاب کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔ کیف اپنے موبائل پر مصروف تھی۔

''جی ضرور......'' کیف نے کتاب اس کی جانب بڑھا دی۔

''اگر آپ پڑھنا چاہیں تو......؟'' اس نے اپنی کتاب کا شاپر اس کی جانب بڑھایا۔ کیف السحر کی تو دلی مراد بر آئی۔ شاپر میں کافی کتابیں تھیں۔ وہ ارد گرد سے بے خبر کتابوں کی ورق گردانی میں مشغول ہو گئی۔ اور پھر کب دنیا و جہاں سے بے خبر ہو کر سوئی کچھ خبر نہیں۔ آنکھ کھلی تو نظر سب سے پہلے اپنی گود میں رکھی کتاب پر پڑی۔ اس نے کتاب شاپر میں رکھی...... اور شاہان کو دینے کا سوچ کر اس کی سیٹ کی جانب نظر دوڑائی۔ سیٹ خالی تھی۔ نہ شاہان، نہ اس کا سامان......

امی سے پوچھا تو انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔

''عجیب احمق آدمی ہے! اپنی کتابیں میرے پاس چھوڑ گیا اور میری اتنی محنت سے ڈھونڈی گئی کتاب اپنے ساتھ لے گیا۔'' کیف کو شدید الجھن ہوئی اور غصہ بھی آیا...... لیکن ان کے اسٹیشن آنے تک شاہان کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ کیف نے دل ہی دل میں اسے خوب کوسا۔ کتابیں اس کے ہمراہ تھیں کسی کی امانت...... واپس کیسے لوٹائے؟ اور اس کی نایاب کتاب...... اسے بے تحاشا افسوس ہوا۔

ننھیال میں اچھا وقت گزار کر وہ واپس ہی آ گئی۔ ماں سے اس کا پتا وغیرہ دریافت کیا۔

''یہ تو بتایا تھا کہ کراچی کا رہائشی ہے۔ کسی دوست

کی شادی اٹینڈ کرنے پنجاب جا رہا ہے لیکن کراچی میں کہاں رہتا ہے، یہ مجھے نہیں بتایا۔'' امی نے جواب دیا۔

اس نے کتابوں کا بغور معائنہ کیا...... شاید کہیں نام، ایڈریس، موبائل نمبر لکھا مل جائے۔ اس کوشش میں وہ کامیاب رہی...... ایک کتاب کے آخر میں اسے ایک موبائل نمبر لکھا نظر آ گیا...... اس نے فون کرنا مناسب نہیں سمجھا بس میسج کر دیا۔

''آپ کی امانت جو ٹرین میں آپ چھوڑ گئے تھے، وہ میرے پاس موجود ہے۔''

''کیا آپ کیف السحر ہیں؟'' فوراً جواب آیا۔ اب شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ دوسری طرف وہی موصوف ہیں۔

''جی......'' اس نے مختصراً جواب دیا۔

''آپ اپنا ایڈریس سینڈ کر دیں، کتابیں لینے آ جاؤں گا۔ وہ بے حد قیمتی کتابیں ہیں، اگر نہ ملیں تو شاید دوسرے جہاں پہنچا دیا جاؤں۔''

''ہائیں......'' اس کی آنکھیں پھیلیں...... ''تو میرے پاس چھوڑی کیوں تھیں...... بے وقوف آدمی......'' اس نے دل ہی دل میں صلواتیں سنائیں۔

''میری کتاب بھی لے آیئے گا۔'' اس نے ایڈریس کے ساتھ ہی یہ جملہ بھی لکھ کر سینڈ کر دیا۔ اس کے بعد مزید کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔

قصہ مختصر...... دو دن بعد شاہان صاحب تشریف لے آئے، مع کتاب، ساتھ میں والدہ بھی تھیں، بے حد تپاک سے ملیں۔

''بس میرا بیٹا جب سے واپس آیا ہے دوست کی شادی اٹینڈ کر کے آپ کی بہت تعریف کر رہا ہے۔'' شاہان کی والدہ اس کی امی سے کہہ رہی تھیں۔ ''بتا رہا تھا کہ بے حد اچھی، محبت کرنے والی، سادہ دل خاتون ہیں۔ جب سے میرا بھی دل چاہ رہا تھا کہ آپ سے ملوں۔'' انہوں نے امی کو مخاطب کر کے کہا۔

اپنی تعریف سن کر امی موم کی طرح پگھل گئیں اور شاہان سے بے حد محبت سے ملیں۔

## تجھ بن

جب تجھ بن دل نہ لاگے
اور نین برسے ساون سے
آنکھوں میں خواب سے
نیندوں میں رہے تم
یوں بھی جینے کی وجہ تم
مرنے کا سبب تم

شاعرہ: ثنا کنول اللہ دتا، لودھراں

''بہن آپ کا بیٹا بھی بے حد شریف اور مہذب ہے۔ اللہ تعالیٰ سلامت رکھے......'' انہوں نے کہا۔

یوں یہ ملاقات خوب رہی...... تعارف کے مراحل طے ہوئے اور آئندہ بھی ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ اور پھر ان ملاقاتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے شاہان کے لیے کیف السحر کا ہاتھ مانگ لیا۔ کیف السحر اپنی تعلیم مکمل کر چکی تھی۔ دونوں گھرانے ایک دوسرے سے ملے۔ شاہان کی جاب بھی اچھی تھی...... انہیں ہر لحاظ سے مناسب لگا تو ہاں کر دی اور چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق سارے کام ہو گئے۔ کیف السحر بھی مطمئن تھی کہ ہم سفر، صاحبِ ذوق اور ادب سے شغف رکھتا ہے...... یہ خوبی تمام خوبیوں پر حاوی تھی۔

''سو خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو......'' وہ سوچ کر مسکرا دی۔

☆☆☆

کمرا تازہ گلابوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا...... کمرے کا انٹریئر انتہائی شاندار تھا...... بے حد نفیس کلر کے پردے، فرنیچر اور سجاوٹ ظاہر کر رہی تھی کہ بندہ بے حد صاحبِ ذوق اور نفیس طبیعت کا مالک ہے۔ کیف السحر سراہے بغیر نہ رہ سکی۔ فرنیچر اور تمام ضروری سامان کا انتظام شاہان نے خود کیا تھا۔ بقول اس کے ''لڑکی والوں

نے اپنی سب سے قیمتی چیز لڑکی دے دی یہی بہت ہے، ضروریاتِ زندگی کا سامان، فرنیچر وغیرہ لڑکے کو خود ارینج کرنا چاہیے۔لڑکی والوں پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے۔'' وہ جہیز لینے کے خلاف تھا۔ اس کی والدہ بھی شاہان سے متفق تھیں۔ یوں انہوں نے کیف کے گھر والوں سے جہیز نہیں لیا...... کیف خود اپنے شوق سے کچھ ملبوسات، جیولری، جوتے اور ذاتی استعمال کا کچھ سامان لائی تھی۔

کیف، شاہان کی اس اچھی سوچ سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔ اس وقت وہ عروسی لباس میں ہم رنگ زیورات پہنے شاہان کے کمرے میں موجود تھی۔ برائیڈل ڈریس میں وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد شاہان کمرے میں آیا اور سلام کر کے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ وہ اس سے بے حد دوستانہ انداز میں باتیں کر رہا تھا۔ کیف کی جھجک کافی حد تک کم ہوگئی...... اور وہ بھی شاہان سے اس طرح باتیں کرنے لگی جیسے عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ کیف السحر کو اس طرح ریلیکس کرنا، اس کی جھجک دور کرنے میں شاہان کی گفتگو کا کمال تھا۔

''کمرے کا انٹیریئر انتہائی گریس فل ہے...... مجھے بہت پسند آیا...... آپ کا ذوق بہت اعلیٰ ہے...... میں نے آپ کی کتابوں کی چوائس سے اندازہ لگالیا تھا کہ آپ صاحبِ ذوق شخص ہیں۔'' کیف نے کھل کر تعریف کی۔

''ارے، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، کمرے کا انٹیریئر بے شک میری پسند کا ہے لیکن کتابوں کے معاملے میں خاصا بے ادب انسان ہوں۔ مطالعے سے دلچسپی تو نہ ہونے کے برابر ہے۔''

''کیا......؟'' کیف کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''تو وہ ٹرین میں کتابوں کا شاپر......؟ وہ جھیل کنارے انتہائی لگن سے کتاب پڑھنا؟'' وہ ہکا بکا تھی۔

''ارے......'' شاہان ہنس دیا۔

''وہ کتابیں میری نہیں تھیں۔ ایک جاننے والے تک پہنچانی تھیں...... اور جس نے دی تھیں اس نے اجازت دے دی تھی کہ پڑھنا چاہو تو پڑھ لینا...... لیکن ٹرین کے سفر میں ایک ایسا حسین چہرہ نظر آگیا کہ کتابیں تو کیا پڑھنی تھیں بس دل چاہ رہا تھا کہ اسی کا چہرہ پڑھتا رہوں...... اس کی خوب صورت آنکھوں کو دیکھتا رہوں۔''

شاہان نے شرارت سے کیف کی آنکھوں میں جھانکا۔ کیف کو شرمانا چاہیے تھا لیکن وہ گم صم سی شاہان کو تکے گئی۔

''یار کیا نظر لگانے کا ارادہ ہے؟'' شاہان نے شوخ لہجے میں پوچھا۔

''نن...... نہیں......'' وہ چونکی۔

آئیڈیل کا تاج محل...... مسمار ہو رہا تھا۔ کیف السحر ابھی شاک میں تھی۔

''تو جناب جب دیکھا کہ سامنے والی سیٹ پر براجمان حسین آنکھوں والا چہرہ دنیا و مافیہا سے بے خبر کتاب میں مگن ہے تو دل نے سوچا کہ کیا طریقہ اختیار کیا جائے کہ یہ چہرہ ہمیں بھی لائق توجہ جانے...... سو فوراً کتابوں کے شاپر کا خیال آیا...... اور اوپر رکھی کتاب نکالی اور نظریں جمادیں...... لیکن وہ چہرہ ہنوز بے پروا تھا۔ اسی وقت ٹرین ایک خرابی کے باعث سبزہ زار علاقے میں رک گئی۔ آپ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھیں۔ میں کتاب لے کر اترا، سامنے ٹیلے پر بیٹھ گیا...... مقصد اس چہرے کو نگاہوں کے سامنے رکھنا تھا۔'' شاہان مزے سے اپنی اسٹوری سنا رہا تھا۔

کیف سن رہی تھی۔

''بالآخر میں اس حسین آنکھوں والے چہرے کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ دو آنکھیں مجھے تک رہی تھیں، یہ مجھے پتا تھا۔ کتاب کا تو بہانا تھا...... کیونکہ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ آپ مطالعے سے بے حد دلچسپی رکھتی ہیں، ٹرین کی وسل سنائی دے رہی تھی۔ کتاب میں کیا لکھا ہے، کچھ پتا نہیں تھا، ایک ہی صفحے پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔'' شاہان کی اسٹوری جاری تھی۔

کیف پر تو صدمے کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔

''ہائے وہ ادبی ذوق کا حامل شریکِ سفر...... ہم سفر......؟ دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا......'' وہ رنج و غم کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔

''پھر پانی والے واقعے کے بعد آنٹی سے بات

چیت شروع ہوئی۔ آنٹی کی سادہ دلی دل کو بھائی......اور آپ کی خفگی بھری تنبیہی نگاہیں......اُف، وہ منظر بھی خوب تھا......آنکھوں میں برہمی، چہرے پر خفگی، میں تو اس منظر کا اسیر ہوگیا۔'' وہ بولا۔

''کبھی، کبھی آنکھوں دیکھا سچ نہیں ہوتا......ہم دونوں جس منظر کے اسیر ہوئے، وہ فریب نظر تھا۔'' اس نے سوچا۔ کیف کو پہلے صدمہ ہوا۔ پھر غم، اب ہنسی آرہی تھی......کیوں؟ یہ کیف ہی جانتی تھی آگے آنے والے لمحات دلچسپ بھی ہوسکتے تھے، دل شکن بھی...... وہ محظوظ ہوئی۔

''بس love at first sight والا معاملہ ہوا۔ موبائل نمبر میں نے جان کر کتاب میں لکھا تھا۔ آپ نے رابطہ کیا، والدہ نے بھی آپ کو پسند کرلیا۔ یوں ٹرین کی ہم سفر تا حیات ہم قدم بن گئیں۔'' شاہان پُر کیف لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''آپ کو کتابوں سے، مطالعے سے بالکل دلچسپی نہیں ہے؟'' ساری داستان سن کر کیف نے بس یہی سوال کیا۔ منہ لٹکا ہوا تھا، غم سے......

''نہیں یار......لیکن غم زدہ نہ ہو، مجھے پڑھ لیا کرنا، میں تمہاری کھلی کتاب ہوں۔'' وہ شرارت سے بولا۔

''کیا ایک بے ادب کے ساتھ تمہارا گزارہ ہوجائے گا؟'' شاہان نے پوچھا۔

''نہیں......بالکل بھی نہیں......!'' کیف سر جھکا کر بولی لیکن لب مسکرا رہے تھے۔ ''لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا۔'' اس نے سوچا۔

''آپ کو میری آنکھوں نے متاثر کیا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں...... مجھے سرمئی رنگ کی آنکھیں بہت پسند ہیں۔''

''ایک منٹ......!'' کیف بیڈ سے اٹھی، ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ احتیاط سے گرے لینس آنکھوں سے اتارے، برائیڈل کلچ سے ڈبیا نکال کر رکھے اور براؤن آنکھوں کے ساتھ دوبارہ بیڈ پر براجمان تھی، شاہان حق دق تھا۔

''ایکچوئیلی میں چشمہ لگاتی ہوں، نظر کمزور ہے میری! یہ لینس کبھی کبھار خاص ایونٹ میں لگالیتی ہوں، ٹرین میں اتفاق سے چشمہ گر کر ٹوٹ گیا سو میں نے نظر کے لینس لگالیے۔'' وہ بے حد اطمینان سے بتارہی تھی۔

''کیا ایک چشمے والی لڑکی کے ساتھ آپ کا گزارہ ہوجائے گا؟'' اس نے شاہان کے انداز میں پوچھا۔

''نہیں ......بالکل بھی نہیں!'' اس نے جواب دیا۔ اب شاہان کا وہی حال تھا جو کیف کا تھوڑی دیر پہلے ہوا تھا۔ وہ ساکت سا غم میں ڈوبا اس کے چہرے کو تک رہا تھا۔ اچانک زوردار دھماکوں، فائرنگ سے فضا گونج اٹھی۔ وہ دونوں چونک اٹھے۔ نظر گھڑی تک گئی۔ 12 بج رہے تھے۔ نیا سال شروع ہوگیا تھا۔ انہوں نے کھڑکی سے باہر دیکھا آسمان پر رنگوں و نور کا سیلاب آیا ہوا تھا، آتش بازی ہورہی تھی۔ شاہان نے ہاتھ بڑھا کر کیف کو کھڑکی میں کھڑا کیا۔

''تم ان آنکھوں کے ساتھ بھی اتنی ہی حسین لگ رہی ہو۔ یہ فریب نظر بے حد دلفریب تھا جس نے ہمیں ایک کردیا۔'' اس نے کیف کے کانوں میں سرگوشی کی۔

''نیا سال مبارک! میری نئی زندگی کے ہم سفر......!'' عروسی جوڑے میں مہکتی کیف الحر نے کہکشاں پر سجے رنگوں کو دیکھا۔

''زندگی کا یہ رنگ بھی بہت خوب صورت ہے......ضروری تو نہیں کہ ہم سفر، ہم ذوق بھی ہو......محبت کرنے والا، خیال رکھنے والا، اچھی سوچ کا حامل شخص ہم سفر ہو تو زندگی کی ٹرین کا سفر سہل اور دلکش ہوجاتا ہے۔''

''نیا سال مبارک ......! گلاب رتوں کے ہم سفر......!'' کیف الحر نے مسکرا کر دھیرے سے کہا۔

کہکشاں پر چمکتی روشنیوں، رنگ و نور کے میلے نے ان دونوں کے چہروں کو حصار میں لے لیا۔ فضا ان کے انوکھے ملن پر مسکرا اٹھی۔

# امرت

شیریں حیدر

تخلیقِ کائنات سے لے کر اب تک ... کئی ادوار بدلے مگر عورت کی کہانی ہر دور میں لگ بھگ وہی رہی ہے ۔اللہ تعالیٰ نے ہمیں رشتوں کی ڈور میں باندھا تو اس کا مقصد یہ تھا کہ ہم اپنی تخلیق کے مقصد کو اور بھی خوب صورت بنائیں مگر اس کے پیدا کردہ دل میں جذبے بھی اسی کے پیدا کردہ تھے۔ محبت ،نفرت، رشک، حسد، رنج، غصہ اور خوشی ...اب ہم پر منحصر ہوتا ہے کہ ہم کس جذبے کو خود پر حاوی کرلیتے ہیں ، یہ ہماری خصلت بن جاتا ہے اور ہماری کل شخصیت کا خلاصہ ...یہی ہمارے کردار کی تعمیر کرتا ہے اور ہم اسی کا تاثر دوسروں پر عمر بھر کے لیے چھوڑتے ہیں۔ ہماری عادات صرف ہم پر ہی نہیں بلکہ دوسروں کی زندگیوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔کسی کی زندگی کا سفر کس طرح سہل یا کٹھن ہوتا ہے اس کا انحصار ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اُن کی زندگی کے اہم کردار ہوتے ہیں اور جن کا ہونا یا نہ ہونا اہمیت رکھتا ہے۔ پیدائش سے لے کر اپنی موت تک رشتوں کی ڈور سے بندھے ہوئے کردار زندگی کو ہنس کر گزارتے ہیں یا رو کر، مشقت سے سانس لیتے ہیں یا خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولتے ہوئے اس کا سارا دارومدار ان سے وابستہ رشتوں پر ہوتا ہے۔ وقت بدل جاتے ہیں مگر کہانی وہی رہتی ہے اور اپنی باری سے اس میں مختلف کردار شامل ہوتے رہتے ہیں۔

**زندگی کے انہی پیچ وخم اور نشیب وفراز سے نبرد آزما ہوتی ایک چشم کشا تحریر......**

لگی ہے حرفِ ناگفتہ پہ تعزیر، بسم اللہ!

میں بھاگتی ہوئی باقاعدہ ہانپ رہی تھی، میرے قدموں کے نیچے زمین بھی ہموار نہ تھی۔ بار، بار کسی نہ کسی پتھر پر پاؤں آ جاتا، جہاں ذرا سست پڑتی وہاں رک کر دیکھتی کہ میرے پیچھے بھاگنے والا یا والے کتنی دور رہ گئے تھے، مجھے یہ تک علم نہ تھا کہ میرے پیچھے کون بھاگ رہا تھا اور تعداد میں وہ لوگ کتنے تھے...... نہ ہی اس وقت تک کوئی نظر





آیا تھا مجھے، اندھیرے کی چادر اتنی دبیز تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دے رہا تھا مگر پھر بھی مجھے اپنا راستہ جانے کیسے نظر آ رہا تھا، پاؤں کبھی کسی اور کبھی کسی چیز سے ٹھوکر کھاتے، میرا لباس بار، بار کسی چیز سے الجھ رہا تھا، بازوؤں کے ساتھ رسّوں جیسی کوئی چیز بار، بار ٹکراتی تھی، غالباً درختوں کی لٹکتی ہوئی شاخیں...... پورا منظر اندھیرے کی بُکل میں تھا، مجھ میں یہ بھی نہیں آ رہا تھا کہ میں اس جنگل میں آئی کس لیے تھی اور کس کے ساتھ؟ ایک مقام تک پہنچ کر تو مجھ میں ایک قدم اور بڑھنے کی سکت ختم ہو گئی تھی۔ میں نے لاچار خود کو مزید بھاگنے سے روکا اور کسی چیز سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ جسے میں درخت سمجھ کر کھڑی ہوئی تھی، وہ تو کوئی ایسی چیز تھی جو میرے ٹیک لگاتے ہی حرکت میں آنے لگی، میں نے گھبرا کر وہاں سے بھاگنا چاہا تو دو مضبوط تنوں جیسی ٹہنیوں نما بازوؤں نے مجھے اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا، مجھے اتنی بری طرح جکڑا کہ میری سانس گھٹنے لگی، میں نے بصد کوشش چیخنا چاہا، میری چیخیں بھی گھٹی، گھٹی سی تھیں۔

''کوئی ہے جو مجھے بچائے! خدا کے لیے کوئی مجھے بچائے، کوئی میری مدد کرے......''

☆☆☆

مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا کہ میں پیدائشی کہانی کار ہوں، میرے وجود کے اندر کہانیوں کے انبار لگے تھے، مجھے ہر چیز اور ہر انسان ایک کہانی لگتا مگر مجھے ان کہانیوں کو سطح قرطاس پر بکھیرنے کا سلیقہ نہیں آتا تھا، تاوقتیکہ میں نے خود کو ایک کہانی کا کردار پایا۔ میں چہرے دیکھتی تو خود بخود میرے ذہن میں ان چہروں سے متعلق کہانیاں پنپنے لگتیں، میرا دل چاہتا کہ میں ان چہروں کے حامل لوگوں سے پوچھوں کہ کیا اس کے اندر اس چہرے سے بننے والی کہانی میں سچائی تھی یا نہیں مگر میں جھجک جاتی۔ مگر آج میں دادی جان کے پیچھے پڑ ہی گئی تھی۔

''تم جانے کہاں سے ایسی انوکھی بچی پیدا ہو گئی ہو اس خاندان میں، جسے ماضی کی کہانیاں سننے کا شوق چرایا ہے، اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔'' انہوں نے میرے بالوں میں پیار سے انگلیاں سہلائیں۔

''آج کل فارغ ہی تو ہوں دادی جان! پھر راتوں کو دیر تک جاگ کر پڑھنے کی عادت کی وجہ سے نیند بھی اتنی آسانی سے نہیں آتی ناں۔''

''آیت الکرسی پڑھ کر خود پر پھونک لیا کرو میری جان!'' انہوں نے پیار سے کہا۔ ''دل ہی دل میں تسبیح فاطمہؓ پڑھا کرو تو نیند خود بخود آ جائے گی۔''

''آپ خواہ مخواہ بہانے کرتی ہیں دادی جان!'' میں نے شکوہ کناں انداز میں کہا۔ ''سنائیں ناں مجھے کہانی...... آپ نے وعدہ کیا تھا کہ میرے امتحانوں کے بعد آپ سنائیں گی۔'' میں نے ضد کی تو انہیں مجبوراً ہتھیار ڈالتے ہی بن پڑی۔

''کہاں سے شروع کروں بھئی یہ کہانی؟'' وہ سوچنے لگیں۔

''اپنی شادی کے وقت سے شروع کریں۔'' میرے لہجے میں اشتیاق تھا۔ ''دادا جان نے آپ کو کہاں پسند کیا تھا؟''

''پگلی......'' انہوں نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''ایسے تھوڑا ہی ہوتا تھا پرانے وقتوں میں، بھئی جو اماں، باوا نے پسند کیا اور کہا کہ وہاں شادی کرنی ہے تو خاموشی سے سر جھکا دیا، شادی بیاہ جیسے معاملات میں کہاں اجازت تھی بچوں کو بولنے کی، خاص طور پر لڑکیوں کو۔''

''کتنی غیر اسلامی سوچ تھی دادی جان!'' میں نے تاسف سے کہا۔ ''لڑکیوں سے کیوں نہیں پوچھا جاتا تھا بھلا، اتنا امتیازی سلوک کیوں لڑکیوں کے ساتھ......؟''

''کیونکہ لڑکیاں ہوتی ہی ایسی پیاری اور فرمانبردار ہیں کہ ماں باپ کے فیصلوں پر سر جھکا دیتی ہیں۔''

''ظلم ہے یہ تو دادی جان!'' میں نے افسردگی سے کہا۔ ''وہ بھی انسان ہیں، لڑکوں جیسے دل اور دماغ رکھنے والی، ہمارا مذہب بھی انہیں اپنے لیے اپنی پسند کا ساتھی چُننے کا اختیار دیتا ہے......''

''بیٹیوں کے لیے سب سے اہم ماں باپ کی عزت ہوتی ہے میری جان، ہر دور میں لڑکیاں ایسی ہی تھیں اور رہیں گی اور تم تو کہانی سن کر بار، بار کہو گی کہ یہ بھی ظلم تھا اور یہ بھی۔''

''اچھا اب نہیں کہوں گی کچھ بھی، پکا والا وعدہ......'' مجھے اندازہ ہوا کہ میری مداخلت سے دادی جان کا کہانی سنانے کا ارادہ اگر بدل گیا تو میں اس دلچسپ کہانی سے محروم ہو جاؤں گی جو میں کب سے سننا چاہتی تھی۔

''وعدہ کرو کہ تم بیچ میں بولو گی بھی نہیں، سوال کرو گی نہ بحث...... کیونکہ جہاں تم بولو گی وہیں میرے ہاتھ سے کہانی کا سرا پھسل جائے گا۔'' دادی جان نے مجھ سے کہا، میں جانتی تھی کہ دادی جان کو عمر کے اس حصے میں آ کر یادداشت کی کمزوری کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا، بات کرتے، کرتے بھول جاتیں۔

''ہوں...... بڑی مشکل صورت حال ہے یہ تو مگر میں کوشش کروں گی۔'' میں نے شرارت سے کہا۔

''نور پور...... ہمیشہ سے ایسا ہی گاؤں نہ تھا پیاری، سب کے سب گھر کچے تھے، کبھی اس گاؤں میں سرسبز اور لہلہاتے کھیت اور پھلوں کے باغات ہوتے تھے، کنوؤں کا شفاف پانی تازہ اور آلودگی سے پاک ہوتا تھا۔ یہ تب کی بات ہے جب میں بیاہ کر اس گاؤں میں آئی تھی۔ تمہارے دادا جان نے مجھے اپنی رشتے کی بہن کی شادی میں دیکھا اور پسند کیا تھا۔'' انہوں نے کہانی شروع کی۔

''واؤ......'' میں چیخی۔ ''ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں......'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''دیکھا! تم رہ نہ سکیں، میں نے تمہیں بتایا ہے ناں کہ انہوں نے مجھے اپنی رشتے کی بہن کی شادی میں دیکھا تھا، نہ میں نے انہیں دیکھا اور نہ ہی ہم دونوں کے بیچ کوئی آج کل کے نوجوانوں کی طرح محبت کی پینگیں پروان چڑھی تھیں۔'' انہوں نے مصنوعی ناراضی سے کہا، ان کے چہرے پر بھی اس وقت کی یاد نے حیا کا گلال بکھیر دیا تھا۔

''اب تم سوال کر لو اور میں جواب دے دیتی ہوں۔'' مجھے تو انہوں نے کہہ دیا تھا مگر ان کے اپنے دماغ میں شاید اس وقت کی یادیں اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ جاگ گئی تھیں۔

وہ اپنی ہندو اور سکھ گھرانوں کی سہیلیوں کے ہمراہ اپنی پھوپی کے بیٹے کی شادی میں بارات کے ساتھ دولہا کی بہن کے طور پر متعارف کروائی جا رہی تھی اس لیے اس کی اہمیت سب سے زیادہ تھی، بارات کا راستہ روکا گیا اور کچھ دے دلا کر معاملہ طے ہوا تو راستہ چھوڑ دیا گیا...... بارات کے استقبال کے لیے کھڑے ہوؤں میں سے اسے وہ نظریں خود پر مرکوز محسوس ہوئیں، عورت کی چھٹی حس ایسی نظروں کے معاملے میں بڑی تیز ہوتی ہے، وہ بھی جان گئی کہ کوئی اسے اپنی نرم اور مشتاق نگاہوں کے حصار میں لیے ہوئے ہے، انہیں نظر انداز کر کے وہ بارات کی عورتوں کے ساتھ زنان خانے کی طرف چلی گئی مگر بعد میں بھی وہ اسے کئی بہانوں سے زنان خانے میں آتا جاتا نظر آیا۔ کسی نے بتایا بھی کہ دلہن کا بھائی لگتا ہے۔ 'مجھے اس سے کیا!' اس نے کندھے اچکا کر اس وقت سوچا تھا مگر بارات سے واپس لوٹ کر بھی وہ ان نظروں کو اپنے خیال میں بار، بار آنے سے نہ ہٹا سکی اور جلد ہی پھوپی کی بہو کے توسط سے اس کا رشتہ بھی آ گیا تھا۔

''پکا وعدہ اب نہیں بولوں گی دادی جان!'' میں نے انہیں کافی دیر خاموش دیکھ کر سمجھا کہ وہ ناراض ہو گئی ہیں...... میں نے اپنے ہونٹوں پر اپنے داہنے ہاتھ کی انگشتِ شہادت رکھ لی، دادی جان چونکیں اور پھر مسکرا دیں۔

''میرے ابا ارد گرد کے چالیس گاؤں کے نمبردار تھے۔'' دادی کی دلچسپ داستان شروع ہو چکی تھی۔ ''اور

جس گھر میں، میں بیاہ کر آئی تھی یہ بھی چھتیس دیہہ کے نمبرداروں کا گھرانا تھا، دونوں خاندان برابر کی ٹکر کے تھے مگر میری تربیت میں جو اوصاف شامل کیے گئے تھے اس کے باعث میں نے کبھی اپنی سسرال کا اپنے میکے سے موازنہ کیا نہ انہیں کسی طرح کمتر جانا۔ بسا اوقات مجھے دل میں کچھ معاملات میں یہاں تنگی محسوس ہوتی مگر جانتی تھی کہ میری ڈولی رخصت کرتے وقت میرے باپ نے منہ سے تو نہ کہا مگر وہ چاہتے تھے کہ میں اس گھر سے جیتے جی نہ نکلوں۔

نور احمد میرے شوہر، ان کے دو بھائی اور ایک بہن تھی، وہ سب سے چھوٹے بھائی اور میں اس گھر کی سب سے چھوٹی بہو، بڑی دونوں بہویں ان کے اپنے خاندان سے اور آپس میں سگی بہنیں تھیں مگر مجھے اپنے ساس، سسر سے بہت عزت ملتی اور اس کی وجہ کہ میرا میکا کافی مضبوط تھا اور میرا رشتہ بڑی چاہت اور تگ و دو سے لیا گیا تھا۔ کسی کو شاید اتنی پروا بھی نہ ہوتی جو میں نور احمد کی من پسند بیوی نہ ہوتی۔ اپنی جس رشتے کی بہن کی شادی میں انہوں نے مجھے دیکھا تھا وہ میری ایک پھوپی کے بیٹے سے بیاہی گئی تھی، اس شادی میں، میں پیش، پیش تھی کیونکہ پھوپی کی اپنی کوئی بیٹی نہ تھی...... پھوپی کا ارادہ میرا رشتہ اپنے چھوٹے بیٹے کے لیے لینے کا تھا، اس درمیان میں دو اور بیٹے تھے، وہ اس وقت کا انتظار کر رہی تھیں جب ان کے باقی دونوں بیٹوں کے رشتے کہیں طے ہو جاتے اور پھر وہ میرے ماں باپ سے بات کرتیں مگر پھوپی کے من کی بات ان کے من میں ہی رہ گئی اور اس سے پہلے ہی ان کے پہلے بیٹے کی شادی کے فوراً بعد نور احمد کے گھرانے سے میرے لیے رشتہ بھجوا دیا گیا۔

پرانے زمانوں میں تو اسی طرح ہوتا تھا کہ کسی کے ذریعے سے بات چلائی جاتی تھی مگر میرے معاملے میں ایسا نہ ہوا، پھوپی نو بیاہتا بہو نے پہلے اماں سے بات کی اور پھر میرے ابا کے ایک پگ بدل بھائی کو بیچ میں ڈالا گیا تاکہ انکار کی گنجائش نہ رہے اور یوں ابا اپنے انتہائی پیارے دوست مہربان چاچا کے سامنے کچھ نہ بول سکے۔ ابا کو چاچا نے پوری ضمانت دی تھی کہ ان کی بیٹی کو ناز سے رکھا جائے گا، اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا ہی تھا۔ گھر میں اگر کسی کو کوئی مسئلہ تھا تو وہ میری جیٹھانیوں کو تھا، وہ چونکہ اسی خاندان سے تھیں اور انہیں محسوس ہوتا تھا کہ میری بات کو اس گھر میں زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ میرے جیٹھ سکندر احمد اور منور احمد اور میری نند حلیمہ، تینوں میری اسی طرح عزت اور مجھ سے پیار کرتے تھے جس طرح کہ ان کے والدین کیونکہ انہوں نے میرے والد کے ساتھ وعدہ کیا تھا۔ ہاں عورت ہونے کے ناتے...... حلیمہ آپا بھی کبھار اپنی بڑی بھابیوں کی باتوں میں آ جاتیں، ظاہر ہے وہ آپس میں پہلے سے رشتے دار بھی تھیں۔ البتہ میری ساس بہت سمجھدار خاتون تھیں اور گھر کے معاملات کو گہری نظر سے دیکھتیں اور کسی کے لہجے یا رویے میں ذرا سی تبدیلی ہوتی تو وہ فوراً ان کی نظر میں آ جاتی تھی۔ انہیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ کس طرح گھر کے معاملات کو اعتدال میں رکھا جا سکتا ہے اور اسی بنا پر پورے خاندان کے معاملات میں ان سے مشاورت کی جاتی تھی، اتفاق تو دیکھو کہ وہ بھی اپنے گھر کی سب سے چھوٹی بہو اور کم عمر بھی تھیں مگر انہیں دنیا داری نبھانا سب سے بہتر آتا تھا۔ میرے لیے وہ ایک آئیڈیل خاتون تھیں، میں سوچتی تھی کہ مجھے اس خاندان میں رہنا ہے تو ان سے قربت میں ہی فائدہ ہے، جو میں ذرا سا بھی ان سے کھنچ جاتی تو میری جیٹھانیاں محاذ بنا لیتیں اور شاید انہیں بھی یہ سمجھانے میں کامیاب ہو جاتیں کہ میں غلط ہوں۔ ایک بات جو میری ساس میں تھی اور مجھ میں نہیں ہو سکتی تھی، وہ ان کا دبنگ انداز تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھیں، انہوں نے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں والے سارے ارمان ان پر پورے کیے اور انہیں بے انتہا پیار کیا، ان کے منہ سے نکلنے سے پہلے ان کے دل کی بات پوری کر دی جاتی۔

ان کی اپنی سسرال کے معاملات پر بھی اجارہ داری اور گرفت تھی اور میکے میں تو جو کچھ بھی تھا وہ سب انہی کا تھا، ان کے ماں باپ کے لیے تو سب کچھ وہی تھیں، ان کے بعد ان کی تمام جائداد کی مالک بھی وہی ہوتیں......

سومیکا بھی مضبوط تھا اس لیے سسرال میں ان کی قدرو منزلت زیادہ تھی۔ وہ بہت انصاف پسند تھیں اور انہوں نے کبھی کسی کو کسی پر صرف قرابت داری کے باعث ترجیح نہیں دی چھوٹے، چھوٹے گھریلو معاملات سے لے کر برادری کے بڑے معاملات تک وہ بہترین مشورے دیتیں اور تو اور خاندان کی سیاسی وابستگیوں اور دلچسپیوں سے متعلق معاملات پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔

میرے بڑے جیٹھ سکندر احمد کی بیوی کا نام عصمت اور منور احمد کی بیوی کا نام زینت تھا...... سکندر احمد کے بچے، عباس، موسیٰ، سلطان اور عائشہ تھے جبکہ منور احمد کے ہاں تین بیٹوں کی ولادت ہوئی مگر وہ زندہ نہ بچ سکے اور کافی وقفے کے بعد جو اولاد بڑی منتوں اور مرادوں سے پیدا ہوئی، وہ ہاجرہ تھی۔ میری ساس کی طرح ہاجرہ بھی اپنے خاندان کی بڑی لاڈلی بچی تھی، سکندر احمد نے اس کی پیدائش کے وقت ہی جھولی پھیلا کر اپنے عباس کے لیے ہاجرہ کو مانگ لیا تھا اور اس پر کسی کو کوئی اعتراض نہ تھا۔

''آپ نے مانگی کیوں بھائیا جی، یہ تو ہے ہی آپ کی بیٹی!'' منور احمد نے بڑے بھائی سے کہا تھا، بھائیوں کے بیچ تو آپس میں اسی وقت بات طے سمجھ لی گئی تھی، جوان ہونے پر ان بچوں کو بتایا بھی جاتا تھا اور وقت آنے پر کوئی باقاعدہ رسم بھی کی جاتی۔

نور احمد کی بہن یعنی میری اکلوتی نند حلیمہ کے ہاں ایک ہی اولادِ نرینہ ہوئی، محمد اعظم...... پھر اس کی چار بیٹیاں ہوئیں تسنیم، تبسم، کلثوم اور شبنم...... وہ اپنے گھر میں خوش تھیں مگر انہیں بہت شوق تھا کہ ایک اور اولادِ نرینہ ہو جاتی تو ان کے اعظم کی جوڑی بھی بن جاتی مگر اسی خواہش کو دل میں پالتے ہوئے انہوں نے چار بیٹیاں پیدا کرلیں اور اپنے شوہر کے دماغ میں انہوں نے مزید اولادِ نرینہ کی خواہش کا بیج اتنا تگڑا بویا تھا کہ اس خواہش کی تکمیل میں اس نے وہ کر دیا جو حلیمہ آپا نے سوچا تک نہ تھا...... ان کے بچے لڑکپن کی حدود سے نکل رہے تھے، وہ روتی، بلکتی ہوئی اپنے بچوں کو لیے میکے آگئیں۔

''اماں، اعظم کے ابا نے اپنے ایک مزارعے کی بیٹی سے نکاح کر لیا ہے...... اب میں لوٹ کر اس گھر میں نہیں جاؤں گی چاہے کچھ بھی ہو جائے۔'' ماں نے بلکتی ہوئی بیٹی کو اپنے سینے سے لگا لیا، منہ سے ایک لفظ نہ کہا۔

''میں چاہے بوجھ ہوں اس کے لیے اور آپ سب کے لیے بھی مگر میں کہیں جانے والی نہیں، نہ ہی کوئی مجھے واپس جانے پر مجبور کرے، میں خود کچھ کھا کر سو رہوں گی یا ان بچوں سمیت نہر میں کود جاؤں گی۔'' ان کی بڑی بھابیاں جو انہیں میرے خلاف ہمیشہ بھڑکاتی تھیں اور جن کے بارے میں وہ سوچتی تھیں کہ ان کی دلجوئی کریں گی، ان کے ماتھے پر انہیں دو دن میں بل نظر آنے لگے، میں نے کوئی تاثر نہیں دیا تھا۔ اس معاملے میں، میں اسی طرح خاموش تھی جس طرح میری ساس خاموش تھیں اور میں سیکھ رہی تھی، میں نے اپنے بچوں سے بھی کہا کہ وہ پھپھو اور ان کے بچوں کا خیال رکھیں۔

میرے ہاں اس وقت تک پانچ اولادیں ہو چکی تھیں اور چھٹی اولاد کی آمد کی نوید مجھے اس روز ملی جس دن وہ ایک برس اس گھر میں گزار کر واپس جا رہی تھیں۔

اقبال احمد، شہر بانو، کمال احمد، مہر بانو اور پھر جمال احمد...... بڑی دونوں بیٹیوں کو سب بڑی بانو اور چھوٹی بانو کہتے تھے اور گل...... جو کہ اس وقت پیدا ہوئی تھی جب میں امید بھی نہیں کر رہی تھی۔ پانچوں بہن بھائی جب بھی کھیلتے تو آپس میں یہی کہتے کہ شہر بانو، اقبال احمد کی اور مہر بانو، کمال احمد کی بہن ہے اور جمال احمد کو چڑاتے کہ اس کی کوئی بہن نہیں اور وہ روتا اور منہ بسورتا ہوا میرے پاس بھاگا آتا، شکایت کرتا مگر میرے پاس اس کی شکایت کا ازالہ کرنے کو کوئی جواب نہ ہوتا۔ میں اس عمر میں اور بچوں کے اتنا بڑا ہو جانے کے بعد اب مزید اولاد کی خواہش

بھی نہ کرتی مگر اللہ نے شاید اسی کی سن لی تھی جو ہمیشہ ایسے کسی جھگڑے کے بعد دعا کرتا تھا۔

''اللہ میاں میرے لیے بھی ایک پیاری سی بہنا بھیج دے...... نازک سی، پھولوں جیسی!'' اور ایک نازک سی پھولوں جیسی بہن اسے بھی اللہ نے دے دی، اس پھولوں جیسی نازک بچی کو ہم نے گل بانو کہنا شروع کر دیا اور وہی اس کا نام ٹھہرا۔

آپا کا بیٹا اعظم تو میرے بچوں کے ساتھ گھل مل گیا تھا کیونکہ بڑی مامیوں نے تو اپنے، اپنے حصے میں اس کی آمد پر پابندی عائد کر دی تھی، بقول ان کے آپا کا اکلوتا بیٹا ہونے کے باعث وہ بہت لاڈلا اور بگڑا ہوا بچہ تھا...... میں اس لیے خاموش تھی کہ میں اپنی ساس کے ساتھ تھی اور وہاں سے آپا کو دیس نکالا دینے والا کوئی نہ تھا۔ آپا کے بھائی اور والد تو خوب غصے میں تھے کہ وہ آپا کے شوہر کرم یار کو یہ کر دیں گے اور وہ کر دیں گے مگر ان کی اماں نے ان سب کو روک رکھا تھا۔ اس وقت انتخابات سر پر تھے اور اپنی برادری میں سے ایسے وقت میں کسی کو اپنا مخالف بنا لینا عقل مندی نہ تھی اور یوں بھی ان کا خیال تھا کہ ''چاہے جتنی بھی غیر عورتیں مردوں کی زندگیوں میں راہ چلتے آ جائیں، خاندانی بیوی کا مقام کوئی نہیں چھین سکتا...... چار دن میں اس کا بخار اتر جائے گا تو وہ حلیمہ کو خود لینے آ جائے گا!'' وہ جانتی تھیں کہ وہ حلیمہ آپا کو کس قدر چاہتا تھا اور حلیمہ آپا سے اس کی چار بیٹیاں اور ایک بیٹا اعظم بھی تھا اور مرد کے لیے کسی ایسی عورت کو چھوڑنا آسان نہیں ہوتا جس سے اس کی اولاد ہو۔

کئی وفود بھیجے گئے، ان کی سسرال سے کئی لوگ بیچ میں پڑے...... ایک نہ آئے تو ان کے شوہر کرم یار...... کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ وہ ان کی اجازت کے بغیر اور ان کے کہے بغیر گھر سے گئی ہے، جس طرح گئی ہے اسی طرح خود ہی واپس آنا چاہے تو آ جائے، گھر بھی اس کا ہے اور اس گھر کی ہر چیز اس کی مگر وہ کیا جاتیں، گھر والا ہی ان کا نہ رہا تھا تو کس مان اور بھروسے پر لوٹ جاتیں، ان کا مطالبہ یہی تھا۔

''اسے چھوڑے اور مجھے لینے آئے تو جاؤں گی!''

دوسری عورت کو تو وہ کیا چھوڑتے...... الٹا کسی کے ذریعے علم ہوا کہ اس سے ان کی اولاد ہونے والی تھی، حلیمہ آپا ان دنوں بلک بلک کر روتیں، راتوں کو جاگتیں اور مصلے پر گھنٹوں گزار دیتیں...... مگر ان کی اماں یعنی میری ساس نے کسی کو جا کر اُن کے شوہر کا گریبان نہ پکڑنے دیا۔

''حق کیا ہے اس نے، نکاح کرنا کوئی بری بات نہیں حلیمہ، اس نے تو تمہیں، نہیں چھوڑا، تم اپنا گھر دوسری عورت کے لیے خود خالی کر کے آ گئی ہو، تم نے اسے اپنے گھر میں گھسنے اور آباد ہونے کا موقع دیا ہے...... جو تم وہاں ہوتیں تو وہ کبھی اس عورت کو اس گھر میں نہ لے کر آتا!''

''تو کیا کرتی اماں...... اپنی ناقدری پر خاموش رہتی؟ احتجاج کرنے کو ہی تو میں نے گھر چھوڑا، یہ سوچ کر کہ وہ گھٹنے ٹیک کر مجھے واپس لینے کو آئے گا، اسے چھوڑ دے گا۔''

''کسی کے لیے بھی برا مت سوچا کرو پیاری......'' اماں بھی کیسے بڑے دل والی تھیں۔ ''کسی بھی عورت کو طلاق دلوانے کا نہ سوچو، تم نے ہی اس کے دماغ میں دوسرے بیٹے کی خواہش کا کیڑا ابو یا تو تمہاری عمر گزر جانے اور تم سے مایوس ہو کر اس نے دوسری عورت سے بیٹا پیدا کرنے کا سوچا، اب تم اس کے دماغ میں یہ کیڑا ڈالو گی تو وہ تمہیں بھی......'' اس سے آگے وہ کچھ کہہ نہ سکیں مگر میں اور حلیمہ آپا دونوں ان کی بات کا مطلب سمجھ گئے۔ میں نے اس دور میں حلیمہ آپا کی دلجوئی میں کوئی کسر نہ چھوڑی، ان کے شوہر نے پھر کئی لوگوں کو بیچ میں ڈالا کہ مصالحت ہو جائے، ابا اور بھائیوں نے بھی سمجھایا مگر آپا کی ہٹ دھرمی ختم ہونے میں نہ آئی۔ میں ان کا بہت خیال رکھتی، ان کے بچوں کا بھی جن کی طرف سے وہ غافل ہو گئی تھیں۔

پھر وہ صبح طلوع ہوئی جس دن ان کے شوہر گرم یار خود انہیں لینے آ گئے...... ان کی گود میں کمبل میں لپٹا ہوا ایک ننھا سا وجود تھا، گھر میں سے کسی نے بھی انہیں خوش آمدید نہ کہا، سب کے چہروں پر جو تاثر تھا وہ انہیں نظر آ رہا تھا۔

''کیوں آئے ہو اب......؟'' ابا جان نے ان سے سوال کیا تھا۔

''میں حلیمہ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے ہمت کر کے کہا تھا۔

''کیا بات کرنی باقی ہے......؟'' سکندر لالہ نے پوچھا۔ ''سال کے بعد تمہیں یاد آ گئی!''

''میرا اور حلیمہ کا رشتہ قائم ہے چاچا جی!'' انہوں نے سکندر لالہ کو نظر انداز کر کے ابا جی سے کہا۔ ''مجھے اس سے ایک بار...... آخری بار بات کرنے دیں، اگر اسے کوئی اعتراض ہوا تو میں واپس چلا جاؤں گا۔''

انہیں حلیمہ آپا کے کمرے میں بھجوا کر ہم سب منتظر تھے کہ اندر سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں آئیں گی، دل انہونی کے خوف سے کانپ رہے تھے، سب اپنی، اپنی جگہ دعائیں کر رہے تھے مگر...... وہ باہر نکلیں تو وہ بچہ ان کی گود میں تھا، ان کی سوتن بیچاری اپنے شوہر کو اس بچے کا تحفہ دیتے ہوئے جانبر نہ ہو سکی تھی، مجھے یقین ہے کہ حلیمہ آپا نے کبھی ایسی سوچ دل میں رکھ کر دعا نہ کی ہو گی مگر اللہ تعالیٰ کا اپنا ایک نظام ہے...... ان کی سنی گئی اور وہ پورے اعزاز اور عزت کے ساتھ ایک سال میکے میں گزار کر واپس گئیں اور اس ایک سال میں ان پر سب لوگوں اور رشتوں کی اصلیت کھل گئی تھی، اپنی ماں کے صبر، برداشت اور توکل کی، میرے خلوص کی، اپنے باپ اور بھائیوں کی جذباتیت کی اور اپنی پیاری بھابیوں کے روکھے پھیکے رویوں کی بھی۔ ان کی بھابیوں کو تو انہیں غلط سمجھنا ہی تھا کہ حلیمہ آپا کے شوہر ان کے رشتے کے ماموں تھے...... رشتوں کی یوں بندھی ہوئی گنجلک ڈور بسا اوقات انسانی رویوں کو تبدیل ہونے پر مجبور کر دیتی ہے۔

''شہر بانو میرے اعظم کی ہے بھائیا جی!'' جاتے ہوئے انہوں نے نور احمد سے کہا تھا۔ ''دیکھو انکار نہ کرنا، اعظم میرا بڑا لاڈلا بچہ ہے!'' اس وقت اس بات پر خاموشی اختیار کر لی گئی کہ ابھی سے تو اب بچوں کے مستقبل کی باتیں ہم طے نہیں کر سکتے تھے...... مگر کچھ ایسا ہی رواج تھا کہ جو بچپن سے مانگ لیا جاتا تھا وہ پتھر پر لکیر جیسا رشتہ بن جاتا تھا، اسے پکی منگ سمجھا جاتا تھا، لاڈ پیار کے باعث اعظم کی بگڑی ہوئی عادتوں کے سوا کچھ اور ایسا نہ تھا کہ ہمیں بھی اعتراض ہوتا مگر ابھی اس میں بچپنا تھا، کل کو وہ بڑا ہو گا سمجھدار ہو گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

''ہاشم......'' آپا نے چھوٹے بچے کا نام رکھا اور کسی اور کا جنم دیا ہوا، ان کے شوہر کا وہ بچہ آپا کی گود میں پلنے لگا، کسی کو لگتا ہی نہ تھا کہ وہ آپا کی سوتن کا بچہ اور ان کی زندگی میں آنے والے سیاہ رات جیسے اس ایک برس کا تحفہ تھا۔ جب سوتن ہی نہ رہی تھی تو اس سے حسد کا کیا جواز ہوتا اور وہ بچہ تو آپا کی خواہش ہی تھا ناں جس کی تکمیل اللہ نے کسی اور انداز میں کر دی تھی، آپا کے بچے بھی اسے اسی طرح پیار کرتے تھے جس طرح وہ اپنی ماں کو دیکھتے تھے۔ اتنے بڑے خاندان میں جہاں میری جیٹھانیوں جیسی عورتیں بھی تھیں وہاں یہ ناممکن تھا کہ ہاشم کو چند برسوں میں علم نہ ہوتا کہ وہ آپا کی اپنی اولاد نہ تھا...... مگر جب اسے یہ علم ہوا تب بھی اسے کوئی فرق نہیں پڑا تھا کہ اس نے تو ماں کے روپ میں انہی کو دیکھا تھا اور وہ پورے عدل سے اسے اور اپنی اولاد کو ایک جیسا رکھتی تھیں۔ باتیں کرنے والوں کے منہ تو کوئی نہیں پکڑ سکتا مگر آپا نے اپنے پیار اور توجہ سے اپنے شوہر کو بھی کبھی انگلی اٹھانے کا موقع نہ دیا، نہ ہی کبھی انہیں ان کی غلطی پر مزید جتلایا بلکہ پہلے سے بڑھ کر ان کا خیال کرتیں، اب انہیں علم ہو گیا تھا کہ اپنے مرد کو اپنے کھونٹے سے کیسے باندھ کر رکھا جاتا ہے۔

یہ بھی اچھا ہوا کہ میری ساس نے اپنے شوہر اور بیٹوں کو داماد کے منہ نہ لگنے دیا تھا، شاید وہ دور اندیش تھیں اور

جانتی تھیں کہ ایک نہ ایک دن ان کے درمیان مصالحت ہو جائے گی اور ناراضی کے اس دور میں ہونے والی کوئی بھی بات عمر بھر کے لیے بھلائی نہیں جائے گی۔ الفاظ کے گھاؤ عمر بھر نہیں بھرتے اور کسی غلط سلط بات سے دلوں کے شفاف آئینے میں پڑ جانے والا بال کبھی صاف نہیں ہوتا، انہوں نے اپنے بچوں کو خاموش رہ کر تیل اور اس کی دھار دیکھنے کو کہا تھا تو ان کی پالیسی کام آ گئی تھی۔ وہ ایک معاملہ فہم خاتون تھیں اور جانتی تھیں کہ انہیں کس طرح اپنی چال چلنی ہے، میں ایک دن ان سے پوچھ ہی بیٹھی تھی کہ وہ کیا سوچتی ہیں کہ آپا کا معاملہ کس طرح حل ہوگا۔

''بخدا اماں، میرے لیے وہ کوئی بوجھ نہیں ہیں، نہ ہی میں عصمت آپا اور زینت آپا کی طرح ہوں کہ جنہیں اپنے ماموں کی حمایت کرنی ہے، آپا حلیمہ آپ کے اور ابا جی کے گھر پر ہیں، میرے اوپر ان کا رتی برابر بھی بوجھ نہیں، صرف جاننا چاہ رہی ہوں، آپ کو کیسے لگتا ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا؟''

''مجھے کوئی شک نہیں تمہاری نیت پر بیٹا اور نہ ہی میں تمہارے سوال کو غلط سمجھ رہی ہوں۔'' انہوں نے کہا تھا۔

''حالات کیسے ٹھیک ہوں گے...... اس وقت کچھ کہہ نہیں سکتی مگر مسئلہ یہ ہے کہ میں اس وقت اگر حلیمہ کے ہر مطالبے کی حمایت کروں تو اس کے دل میں یہ بیٹھ جائے گا کہ وہ بالکل صحیح ہے۔ پانچ بچوں کے ساتھ وہ اپنے باپ کے گھر تو آ بیٹھی ہے مگر بھائیوں کے گھروں میں اس کا پانچ بچوں کے ساتھ گزارہ نہیں ہوگا، آج ہم ہیں، کل کو نہیں ہوں گے...... میکے کا سارا مان تو ماں باپ سے ہوتا ہے اور پھر اس کے شوہر نے شادی کر لی ہے تو کیا ہم اسے مجبور کریں کہ وہ اسے طلاق دے؟ نہیں بیٹا، بیٹیاں سب کی ایک جیسی ہوتی ہیں، کیوں ہم کسی کی بیٹی کو واغدار کریں۔ یہ سچ ہے کہ کوئی عورت سوتن برداشت نہیں کر سکتی مگر حلیمہ کو وہاں رک کر اپنے شوہر سے بات کرنی چاہیے تھی، اپنے ساس، سسر سے بات کرتی اور اپنے اور اپنی سوتن کے لیے حقوق کی حدیں مقرر کرواتی، اس کا شوہر صاحب حیثیت ہے، دو چھوڑ چار بیویاں رکھ سکتا ہے، یہ کہتی تو وہ اسے علیحدہ گھر میں رکھتا اور یہ اپنے اسی خاندانی گھر میں رہتی مگر اس نے بے وقوفی کی کہ گھر چھوڑ کر آ گئی۔''

''کوئی بھی عورت ہوتی تو ایسا ہی کرتی اماں جی!'' میں نے ان سے کہا۔

''ہاں ایسا ہی ہوتا...... تو پھر وہ عورت یہ تو نہ سوچے کہ اس کی خالی کی ہوئی جگہ کوئی اور نہ لے......'' اماں جی نے کہا۔ ''اس کے ساس، سسر کئی بار آئے، ناک تک رگڑی کہ یہ چل کر اپنے گھر میں رہے مگر اس کی اپنی ہٹ! اسی لیے تو اپنی ان بھابیوں کے مزاج دیکھنا پڑے اسے کہ یہ ان کے نانا، نانی کو ہر بار بے عزتی کر کے اٹھا دیتی ہے...... وقت آئے گا کہ اسے احساس ہوگا، اس نے غلط کیا اور اس وقت یہ میرے رویے کو غلط اور بزدلی پر مبنی سمجھتی ہے، جان جائے گی کہ عزت اسی میں ہے کہ گھر کے معاملات کو گھروں میں ہی سمیٹا جائے...... اجڑ کر آئی ہوئی عورت کی کوئی عزت نہیں ہوتی بیٹا!'' انہوں نے ایک تلخ حقیقت بیان کی تو مجھے ان کے چہرے کی جھریوں میں سے جھانکتے اس درد کا اندازہ ہوا جو وہ خوب صورتی سے چھپا لیتی تھیں، ماں تھیں...... بیٹی کی تکلیف کو خود پر جھیلتی تو تھیں مگر اپنا بہادری کا ماسک کیسے اتار دیتیں، برداشت کر رہی تھیں اور ان کے تو جسم کا رواں، رواں بیٹی کے لیے دعا گو رہتا ہوگا۔

''ہاں بیٹی......'' انہوں نے بہت بعد میں مجھے ایک دفعہ کہا تھا، جب میرے ہاں گل بانو بھی پیدا ہو چکی تھی۔ ''حلیمہ کو دل کڑا کر کے بڑی بانو کا رشتہ ضرور دے دینا بیٹی، اس کا ناتا میکے سے صرف اس رشتے کے باعث ہی قائم رہ سکے گا...... بڑی دونوں تو یوں بھی دل کی کھوٹی ہیں اور پھر ان سے اس کا رشتہ میکے کی طرف سے بھی ایسا ہے کہ اس میں بہت پیچیدگیاں ہیں، کوئی کمی کسر اعظم میں ہوئی بھی تو حلیمہ اپنی بھتیجی کا خیال رکھے گی، یوں بھی اپنا مارے بھی تو چھاؤں میں ہی ڈالتا ہے، اس گھر کی بیٹی ہے، اگلی نسل میں کوئی رشتہ نہ بنا تو میری بیٹی اس گھر سے کٹ جائے گی۔''

میں نے ان کے اس سبق کو اپنے ذہن میں گرہ دے کر باندھ لیا تھا، ابھی تو اس میں بہت وقت تھا، ابھی تو شہر بانو سولہ برس کی ہوئی تھی......مگر......

چند برس پنکھ لگا کر اڑ گئے...... اماں جی کو اچانک فالج ہوا اور وہ بستر پر پڑ گئیں، گھر کے نظام کے سارے تاگے بکھرنے لگے......تب ایک رات ابا جی نے ہم سب کو بلایا اور ہم سر جھکائے سب اماں کی چارپائی کے گرد بیٹھ گئے تھے، ان کے منہ سے ادا ہونے والے الفاظ ہمیں کوشش کے بعد سمجھ میں آتے تھے......انہوں نے ابا جی سے کہا کہ وہ سب کو قریب کر کے بٹھائیں پھر وہ مخاطب ہوئیں۔

''میں اب بستر پر پڑ گئی ہوں اور اس قابل نہیں رہی کہ اپنے گھر کے معاملات کو دیکھ سکوں، میں تم سب سے کچھ اہم باتیں کرنا چاہتی ہوں......غور سے سننا اور انہیں میری وصیت سمجھ لینا۔'' وہ سانس لینے کو رکیں تو بھی ہم ہمہ تن گوش تھے۔

''بھائی، بھائی کی طاقت ہوتا ہے، کبھی کسی جائداد یا عورت کی خاطر آپس میں بھائی، بھائی نہ علیحدہ ہوتا...... کسی بھی معاملے پر فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کرنا، حلیمہ کا معاملہ تم سب لوگوں نے دیکھ لیا کہ اللہ نے کیسے طریقے سے سلجھا دیا، جو ہم جلد بازی میں کچھ ایسا ویسا کر دیتے تو وہ ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے اس گھر سے فارغ ہو جاتی۔ اکلوتی بہن ہے تمہاری، اس کا خیال رکھنا، اس کا کوئی حق غصب نہ کرنا، اللہ کا دیا بہت کچھ ہے تم لوگوں کے پاس، اسے اس کا حق ضرور دینا، ہاں اگر وہ خود دست بردار ہو جائے یا تم لوگوں کو اپنا حصہ بیچ دے یا تم میں سے کسی کو یا تم سب کو ہبہ کر دے......'' ان کی سانس پھر پھول گئی تھی۔

''حلیمہ نے اپنے بیٹے اعظم کے لیے شہر بانو کا رشتہ بھائی سے سب کی موجودگی میں مانگا تھا اور نور احمد اور اس کی بیوی کی طرف سے خاموشی ان کی رضا مندی ٹھہری...... سارے بھائی اپنی بہن سے قرابت داری رکھنا، تمہارے گھروں میں بھی بیٹیاں ہیں۔ عباس اور ہاجرہ کا رشتہ منور احمد اور سکندر احمد کی باہمی رضامندی سے طے پایا ہے...... ہاجرہ، منور احمد کی اکلوتی اولاد ہے، اسے خاندان سے باہر تو بھیجا نہیں جا سکتا، دونوں کی مائیں آپس میں بہنیں اور باپ آپس میں بھائی ہیں، مستقبل میں ہونے والا یہ رشتہ ان رشتوں کو اور بھی مضبوط کر دے گا مگر میرے نور احمد کو کبھی تنہا نہ کرنا، آپس میں مزید رشتے داریاں تم سب کے مابین محبت پیدا کریں گی، میں کچھ رشتے تجویز کرتی ہوں، اگر تم لوگوں کو اعتراض نہ ہو تو...... دل چاہے تو ماں کی بات مان لینا ورنہ جو تم لوگ خود مناسب سمجھو......'' وہ رکیں۔

''اللہ آپ کو سلامت رکھے اماں جی!'' سکندر لالہ نے سسک کر ماں کا ہاتھ تھام لیا تھا، میں تو وہ سب بہت روانی میں بتا رہی ہوں، اماں تو بہت رک، رک کر بول رہی تھیں اور ان کے الفاظ ٹوٹے پھوٹے بھی تھے ان میں ربط کی بھی کمی تھی، نصف رات بیت چکی تھی، انہوں نے کہا کہ حلیمہ کو بھی بلوا لیں تو ابا جی نے کہا کہ رات بہت بیت چکی تھی اور سردی میں وہ بے آرام ہو گی، اسے صبح بلوا لیں گے۔

''کل کس نے دیکھی ہے چوہدری صاحب......'' انہوں نے کھانس کر کہا تھا تو ابا جی نے کسی کو بھیجا کہ وہ جا کر حلیمہ آپا کو ساتھ ہی لے کر آئے......'' سکندر احمد، تمہیں اللہ نے تین بیٹوں سے نوازا ہے، عباس کے لیے تم نے ہاجرہ کو مانگ لیا ہے......موسیٰ کو حلیمہ کی بڑی بیٹی تسنیم سے اور سلطان کو نور احمد کی بیٹی، مہربانو سے......''

''مگر ابا جی......'' نور احمد نے فوراً کہا۔'' مہر بانو کی بات تو اس کی پیدائش پر ہی اس کے ننھیال میں طے ہے۔'' ابا جی نے اماں کو بتایا تو ذرا کی ذرا انہوں نے چند لمحے رک کر کچھ سوچا۔

''چلو......گل بانو بھی تو ہے ناں ذرا سا عمر کا فرق زیادہ ہو جائے گا مگر اس میں کوئی حرج نہیں ہے......نور احمد......تم اپنے اقبال کے لیے حلیمہ کے ہاں سے تبسم کا رشتہ لے لینا اور کمال احمد کے لیے سکندر کی بیٹی عائشہ کا......''

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ ”کسی کو کوئی اعتراض ہو تو ابھی بتا دے۔“ انہوں نے سوال کیا، سب خاموش رہے، فوری طور پر کوئی ردِعمل کیا ہوتا اور یوں بھی اماں کی حالت اس بات کی متقاضی تھی کہ خاموش رہا جائے۔
حلیمہ آپا بھی پہنچ گئی تھیں، اماں نے انہیں پاس بیٹھنے کو کہا، وہ روتی ہوئی اماں کا ہاتھ تھام کر بیٹھ گئیں، ان کے شوہر کرم یار بھی ان کے ہمراہ تھے، وہ ابا جی کے پاس بیٹھ گئے۔ ”حلیمہ میں نے تم سے پہلے جو باتیں کی ہیں ان کے بارے میں تمہارے ابا جی تمہیں بتا دیں گے، کچھ اہم باتیں میں تمہیں بتاتی ہوں۔“ اماں جی نے روتی ہوئی حلیمہ آپا کو ان کے بچوں کے طے کیے جانے والے رشتوں کی بابت بتایا، وہ سر ہلا کر سنتی رہیں۔ ”دو بیٹیاں اور ایک بیٹا اپنی سسرال میں بیاہنا حلیمہ...... تین بچے میکے میں اور تین سسرال میں، دونوں طرف اعتدال بھی رہے گا اور تمہاری تعلق داری ہمیشہ مضبوط!“ اس کے بعد اماں جی نے ابا جی سے کہا کہ ”وہ سب اولادوں کے معاملات میں ہمیشہ عدل سے کام لیں، خاندان تب مضبوط ہوتا ہے جب سب باہم اتفاق سے رہیں، چونکہ سیاسی گھرانا ہے تو اسے متحد رہنا چاہیے، جو بھی فیصلہ ہو وہ چوہدری محمد اسلم یعنی آپا کے سسر اور ابا جی ہمیشہ مل کر کریں اور آپس کی مخالفت سے گریز کریں۔“ سب ہمہ تن گوش تھے۔
”اس کے بعد آتی ہے سب سے اہم بات......“ انہوں نے یہ کہہ کر توقف کیا۔ ”میرے بعد، جس طرح اس گھر کے معاملات کو میں چلاتی تھی، اس گھر کے اہم کام، اہم فیصلے...... نور احمد کی بیوی کی ذمے داری ہوں گے، اس گھر کی تمام چابیاں جو پہلے میرے پاس ہوتی تھیں، میرے بعد اس کے پاس ہوں گی، میں جانتی ہوں کہ وہ ایسے اوصاف رکھتی ہے، عصمت اور زینت کو اس بات سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اس گھر پر قابض ہو جائے گی یا اسے چابیاں دینے کا مقصد، ان دونوں کو بے دخل کرنا ہے......“ ابا جی نے چابیوں کی مخملیں تھیلی، جو اماں جی بتایا کرتی تھیں کہ ان کی ساس نے ان کے حوالے کی تھی، میری طرف بڑھائی، میں جھجک گئی اور ہاتھ نہ بڑھایا مگر ابا جی کا ہاتھ وہیں تھا، اماں جی کی نحیف آواز نے مجھے چونکا دیا۔
”کیا بات ہے حوا؟“ میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ”تمہیں میرے اس یا کسی بھی اور فیصلے پر کوئی اعتراض ہے؟“ مجھے تاب نہ تھی کہ نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھتی یا لب کشائی کرتی، خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھی رہی۔
”حوا......“ حلیمہ آپا کی آواز آئی۔ ”اماں تم سے کچھ پوچھ رہی ہیں۔“ انہوں نے ابا جی کے ہاتھ سے چابیوں کی تھیلی لی اور میری گود میں رکھ دی۔
”اماں جی!“ میں سسکی۔ ”اللہ آپ کو سلامت رکھے، مجھ پر ایسا بوجھ نہ ڈالیں...... میں اس کی متحمل نہیں ہو سکتی، میں کب آپ جیسی بن سکتی ہوں، آپ جیسی صابر، عاقل اور متحمل مزاج!“
”میں جانتی ہوں کہ تم کس قابل ہو......“ اماں جی کے کہنے پر میں نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا، آنسوؤں کی دھند کے پار مجھے ان کے چہرے کے نقوش بھی واضح نظر نہیں آ رہے تھے مگر ان کی چارپائی کے دوسری طرف بیٹھی ہوئی ان دونوں بہنوں کو چہرے پر سختی لیے ہوئے پہلو بدلتے ضرور دیکھا۔
”سو جاؤ اب سب لوگ جا کر......“ اماں جی نے محفل برخاست ہونے کا حکم جاری کیا۔ ”ہاں ایک اور خواہش ہے جسے شاید دل میں لیے چلی جاؤں گی......“ انہوں نے کہا تو ہم سب نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”اگر مجھے اپنی اولادوں کی اولادوں میں سے پہلی خوشی دیکھنے کو مل جاتی، ان کا اشارہ یقیناً شہر بانو اور اعظم کی شادی کی طرف تھا، میرے دل پر گھونسا سا پڑا، ابھی تو وہ بچی ہی تھی مگر کسے مجال تھی جو ایک لفظ بھی کہتا، حلیمہ آپا کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا اور یوں ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی طرح دونوں گھروں میں شادی کی تیاریاں ہونے لگیں، ہماری طرف دن رات جہیز بنانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو آپا کے گھر پر رنگ و روغن کا کام شروع کر دیا گیا تھا، دونوں

گھروں میں کھانے پکوانے کے انتظامات جاری تھے۔ آپا کے گھر پر منوں کے حساب سے مٹھائی بن رہی تھی، دو ہفتے بعد ہی جمعے کا دن طے پایا تھا مگر......

''یہ تو سراسر ناانصافی ہے میرے ساتھ......'' عباس ماں کے سامنے مچل اٹھا۔ ''یا تو میری بھی شادی ساتھ ہی کریں یا پھر پہلے اماں...'' اس کی بات بھی بچپن سے طے تھی اور تین ماہ پہلے ہی باقاعدہ منگنی بھی کر دی گئی تھی۔ ''جو رشتہ دادی جان نے چند دن پہلے طے کیا ہے اس کی جلدی پڑی ہے سب کو پھر ان کے گھر میں بڑی بانو کی شادی ہو رہی ہے...... اعظم مجھ سے بڑا سہی مگر ہاجرہ تو بڑی بانو سے بڑی ہے۔''

عصمت آپا ابھی اسے چھوٹا سا بچہ ہی سمجھتی تھیں، اس کی باتیں سن کر انہیں لگا کہ وہ تو شادی ہوتے ہی کام سے جائے گا کہ اس کی دلچسپی ہاجرہ کے ساتھ جانتی تھیں اور یہ بھی جانتی تھیں کہ ہاجرہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اور نازوں پلی بیٹی ہے تو اسے عباس بھی ناز سے ہی رکھے گا، دل میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اپنے بیٹے کی محبت تقسیم ہونے کا خوف دل میں بسیرا کر گیا تھا، انہوں نے اپنے شوہر اور دیور سے بات کرنے کا سوچا۔

☆☆☆

اماں کو شاید قدرت کی طرف سے اشارہ مل گیا تھا جو انہوں نے اپنے بچوں کو بلا کر تفصیل سے اور واضح احکامات دے دیے تھے۔ اس کے دو تین دن کے بعد ہی وہ ایسا سوئیں کہ جاگی ہی نہیں...... ہم سب پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی تھی، وہ اپنی زندگی بہت اچھے انداز میں گزار کر گئی تھیں۔ اپنے آخری دو چار دن میں انہوں نے مجھے ان لوگوں کی تفصیلات بتائی تھیں جنہیں وہ باقاعدگی سے کچھ نہ کچھ بھجواتی تھیں، زکوٰۃ، صدقات و خیرات کی مد میں۔

''شہر بانو کی شادی کی تیاریاں کر رہی ہو تو دیکھنا کہ کس غریب گھر میں کسی بچی کی شادی ہے، ساتھ اس کا بھی کچھ ضروری سامان بنوا لینا، جب بھی اپنے گھر میں کوئی شادی ہو تو لازمی چیک کر لیا کرنا کہ کسی غریب کی شادی بھی ساتھ میں کروا دینا، اس میں تو اتنا خرچہ نہیں اٹھے گا مگر اپنے بچوں کی خوشیوں کی زکوٰۃ نکل جاتی ہے......'' میں نے منشی جی کو بلا کر ان تمام لوگوں کی ایک فہرست تیار کروالی اور یہ کہ کس، کس کی کیا مدد امداد کی جاتی تھی، اماں نے کہا کہ مجھے ہمیشہ اپنے اردگرد نظر رکھنی چاہیے اور یہ کہ کبھی کسی ضرورت مند کو نظر انداز کروں نہ کسی ہاتھ پھیلانے والے کو خالی لوٹاؤں، ان کا دیا ہوا یہ درس میں نے اپنے پلو سے باندھ لیا تھا۔

ان کے چلے جانے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کیسی چھتر چھاؤں تھیں...... ہمارے سروں پر کبھی کوئی بوجھ ہی نہیں پڑا تھا نہ عمر کے اتنے سالوں میں یہ اندازہ ہوا تھا کہ ذمے داری کس چڑیا کا نام ہے، ہم سب اپنے، اپنے بچوں اور شوہروں کی ذمے داریوں کو بغیر کسی اور مصروفیت کے نبھا رہی تھیں۔ ہمارے بچے اب جوانی کی سرحدوں کو چھونے لگے تھے، میرے بچے باقی سب کے بچوں سے چھوٹے تھے مگر شادیوں کا وقت آیا تو قرعہ سب سے پہلے میری بیٹی کے نام نکلا، حالانکہ یہی شادی عباس اور ہاجرہ کی بھی کہہ سکتی تھیں اماں جی مگر انہیں شاید آپا کے چہرے پر چھلکتی خوشیوں کے رنگ دیکھنا تھے۔

کھانے کا جو سامان شادی پر استعمال ہونا تھا وہ اماں جی کی وفات کے بعد ان کے قل تک استعمال ہوتا رہا تھا، مٹھائی جو بن چکی تھی اسے غریب بستیوں میں بھیج دیا گیا تھا، اماں جی کی وفات کے بعد دوسری جمعرات تھی جب آپا کے شوہر نے رات کو ابا جی سے بات کی کہ کل کا دن وہ تھا جو اماں جی نے خود اپنی پوتی اور نواسے کی شادی کے لیے طے کیا تھا، ابا جی حیرت سے ان کا چہرہ دیکھ رہے تھے، کوئی ایسا سنگ دل کیونکر ہو سکتا ہے...... مگر ایک وہی نہیں، برادری کے کئی لوگوں نے ان سے کہا کہ اماں جی کے مقرر کردہ دن پر نواسے اور پوتی کا نکاح سادگی سے کر دیں تو...

اباجی نے یہ مسئلہ اپنے بیٹوں کے سامنے رکھ دیا، اس پر سب خاموش تھے، اباجی جو بھی فیصلہ کرتے وہ سب کو منظور ہوتا۔

یوں اگلے ہی دن یعنی روزِ جمعہ شہر بانو سادگی سے نکاح کے بعد رخصت ہو کر اعظم کے سنگ سدھاری، آپا نے ولیمہ اماں کے چہلم کے بعد کا مقرر کیا تھا۔ میری معصوم سی شہر بانو، سادہ سی دلہن بنی تھی مگر اس پر ٹوٹ کر روپ آیا تھا، کم عمری اور اس پر سادگی اور معصومیت نے مل کر اسے چار چاند لگا دیے تھے۔ دو دن کے بعد وہ اعظم کے ساتھ میکے آئی تو اس کے چہرے پر حیا کے کئی رنگ بکھرے ہوئے تھے اور ان رنگوں کے بیچ مجھے خوشی اور اطمینان کا رنگ بھی نظر آیا تو میں اماں کے فیصلے کی قائل ہو گئی۔ میری بیٹی کے دل کے کچے آنگن میں اعظم کی محبت کے بیج نے جڑ پکڑ لی تھی، وہ خوش تھی اور میں بھی خوش تھی۔

اعظم اور شہر بانو کی شادی تو آغاز ٹھہری، سارے ہی بچے سال کے سال جوان ہو رہے تھے۔ ایک کے بعد دوسری شادیاں طے پانے لگیں...... مگر جو نہ ہوئی تھی تو ابھی تک عباس اور ہاجرہ کی شادی نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے تشویش تھی، جانے ان کے والدین کو کیوں تشویش نہ تھی۔ میں نے اس معاملے پر پہلے نور احمد سے اور پھر اباجی سے بھی بات کی تھی مگر ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

☆☆☆

''کیوں شادی نہیں کرنا چاہتے تم ابھی عباس؟'' ماں نے اسے پکڑا تھا۔

''اماں میں ہاجرہ سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

''میں سمجھ گئی کہ تم ابھی شادی نہیں کرنا چاہتے......''

''ابھی نہ کبھی...... مگر ہاجرہ سے کبھی نہیں!'' اس نے ماں کی بات کاٹ کر کہا۔

''کیوں نہیں کرنا چاہتے تم ہاجرہ سے شادی؟'' انہوں نے چتون چڑھا کر پوچھا۔

''کیونکہ اب وہ مجھے اچھی نہیں لگتی۔'' اس نے صاف کہا۔

''کوئی تو سبب ہوگا جو اب تمہیں وہ بری لگنے لگی ہے؟'' انہوں نے پھر پوچھا۔ ''کیا کوئی اور ہے جو......؟''

''اماں کبھی شہر جا کر دیکھو اور شہر کی لڑکیاں......''

''ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی عباس پتر......'' ماں نے اسے سمجھانے کو کہا۔ ''ٹھیک ہے تمہیں کوئی لڑکی اچھی لگی ہے تو لازمی نہیں کہ اس کا پس منظر بھی اچھا ہو، اس کا خاندان اور برادری بھی وہی ہو جو ہماری ہے۔''

''خاندان اور برادری سے کیا ہوتا ہے اماں؟'' وہ ٹھنکا۔

''جب نور پور کے نمبرداروں کے خاندان کی ساری لڑکیاں ختم ہو جائیں تو اس کے بعد سوچا جا سکتا ہے کہ اب ہم برادری سے باہر نکلیں!''

''اماں وہ بہت اچھی ہے......'' اس نے زور دے کر کہا۔

''ہوگی...... دنیا میں اور بھی بہت سی اچھی لڑکیاں ہوتی ہیں تو کیا تم سب سے شادی کرو گے؟'' انہوں نے غصے سے کہا۔ ''جانے کون کم نسل اور کم ذات عورتیں ہوتی ہیں جو مردوں کو پھانس لیتی ہیں۔''

''مسلمان ہونا اہم ہے اماں، ذات پات کا کیا ہے......'' وہ گھگیایا۔ ''اور وہ ایسی ویسی لڑکی بھی ہرگز نہیں اماں!''

''عباس...... میری لاش کے اوپر سے گزر کر اس گھر میں ہاجرہ کے علاوہ کوئی اور لڑکی آئے گی سمجھے تم۔'' انہوں نے اپنی مخصوص ٹون میں کہا تھا۔ ''بہتر ہے کہ اس کے علاوہ اس موضوع پر ہم کوئی اور بات نہ کریں۔'' ان کا انداز حتمی تھا۔

''اگر آپ کی شرط اتنی کڑی ہے تو آپ سن لیں...... میں بھی ہاجرہ سے جیتے جی شادی نہیں کرنے والا۔'' وہ بھی انہی کا بیٹا تھا، انہی کے جوش وجذبے کے ساتھ کہہ کر گھر سے نکلا۔

''تم دیکھو گے اور زمانہ بھی دیکھے گا کہ تمہاری شادی ہاجرہ کے ساتھ ہی ہوگی۔'' انہوں نے پورے یقین سے کہا تھا۔

☆☆☆

''جوان اور اکلوتی اولاد ہے آپا، اس پر اتنی سختی نہ کریں۔'' نور احمد بڑی جرأت سے ان کے سامنے بیٹھے بات کر رہے تھے۔ ان کے دل میں بھابی کا احترام تھا اور اپنی ماں کی وفات کے بعد انہوں نے انہیں ماں جیسا سمجھ لیا تھا اور اسی طرح ان سے بات کرتے تھے۔

''نور احمد......'' ان کے لہجے میں غصہ تھا۔ ''ہاجرہ صرف منور کی نہیں تمہاری بھی بیٹی ہے، اس کی پہلی سانس سے لے کر اس کے دماغ میں یہ بات ڈالی گئی کہ اس کے لیے عباس کیا ہے، یہ رشتہ عباس کے ابا نے اپنی خوشی سے لیا تھا، اب تم کہہ رہے ہو کہ میں عباس کی بات پر غور کروں اور زبردستی ہاجرہ سے اس کا بیاہ نہ کروں؟''

''مانتا ہوں آپا کہ ہاجرہ میری بھی بیٹی ہے، اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ میں نہیں چاہتا کہ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی عباس کے پلے باندھ دیا جائے۔ ہاجرہ ہمارے خاندان کی سب سے پیاری بچی ہے اور وہ اگر عباس کے ساتھ خوش نہیں ہوگی تو ہم سب کے لیے اسے یوں دیکھنا تکلیف کا باعث ہوگا۔'' انہوں نے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔

''اسے کیوں ناخوشی ہوگی نور احمد؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ ''عباس میں کیا کمی ہے جو ہاجرہ خوش نہیں ہوگی؟''

"عباس میں کوئی کمی نہیں آپا مگر ہاجرہ جب عباس کو پسند نہیں ہوگی تو وہ اسے خوش نہیں رکھ سکے گا......"

"میں تو اس دن کو پچھتاتی ہوں جب میں نے خود آپ دونوں سے کہہ کر عباس کو شہر والے کام پر لگانے کو کہا تھا، سوچتی تھی کہ اسے ہر طرح کا کام سنبھالنا آ جائے گا، دس جماعتیں پڑھا ہے تو خاندانی کاروبار کا حساب کتاب بھی دیکھے گا...... مجھے کیا علم تھا کہ شہر جا کر اس کے دماغ میں کیا خناس سما جائے گا۔"

"ہم اس کی بات سن لیتے ہیں آپا!" نور احمد نے تجویز دی۔ "اس کی رائے پوچھ لیتے ہیں، جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسے کس طرح کی لڑکیاں پسند ہیں، اگر اسے پڑھی لکھی لڑکیاں پسند ہیں تو ہم ہاجرہ کو اتنا پڑھا لیتے ہیں جتنا وہ خود پڑھا ہوا ہے، وہ ایک ذہین بچی ہے جیسا وہ کہے گا اس رنگ میں ڈھل جائے گی...... اور اگر......"

"اور اگر کیا؟" عصمت بھابی نے چتون چڑھا کر پوچھا۔

"اگر اسے شہر کی کوئی لڑکی پسند ہے تو ہم اس کا شجرہ چیک کر لیتے ہیں۔"

"یہ تم اس لیے کہہ رہے ہو کہ ہم ہاجرہ کے بارے میں بات کر رہے ہیں، مہربانو، شہربانو یا گل بانو کے بارے میں نہیں۔" عصمت نے نور احمد کی بیٹیوں کا حوالہ دیا۔

"بخدا میں نے کبھی ہاجرہ کو اپنی بیٹیوں سے جدا نہیں سمجھا، اگر اس کی جگہ میری بیٹیوں میں سے کوئی ہوتی آپا تو میں خود ہی انہیں ایسے شخص سے نہ بیاہتا جو ان سے شادی کرنے سے انکاری ہوتا۔"

"اس نے کھل کر انکار نہیں کیا...... سال بھر پہلے تو وہ میرے پیچھے پڑا ہوتا تھا کہ میں کل سے پہلے ہاجرہ کو بیاہ کر لے آؤں، میں نے ہی سوچا کہ چند سال اور گزر جائیں تاکہ وہ خاندان کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو سکے، چھوٹی عمر میں بیاہ ہو جائے تو لڑکے ذمے داریوں سے جی کتراتے ہیں، مجھے کیا معلوم تھا کہ میری اپنی سوچ ہی اس کا ذہن بدل دے گی۔"

"یا تو آپ اس وقت اس کی شادی کر دیتیں جب وہ کہہ رہا تھا یا پھر خاموش ہو جائیں اور دیکھیں کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے......"

"ہرگز نہیں، اب میں اونٹ کے بیٹھنے کا انتظار نہیں کروں گی...... تم منور احمد کو بتاؤ کہ اگلی فصل کٹتے ہی بیٹی کی رخصتی کی تیاری کرے...... باقاعدہ تاریخ مقرر کرنے کے لیے تمہیں اور حوا کو اگلے جمعے کو میرے ساتھ چلنا ہوگا......"

ان کی بات اتنی ہی حتمی تھی جتنی اس کے علاوہ ان کی ساری باتیں ہوتی تھیں مگر نور احمد کو اپنے بھتیجے کا مقدمہ لڑنا تھا۔

"اگر ایک بار آپ راضی ہو جائیں اور بیٹھ کر صرف اس کی بات سن لیں آپا؟"

"نور احمد......" غصے سے ان کا چہرہ لال ہو گیا تھا۔ "صرف ہاجرہ کا باپ منور، سکندر کا بھائی نہیں...... اس کی ماں بھی میری بہن ہے اور اس دوہرے رشتے کی وجہ سے اس رشتے سے انکار مجھ پر اور میرے بیٹے پر اس کے ننھیال اور ددھیال کے سارے دروازے بند کر دے گا، اس لیے اس موضوع کو یہاں پر ختم نہیں، دفن کر کے اٹھو اور بتا دو اپنے لاڈلے بھتیجے کو کہ اس کی ماں، اس کے باپ کی دی ہوئی زبان سے اپنی زندگی میں نہیں پھرے گی، ہاں میں مر جاؤں تو وہ جو جی کرتا پھرے...... میں کچھ کھا کر سو رہوں گی اور اسے اپنا دودھ بھی نہ بخشوں گی۔"

☆☆☆

"تم ہی اپنی ضد چھوڑ دو عباس......" نور احمد اس کے سامنے بے بسی کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ "ابھی تو بات اپنے گھر میں ہی ہے، یہاں سے باہر نکلے گی تو جانے کیا، کیا طوفان اٹھیں گے، بھابی تو بالکل سختی سے اپنے موقف پر قائم ہیں۔ ان کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں، ان پر تنقید یا مخالفت کی جرأت تو آج تک ہم میں نہیں پیدا ہو سکی۔ ہم انہیں بڑی بہن نہیں بلکہ اپنی ماں جیسا سمجھتے ہیں۔"

''چاچا جی...... نہیں کر سکتا میں ہاجرہ سے شادی اور نہ ہی میں اس کو خوش رکھ سکتا ہوں، وہ مجھے اچھی لگتی تھی سال بھر پہلے تک...... مگر اب نہیں چاچا! وہ اپنے ماں باپ کی بڑی لاڈلی اور اکلوتی بیٹی ہے، میں انہیں ان کی بیٹی کی وجہ سے ناخوش نہیں دیکھ سکتا کیونکہ وہ میرے چاچا اور خالہ ہیں۔''

''بات ایک یا دو گھروں کی نہیں عباس...... بیٹا یہ بات اب دو خاندانوں میں ہے، دو خاندان ٹوٹ جائیں گے بیٹا تمہارے انکار کے بعد ہم کس سے ملیں گے اور کس کو نہیں، سارے خاندان کے لیے مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔''

''خاندان کی مشکلات کے حل کے لیے میں خود کو مشکل میں تو نہیں ڈال سکتا ناں چاچا جی!'' اس نے بے بسی سے کہا۔ ''میرا دل ہی نہیں مانتا، میں کیا کروں، ہاجرہ سے میں بیاہ کر بھی لوں تو میں اس کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتا، آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔''

''کوئی بھی بیوی اپنے شوہر سے یا شوہر اپنی بیوی سے مکمل خوش نہیں ہوتے۔'' نور احمد نے مسکرا کر اس کا موڈ خوشگوار کرنے کی کوشش کی۔ ''تم بھی کوشش کرو تو ایک عام آدمی جتنا خوش کر ہی لو گے اسے...... زندگی میں ہمیں کتنے ہی معاملات میں جبر کرنا پڑتا ہے، ایک تم بھی کر لو، مرد ہو یار...... مردوں کی زندگیوں میں کئی عورتیں حادثات کی طرح آتی ہیں اور بہتے ہوئے پانی کی طرح چل دیتی ہیں، اب ہر موڑ پر رک کر عمریں تو نہیں گزاری جا سکتیں ناں۔''

''چاچا جی، میں پچیس سال کا ہو گیا ہوں اب اور اپنا اچھا برا سمجھتا ہوں، جانتا ہوں کہ میری طبیعت اب ہاجرہ کی طرف مائل نہیں ہو گی، دل پر جبر بھی نہ کر سکوں گا کہ دل تو میرے پاس رہا ہی نہیں......'' نور احمد اس کے یوں برملا اظہارِ محبت پر شرمندگی سی محسوس کرنے لگے۔

''میں پھر کوشش کروں گا بیٹا، بھابی سے بات کرنے کی، تم کسی اور سے بات نہ کرنا، میں نے حوا کو بھی کچھ نہیں بتایا، بھابی تو اگلے جمعے کو تمہاری شادی کی تاریخ مقرر کرنا چاہتی ہیں۔''

''میں گھر سے بھاگ جاؤں گا چاچا جی اگر کسی نے میرے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی تو......''

''اچھا بیٹا...... دھیرج...... میں کوشش کروں گا دوبارہ!'' نور احمد اندر سے لرز گئے تھے، جوان اولادوں کی سرکشی کا سامنا کرنا کتنا مشکل کام ہوتا ہے، انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان سے اتنا پیار کرنے والا اور اتنا فرمانبردار بھتیجا ان کے سامنے اس لہجے میں بات کر رہا تھا، اتنا اڑیل ہو رہا تھا۔ سکندر بھائی کا یہ بیٹا، ان کے باپ کی نسل کا پہلا بچہ، خاندان بھر کا کتنا لاڈلا تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب سکندر بھائی نے ہاجرہ کی پیدائش پر ہی منور بھائی سے اسے مانگ لیا تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔

''کچھ اور مانگا ہوتا بھائیا جی...... یہ تو ہے ہی آپ کی بیٹی!'' منور احمد نے بھائی کا مان بڑھا دیا تھا، عصمت بھابی کا مزاج غصے والا تھا مگر ابھی ان کی بیٹی ہاجرہ کا ان کے مزاج سے بطور بہو پالا پڑنے میں جانے کتنے سال تھے اور اتنے وقت میں تو انسان کے مزاج کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔

''عباس......'' نور احمد نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ ''بیٹا مجھے کچھ بتاؤ اس لڑکی کے بارے میں تو میں بھابی سے بات کرتا ہوں دوبارہ... اگر مجھے اس کے ماں باپ سے ملوا دو تو میرے لیے تمہارا مقدمہ لڑنا اور بھی آسان ہو جائے گا۔''

''اس کا نام الفت ہے چاچا جی......'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''اور اس کی امی کا نام زرقا!''

''امی کے نام کا کیا کرنا ہے بیٹا......'' انہوں نے فوراً کہا۔ ''مجھے اس کے ابا کا نام اور کام بتاؤ۔''

''اس کے ابا؟'' وہ جیسے بڑبڑایا تھا۔
''اوہو...... ''نور احمد نے خود ہی نتیجہ اخذ کرلیا۔'' کیا نہیں رہے وہ؟''
''پتا نہیں...... ''غائب دماغی سے وہ بولا۔ ''مجھے نہیں معلوم!''
''کیا مطلب؟'' انہوں نے حیرت سے کہا۔ ''کیا تمہیں یہ نہیں معلوم کہ اس کے ابا زندہ ہیں یا کہ......''
''نہیں چاچا...... ''وہ اسی کھوئے، کھوئے لہجے میں بولا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ اس کا باپ کون ہے...... میرا مطلب ہے کہ اسے نہیں معلوم کہ اس کا باپ کون ہے، اس کی اماں کو شاید۔'' نور احمد کا چہرہ لال ہوگیا، انہیں لگا وہ تھپڑ مار رہا تھا انہیں...... ان کے خاندان کو...... نور پور کے نمبردار خاندان کی عزت کو۔
''تمہارا اس سے تعلق کوئی حد تو پار نہیں کر گیا؟'' وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں بہت کچھ کہہ گئے تھے۔
''ارے نہیں چاچا...... وہ ایسی ہرگز نہیں ہے، وہ تو مجھے اپنی انگلی بھی نہیں چھونے دیتی، وہ مجھے اچھی لگتی ہے، میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر وہ ویسی ہرگز نہیں جیسا آپ سمجھ رہے ہیں، مجھ سے پیار کرتی ہے وہ بھی چاچا' مگر کہتی ہے کہ مجھ سے شادی اس وقت تک نہیں کرے گی جب تک اس کے ہاں میرے خاندان سے کوئی رشتہ مانگنے نہیں جائے گا۔''
''اور تمہیں لگتا ہے کہ اس خاندان سے کوئی رشتہ مانگنے جائے گا؟'' نور احمد نے کہا۔ ''مر کر بھی نہیں!'' ان کا انداز حتمی تھا...... اس سے قبل تک تو مجھے نور احمد نے کچھ نہیں بتایا تھا مگر اس روز اپنے بھتیجے سے بات کرکے اور یہ جان کر کہ وہ کسی طوائف کے چنگل میں جا پھنسا تھا، وہ اتنے پریشان تھے کہ مجھ سے کچھ چھپا نہ سکے۔
''تم ہی بتاؤ حوا، میں کیا کروں؟ شرم آتی ہے یہ سوچ کر بھی کہ یہ کیا کر رہا ہے، کس طرح خاندان کو ٹکڑے، ٹکڑے کرنے پر تلا ہوا ہے، جو اماں اور ابا زندہ ہوتے تو یہ سن کر زندہ نہ رہتے، میں بھی سن کر اندر سے ختم ہی تو ہوگیا ہوں۔''
''ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے اور اللہ اس مشکل کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکالے گا، انشاء اللہ!'' میں نے انہیں تسلی دی تھی۔

☆☆☆

ان کے ذہن میں عجیب سا تاثر تھا یہاں آنے سے پہلے...... وہ تو بازارِ حسن جانے کا سوچ کر شرم سے پانی، پانی ہو رہے تھے کہ جو کوئی آشنا مل گیا تو...... مگر اپنے ذرائع سے چیک کروانے پر انہیں اس متوسط طبقے کی چھوٹی کوٹھیوں کے علاقے کا پتا ملا، وہ عباس کو بھی بتائے بنا آئے تھے۔ تانگا انہیں اتار کر روانہ ہوا تو انہیں اندازہ ہوا کہ تانگے کا کوچوان انہیں کتنی عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا، وہ خوش شکل تو تھے اور کسرتی جسم کی وجہ سے صحت بھی اچھی تھی مگر کنپٹیوں پر سفید بالوں کا نمایاں ہونا ان کی عمر کی چغلی کھاتا تھا۔ پچاس کی دہائی کے آخری سالوں میں تھے...... تانگے والا سوچتا ہوگا کہ اس عمر میں تو مرد توبہ تائب کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور یہ صاحب......
لکڑی کا گیٹ کھلا ہی تھا...... اس گھر میں شاید کچھ ایسا نہ تھا جس کے لٹنے کا ڈر ہوتا اس لیے مکینوں نے گیٹ کھلا چھوڑ رکھا تھا یا یہ ہر کسی کو خوش آمدید کہنے کا کوئی انداز تھا'' اس کوٹھی میں تو ہوسکتا ہے کہ زرقا خود رہتی ہو، کاروبار کہاں اور کس طرح ہوتا ہوگا اس کا؟'' انہوں نے یہی سوچتے ہوئے ہولے سے سیمنٹ کی روش پر اندرونی دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ گھاس کا قطعہ سرسبز تھا اور اس کے کناروں پر اور گھر کی باؤنڈری وال کے ساتھ، ساتھ پھولوں کی کیاریاں تھیں جن میں سے بھینی، بھینی مہک سارے ماحول میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ گھر کے مکینوں میں کوئی باغبانی کا شوقین اور باذوق بھی تھا۔ گھر کے داخلی دروازے کے باہر کھڑے وہ سوچ رہے

تھے کہ اندر کیسے اطلاع کریں، تبھی اندر سے قدموں کی آواز قریب آنے لگی۔ بغیر کھٹکھٹائے دروازہ کھلا تھا، دروازے میں استادہ لڑکی نے ابرو اچکائے...... حلیے سے وہ ملازمہ نہیں لگ رہی تھی، شاید ان کے ہاں کی لازماؤں سے بہتر حلیے میں تھی اس لیے...... انہوں نے الفاظ سوچ کہ اس سے کیا کہیں۔

''مجھے زرقا...... میرا مطلب ہے کہ ان سے ملنا ہے۔''

''آپ کون ہیں جی؟'' وہ بولی تو انہیں اندازہ ہوا کہ وہاں ملازمہ کو بھی ادائیں دکھانے کی تربیت خواہ مخواہ مل گئی تھی۔ ''میڈم کا نام اتنی بے تکلفی سے لے رہے ہیں؟''

''وہ...... مجھے زرقا میڈم سے ملنا ہے۔'' انہوں نے فوراً اپنی اصلاح کر لی۔ ''مجھے ان سے ہی کام ہے، تمہیں نہیں بتا سکتا۔''

''آپ رکیں، میں میڈم سے پوچھ کر آتی ہوں۔'' اس نے دروازہ اپنے پیچھے بند نہیں کیا تھا مگر وہ باہر کھڑے رہے کہ انہیں اندر آنے کو جو نہیں کہا گیا تھا۔ ''آئیں جی!'' تھوڑی دیر کے بعد واپس آ کر اس نے ان سے کہا اور وہ دروازے سے داخل ہوئے، اندر داخل ہوتے ہی راہداری میں پہلا دروازہ کھول کر اس نے انہیں اندر بیٹھ کر انتظار کرنے کو کہا۔ وہ خاموشی سے وہاں داخل ہوئے اور ایسی جگہ بیٹھ گئے کہ ان کا چہرہ اسی سمت تھا جہاں سے وہ اندر آئے تھے تاکہ اندر آنے والے کو وہ بہ آسانی دیکھ سکیں۔

''آداب عرض ہے......'' انہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ انہوں نے فوراً سر اٹھا کر دیکھا مگر سامنے کوئی نہ تھا، آواز عقبی سمت سے آئی تھی، وہ مڑتے مگر تب تک چند قدم چل کر وہ ان کے سامنے آ چکی تھی، لگ بھگ انہی کی عمر کی وہ خاتون، زرقا۔ آج بھی اس کے چہرے پر ماضی کی وہی خوب صورتی، انداز میں وہی تمکنت اور آواز میں وہی لوچ تھا، ان کے ذہن میں اس کی شخصیت کے تاثر کے لیے کوئی لفظ نہ آیا کہ تعلیم کم ہونے کے باعث ان کا ذخیرۂ الفاظ محدود سا تھا، وہ بے اختیار کھڑے ہو گئے، اسے تعظیم دینا مقصد نہ تھا مگر ان سے یہ تعظیم سرزد ہو گئی تھی۔

''ذرہ نوازی ہے آپ کی، بیٹھیے!'' کہہ کر وہ خود ان کے عین ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''شکریہ!'' کہہ کر وہ بھی بیٹھ گئے۔

''کہیے کیسے آنا ہوا سرکار؟'' اس کا لہجہ شستہ مگر الفاظ فلمی سے تھے، انہیں اس کے انداز سے لگا کہ وہ انہیں بھی کوئی ''ضرورت مند'' سمجھ رہی تھی۔ ''کیا خدمت کر سکتی ہوں میں آپ کی؟'' اتنی دیر میں وہی ملازمہ شیشے کے گلاس میں لال شربت طشتری میں رکھ کر لائی اور ان کے سامنے رکھ گئی۔ ''شربت لیجیے۔'' وہ دل ہی دل میں اس کی شائستگی سے متاثر ضرور ہوئے تھے۔ یہ عورت جسے انہوں نے اپنی جوانی میں کبھی فلموں میں دیکھا ہوگا، اس عمر میں اسے جانے کس، کس انداز سے سراہا ہوگا اور شاید اسے آئیڈیلائز بھی کیا ہوگا اور سوچا ہوگا کہ ایسی عورتیں کون سا حقیقت میں ہوتی ہیں، اس وقت ایک مجسم حقیقت ان کے سامنے تھی، ان کا دل چاہ رہا تھا کہ اسے چھو کر محسوس کریں، وہ انہیں اس عمر میں بھی اچھی لگتی تھی کیونکہ اس کے انداز میں عامیانہ پن نہیں تھا۔

''آپ نے فلموں میں کام کرنا کیوں چھوڑ دیا زرقا جی؟'' منہ سے سوال نکلا بھی تو کیا فضول۔

''میں نے اپنے عروج کے دور میں زوار شاہ سے شادی کر لی تھی۔'' اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''آپ جیسے کئی لوگ میرے مداح تھے مگر میں زوار شاہ کی چکنی چپڑی باتوں کے جال میں پھنس گئی اور اس سے شادی کر لی، شادی کے بعد اس نے مجھے گھر پر پابند کر دیا کہ نہ صرف میں فلموں کو خیرباد کہوں گی بلکہ ہر طرح کی سوشل مصروفیات سے کٹ کر رہوں گی، جب ہم جیسی عورتوں کو کوئی عزت والی شناخت ملتی ہے ناں چوہدری صاحب...... تو ہم اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جاتی ہیں، ایسی عزت والی زندگی جس کی وہ عورتیں قدر نہیں کرتیں جن کو یہ پہلے سے

ہی میسر ہوتی ہے...... میں نے بھی سب کچھ مان لیا اور پورے خلوص سے اس کے گھر میں قید ہو کر زندگی گزارنے لگی مگر جلد ہی مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے مجھے محض ایک ڈیکوریشن پیس سمجھ کر اپنے گھر میں سجایا تھا اور جس وفا اور حیا کی وہ مجھ سے توقع کر رہا تھا وہ خود اس میں نہ تھی، میں نے اس کے بارے میں ایسی، ایسی باتیں سنیں کہ یقین نہ آتا مگر پھر اس نے دھڑلے سے سب کچھ میرے سامنے تسلیم کر لیا اور یہ بھی کہ اس نے مجھ سے شادی اس لیے کی تھی کہ وہ مجھے فلم انڈسٹری سے باہر کر دے...... غالباً اسے اپنی کسی پیاری کو وہ مقام فلم انڈسٹری میں دلانا تھا جو اسے میرے ہوتے ہوئے مل نہ پاتا۔''

''اوہو......'' ان کے منہ سے نکل گیا۔

''اس نے مجھے بیچ منجدھار میں تنہا چھوڑ دیا۔ اس مشکل وقت میں ایک ہدایت کار میری زندگی میں آ گیا جس نے مجھے جذباتی سہارا دیا، ہمارے درمیان دوستی پنپنے لگی، یہ جذباتی سہارا محض جذباتی نہ رہا اور اسی دوران مجھے علم ہوا کہ میں ماں بننے والی تھی۔ شعیب سے دوستی کے سات ماہ کے بعد میں نے الفت کو جنم دیا۔ میں نے زوار سے رابطہ کیا اور اسے بتایا مگر اس نے بھی کہیں نہ کہیں سے میرے اور شعیب کے بارے میں اڑتی، اڑتی خبریں سن رکھی تھیں، اس نے اس بچی کی ولدیت سے انکار بھی کر دیا اور مجھے طلاق بھی بجھوا دی...... شعیب نے اس بچی کو تو اپنی بچی نہ مانا مگر مجھ سے خفیہ نکاح کر لیا، اس کی بیوی کو خبر ہوئی تو اس کے کتے میری بو سونگھنے لگے، میں چھپتی پھرنے لگی کیونکہ الفت ابھی چند ماہ کی تھی اور میں پھر ماں بننے والی تھی۔ اپنی بیوی کے دباؤ میں آ کر شعیب نے بھی مجھے طلاق کے کاغذات بجھوا دیے اور میں تن تنہا اور بے آسرا ہو گئی، اچھے وقتوں میں خریدی ہوئی یہ کوٹھی میرا واحد سرمایہ تھی۔ آرزو پیدا ہوئی تو میں نے دوبارہ کام کرنے کا سوچا، اپنے آپ کو دوبارہ کام کرنے کے قابل بنانے میں مجھے چند ماہ لگ گئے مگر جہاں جاتی مجھے ایسے گھٹیا رول کرنے کی آفر لگتی کہ جن کو میں کسی حال میں قبول نہیں کر سکتی تھی، میں نے بلاشبہ فلم انڈسٹری پر دس سال راج کیا تھا، سولہ برس کی بالی عمر میں پہلی فلم کی اور چھبیس برس کی عمر جس عمر میں باقی ہیروئینیں ابھی تک اسکول کی طالبات کا کردار ادا کر رہی ہوتی ہیں...... مجھے زوار شاہ نے دھوکے سے منظر سے ہٹا دیا۔ وقت اور حالات بہت بڑے استاد ہیں چوہدری صاحب...... میں نے ایکسٹراز یا ماؤں کے کردار کرنے سے بہتر سمجھا کہ اپنی بیٹیوں اور اپنے گھر پر توجہ دوں۔ ساری محنت، ساری توانائیاں میں نے اپنی بیٹیوں پر صرف کر دیں۔''

''آپ یہ سب کچھ مجھے کیوں بتا رہی ہیں میڈم؟'' انہوں نے حیرت سے سوال کیا۔

''آپ نے پوچھا تو تھا کہ میں نے فلموں میں کام کرنا کیوں چھوڑ دیا۔'' اس کے چہرے پر بھی حیرت تھی۔

''مگر پھر بھی یہ آپ کی بے حد ذاتی باتیں...... میرا مطلب ہے کہ آپ ہر اجنبی کو ایسے ہی تفصیل بتا دیتی ہیں اپنے بارے میں؟''

''ارے...... کیک لیجیے ناں۔'' اس نے پلیٹ اٹھا کر ان کی طرف بڑھائی، ان کی باتوں کے دوران ہی ملازمہ چائے رکھ گئی تھی۔ بے حد نفاست کے ساتھ اس نے کیک اور پلیٹ ان کی طرف بڑھائی تھی، انہوں نے شکریہ کہہ کر ایک ٹکڑا اپنی پلیٹ میں رکھ لیا اور چائے کا گھونٹ بھرا۔ ''اور پھر آپ ہمارے لیے اجنبی کیسے ہو گئے۔ اتنی لگن سے ہمیں ڈھونڈا، تین دن سے ہر روز ہمارے گھر کے باہر تک آ کر لوٹ کر جاتے رہے ہیں، آج ہمت کر کے اندر آئے ہیں، اجنبی ہوتے تو اندر کیوں آتے......؟'' وہ اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئے مگر وہ کاروباری عورت تھی جو اپنی زندگی کی بہترین جنس بیچتی تھی تو اس کی نظر اپنے گھر کے اندر اور باہر ہر طرف ہونا ناممکنات میں سے نہ تھا۔ ''میں تو یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ آپ کے یہاں آنے کی غرض کیا ہے؟''

''میرا نام چوہدری نور احمد ہے اور میں آپ سے الفت کے بارے میں بات کرنے کے لیے آیا ہوں۔''

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



انہوں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اس نے ابرو اچکا کر انہیں دیکھا، اس کی یہ ادا آج سے تیس سال پہلے نوجوان مردوں کے دلوں کی دھڑکن اتھل پتھل کر دیتی تھی، اس وقت بھی وہ اس کی خوب صورتی سے متاثر ہوئے تھے۔

''آپ کی عمر تو مجھ سے میرے بارے میں بات کرنے کی ہے چوہدری صاحب۔''

''ایسا نہیں ہے جو آپ سمجھ رہی ہیں۔'' انہوں نے ہکلا کر کہا۔ ''بلکہ مجھے یوں کہنا چاہیے کہ میں الفت سے بات کرنے کے لیے آیا ہوں، عباس کے حوالے سے......''

''اوہ اچھا......'' اس نے لمبی سی اچھا کی۔ ''کیا بات کرنا چاہتے ہیں آپ؟''

''اس کا مطلب ہے کہ آپ عباس کی الفت میں دلچسپی کو جانتی ہیں؟'' انہوں نے سوال کے جواب میں ایک اور سوال کیا۔

''ہاں ہوں الفت کی سرکار......'' اس نے تفاخر سے کہا جیسے کوئی اس کی الفت کا رشتہ مانگنے آیا ہو۔ ''آپ عباس کے کیا لگتے ہیں؟''

''باپ ہی سمجھیے......'' انہوں نے اس سے بڑھ کر تفاخر سے کہا تھا۔ ''کیا میں الفت سے مل سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں......'' اس نے ملازمہ کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی اور اس سے کہا کہ الفت کو بلا کر لائے۔ ''اسے کہنا کہ فوراً آئے، جس حلیے میں بھی ہے، تیار ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''جی اچھا!'' کہہ کر ملازمہ غائب ہوگئی، تھوڑی دیر کے بعد آ کر اس نے برتن اٹھا لیے اور کانچ کی چوڑیوں کی ہلکی سی کھنک کی آواز اس سمت سے آئی جس سمت سے وہ اس کمرے میں داخل ہوئے تھے...... کیا حسن تھا زرقا کا جو جوانی میں لاکھوں کے دل لوٹتا تھا، اس حسن کی یاد ان کے ذہن میں آئی اور ماند پڑ گئی...... کیونکہ اندر داخل ہونے والی کے حسن نے انہیں مبہوت کر دیا تھا، عباس دیوانہ بلاوجہ نہیں ہوا تھا۔

''آداب عرض ہے......'' اس نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام کیا۔

''بیٹھو الفت!'' زرقا نے اس سے کہا تو وہ ماں کے ساتھ بیٹھ گئی۔ انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی دونوں کا موازنہ کیا، زرقا نک سک سے تیار ہو کر اب بھی حسن کا پیکر لگ رہی تھی تو الفت بغیر کسی میک اپ اور تیاری کے ایک ایسا ان چھوا حسن لیے ہوئے تھی کہ وہ اپنے بھتیجے کے انتخاب کی داد دے اٹھے، ہاجرہ اس کے حسن کا کیا مقابلہ کرتی۔ گاؤں کی سادہ لوح لڑکی، ناز و ادا سے بے نیاز مگر کیا وہ صرف اس لیے اپنے بھتیجے کو ایک پیشہ ور کے ساتھ شادی کی اجازت دے دیتے کہ وہ خوب صورت تھی؟

''میں تم سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں اپنی بیٹی کو کسی مرد کے ساتھ اکیلے میں نہیں ملنے دیتی۔'' زرقا نے فوراً کہا۔

''تو کیا عباس کو وہ آپ کی موجودگی میں ملتی ہے...... اس سے شادی بیاہ کی باتیں دوسروں کے سامنے بیٹھ کر کرتی ہے؟'' انہوں نے طنز سے سوال کیا۔

''ہاں!'' اس نے کہا۔ ''میری بیٹی ابھی بہت کم سن اور بے وقوف ہے، میں اسے جب تک مکمل تیار نہ کر لوں کسی مرد کو اسے ہاتھ لگانے کی اجازت بھی نہیں دے سکتی اس کو، نہ ہی اس کے ساتھ تنہا ہونے کی، ہمارے ہاں کچھ چھپا کر نہیں کیا جاتا۔ عباس اپنے دوستوں کے ساتھ آرزو کا گانا سننے آیا تھا، الفت اسے بھا گئی مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں بے وقت......اور میری بیٹیاں طوائفیں نہیں ہیں صاحب!''

''کیا ہیں آپ کی بیٹیاں؟'' انہوں نے غصے سے پوچھا۔ ''کیا کروانا چاہتی ہیں آپ الفت سے؟''

''میں الفت کو ایک بہترین ہیروئن بننے کے لیے تیار کر رہی ہوں اور آرزو کا رجحان گلوکاری کی طرف ہے،

میں نے زندگی میں جو ٹھوکریں کھائی ہیں وہ میں اپنی بیٹیوں کو نہیں کھانے دوں گی۔'' ان کے غصے اور گرم لہجے کے باوجود زرقا نے اپنے لہجے کو سکون میں رکھا تھا۔

''پھر عباس کے ساتھ اس کا کیا رشتہ ہے؟''

''عباس نے اس کے ساتھ شادی کی خواہش خود ظاہر کی ہے۔ الفت نے اس سے کہا ہے کہ وہ اس کے خاندان کی مرضی کے بغیر اس سے شادی نہیں کرے گی۔ اس کے خاندان کا کوئی فرد خود اس کا رشتہ مانگنے آئے اور مان سے اسے بیاہ کرلے جایا جائے تو......''

''ایسا تو ہرگز نہیں ہونے والا۔'' انہوں نے بصد کوشش تحمل سے کہا۔ ''آپ عباس کی اماں کو نہیں جانتیں اور پھر عباس کی منگنی اس کی خالہ زاد اور چچازاد سے سال بھر پہلے ہوئی ہے جس کے ساتھ اس کی بات بچپن سے طے تھی، امی کی رضا کے ساتھ اور وہ اس سے خوش بھی تھا، اب جانے کیا ہو گیا ہے اسے!'' وہ جیسے بڑبڑانے لگے تھے آخر تک پہنچتے پہنچتے۔

''آپ فکر نہ کریں سرکار...... ہم آپ کے خاندان کی مرضی کے بغیر الفت کی شادی عباس سے نہیں کریں گے، میں ایسی کسی غلطی کو نہیں دہراؤں گی جس نے میری زندگی عذاب کردی، اپنی بیٹیوں کے معاملے میں مجھے عقل مندی سے کام لینا ہوگا۔''

''کچھ ایسا ہی میں کہنا چاہتا ہوں زرقا جی!'' انہوں نے اپنے غصے پر مکمل قابو پالیا تھا۔ ''میں چاہتا تھا کہ الفت اور عباس میں دوستی اور تعلق چاہے رہے...... مگر الفت، عباس سے شادی کی خواہش کرے نہ ضد!''

''یہ بھی کر کے دیکھ لیا ہے، الفت نے کئی بار عباس کو اپنے پاس آنے سے منع کیا ہے، یقین کریں کہ وہ اس سے تنہائی میں ملتی بھی نہیں ہے......''

''نہیں نہیں...... میں یہ نہیں کہہ رہا۔'' انہوں نے فوراً ٹوکا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ وہ بے شک الفت کو ملے، اس سے دوستی یا تعلق رکھے، اپنی ماں کے کہنے پر شادی بھی کرلے اور جب بھی شہر آئے تو الفت سے......''

''آپ کا مطلب ہے کہ گاؤں والی بیوی کو گاؤں میں رکھے اور الفت سے شادی کر کے اسے شہر میں علیحدہ رکھے؟'' زرقا نے سوال کیا۔

''الفت سے شادی کی کیا ضرورت ہے جیسے آپ نے شعیب ملک سے دوستی کرلی تھی۔''

''انکل......'' ان کی بات کاٹ کر الفت اٹھ کھڑی ہوئی، اس کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔

''آپ یوں کریں کہ عباس کو مجھ سے شادی کی اجازت دے دیں اور اپنی بیٹی ہاجرہ سے صرف دوستی رکھنے دیں اسے......'' تو گویا وہ سب کچھ جانتی تھی، انہیں ہاجرہ کا باپ سمجھی تھی مگر ہاجرہ کا باپ نہ ہونے کے باوجود انہیں الفت کی بات سے ایسی آگ لگی کہ کنپٹیوں میں گرم، گرم خون دوڑنے لگا، قریب تھا کہ وہ ان کا ہاتھ اٹھتا یا زبان چلتی۔

''الفت!'' زرقا کے انداز میں تنبیہ تھی۔ ''بڑوں سے اس طرح بات نہیں کرتے۔''

''انہوں نے میرے بارے میں جو کچھ کہا ہے امی، وہی بات ان سے اپنی بیٹی کے بارے میں برداشت نہیں ہوئی ناں، میں بھی ان کی بیٹی جیسا ایک حساس دل ودماغ رکھنے والی ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہوں......''

''بیٹا ہر انسان اپنی سوچ اور ظرف کے مطابق بات کرتا ہے، ہم لوگوں کی سوچ نہیں بدل سکتے، انہیں سکھا نہیں سکتے کہ وہ کس طرح بات کریں، خصوصاً اس عمر کے لوگوں کو جن کے اپنے ہاں بھی جوان بیٹیاں ہوں۔'' زرقا کے الفاظ سے انہیں اپنے کہے پر شرم بھی آئی مگر اس کا اظہار یا اس پر معذرت کرنا ان کی شان اور مردانگی کے خلاف تھا۔

''آپ جاسکتے ہیں چوہدری صاحب...... '' انہوں نے انہیں عزت سے دیس نکالا دیا۔ '' اور اللہ کا شکر ادا کریں کہ...... '' وہ چلتے ہوئے رک کر مڑے اور زرقا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ '' کہ آپ عباس کے باپ ہیں اور شاید الفت کے ہونے والے سسر ورنہ ایسی بات کوئی اور کہتا تو اپنے قدموں پر چل کر واپس نہ جاتا!''

''ہونہہ...... '' کہہ کر وہ پلٹے اور تیز، تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔

''تم فکر نہ کرو الفت...... '' انہوں نے بیٹی کو ساتھ لگالیا۔ ''عزت کی زندگی گزارنا بڑا کٹھن کام ہے اور وہ بھی ایسی لڑکیوں کے لیے جن کے پاس ماضی کی عزت کا کوئی حوالہ نہ ہو، اگر عباس کی محبت میں طاقت ہوگی تو تم اس کے گھر میں مان اور عزت سے رہ سکوگی ورنہ اسے کہنا اپنا راستہ بدل لے...... '' الفت کی آنکھ سے نکلنے والا آنسو زرقا کے ہاتھ پر نہیں بلکہ دل پر گرا تھا۔

☆☆☆

''چاچاجی...... میرے خیال میں اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اندر خانے کی بات اندر خانے ہی رہے گی، باہر لوگوں کو علم بھی نہ ہوگا کہ ہم نے کیا منصوبہ بنایا ہے، ساری دنیا کی سیاست کے ایجنڈے بدل رہے ہیں۔'' کرم یار (حلیمہ آپا کا شوہر) اباجی کے سامنے جرح کررہا تھا، میں اپنے کمرے کے کھلے دروازے سے سن رہی تھی، تینوں بھائی اباجی کے ساتھ ہی تھے اور کرم یار کے ساتھ اس کے والد محمد اسلم بھی تھے۔ ''ہمیں بدلتے ہوئے وقت کے تقاضوں کو بھی سمجھنا چاہیے چاچاجی!'' وہ انہیں سمجھا رہا تھا کہ ملک میں سیاست کا انداز اب بدل رہا تھا۔ ایک، ایک خاندان میں دھڑے بندیاں ہورہی تھیں۔ بھائی، بھائی کے اور باپ، بیٹے کے خلاف کھڑا ہورہا تھا، نئی سیاسی جماعتوں کے بننے سے سیاست کا رنگ بدل گیا تھا۔ اب دور ہے کہ ہر خاندان حکومت میں ہر دور میں شامل رہتا ہے چاہے کسی بھی سیاسی پارٹی کی حکومت ہو، کوئی بھی جماعت جیتے، خاندان اقتدار میں رہتا ہے...... اباجی کو یہ کلیہ آسانی سے ہضم نہیں ہورہا تھا، ان کا اصرار تھا کہ ہم اپنے بچوں کو تعلیم کے میدان میں اتاریں، گاؤں کے اسکول سے دس، دس جماعتیں پڑھ لینا کوئی کمال نہ تھا، لڑکیوں کے لیے صرف پانچویں جماعت تک کا اسکول تھا اس لیے جو بھی لڑکی پڑھ پائی تھی اس کی حد زیادہ سے زیادہ پانچ جماعتیں ہی تھی۔

اس سے قبل تو گھر پر قرآن کی تعلیم اور زیادہ سے زیادہ بہشتی زیور پر ہی اکتفا کرلیا جاتا تھا جیسا کہ ہمارے ساتھ ہوا تھا مگر میری مرحومہ ساس نے اپنی سب پوتیوں کو پانچویں جماعت تک اسکول پڑھایا، ممکن ہوتا تو انہیں اس سے آگے بھی پڑھاتیں مگر اس وقت کوئی اسکول تھا ہی نہیں...... قسمت اچھی تھی کہ صرف میری بیٹی گل بانو کو پانچویں کے بعد آگے پڑھنے کو ملا کہ اس وقت تک گاؤں کی لڑکیوں کے لیے واحد اسکول کو پہلے مڈل اور پھر ہائی اسکول کا درجہ دے دیا گیا تھا۔

''تعلیم انسان کو کھانے کو روٹی دیتی ہے نہ طاقت لالہ جی!'' چوہدری اسلم نے اباجی کو سمجھانا چاہا تھا۔ ''سیاست طاقت ہے، اقتدار نشہ!'' وہ کہہ رہے تھے۔ ان کے اندر کا مخصوص چوہدری بول رہا تھا۔ اختلاف رائے کے باوجود اباجی کو اسلم صاحب کا یہ نکتہ سمجھ میں آگیا تھا کہ سیاست کے کھیل میں باپ کا بیٹے کے خلاف یا بھائی کا بھائی کے خلاف کھڑے ہونے کا مقصد ایک دوسرے کو اکھاڑنا، پچھاڑنا نہیں بلکہ ہمیشہ اقتدار میں رہنے کا کھیل ہے۔ چاہے جو بھی جماعت جیتے...... حکومت اسی گھر یا خاندان کی باندی رہتی ہے۔ اس روز اس بیٹھک میں ہونے والا فیصلہ اس خاندان اور اردگرد کے دیہات کی قسمت کو کس طرح بدل گیا تھا۔ یہ تو آگے آنے والا وقت ہی بتاتا۔

سرمایہ داروں کے خلاف اور غریبوں کے حقوق کی باتیں...... چوہدری کرم یار، اپنے لیڈر کے انداز میں ہاتھ ہلا، ہلا کر جوشیلی تقریریں کرتا، امیروں کے خلاف باتیں کرتا یعنی زمین اس کی جو اسے کاشت کرے جیسے

باغیانہ خیالات کا پرچار کرتا۔ یہ الگ بات تھی کہ جس روز اس سے اس کا کوئی مزارعہ یہ پوچھ لیتا کہ اس کے زیرِ کاشت زمین کیا اس کی ہے؟ تو کرم یار کے بندے اس پوچھنے والے کا نام ونشان ہی مٹا ڈالتے۔ سننے والوں نے دانتوں میں انگلیاں داب لیں۔ کرم یار، چوہدری نیک بخت کے مقابلے میں انتخابات میں کھڑا ہو گیا تھا۔ اور وہ بھی اپنے قائد کی جماعت سے وابستگی چھوڑ کر، ایک نئی ابھرنے والی جماعت کے پرچم تلے......

ایک ہی خاندان میں لوگوں کی نظر میں بٹوارا ہو گیا تھا مگر اندر خانے کیا طے ہوا تھا یہی رنگ ملک کے ہر شہر، قصبے اور گاؤں میں تھا۔ دونوں کشتیوں میں ایک، ایک پاؤں رکھا گیا تھا کہ اقتدار کی کشتی جو بھی ٹھہرے اس میں سب شامل رہیں۔ نئی ابھرنے والی جماعت کا نعرہ اس قدر پُرکشش تھا کہ غریبوں نے واقعی اسے اپنا نجات دہندہ سمجھ لیا اور انہیں نمایاں کامیابی ملی...... تاریخ نے پہلی بار نمبردار خاندان کو انتخابات میں شکست سے دوچار ہوتے دیکھا تھا۔ محمد اسلم کے گھر پر خوشیوں کے شادیانے بج رہے تھے، وہ بھی ہمارا ہی خاندان تھا اور اصل میں تو ہماری ان سے کوئی دشمنی بھی نہ تھی، ہماری ایک بیٹی حلیمہ اس گھر میں تھی تو دوسری بیٹی شہربانو بھی۔

سب مل بیٹھے اور طے پایا کہ ان کے ہاں مبارک باد دینے کے لیے جانا چاہیے، مٹھائی تیار کروائی گئی اور ہم سب لوگ ان کی خوشی میں شریک ہونے کو گئے تھے مگر وہاں ہمارے لیے کیا حادثہ منتظر تھا کون جانتا تھا۔ جیت کی خوشی میں اس گھر میں ڈھول بج رہے تھے، بھنگڑے ڈالے جا رہے تھے، ہوائی فائرنگ کی جا رہی تھی، جانے کس کی چلائی ہوئی گولی واپسی کے لیے باہر صحن میں نکل کر کھڑے ہوئے ہمارے سکندر بھائی کو چاٹ گئی...... ہوائیں اور فضائیں چیخ رہی تھیں، اپنے بھائی کا لہولہان جسم دیکھ کر حلیمہ آپا نے اپنا سینہ پیٹ لیا۔ ہم سب مُردوں کی طرح اس آنگن میں اپنی متاع لٹتے ہوئے دیکھ کر بے بسی سے کھڑے تھے۔ کس کے سر پر الزام دیتے۔ ہمیں تو سیاست میں یہ گندا کھیل آغاز سے ہی راس نہ آیا تھا، ابا جی اپنے بیٹے کو چارپائی پر ڈلوا کر اس صحن سے نکلے تو ننگے سر ان کی بیٹی حلیمہ چارپائی کے پائے سے لپٹی ہوئی ان کے ساتھ چلی آئی اور ان کی پوتی یعنی میری بیٹی بھی اپنے تایا کے لیے بین کرتی ہوئی ہمراہ تھی۔

ان کے گھر سے سب لوگ ہمارے ہاں آئے تھے مگر ان کے ساتھ کسی نے بات نہیں کی تھی۔ عصمت بھابی نے تو اپنے ننھیال والوں سے خود ملنے سے انکار کر دیا، اس گھر سے ان کا سہاگ اجڑ کر آیا تھا، ان کے نانا اور ماموں محمد اسلم، ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر معافی مانگنا چاہتے تھے مگر وہ کسی کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔ اس سے دوہرا قرابت کا رشتہ ہونے کے باعث زینت بھابی اور منور احمد کا بھی یہی فیصلہ ٹھہرا اور نور احمد اپنے بھائیوں سے الگ کیوں سوچتے، یوں ہم نے اپنے ہاتھوں سے اپنی بہن حلیمہ اور اپنی بیٹی شہربانو کو اپنے گھر سے نکال دیا کہ وہ ہمارا خون ہونے سے زیادہ، ہمارے بھائی جی کے قاتلوں کی بہوئیں تھیں۔ وہ وقت اور تھے اور آج ایسا کچھ ہوتا تو وہ دونوں بیٹیاں اپنی سسرال چھوڑ کر میکے میں ٹک جاتیں مگر وہ زمانہ ایسا تھا کہ بیٹیوں کو میکے سے یہ کہہ کر بھیجا جاتا تھا کہ وہ تمہارا اصلی گھر ہے اور یہاں تم مہمان ہو گی، میں اپنی لختِ جگر کو دیکھنے سے محروم ہو گئی تھی۔

ابا جی کے لیے یہ صدمہ عمر کی سب سے بڑی چوٹ ثابت ہوا تھا۔ ان کا زخم مندمل ہی نہیں ہو رہا تھا، ناسور بن گیا تھا، ان کے سارے بدن میں یہ غم بیٹھ گیا تھا اور سانس لینی بھی ممکن نہیں رہی تھی، وہ خاموش ہو کر رہ گئے تھے، کسی سے بات نہ کرتے، پہروں کچھ کھاتے پیتے بھی نہیں تھے، روز بروز کمزور ہوتے چلے گئے اور ایک دن کسی دیمک زدہ شہتیر کی طرح ڈھ گئے۔ ہمارے لیے یہ عمر کا کٹھن دور تھا جب ہم سکندر بھائی کے صدمے کو نہ بھلا پائے تھے، میرے لیے بیٹی کی جدائی کا بھی صدمہ تھا، اس پر ابا جی کا شفقت اور راہنمائی کا ہاتھ اٹھ گیا تھا۔

☆☆☆

پے در پے ہونے والے حادثات اور ماں کے دکھ کا ازالہ کرنے کی کوشش عباس نے یہ کی کہ جانے کسی کے سمجھانے پر یا خود ہی ماں کے دکھ کا سوچ کر وہ ہاجرہ سے شادی کرنے کو مان گیا مگر اس نے صاف کہا کہ وہ ہاجرہ کو خوش رکھ سکے گا نہ خود خوش ہوگا...... ہم سب کی سوچ تھی کہ شادی کے بعد بڑے بڑوں کی اُڑی ختم ہو جاتی ہے، ساتھ رہیں گے تو انسیت پیدا ہو ہی جائے گی۔ نکاح کے دو بولوں میں تو ویسے ہی بہت طاقت ہوتی ہے۔ اس نے خاموشی سے ماں کے فیصلے پر سر جھکا دیا۔ ہاجرہ سے اس کا بیاہ بڑی دھوم دھام سے ہوا، جتنی سادگی سے سلطان اور شہر بانو کا بیاہ ہوا تھا اس کے بالکل برعکس...... اس بیاہ پر گویا خزانوں کے اور خوشیوں کے منہ کھل گئے تھے...... عصمت بیگم اپنی جیت پر خوش تھیں تو ہاجرہ کے ماں باپ مسرور! اچھی بات یہ تھی کہ منور اور زینت کو عباس کی اُڑی کا علم نہ تھا، انہیں اپنے اس بھتیجے اور بھانجے پر ذرا سا بھی شک نہیں تھا......

وہ تو سادگی میں ہی حسن کا پیکر دِکھتی تھی، جانے کہاں سے حسن کے خزانے اس کے پاس آ گئے تھے، منہ دھو کر آنکھوں میں کاجل کی دھار لگاتی تو اس کے چہرے پر نظر ٹھہرنا مشکل ہو جاتا۔ اس کے بال بھورے اور ہلکے گھنگرالے تھے...... اماں جان کی طرح۔ دلہن بن کر اس پر ایسا روپ آیا تھا کہ نظر لگ جانے کا ڈر تھا۔ شاید اسی لیے اس پر ماں پڑھ، پڑھ کر پھونک رہی تھی...... تیار ہو کر بارات کے انتظار میں تھی تو اس کی شادی شدہ سہیلیاں اور کزن اس کے کمرے میں تھیں اور اسے عباس کو مات کرنے کے سارے گر سکھا رہی تھیں اور وہ شرما، شرما کر ہنس رہی تھی۔

آئینہ دیکھ کر اس نے سوچا تھا کہ اس کی ایک جھلک ہی عباس کو چاروں شانے چت کر دے گی۔ اپنا روپ دیکھ کر اسے خود یقین نہیں آ رہا تھا، نکاح کے بعد بارات کا اور پھر اپنی برادری کا کھانا ہوا اور وہ وقت آ گیا جب اسے اپنے بابل کا آنگن چھوڑ کر اپنے تایا کے آنگن میں اترنا تھا۔ اس کی رخصتی کے وقت اس کے میکے میں اور استقبال کے وقت اس کی سسرال میں اس کے لیے بکرے کا صدقہ دیا گیا۔ ساس واری صدقے ہو رہی تھیں، تایا کی عدم موجودگی نے کئی آنکھوں کو مستقل نم رکھا تھا۔ انہوں نے ہی اتنی چاہ سے یہ رشتہ لیا تھا اور اس اہم موقع پر ان کی عدم موجودگی سے جو خلا تھا اسے اور کوئی پُر نہیں کر سکتا تھا۔

سسرال میں بھی اس کی خوب پذیرائی ہوئی، شام تک عورتیں دلہن دیکھنے آتی...اور اس کی گود سلامیوں سے بھرتی رہیں، رات کا کھانا سرِ شام ہی کھا لیا گیا اور اسے اس کے سجے ہوئے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ بڑے پلنگ پر بیٹھ کر اس نے کمرے کی سجاوٹ کا جائزہ لیا، دل آنے والے وقت کا خیال کر کے کتنی ہی رفتار سے دھڑک رہا تھا، ذرا سی آہٹ ہوتی یا کوئی کھٹکا تو وہ سمٹ جاتی۔ کمرے میں کوئی گھڑی نہ تھی نہ ہی وقت جاننے کا کوئی اور طریقہ، اپنے ہی تایا کا گھر تھا مگر وہ رات ایسی نہ تھی کہ وہ باہر نکل کر کسی سے وقت معلوم کرتی یا کہتی کہ عباس کب آئے گا کہ وہ دن بھر سے بیٹھ، بیٹھ کر تھک گئی تھی...... سو بھی نہیں سکتی تھی کہ عمر میں یہ رات ایک ہی بار آتی ہے۔

شادی کے اگلے دن جب عصمت آپا اپنے کمرے سے باہر نکلیں تو عباس کو صحن میں بغیر بستر کی چارپائی پر لیٹے ہوئے دیکھ کر دھک سے رہ گئیں...... انہوں نے خود رات کو اسے اس کے کمرے میں بھیجا تھا۔ لپک کر وہ اس کے پاس آئیں، اسے جگایا اور اس سے استفسار کیا، اس کے پاس ماں کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا، انہوں نے پوچھا کہ وہ کس وقت سے وہاں سو رہا تھا، اس نے بتایا کہ رات کو وہ کمرے میں گیا ہی نہیں......

''وہ کیوں دادی جان؟'' میرے منہ سے سوال پھسل گیا۔

''سو جاؤ اب تم...... بہت دیر ہو چکی۔'' انہوں نے میرے بالوں کو اپنی انگلیوں سے سلجھایا، انہیں اندازہ ہوا کہ اس سے آگے کی کہانی کا نہ جاننا ہی میرے لیے بہتر ہے۔

''پلیز دادی جان......'' میں نے منہ بسورا۔ ''ایسا تو نہ کریں ناں۔''
''میں تھک گئی ہوں میری جان......اب سکت نہیں رہی، کل سناؤں گی باقی کہانی اور یوں بھی کہانی کا اہم حصہ تو میں تمہیں سنا چکی ہوں!''
''نہیں، نہیں دادی جان...... مجھے آپ کے بچوں کی کہانی سننی ہے ابھی۔'' میری بات جانے انہوں نے سنی کہ نہیں، وہ کروٹ بدل کر لیٹ چکی تھیں، میں آہستگی سے اٹھی، ہولے سے چھوٹے، چھوٹے قدم رکھتی غسل خانے میں گئی اور واپسی پر بتی بجھا کر دادی جان کے ساتھ بچھے پلنگ پر لیٹ گئی۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی، سونے سے پہلے تک میں قیافے لگا رہی تھی کہ ہاجرہ نے کیا، کیا ہوگا...... 'ظاہر ہے کہ ایسی شادی پر لعنت بھیج کر اپنے میکے لوٹ گئی ہوں گی۔' کیونکہ میں ان کی جگہ ہوتی تو ایسا ہی کرتی۔

☆☆☆

بڑی سی سیاہ گاڑی جس کی کھڑکیوں کے شیشے بھی سیاہ تھے گیٹ کے عین سامنے رکی، اس میں سے بغیر وردی کے مگر شکل اور حلیے سے ہی محافظ نظر آنے والا قیم شحیم آدمی ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ سے اترا اور اس نے دائیں بائیں ہر طرف عقابی نظروں سے دیکھا...... اپنی طرف کا پچھلی سیٹ والا دروازہ کھولا اور رخ موڑ کر تعظیم سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد گاڑی سے سیاہ سینڈل میں قید ایک گلابی پاؤں باہر نکلا پھر دوسرا، ڈرائیور نے گاڑی کو اسٹارٹ ہی رہنے دیا اور اٹھ کر اپنی سیٹ کے پیچھے والا دروازہ کھولا، دوسری طرف سے ایک اور لڑکی باہر نکل کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں گاڑی سے نکلیں، پہلے والی لڑکی نے اپنا بیگ کندھے پر لٹکا لیا تھا، اس کے ہاتھ میں فولڈر تھا جسے اس نے سینے سے لگا رکھا تھا۔ سیاہ اسکارف ماتھے تک اس کے چہرے کا ہالہ کیے ہوئے تھا۔ ابھی گاڑی میں بیٹھے ہوئے اس نے اپنے سنہری اور گھنگھرالے بالوں کی ایک لٹ کو اسکارف میں اُڑسا تھا۔
''نصیر چاچا!'' اس نے ہولے سے پکارا، ڈرائیور اپنی سمت سے بھاگ کر اس طرف آیا اور نگاہ جھکا کر تعظیم سے اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ''چاچا ہم دونوں کا سامان ہمارے ہاسٹل کے کمرے میں رکھوا دیں اور پھر آپ واپس یہیں آ جائیں......ہم دونوں اپنی تعارفی کلاس کے بعد اسی جگہ پر واپس آ جائیں گی اس کے بعد مارکیٹ جانا ہے......ہمیں کچھ سامان خریدنا ہے اپنے لیے۔''
''جی چھوٹی بی بی، جو حکم، آپ کے سامان کی دوسری گاڑی سیدھی ہاسٹل ہی گئی ہے، جو سامان اس گاڑی میں ہے اسے بھی ہم وہیں چھوڑ کر جلدی لوٹ آئیں گے، اگر آپ کہیں تو ہم یہیں باہر کھڑے انتظار کر لیتے ہیں اور ایک ہی دفعہ آپ کے ساتھ خریداری کے بعد سامان سمیت آپ کو ہاسٹل چھوڑ دیں گے؟''
''ایسا بھی ٹھیک ہے نصیر چاچا مگر آپ اتنی دیر گاڑی میں اسی طرح بیٹھے رہیں گے؟'' اس نے نرمی سے کہا۔ ''پھر آپ کہیں جا کر کچھ چائے پانی پی لیں یا کھانا کھا لیں اتنی دیر میں!''
''نہیں بی بی، بہت مہربانی آپ کی، معلوم نہیں کہ ہم کہیں چلے جائیں اور آپ کو فارغ ہو کر انتظار کی زحمت اٹھانا پڑے......'' اس نے ادب سے کہا تھا۔
''انتظار تو اب ہمیں ہر روز اپنی بس کا کرنا ہی ہوگا تو اچھا ہے ہماری پریکٹس ہو جائے گی۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''اچھا یوں کریں......'' اس نے اپنے بیگ میں سے والٹ نکالا اور اس میں سے ایک لال نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ''آپ لوگ کہیں قریب سے ہی چائے پی لیں، مجھے معلوم ہے کہ آپ کو چائے کی عادت ہے اور آپ کہتے ہیں کہ گاڑی تب چلتی ہے جب گاڑی میں پٹرول اور ڈرائیور کے پیٹ میں چائے ہو۔'' اتنی بات چیت سارے ملازمین میں سے صرف نصیر چاچا کے ساتھ ہی ہوتی تھی کیونکہ نصیر چاچا ان کے ڈرائیور ہی نہیں بلکہ دور پار

سے ان کے کوئی عزیز بھی ہوتے تھے۔ ان کے گھر میں عام ملازمین کی بھی عزت کرنا سکھائی جاتی تھی، یہ تو پھر رشتے دار تھے۔ اس نے والٹ واپس بیگ میں رکھا اور اپنے ساتھ آئی ہوئی دوسری لڑکی کی ہمراہی میں قدم بڑھا دیے۔

''مس!'' پکار پر اس نے مڑ کر دیکھا۔ ''آپ کے والٹ سے کچھ گر گیا ہے۔''

''اوہ!'' اس نے اس کے ہاتھ سے اپنا اے ٹی ایم کارڈ لیا۔ ''تھینک یو!'' شاید پیسے نکالتے ہوئے وہ پھسل کر گر گیا تھا، وہ مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔

''کئی بار کہا ہے کہ احتیاط کیا کرو...... جو نہ دیتا یہ تمہیں تو؟ مصیبت پڑ جاتی، نیا کارڈ بننے تک جانے کیا کیا مشکلات ہوتیں۔'' ساتھ چلتی ہوئی لڑکی نے اپنے خاکی اسکارف کو ماتھے تک کھینچا۔ ''ایک تو اس اسکارف نے وختا ڈال دیا ہے یار!'' اس نے بیزاری سے کہا۔ ''پتا نہیں کیا ضرورت تھی ہمیں اس طرح آثارِ قدیمہ کی لڑکیاں بنا کر بھیجنے کی؟'' وہ بڑبڑائی۔ ''اس سے پہلے بھی تو ہم اسکول اور کالج جاتی رہی ہیں، اب ہم پر اعتماد ختم ہو گیا ہے کیا؟''

''پہلی بار ہم کسی مخلوط ادارے میں آئی ہیں پیاری اور ماں باپ کی طرف سے اپنی بیٹیوں کے لیے احتیاط اس لیے نہیں ہوتی کہ انہیں ان پر اعتماد نہیں ہوتا بلکہ انہیں دوسروں پر اعتماد نہیں ہوتا، انہیں بری نظروں پر اعتماد نہیں ہوتا اور اموتے یونہی تو ہم لوگوں کو اتنا سمجھا بجھا کر نہیں بھیجا، کچھ نہ کچھ تو وہ جانتی ہیں ناں شہر کی دنیا کے بارے میں۔''

''ہاہ!'' اس نے استہزا سے ہنس کر کہا۔ ''شہر کے بارے میں کیا جانتی ہوں گی وہ، کبھی شہر آئی بھی ہوں گی بھلا؟''

''میں اور تم تو لندن اور امریکا کبھی نہیں گئیں مگر ان کے بارے میں ہم جانتے تو ہیں ناں۔''

''ہمارا علم ان جگہوں کے بارے میں کتابی ہے بابا!''

''اموبھی پڑھی لکھی ہیں اور تمہیں علم ہے کہ اخبار، رسالے اور کتابیں کتنے شوق سے پڑھتی ہیں وہ!'' باتیں کرتے، کرتے وہ گیٹ سے اندر داخل ہو چکی تھیں۔ اندر تو جیسے کوئی بازار لگا ہوا تھا، رنگ ہی رنگ، خوشبوئیں، قہقہے...... کسی تعلیمی ادارے کے ایسے منظر کا تو انہوں نے سوچا بھی نہ تھا۔ یونیفارم نہ ہونے کے باعث لڑکیاں اور لڑکے ہر رنگ کے ملبوسات میں تھے، ان کے حلیے بھی عجیب وغریب تھے۔ عجیب طرز کے کٹے ہوئے بال، لڑکیوں کے بال بھی لڑکوں کی طرح کٹے ہوئے، انہوں نے لڑکیوں کو کب یوں ٹیلی وژن کے علاوہ دیکھا تھا، اسکارف یا چادر تو دور کی بات ان کے سروں پر کجا کندھوں پر بھی دوپٹے نہ تھے، جینز کے ساتھ چھوٹی، چھوٹی کرتیوں یا ٹی شرٹ کے ساتھ...... ان کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں، ایسے مناظر اپنی نظر کے سامنے دیکھنے کا پہلا تجربہ تھا، ایسا نہیں تھا کہ وہ دونوں کوئی دبو یا بزدل لڑکیاں تھیں مگر اتنی بے باکی ان سے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ پوری کوشش کر کے اعتماد کے ساتھ آگے بڑھنے لگیں۔

☆☆☆

اسلام آباد سے لے کر گوجرانوالہ تک ان کا سفر جی ٹی روڈ پر گزرا تھا، سڑک جگہ جگہ سے مرمت کے لیے اکھاڑ کر اس پر رکاوٹیں کھڑی کر کے سڑک کو دو طرفہ ٹریفک کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا اس لیے جو سفر یہاں تک تین یا ساڑھے تین گھنٹے میں طے ہو جاتا وہ پانچ گھنٹے میں طے ہوا تھا۔

''پاپا نے کہا تھا کہ گوجرانوالہ شہر ختم ہوتے ہی ہمیں رک کر کسی سے راہنمائی لینا ہوگی۔'' ہموار سڑک سے اتر کر گاڑی کی رفتار آہستہ ہوئی، سڑک کے کناروں پر کچی اور خشک مٹی تھی...... اس لیے یک دم گرد کا ایک طوفان سا اٹھا۔ ''آہستہ چلاؤ یار!'' گاڑی کے اندر ایک ناراض سی آواز آئی۔

''جناب!'' مؤدب لہجے میں جواب دے کر گاڑی چلانے والے نے گاڑی روک لی اور گرد کا طوفان بیٹھنے کا

انتظار کرنے لگا، اکیلا ہوتا تو فوراً شیشہ نیچے کرتا مگر مالک کو ناراض نہیں کر سکتا تھا، چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے اپنی طرف کا دروازہ کھولنے کو ہاتھ بڑھایا۔

''گاڑی سے باہر نکلنے کی کیا ضرورت ہے، بیٹھے، بیٹھے پوچھ لو ناں۔'' اسی لہجے میں پھر کہا گیا۔

''چھوٹے صاحب!'' عاجزی سے بھرپور لہجہ۔ ''دیہاتی لوگ اس بات کو برا محسوس کرتے ہیں کہ کوئی ان سے اس طرح بات کرے، وہ اسے غرور سمجھتے ہیں...... ان کی سطح پر جانا پڑتا ہے جناب!''

''چھوڑو تم......'' اس نے غصے سے کہا اور اپنی طرف کا شیشہ نیچے کیا۔ ''خواہ مخواہ میں وقت ضائع کرنے کا شوق ہے تمہیں!'' اپنے سیاہ گلاسز آنکھوں سے ہٹا کر سر پر جمائے۔ ''ہیے بابا جی!'' اس نے باہر سڑک کے کنارے بنے چائے اور مشروبات کے چھوٹے سے کھوکھے کے قریب بچھی چارپائی پر تنہا بیٹھے، حقہ سامنے رکھے، لسی کے بڑے سے گلاس سے لطف اندوز ہوتے، ادھیڑ عمر کے آدمی کو مخاطب کیا۔

کھوکھے کو غالباً ایک ریڑھی پر لگایا گیا تھا، اس کے اوپر فائبر گلاس کی چھت اور دو طرف کی دیوار بھی تھی، ایک طرف بوتلیں رکھنے والا ریک بنا تھا جس پر رنگ برنگے مشروبات کی بڑی بوتلیں رکھی تھیں اور ساتھ ہی پلاسٹک کے تین بڑے، بڑے کولر جن میں غالباً پانی تھا جو شربت بنانے کے کام آتا ہوگا، چند قدم کے فاصلے پر ایک کچا پکا سا بس اسٹاپ بنا ہوا تھا۔ اس میں دو بینچیں متوازی رکھی تھیں۔ ان کی حالت کافی خستہ تھی۔ بس اسٹاپ کی چھت کسی وقت لال رنگ میں پینٹ کی گئی ہوگی مگر اب اس کے بھورے سے رنگ میں کہیں، کہیں لال پپڑیاں نظر آتی تھیں۔

بابے نے لسی کا گلاس منہ سے ہٹایا، ناگواری سے اس طرف دیکھا جہاں سے آواز آئی تھی، اپنے کندھے پر رکھے صافے کے کنارے سے منہ صاف کیا اور پھر بے نیازی سے واپس اپنے لسی کے گلاس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''بہرہ ہے یہ تو!'' اس نے جھنجلا کر کہا۔ ''ارے چھوٹے!'' اس نے کھوکھے کے ''کاؤنٹر'' پر بیٹھے ہوئے لڑکے کو پکارا۔ ''اِدھر آؤ، بات سنو!'' اس سے بھی اسے بے پروائی سے کندھے جھٹکنے کا جواب ملا۔ ''پاگلوں کا علاقہ لگتا ہے مجھے تو یہ!'' وہ بڑبڑایا، اسے کھوکھے والے کے کانوں میں لگے ہوئے ائر پلگ نظر نہیں آئے تھے جن کی مدد سے وہ اپنے موبائل فون سے یقیناً عطا اللہ عیسیٰ خیلوی کے گانے سن رہا تھا۔

''مجھے باہر جانے دیں صاحب!'' دروازہ کھول کر ڈرائیور الیاس باہر نکلا، چند قدم چل کر ان بابا جی کے پاس پہنچا، بابا جی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا، اٹھ کھڑے ہوئے...... ڈرائیور نے ان سے مصافحہ کر کے اپنے ہاتھ کو سینے پر رکھ کر انہیں تعظیم دی۔ بابا جی واپس بیٹھ گئے اور ڈرائیور کو بھی بیٹھنے کو کہا، وہ ان کے پاس چارپائی کے کنارے پر ٹک گیا، گاڑی میں بیٹھے ہوئے نوجوان نے اپنی طرف کی کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا کہ ان کی گفتگو سن سکے مگر باہر سے گرم ہوا کا جھونکا اندر آیا تو اسے فوراً واپس بند کیا مگر باہر کی گفتگو سننے کے لیے اسے چند انچ کھلا رہنے دیا اور اپنا کان باہر کی گفتگو پر لگا دیا۔ ''کیا حال ہے بزرگو!'' الیاس نے ان بزرگوار کے پاس بیٹھ کر ان سے پوچھا تھا۔

''اللہ کا احسان ہے پتر!'' انہوں نے جواباً کہا۔ ''نرالے پتر...... دو گلاس ٹھنڈی ٹھار لسی کا بنا ذرا جلدی سے، مہمان لگتے ہیں یہ۔'' انہوں نے کھوکھے کی طرف رخ کر کے زور سے کہا۔

''بہت مہربانی بزرگو، اس وقت ذرا جلدی میں ہوں، اصل میں ہمیں نور پور جانا تھا، بڑے عرصے کے بعد اس علاقے میں آئے ہیں۔ کئی نئی سڑکیں اور بائی پاس بن گئے ہیں تو راستوں کی سمجھ ہی نہیں آرہی...... شام پڑ رہی ہے

تو اندیشہ تھا کہ کہیں بھٹک نہ جائیں اس لیے آپ سے راستہ پوچھا تھا۔'' اسے کسی حد تک راستے کا اندازہ تھا مگر اب تک اسے باہر نکل کر ٹانگیں سیدھی کرنے کی مہلت بھی نہیں دی تھی صاحب نے...... اس نے سوچا اسی بہانے ذرا چار قدم چل بھی لے گا۔

''کہاں سے آ رہے ہو پتر؟''

''اسلام آباد سے چاچا جی!'' ڈرائیور کو انہوں نے پتر کہا تو اس نے انہیں چاچا بنانے میں دیر نہ لگائی، گاڑی میں بیٹھا نوجوان پیچ و تاب کھا رہا تھا مگر کچھ کر نہیں سکتا تھا، چند لمحے کی کوفت جو راستہ بھول جانے کی صورت میں ہوتی وہ اس کوفت سے کم ہوتی جو اس وقت الیاس کو اس بابے کے ساتھ بیٹھے ہوئے تسلی سے گفتگو کرتے دیکھ کر ہو رہی تھی۔

''نور پور جانا ہے، الیاس نام ہے میرا......'' وہ بھلا یہ سب کیوں پوچھ رہے تھے الیاس سے اور اسے اتنی وضاحتیں دینے کی کیا ضرورت ہے؟ اسے سوچ کر غصہ آ رہا تھا۔

''کہاں کے رہنے والے ہو تم؟'' بابے نے کیسا بے مقصد سوال کیا تھا۔ اس نوجوان کی بیزاری میں اضافہ ہو رہا تھا۔ نرالے نے اتنی دیر میں لسی تیار کر لی تھی۔ الیاس نے اس سے گلاس پکڑا اور گاڑی کی طرف آیا، اندر بیٹھے نوجوان کے انکار میں سر ہلانے سے پہلے، اس کی غصیلی نظر سے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ ان کا کیا جواب ہے...... اس لیے وہ بنا اصرار کیے واپس لوٹ گیا۔

''میں گوجر خان کا رہنے والا ہوں جی!''

''اچھا، اچھا...... خاص گوجر خان؟''

''نہیں جی، تھوڑا آگے گاؤں ہے میرا......'' الیاس اب انہیں اپنے گاؤں کا محل وقوع سمجھا رہا تھا، لسی کا گلاس ختم ہو رہا تھا اور نوجوان مالک کے غصے کا گراف اوپر جا رہا تھا۔

''بالکل صحیح جگہ پر رکے ہو بیٹا ورنہ تم لوگ آگے نکل جاتے۔ یہ اگلا بھٹا نظر آ رہا ہے ناں اینٹوں والا......'' انہوں نے ماتھے پر ہاتھ کا چھجا بنا کر دور دیکھتے ہوئے الیاس کو اشارہ کیا۔ ''اس کے گزرتے ساتھ ہی اینٹوں کی سولنگ والا راستہ ہے جو نور پور تک جاتا ہے، دو تین میل کے بعد نور پور کے نام کی تختی بھی نظر آ جائے گی پتر!''

''بہت مہربانی چاچا جی!'' الیاس نے اٹھ کر تعظیم سے ان سے ہاتھ ملایا اور واپس گاڑی کی طرف چلا۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے نوجوان نے اپنی کھڑکی کا شیشہ چڑھایا، ٹشو پیپر کے ڈبے سے ایک انتہائی نرم اور ہلکی سی خوشبو والا ٹشو پیپر نکالا اور تھپتھپا کر اپنا ماتھا صاف کیا، الیاس گاڑی میں بیٹھا، گاڑی اندر سے فریج کی طرح ٹھنڈی تھی۔

''کس قدر گرمی ہے۔'' اس نے الیاس کے بیٹھتے ہی کہا۔ ''تمہیں اندازہ بھی ہے کہ ہمیں وہاں جلدی پہنچنا ہے پھر بھی تم لسی پینے اور گپیں لگانے بیٹھ گئے......'' لسی کی ٹھنڈک اندر اترتے ہی مالک کے مزاج کی گرمی بے اثر ہونے لگی۔

''ابھی تو گرمی کا سے ڈھل چکا ہے جناب، شام ہو رہی ہے اور باہر کی گرمی کا اندازہ ابھی آپ کو نہیں ہو سکتا۔'' الیاس نے چند لمحے پہلے ہی باہر کھڑے ہو کر سوچا تھا کہ صاحب کے لیے تو ایک، ایک لمحہ یہاں گزارنا مشکل ہو گا، جس قسم کی سہولیات کے وہ شہر میں عادی تھے، وہ گاؤں میں میسر نہیں ہو سکتی تھیں۔ ان کے ہاں مالک تو مالک، ان کے گھر کے کتے اور ملازمین بھی بجلی کی اس لوڈ شیڈنگ کے عادی نہ تھے جس کا سامنا ملک کی باقی عوام کو کرنا پڑتا

ہے، بجلی بند ہونے اور جنریٹر آن ہونے میں لمحوں کا غیر محسوس سا وقفہ ہوتا اور بے آواز بھاری جنریٹر پورے گھر کی بجلی کا لوڈ اٹھا لیتے تھے۔ یہ چند لمحوں کا وقفہ بھی ان کے مزاجوں پر گراں گزرتا تھا..... اب ان کو اس مجبوری میں گاؤں آنا پڑا تھا تو جانے انہوں نے کیسے یہ وقت گزارنا تھا۔

☆☆☆

''ہوں..... تو تمہیں شک ہے کہ تم.....''

''پتا نہیں سارہ.....'' میں نے گہری سانس لی۔ ''حالانکہ تمہیں علم ہے کہ ہم دونوں کتنے محتاط ہیں۔''

''تو اس کا بہتر حل یہ ہے کہ تم ڈاکٹر کے پاس چلی جاؤ اور ٹسٹ کروالو، شک رفع ہو جائے گا۔''

''یہی تو میں چاہتی نہیں سارہ..... ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا چاہتی میں، وہ منہ سے بات نکل کر کتنے ہی لوگوں کے بیچ پہنچ جائے گی۔''

''اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے.....'' اس نے مایوسی سے کہا۔ ''ایسا تو کرنا ہی پڑے گا، اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے۔''

''نہیں، میں نے کہہ دیا ناں کہ میں ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا چاہتی، تم کوئی اور تجویز بتاؤ۔''

''تمہیں شک کس بات سے ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے خواب ایسے دکھائی دیتے ہیں سارہ!''

''کیسے خواب؟''

''بھیانک خواب..... جیسے میں کسی جنگل میں ہوں، اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور میں مدد کے لیے پکار رہی ہوں.....''

''ان خوابوں کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی خوشخبری ہے؟'' سارہ نے طنز سے پوچھا۔

''جانے کیوں مجھے ان خوابوں کا یہی مطلب لگتا ہے.....''

''کیا تمہارا جی بھی متلاتا ہے یا کوئی اور علامت؟''

''نہیں کوئی علامت ہے نہ جی متلاتا ہے مگر مجھے جانے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ.....''

''کیا محسوس ہوتا ہے؟''

''یہی کہ میرے اندر کچھ بدل رہا ہے، مجھے جاگتے میں خیالوں میں اس کا چہرہ نظر آتا ہے۔''

''اچھا!'' اس نے اچھا کو لمبا سا کھینچا۔ ''تو کیسا ہے اس کا چہرہ، تمہارے جیسا یا اس جیسا؟''

''فضول باتیں نہ کرو سارہ!'' میں چڑ گئی۔

''اچھا میں کوئی اور حل سوچتی ہوں.....''

''تھینک یو سارہ..... صرف تم سے میں اپنے دل کی ہر بات کہہ لیتی ہوں، اس اعتماد کے ساتھ کہ تم سے بات کرنا یونہی ہوتا ہے جیسے کہ میں خود کلامی کر رہی ہوں۔''

''تم فکر ہی نہ کرو پیاری، سمجھو کہ تم نے مجھ سے کبھی کچھ کہا ہی نہیں..... تمہاری ہر بات میرے سینے کے گہرے کنویں میں دفن ہے۔''

''تھینک یو سارہ پیاری!'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''میں اپنے پاس کوئی اور ایسا نہیں پاتی، جس سے میں کچھ بھی شیئر کر سکوں، میں اتنی تنہا کیوں ہو گئی ہوں سارہ؟''

(جاری ہے)

ناولٹ

دوسرا اور آخری حصہ





# یہ عشق ہے جاناں

نفیسہ سعید

زِلف خاصی مطمئن ہو کر گھر گئی تھی لیکن اگلے دو دن تک وہ کالج ہی نہیں آئی جس نے ذوھان کے ساتھ، ساتھ میڈم بشریٰ کو بھی تشویش میں ڈال دیا۔

"تمہارے پاس اس کا سیل نمبر نہیں ہے؟"

جب وہ آج بھی ریہرسل کے لیے نہ آئی تو میڈم نے ذوھان کو بلا کر پوچھا۔

"نہیں میم! کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔" وہ سادگی سے بولا۔

"لیکن اب تو تم دونوں کو اپنا نمبر ایک دوسرے سے شیئر کرنا چاہیے تھا کم از کم پتا تو چلتا کہ وہ کیوں نہیں آرہی۔"

"میم میں پتا کرتا ہوں، آپ ٹینشن نہ لیں۔" میڈم کو تسلی دیتا وہ باہر نکل آیا، سامنے ہی شعیب اور شاویز کھڑے تھے، ذوحان ان کے قریب ہی چلا گیا۔

"یار زلف کا نمبر کس کے پاس ہوگا؟" جہاں تک اسے یاد تھا زلف کی کسی سے بھی اتنی دوستی نہیں تھی کہ وہ اپنا نمبر کسی کو دیتی، اتنے عرصے میں تو ذوحان نے اسے کسی لڑکی کے ساتھ بھی نہیں دیکھا تھا کہ امید ہوتی کہ اس کے پاس ہی زلف کا کوئی رابطہ نمبر ہوگا وہ شروع سے ہی سب سے الگ تھلگ رہنے والی لڑکی تھی، بہت زیادہ کسی سے گھلنے ملنے کی عادی نہ تھی، ذوحان کو یقین تھا کہ اگر میم بشریٰ کے کہنے کے مطابق وہ بھی زلف سے نمبر مانگتا تو وہ کبھی نہ دیتی اور یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ سوچوں میں وہ گم تھا کہ اچانک اس کی نظر سامنے سے گزرتے ارسل پر پڑی، ارسل جو شاید زلف کا واحد دوست تھا وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

"ایک منٹ ارسل۔" ارسل کو روکنے کے لیے وہ اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"کیا بات ہے؟" ارسل کا انداز خاصا روکھا تھا۔

"سوری یار تمہیں ڈسٹرب کیا، مجھے دراصل زلف کا نمبر چاہیے تھا۔" بالآخر جھجکتے ہوئے اس نے اپنی بات مکمل کی۔

"زلف کا نمبر......" ارسل نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں، دراصل میڈم بشریٰ مانگ رہی ہیں کیونکہ وہ کالج نہیں آرہی جس کے باعث ہمارے ڈرامے کی ریہرسل کا حرج ہو رہا ہے۔" ارسل کچھ غلط نہ سمجھ لے یہ سوچ کر وہ جلدی، جلدی بول اٹھا۔

"اس کی طبیعت خراب ہے، دو دن سے اسپتال میں تھی، آج ڈسچارج ہوگئی ہے۔ انشاء اللہ ایک دو دن تک آجائے گی پھر بھی میڈم سے مل کر اس کا نمبر انہیں دے دیتا ہوں اوکے، بائے۔" ذوحان کا کوئی بھی جواب سنے بنا وہ آگے بڑھ گیا۔

"زلف بیمار ہے۔" یہ سنتے ہی ذوحان کے دل کو کچھ عجیب سا لگا...... جانے کیوں، وہ جاننا چاہتا تھا کہ ایسی کیا بیمار ہوگئی کہ اسپتال میں ایڈمٹ ہونا پڑا لیکن دوسری طرف ارسل کا انداز اتنا نپا تلا تھا کہ ذوحان کو کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ اور وہ شعیب کی سمت واپس پلٹ گیا... پھر اگلے دو دنوں تک وہ کچھ بے چین رہا تاوقتیکہ زلف کالج آنہ گئی، اسے دیکھتے ہی دل میں اترتے اطمینان نے ذوحان کو مزید بے چین کردیا۔ اسے یقین کرنا مشکل ہوگیا کہ وہ زلف کے کالج نہ آنے پر اتنا پریشان تھا کیوں......؟ یہ بات اگلے کئی دنوں تک اسے سمجھ نہ آئی اور جب سمجھ آئی تو وہ شاکڈ رہ گیا۔

☆☆☆

"سہتی اب اور انتظار نہیں ہوتا تو میرے ساتھ نکل چل، کتنا زمانہ بیت گیا ہے مجھے گھر بار چھوڑ کر تیرے عشق میں یہاں پڑے، پڑے رُل گیا میں تیری چاہ میں۔" اس کا ہاتھ تھامے مراد محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میرا وعدہ ہے اپنی بھرجائی کے ساتھ جب تک وہ رانجھے کی نہیں ہوجاتی، میں تیرے ساتھ نہیں جاسکتی مراد میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔" ایک بے بسی سہتی کے لہجے میں در آئی۔

"میرے ساتھ بہانے نہ بنا...... صاف کہہ دے تو ڈرتی ہے کھیڑوں سے، کہیں وہ تجھے ڈھونڈ کے مار نہ دیں۔" ناراضی مراد کے لہجے میں در آئی۔

"تو اچھی طرح جانتا ہے مراد، سہتی کسی سے نہیں ڈرتی سوائے سوہنے رب کی ذات کے۔" بالوں کی چوٹی کو ایک جھٹکے سے پیچھے کرتے ہوئے وہ بولی۔ ذوحان نے آج پہلی بار آج اس کے بال دیکھے تھے، لمبے اور گھنے، ہلکے گولڈن سے بال جو ہمیشہ اس کے اسکارف میں ہی چھپے رہتے۔ آج میڈم بشریٰ کے بہت سمجھانے پر اس نے اسکارف کی جگہ سر پر دوپٹا لے لیا تھا جس نے

زِلف کو قدرے تبدیل کر دیا تھا کہ اس سے بات کرتے ہوئے ذوحان کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے سامنے سچ مچ جیتی جاگتی سہتی آن کھڑی ہوئی ہو ویسے بھی اس نے کالج آنے جانے کے لیے اسکارف لینا شروع کیا تھا۔ ورنہ تو سر پر دوپٹا ہی لیتی تھی۔

''بس دو دن تک اپنا اونٹ تیار کر لے، میں تیرے ساتھ جانے کے لیے پورے دو دن بعد یہاں پہنچ جاؤں گی اور ہاں دوبارہ کبھی نہ کہنا کہ سہتی کھیڑوں سے ڈر گئی، میں اگر ڈر گئی ہوتی تو تجھ سے پیار نہ کرتی۔'' اپنے ڈائیلاگ بولتی زِلف، ذوحان کے دل میں اندر تک اتر گئی۔

''واؤ گڈ، زبردست، بہت اعلیٰ ڈائیلاگ ڈلیوری ہے۔'' میڈم بشریٰ کی آواز کانوں سے ٹکراتے ہی وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔

''تھینک یو میم......'' زِلف نے اپنا سر واپس اچھی طرح اسکارف سے ڈھک کر پن لگالی، سہتی اس کے اندر کہیں گم ہوگئی اب سامنے صرف زِلف کھڑی تھی جو اسی ڈرامے کا اہم کردار تھی۔

''بس اب ایک آخری ریہرسل مائیک پر بھی ہوگی تاکہ تمہیں اصل ڈراما کرتے ہوئے مشکل نہ ہو اور ہاں آخری ریہرسل والے دن یہاں کالج کے طالب و طالبات بھی ہوں گے تاکہ تم میں لوگوں کے سامنے ڈراما پیش کرنے کا اعتماد بحال ہو۔'' میڈم بشریٰ یہ سب کہتے ہوئے وہاں سے چلی گئیں۔

وہ بھی باہر جانے کے لیے آڈیٹوریم کے داخلی دروازے تک پہنچی ہی تھی کہ پیچھے سے آتے ذوحان نے روک لیا۔

''تم اسپتال میں ایڈمٹ تھیں؟'' بنا کسی تمہید کے اس نے اپنے دل میں آیا سیدھا سا سوال داغ دیا۔

''ہاں، طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔'' ذوحان نے دیکھا اس کی رنگت پیلی پڑ گئی تھی اور چہرے پر تھکن کے آثار نمایاں تھے۔

''کیا ہوا تھا اور اب طبیعت کیسی ہے؟'' پتا نہیں کیوں اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ زِلف سے باتیں کرے بہت ساری باتیں...... وہ اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔

''بخار ہو جاتا ہے اور اسے ٹھیک ہونے میں ٹائم لگتا ہے۔'' جواب دے کر وہ آگے کی جانب چل دی، ذوحان بھی رکا نہیں بلکہ اس کے ساتھ، ساتھ ہی چلنے لگا...... جانے کیوں اسے اچھا لگنے لگا تھا اس طرح زِلف کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا جیسے وہ ابھی چل رہا تھا۔

''ذوحان ملا تھا تم سے؟'' شعیب نے دور کھڑے ذوحان کو دیکھتے ہوئے شاویز سے سوال کیا۔

''نہیں، آج کل تو وہ زیادہ تر آڈیٹوریم میں ہی ہوتا ہے، میرا خیال ہے کہ آج اس کی ریہرسل کا آخری دن ہے پھر دو دن بعد ڈراما......اس کے بعد فارغ ہی فارغ پھر ہم ہوں گے اور وہ...... یعنی ہمارا اپنا یار ذوحان۔'' شاویز نے شعیب کی بات پر توجہ دیے بنا جواب دیا۔

''جانے کیوں مجھے ایسا لگنے لگا ہے جیسے ذوحان بدل گیا ہے اب وہ اپنا پہلے والا یار ذوحان نہیں رہا۔'' شعیب نے ایک بار پھر اسی سمت دیکھا جہاں ذوحان کھڑا تھا مگر وہ اکیلا نہ تھا بلکہ زِلف بھی ساتھ تھی جس کے قدم سے قدم ملائے شاداں و فرحاں ذوحان دوسری سمت جا رہا تھا شاید آڈیٹوریم کی جانب......

''میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں وہ کبھی نہیں بدل سکتا تو خواہ مخواہ کی ٹینشن نہ لے۔'' شاویز نے ہنستے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا مگر شعیب نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کئی دنوں سے ذوحان کو دیکھ رہا تھا اب ہر گزرتا دن ذوحان کے اندر نئی تبدیلی لا رہا تھا۔ جو یقیناً مثبت ہی تھی اور یہ بات شعیب کی پریشانی میں اضافے کا سبب بن رہی تھی، اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس طرح وہ آہستہ، آہستہ ان لوگوں سے دور ہو جائے گا جو بھی تھا شعیب کسی طرح بھی ذوحان کی دوستی نہیں کھونا چاہتا تھا۔ اسے ایسا بھی محسوس ہو رہا

تھا جیسے ذوحان میں آنے والی اس نئی تبدیلی کی وجہ زلف تھی۔

☆☆☆

''تم پڑھ رہے ہو؟'' روحی جیسے ہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں، سامنے بیٹھے ذوحان کی ہاتھ میں کورس کی کتاب دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

''کیوں، کیا میں نہیں پڑھ سکتا، آپ تو ایسے حیران ہو رہی ہیں جیسے یہاں تک میں بنا پڑھے ہی پہنچ گیا ہوں۔'' ذوحان نے ماں کی بات سنتے ہی برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔

''جانتی ہوں میں تمہیں اچھی طرح...... ہمیشہ نقل پر ہی تکیہ کرتے رہے ہو، اسی لیے کورس کی کتاب تمہارے ہاتھ میں دیکھ کر حیرت ہوئی ہے۔'' وہ بھی آخر اس کی ماں تھیں، ہر بات اچھی طرح جانتی تھیں۔ ''اچھا اپنے میلے کپڑے نکال دو، نذیراں نے واشنگ مشین لگائی ہے پھر نہ کہنا کہ یہ نہیں دھلا اور وہ رہ گیا۔'' دروازے سے ہی اسے ہدایت دے کر وہ واپسی کے لیے پلٹی ہی تھیں کہ ذوحان نے آواز دے کر انہیں روک لیا۔

''بات سنیں مما......'' آواز کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر ان کے پاس آن کھڑا ہوا۔ ''آپ نماز کیوں نہیں پڑھتیں؟''

اسے حیرت تھی کہ اس نے اپنی ماں کو کبھی باقاعدگی سے نماز پڑھتے نہ دیکھا تھا سوائے اس وقت جب وہ کسی تکلیف میں ہوں اور روتے دھوتے خدا سے شکوہ کرتی ہوئی پائی جاتیں۔

اور دوسری طرف زلف تھی جو کالج میں بھی ظہر کی نماز ضرور پڑھتی کیونکہ ڈرامے کی ریہرسل کی وجہ سے انہیں ہر روز کالج میں ہی چار بج جاتے۔

''نماز......؟'' روحی نے حیرت سے پلٹ کر بیٹے کی شکل دیکھی۔

''پڑھتی تو ہوں بیٹا۔'' انہیں سمجھ ہی نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دیں۔

☆☆☆

آل پاکستان مقابلے میں ان کا ڈراما تیسرے انعام کا حق دار ٹھہرا جس کی خوشی میں آج میڈم بشریٰ نے ان تمام لوگوں کو کالج کے باہر لنچ دیا تھا جو اس ڈرامے کا حصہ تھے۔ لنچ سے فارغ ہو کر جب وہ باہر نکلا تو دیکھا زلف تن تنہا روڈ کے کنارے کھڑی غالباً بس یا رکشے کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ علاقہ کالج کی نسبت خاصا سنسان تھا اور دور، دور تک کسی رکشا، ٹیکسی کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔ کچھ دیر اپنی جگہ کھڑے ہو کر اس نے سوچا اور پھر پارکنگ سے جا کر گاڑی نکال لایا لیکن جب وہ مین روڈ تک پہنچا تو زلف وہاں نہ تھی۔ وہ روڈ کے کنارے پیدل چلتی ہوئی کافی آگے جا چکی تھی، وہ تیزی سے گاڑی لے کر اس کے قریب جا پہنچا اور ہارن بجا کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

''آ جاؤ میں چھوڑ دوں، یہاں تمہیں کوئی سواری نہیں ملے گی۔'' اس کے کہتے ہی زلف فرنٹ ڈور کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ ذوحان نے دیکھا اس کی سانسیں قدرے پھولی ہوئی تھیں اور ماتھے پر پسینے کے قطرے بھی نمایاں ہو چکے تھے۔

''کیا ہوا تمہیں، طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟'' زلف کی یہ حالت دیکھ کر وہ تھوڑا سا گھبرا گیا، زلف نے کوئی جواب نہ دیا، سیٹ سے ٹیک لگا کر اپنا سر پیچھے کرتے ہوئے اس نے بہ مشکل دو تین گہری سانسیں لیں اور پھر اپنے بیگ میں یہاں وہاں ہاتھ مار کر گولیوں کا پتا برآمد کیا، ذوحان گاڑی کنارے سے لگائے اسے خاموشی سے یہ سب کرتا دیکھ رہا تھا۔ زلف نے پتے سے گولی نکال کر منہ میں رکھی اور ہاتھ میں پکڑی بوتل کا ڈھکن کھول کر غٹا غٹ پی گئی اس دوران وہ بالکل خاموش تھی شاید اس سے بات نہیں کی جا رہی تھی، ذوحان انتظار کر رہا تھا کب اس کی حالت بہتر ہو اور وہ کچھ پوچھ سکے۔ بالآخر زلف نے اپنی بند آنکھیں کھولیں اور سیٹ پر سیدھی ہو کر بیٹھنے کی کوشش کی، جس میں وہ کامیاب بھی ہو گئی۔

''کہاں جانا ہے تمہیں؟'' اس کی حالت بہتر

ہوتے ہی ذوہان نے گاڑی اسٹارٹ کر کے روڈ پر ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

''کسی قریبی بس اسٹاپ پر چھوڑ دو یا کسی بھی ایسی جگہ جہاں سے رکشا بہ آسانی مل جائے۔'' اس کے چہرے کی طرح آواز میں بھی تھکن اتری ہوئی تھی۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے بہتر ہو گا میں تمہیں، تمہارے گھر چھوڑ دوں، مجھے اپنا ایڈریس بتاؤ'' ذوہان نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''کہا ناں میں تمہارے ساتھ تمہاری گاڑی میں اپنے گھر نہیں جا سکتی، اس لیے پلیز مجھے یہیں اتار دو وہ سامنے رکشا کھڑا ہے میں لے لوں گی۔''

''کیا فضول بکواس ہے یہ، میں راستے میں تمہیں کھا نہیں جاؤں گا۔ خاموش بیٹھی رہو اور اپنا ایڈریس بتاؤ مجھے۔'' اس کی باتوں سے زیادہ ذوہان کا دھیان زِلف کی طبیعت کی جانب تھا اور اسے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اسے اس حال میں کسی رکشا یا پبلک ٹرانسپورٹ میں بٹھا دیتا۔

''پلیز ذوہان گاڑی روکو۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''تم نہیں جانتے میرے والد ایک عالم دین ہیں جن کی محلے بھر میں بہت عزت ہے۔ اپنی ضد اور اسی ادارے کی شہرت کے باعث میں ایک ایسے تعلیمی ادارے میں علم حاصل کرنے گھر سے ضرور نکلی ہوں جو مخلوط طرزِ تعلیم کا حامی ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں، اس طرح کسی بھی لڑکے کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر چلی جاؤں۔ سارا محلہ باتیں کرے گا، مولانا صاحب دوسروں کو درس دیتے ہیں اور اپنی بیٹی جانے کہاں، کہاں پھرتی ہے غیر لڑکوں کے ساتھ گاڑیوں میں۔'' اس کی بات ختم ہونے سے قبل ہی ذوہان نے گاڑی روک دی تھی۔ وہ گاڑی سے اتر کر رکشے میں بیٹھ گئی تھی۔ سامنے ہی رکشا کھڑا تھا.....

بے شک وہ رکشے والا ذوہان سے زیادہ قابلِ اعتبار تھا کیونکہ اگر کوئی اس کے رکشے میں زِلف کو دیکھتا تو یا تیں نہ بتاتا اور سچ ہے ایک مہنگی گاڑی سے اترنے والی کسی بھی شریف محلے کی لڑکی پر کوئی بھی شخص انگلی اٹھا سکتا ہے۔ رکشا اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا، جانے ذوہان کتنی دیر اسی طرح سڑک کے بیچ کھڑا رہتا اگر پیچھے سے آنے والی بڑی بس کا ہارن اس کی محویت کو ختم نہ کرتا۔ اس نے گاڑی کو پہلے گیئر میں ڈالا اور آہستہ، آہستہ آگے کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

''تم ذوہان علی خان کو کب سے جانتی ہو؟'' زِلف نے اپنے سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھا جو بے شک اس کی کلاس فیلو تھی مگر جہاں تک زِلف کو یاد پڑتا تھا آج تک دونوں کے درمیان کبھی ہائے ہیلو بھی نہیں ہوئی تھی۔

''میرا خیال ہے میں تمہارے کسی بھی ایسے سوال کا جواب دینے کی پابند نہیں جس کا تعلق تمہاری ذات سے نہ ہو۔'' زِلف کو اس کا اس طرح کالج گراؤنڈ میں کھڑے

## سنیے آپ کا بچہ آپ سے کچھ کہہ رہا ہے

جب میں کوئی کام اچھا کروں تو حوصلہ افزائی کریں میری...... مجھے میرے دوستوں میں معزز بنائیں...... مجھ سے غلطی ہو جائے تو برائے مہربانی مجھ پر چیخیں چلائیں نہیں بلکہ نرمی سے مجھے میری غلطی بتائیں۔ مجھے نکما اور بے وقوف کہہ کر مت پکاریں۔ مجھے سب کے سامنے برا بھلا نہ کہیں تنہائی میں سمجھائیں، میرے ماتھے پر آپ کا دیا بوسہ مجھے فخر سے بھر دیتا ہے۔ مجھ پر تنقید ذرا آہستہ اور تعریف بلند آواز سے کریں۔ آپ...... یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ آپ بھی کبھی بچے تھے کیا آپ کو اچھا لگتا کوئی آپ کے ساتھ برا رویہ رکھتا نہیں ناں تو پلیز مجھے ڈانٹنے اور مارنے سے پہلے ایک بار ضرور سوچیے۔

مرسلہ: عظمیٰ حیدر زہری، اوستہ محمد، صوبہ بلوچستان

ہو کر ذوہان کے متعلق سوال کرنا ذرا پسند نہیں آیا۔

''مرضی ہے تمہاری مت دو جواب۔'' لڑکی کندھے اچکاتے ہوئے ذرا سا مسکرائی۔ ''لیکن میں تمہیں ایک ضروری بات بتانے آئی تھی وہ ضرور بتاؤں گی ذوہان علی خان سے دور رہنا، بہت دھوکے باز لڑکا ہے وہ محبت کے نام پر نازک دلوں سے کھیلنے والا شاطر کھلاڑی۔'' لڑکی زہر خند لہجے میں بولی۔

''ایکسکیوزمی، میرا خیال ہے تمہیں کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے، میرا ذوہان سے کوئی ایسا تعلق نہیں جو دھوکے کا باعث بنے اور ویسے بھی میں محرم اور نامحرم کا فرق پہچانتی ہوں۔'' نرم لہجے میں سخت الفاظ کہتی وہ جیسے ہی کلاس میں داخل ہوئی سامنے سے آتے ذوہان سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

''اوہ سوری یار، میں اپنی بے دھیانی میں تھا تمہیں دیکھا ہی نہیں۔'' موبائل میں مصروف ذوہان اسے دیکھ کر مسکرایا۔

وہ بنا جواب دیے بالکل سپاٹ چہرہ لیے اس کے برابر سے گزر گئی۔ ڈیڑھ ماہ ایک ساتھ کام کر کے دونوں کے درمیان اتنی دوستی تو ہو گئی تھی کہ کم ازکم ایک دوسرے سے بات ہی کر لی جائے اس وقت زلف کا اس طرح نظر انداز کر کے آگے بڑھ جانا، ذوہان کو بے چین کر گیا وہ پلٹ کر اس کے پیچھے گیا۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟'' ابتدائے...... گفتگو کچھ تو سلسلۂ کلام چاہیے تھا۔

''شکر الحمد للہ......'' بیگ رکھ کر اس نے اپنے پیچھے کھڑے ذوہان کو جواب دیا۔

''پھر موڈ کیوں اس قدر آف ہے؟'' زلف کے چہرے پر چھائی خفگی بھرے تاثرات اس کے اندرونی غصے کو ظاہر کر رہے تھے۔

''کچھ نہیں، بس کالج میں داخل ہوتے ہی عجیب فضول سی لڑکی متھے لگ گئی۔ شاید تمہاری کوئی ایکس تھی، اسی حوالے سے اس کی، کی جانے والی گفتگو بھی عجیب مضحکہ خیز سی تھی۔'' زلف کیا کہہ رہی تھی اس نے نہ سنا، اس کے دماغ کی سوئی لفظ ایکس میں ہی پھنس گئی۔

''غلط فہمی ہوئی ہوگی اسے کوئی بہت بڑی، میں بے شک آوارہ اور کھلنڈرا لڑکا ہوں لیکن اس کے باوجود لڑکیوں کو دھوکا دینا کبھی میری زندگی کا حصہ نہیں رہا بلیومی......'' زلف نے حیرت سے دیکھا وہ اسے کیوں وضاحت دے رہا تھا۔

''تمہاری زندگی تمہارا مسئلہ ہے ذوہان...... اس سلسلے میں مجھے تمہاری کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔'' ذوہان نے دیکھا وہ ہمیشہ کی طرح مطمئن تھی۔

''بات یہ ہے زلف......'' وہ کچھ کہنا چاہتا تھا جب اسی پل کلاس کے دروازے پر شعیب آن کھڑا ہوا، ارسل بھی کلاس میں آچکا تھا، اب مزید کچھ کہنا بیکار تھا۔

''اوئے آجا یار، شاویز اپنی برتھ ڈے کی ٹریٹ دے رہا ہے سب کینٹین میں جمع ہیں۔'' شعیب نے دروازے میں کھڑے کھڑے آواز لگائی۔

یہ اکنامکس کا پیریڈ تھا جو وہ سب عام طور پر بنک ہی کیا کرتے مگر آج اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

''سوری یار، میں آج پیریڈ لوں گا کیونکہ میرے ٹیوٹر نے مجھے اکنامکس پڑھانے سے صاف انکار کر دیا ہے۔''

شعیب کو صاف انکار کرتا وہ زلف کے دائیں ہاتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ زلف اپنی بک کھولے کچھ پڑھنے میں مصروف تھی اس کے برابر کوئی آن بیٹھا اس نے توجہ نہ دی مگر ذوہان کے لیے شاید اتنا ہی کافی تھا کہ پورے دو گھنٹے کی کلاس میں اسے زلف کے برابر بیٹھنے کا اعزاز حاصل ہو گیا تھا اور یہ بھی اس کی زندگی کی حالیہ چھوٹی، چھوٹی خوشیوں میں سے ایک خوشی تھی۔

☆☆☆

''میں چاہتا ہوں آپ میری رہنمائی فرمائیں، مجھے اندھیرے سے نکال کر اجالے میں لے جائیں آپ کا یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔'' سیف اللہ صاحب نے اپنے سامنے بیٹھے اس خوب صورت نوجوان کو دیکھا جس کا تعلق یقیناً کسی امیر گھرانے

سے تھا جس کی گواہی اس کے جسم پر موجود قیمتی لباس دے رہا تھا۔

''میں بڑا ادنیٰ سا بندہ ہوں میرے بچے، میں بھلا کیا کسی کو راہ دکھاؤں گا، میں تو خود اپنے رب کا محتاج ہوں۔'' وہ اپنے ازلی دھیمے لہجے میں بولے ایسا لہجہ جس میں پیار و محبت گندھا تھا بے اختیار ہی ذوھان کو اپنے پاپا یاد آگئے۔ پیسے کی دوڑ میں دوڑتے، مقابلہ کرتے اس کے پاپا تھکے اور ہانپے ہوئے رہتے کیونکہ دنیاوی دوڑ میں بندہ بالآخر تھک ہی جاتا ہے اور ایک یہ سامنے بیٹھا شخص تھا نہایت مطمئن، شاداں اور فرحاں...... ذوھان کو بے اختیار ان پر رشک آ گیا، یقیناً زلف ان جیسے ہی شخص کی بیٹی ہو سکتی تھی تبھی تو اس کی ذات میں ہر لمحہ اطمینان جھلکتا تھا۔ اس نے ان تک پہنچنے کے لیے کافی کوشش کی تھی جو آج یہاں بیٹھا تھا۔

''میں قرآن شریف کو ترجمے اور تفسیر کے ساتھ پڑھنا چاہتا ہوں۔'' بالآخر اس نے اپنے یہاں آنے کا مقصد واضح کیا۔

''ٹھیک ہے بیٹا، آپ شام چار بجے آجایا کریں۔'' مولوی سیف اللہ نے اسے پڑھانے کی ہامی بھرلی۔

''نماز پڑھنی آتی ہے آپ کو؟'' ذوھان کا حلیہ دیکھتے ہوئے ان کا کیا جانے والا سوال بالکل درست تھا۔

''جی...... مگر یہ نہیں پتا کہ میں اپنے اس فرض کی ادائیگی کس حد تک درست کرتا ہوں...... پلیز آپ اس سلسلے میں بھی میری رہنمائی فرمائیں تو یقیناً مجھے خوشی ہوگی۔''

''ٹھیک ہے پھر کل عصر کی نماز ہم ساتھ ہی پڑھیں گے۔'' اب یہ غالباً ان کی طرف سے گفتگو ختم ہونے کا اشارہ تھا۔ ذوھان اٹھ کھڑا ہوا، اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کم از کم اس نے زلف کے والد تک تو رسائی حاصل کرلی تھی اب انشاء اللہ اس کے گھر بھی پہنچنا مشکل نہ تھا۔

☆☆☆

''آپ پاپا کو منع کردیں، میں آسٹریلیا نہیں جاؤں گا مجھے جو بھی تعلیم حاصل کرنی ہے یہاں ہی رہ کر حاصل کرنی ہے وہ بلاوجہ میری طرف سے پریشان نہ ہوں یہاں بھی بہت بہترین یونیورسٹیاں موجود ہیں۔'' خلافِ توقع اس کا لہجہ خاصا نرم تھا ورنہ عام طور پر وہ چیخ چلا کر گفتگو کرنے کا عادی تھا، اس کے کردار میں رونما ہونے والی یہ تبدیلی بے شک مثبت تھی مگر روحی جانے کیوں پریشان ہو رہی تھیں۔

''تم نے شیو کیوں نہیں بنائی، عجیب مست ملنگ سے لگ رہے ہو۔'' ذوھان سے بات کے دوران ان کی نظر اس کی ہلکی، ہلکی بڑھی ہوئی شیو پر پڑی تو وہ عجیب وہمی انداز میں بولیں۔

''کیونکہ میں داڑھی رکھنا چاہ رہا ہوں، مجھے اچھی لگتی ہے۔''

''ہاں وہ تو ٹھیک ہے مگر......'' وہ کچھ کہتے، کہتے رک گئیں، اس وقت وہ ذوھان کے چہرے پر فرنچ کٹ یا کوئی اور فیشن ایبل داڑھی کا تصور کر رہی تھیں۔

''کیا بات ہے مما، آپ کچھ پریشان ہیں؟''

''نہیں بیٹا، میں سوچ رہی تھی کہ تم کل میرے ساتھ ڈاکٹر ارمان کے پاس چلو میں ذرا تمہارا چیک اپ کروا دوں۔''

ڈاکٹر ارمان سائیکاٹرسٹ تھے اس کا مطلب یہ ہوا کہ مما اسے ذہنی مریض سمجھنے لگی تھیں، وہ بے اختیار ہی مسکرا دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس وقت ان سے کوئی بھی بحث کرنا بیکار تھا اس لیے ذوھان نے بات ختم کرنے کو جانے کی ہامی بھرلی۔

☆☆☆

''محبت اور اس ملاقی سے۔'' شعیب اس کی بات سنتے ہی ہنس دیا جبکہ شاویز نہایت خاموشی کے ساتھ اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

''زلف نام ہے اس کا شعیب اور بہتر ہوگا آئندہ جب تم اس کا نام لو تو تمیز کے دائرے میں رہ کر

لو ورنہ شاید میں یہ بھول جاؤں گا کہ تم میرے دوست ہو۔'' ذوحان کا بدلہ ہوا لہجہ اور انداز ان دونوں کو حیران کر رہا تھا۔

''اچھا اب ایک لڑکی کی خاطر تم دونوں آپس میں لڑو گے؟'' شاویز لڑائی ختم کرواتا ہوا ان کے درمیان آ گیا۔

''دیکھو ذوحان، میری ایک بات مانو اگر یہ تمہارا کوئی ٹاسک ہے تو چھوڑ دو۔''

اسے لگا شاید شعیب اور ذوحان کے درمیان کوئی ایسی شرط لگی ہو جس کے تحت وہ یہ سب کر رہا ہے۔

''یہ ٹاسک نہیں...... محبت ہے شاویز، جو مجھے زلف سے واقعی ہو گئی ہے کب، کیوں اور کیسے یہ سب بیکار کی باتیں ہیں، اصل بات صرف یہ ہے کہ میں اس کی محبت میں غرق ہوتا جا رہا ہوں اور ہر آنے والا نیا دن مجھے یہ آگہی دے رہا ہے کہ اگر وہ نہیں تو کچھ نہیں۔'' وہ سچے اور سادہ لہجے میں اپنی بات مکمل کرتا ہوا بولا۔

''تم نے یہ سب کچھ اسے بتایا ہے؟''

وہ دونوں وہاں موجود شعیب کی موجودگی کو قطعی نظر انداز کر چکے تھے۔

''نہیں... کیونکہ مجھ میں ہمت نہیں اسے یہ کہنے کی کہ میں اس سے پیار کرنے لگا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں وہ کبھی نہیں مانے گی کہ میں سچ بول رہا ہوں۔ اور اس کی بے یقینی کا خوف مجھے کچھ کہنے سے باز رکھے ہوئے ہے۔''

''حیرت ہے جس سے محبت کرنے لگے ہو اسی سے یہ کہتے ہوئے ڈرتے ہو ورنہ آج تک تو تم کسی سے بھی نہ ڈرے۔'' پہلی بار شعیب نے ان کی گفتگو میں حصہ لیا۔

''محبت پہلی بار کی ہے ناں، اس لیے اس کے رد ہونے کا خوف بھی دل میں پہلی بار ہی آیا ہے ورنہ تو آج تک کبھی کسی کی ہاں یا نہ سے ڈر ہی نہیں لگا۔'' ذوحان کی بات کسی حد تک درست تھی، وہ دونوں خاموش ہو گئے سمجھ بھی نہیں آیا کہ اب اسے مزید کیا کہیں......

''بہر حال میرا مشورہ مانو تو اپنے دل کی بات اس تک پہنچا دو جس سے تمہارے دل کا کنکشن جڑ گیا ہے ورنہ ایسا نہ ہو یوں ہی بے مراد مارے جاؤ۔'' شاویز نے اسے کھلے دل سے مشورہ دیا۔

''یہ صحیح کہہ رہا ہے ذوحان، تم زلف سے بات کرو اور اسے بتاؤ کہ وہ تمہارے لیے کیا حیثیت رکھتی ہے۔'' شعیب نے بھی اسے حوصلہ دلانے کی کوشش کی۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ تھکے، تھکے لہجے میں کہتا آگے کی جانب بڑھ گیا۔

محبت انسان کو بے دست و پا کر دیتی ہے۔ اس کے وجود میں بہتے لہو کے اندر تک اتر جاتی ہے...... سچ تو یہ ہے کہ محبت انسان کو شاید مار دیتی ہے۔ یہ سب کتنا سچ تھا، آج ذوحان کی حالت نے اس کے دوستوں کو بہت اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔

☆☆☆

''مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے میرے ساتھ آؤ۔'' وہ کئی دنوں سے زلف سے بات کرنا چاہ رہا تھا مگر وہ ہمیشہ ارسل کے ساتھ ہوتی اس لیے آج وہ ہمت کر کے ان دونوں کے پاس جا پہنچا......

''خیریت ہے تمہیں مجھ سے کیا کام پڑ گیا؟''

ڈرامے کے دوران ہونے والی ان دونوں کی دوستی ڈراما ختم ہوتے ہی تقریباً ختم ہو چکی تھی جس میں سارا ہاتھ زلف کا تھا جو باوجود ذوحان کی کوشش کے اس سے اپنی دوستی بحال کرنے کی خواہش مند نہ تھی جس کا اندازہ وہ کئی بار لگا چکا تھا، یہ بھی وجہ تھی جو اس سے بھی زلف کا بات کرنے کا انداز خاصا روکھا تھا۔

''کہا نہیں جاؤں گا تمہیں، آؤ میرے ساتھ۔'' زلف سے بات کرتے ہوئے اس نے ارسل کو قطعی نظر انداز کر دیا تھا۔

''جو بات کرنی ہے یہاں ہی کر لو ارسل کے سامنے۔'' زلف بھی ایک ڈھیٹ تھی اس لیے صاف انکار کرتے ہوئے بولی۔

''پلیز زِلف صرف دو منٹ، سوری ارسل۔'' جانتا تھا زِلف اب ایک انچ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلنے والی۔ اس لیے ہی ارسل کو مخاطب کرنا پڑا جو فوراً ہی اس کی بات سمجھ گیا۔

''میں لائبریری میں ہوں، تم بھی وہیں آجانا۔'' اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ زِلف سے مخاطب ہوا اور پھر ذوحان خاموش کھڑا اس وقت تک انتظار کرتا رہا جب تک وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔

''کہو کیا بات ہے؟'' اس کی خاموشی سے جیسے زِلف اکتاتے ہوئے بولی۔

''یار تم تھوڑا سا ریلیکس تو ہو جاؤ تاکہ مجھے بات کرنے میں آسانی ہو۔'' زِلف کے بگڑے موڈ نے اسے بات کرنا مشکل کر دیا تھا۔

''میں ریلیکس ہوں ذوحان جو کہنا ہے پلیز جلدی کہو۔'' اس نے یہاں وہاں دیکھا، کاریڈور اتفاق سے خالی تھا اور یہ بہترین وقت تھا اپنے دل کی بات دوسرے فریق تک پہنچانے کا تاکہ اگر بدلے میں بے عزتی بھی ہو تو کوئی نہ دیکھ سکے۔

''پتا نہیں زِلف کیسے، مجھے پتا بھی نہیں چلا یا شاید میں جان کر انجان بنا رہا۔'' وہ آہستہ آہستہ اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیا کہہ رہے ہو تم جلدی کہو، مجھے لائبریری جانا ہے۔'' ذوحان کچھ خاص کہنا چاہتا تھا یہ وہ جان گئی تھی، یہ ہی وجہ تھی اس کے درگزر کرنے کی کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ذوحان کی بات سنے مگر اب سنے بنا گزارہ بھی نہیں تھا۔

''تم شاید نہیں جانتیں زِلف، مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے اتنی محبت...... کہ شاید اگر تم مجھے نہ ملیں تو میں مر جاؤں گا۔''

دیوار پر ہاتھ رکھتا ہوا وہ اس کے اتنا قریب ہو گیا کہ زِلف کو اس کے سانس لینے کی آواز تک صاف سنائی دے رہی تھی۔

''ڈراما ختم ہو چکا ہے ذوحان، حقیقت کی دنیا میں واپس آجاؤ میں سمجھتی نہیں ہوں جسے تم مراد بن کر دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔'' اس کے بازو کے نیچے سے نکل کر وہ باہر آگئی، ذوحان کو اس کی اس بے یقینی پر شروع سے ہی یقین تھا۔ اس لیے اسے قطعی برا نہیں لگا۔

''میں جانتا تھا تمہیں یقین دلانا بہت مشکل ہے لیکن میں پھر بھی یہ چاہتا ہوں کہ تم یقین کرلو میری محبت کا، میرا یقین کرلو، ذوحان علی خان کا۔ جو تمہاری چاہ میں سب کچھ بھلا بیٹھا ہے۔''

اس نے ہمت نہ ہاری شاید اسے یہ موقع زندگی دوبارہ نہ دیتی۔

''تم جو کہو گی میں تمہاری خاطر کرنے کو تیار ہوں، جو امتحان لینا ہے میرا لے لو لیکن خدا کے لیے میرا یقین کرو، میری محبت کا یقین کرو، میں سب کچھ چھوڑ دوں گا اور جلد ہی اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر اس قابل ہو جاؤں گا کہ تمہیں اپنا سکوں۔'' وہ اس کے سامنے... گڑگڑا کر اپنی محبت کی بھیک مانگ رہا تھا جواب میں زِلف بالکل خاموش کھڑی تھی ازلی اطمینان اس کے چہرے سے جھلک رہا تھا ایسے جیسے وہ جانتی تھی، ذوحان کی دلی کیفیت سے واقف تھی۔

''کسی سے محبت کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے ذوحان اس کے بارے میں سب کچھ جان لیا جائے...... بنا کچھ جانے کی جانے والی محبت دکھ اور اذیت کا باعث بنتی ہے۔'' اس بار اس کا لہجہ پہلے جیسا سرد نہ تھا شاید اس پر لگی برف ذوحان کے جذبوں کے آگے پگھل رہی تھی باہر سے گزرتی کسی بس کے تیز ہارن نے اس کی آواز کو تھوڑا سا دبا دیا۔

''کوئی فائدہ نہیں ہے تمہاری مجھ سے اتنی محبت کا، میرے ناتواں کندھے اتنا وزنی بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔'' ذوحان کو ایسا لگا جیسے اس کی آواز میں نمی گھلی ہو۔ ''میں تمہارے ساتھ زیادہ عرصہ نہیں چل سکتی، اسی لیے تمہیں محبت کے نام پر دھوکا نہیں دے سکتی۔''

وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی ذوحان بالکل نہ سمجھ پایا۔

# پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

| | | | |
|---|---|---|---|
| عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عُشنا کوثر سردار | اشفاق احمد |
| نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی |
| فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایتُ اللہ التمش |
| قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابر راجہ | ہاشم ندیم |
| نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | مُمتاز مُفتی |
| نگہت عبدُاللہ | سباس گُل | عنیزہ سید | مُستنصر حُسین |
| رضیہ بٹ | رُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیمُ الحق |
| رفعت سراج | اُمِ مریم | نایاب جیلانی | ایماے راحت |

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

''تم تو شاید میرے بارے میں بھی یہ نہیں جانتے کہ میں بیمار ہوں، لیو کیمیا ہے مجھے ذوحان علی خان لیو کیمیا...... یعنی بلڈ کینسر......'' پھولی، پھولی سانسوں میں اپنی ہر بات کی وضاحت کرتی زلف گویا اس کے گرد بم گراتے ہوئے بولی۔ ذوحان کو لگا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ اسے اپنے آس پاس کی دیواریں لرزتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

''ہاں ذوحان ...... مجھے بلڈ کینسر ہے۔ مجھے بچانے کی کوششوں میں میرے ماں، باپ ہلکان ہوئے جا رہے ہیں۔ میں تو انہی کی محبت کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہوں مزید محبت جمع کر کے کیا کروں گی۔'' بات ختم کرتے ہوئے وہ مسکرائی۔ تھکی، تھکی سی مسکراہٹ جو ذوحان کو اندر تک بے چین کر گئی۔

''تم جھوٹ بول رہی ہو ناں زلف، صرف مجھے تکلیف دینے کے لیے ایسا جھوٹ مت بولو جسے سن کر میری جان ہی نکل جائے۔'' اب بے یقین ہونے کی باری اس کی تھی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں اور جانتے ہو تمہاری محبت بنا کچھ کہے میرے دل کے تاروں کو چھو چکی تھی بہت پہلے ہی میں جان گئی تھی کہ تمہیں مجھ سے محبت ہوگئی ہے یہی وجہ تھی جو میں تم سے کترا رہی تھی کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ میرے دکھ اور تکلیف کی اذیت محسوس کرنے والوں میں ایک اضافہ اور ہو جائے۔'' اتنا کہہ کر وہ رکی نہیں، تیز تیز سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی جبکہ اپنے پیچھے کھڑے ذوحان کو ایک ایسی اذیت میں مبتلا کر گئی جس کا حل فی الحال اس کے پاس کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

روحی اسے کب سے جانماز پر ایک ہی حالت میں بیٹھے دیکھ کر تھوڑا پریشانی میں مبتلا...... ہوگئیں، اس کے قریب آ کر پکارا جس کا کوئی جواب ذوحان نے نہیں دیا، جانے وہ آنکھیں بند کیے اتنی دیر سے کیا پڑھ رہا تھا، یہ بات روحی کو بے چین کرنے کے لیے کافی تھی۔

''ذوحان ...... ذوحان ......'' بالآخر وہ برداشت نہیں کر سکیں اور عبادت میں مشغول ذوحان کو کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔

''کیا پڑھ رہے ہو تم؟'' مشکوک اور تفتیشی انداز میں وہ اس کے آس پاس ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے ذوحان نے سینے پر بم باندھ رکھا ہو۔

''نماز......'' جانماز تہ کرتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''ہاں...... پر نماز کے بعد کیا پڑھ رہے تھے؟'' روحی کو ایسا لگا جیسے ذوحان رو رہا ہو۔

''دعا کر رہا تھا مما۔'' آہستہ آواز مختصر سا جواب پھر پلٹ کر ماں کو دیکھا جو آنکھوں میں دنیا جہاں کی حیرت لیے اسے تک رہی تھیں۔

''آپ بھی نماز کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کی عادت ڈالیں، اس کی بڑی فضیلت ہے اور اس طرح سے مانگنے کا مزہ ہی اور ہے۔'' وہ جذب کے عالم میں بولا۔ کہتے ہیں بچے ہمیشہ بڑوں سے سیکھتے ہیں مگر یہ جملے تو انہوں نے کبھی ادا نہ کیے تھے پھر ذوحان نے کہاں سے سیکھے، وہ بنا کوئی جواب دیے خاموشی سے اس کے کمرے سے باہر نکل کر تیز تیز سیڑھیاں اترتی لاؤنج میں آ گئیں۔ سامنے ہی فہد بیٹھے تھے، گھبرائی ہوئی ان کے سامنے جا کھڑی ہوئیں جانے کیوں آج ذوحان کو دیکھ کر انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی جمع پونجی لٹانے والی ہیں۔

''فہد...... فہد......'' روہانسی آواز میں شوہر کو پکارتی وہ ان کے برابر ہی صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''کیا ہوا، کیوں اتنی پریشان ہو؟'' فہد کی سمجھ میں نہیں آیا کہ انہیں کیا ہوا ہے۔

''آپ پتا کریں ذوحان آج کل کہاں جا رہا ہے، وہ مجھے بہت بدلا ہوا سا محسوس ہو رہا ہے ایسے جیسے کوئی نیا ذوحان ہو، اسے کچھ ہو گیا ہے فہد۔'' اپنی برداشت کھوتے ہی وہ رونے لگیں۔

''میں سب معلوم کر چکا ہوں روحی، وہ آج کل شام میں کسی مدرسے جاتا ہے، دینی تعلیم کے لیے اور میرا خیال ہے کہ اس دینی تعلیم نے ہی اسے اتنا تبدیل

کر دیا ہے کہ وہ ماں، باپ کی عزت اور بڑوں سے بات کرنا سیکھتا جا رہا ہے۔ وہ سب کچھ جو ایک ماں کی حیثیت سے تم اسے نہ سکھا پائیں وہ اس عمر میں اگر وہ خود اپنی کوششوں سے سیکھ رہا ہے تو کیا برا ہے۔''

مطلب وہ سب کچھ جانتے تھے، اپنے بیٹے کے ہر پل سے باخبر تھے۔

''آپ جانتے ہیں آج کل اس سب کی آڑ میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اگر خدانخواستہ کچھ غلط ہو گیا تو ہم تو اپنے بیٹے سے ہی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔'' اپنی تربیت پر بات آتے ہی وہ چلا اٹھیں۔

''آہستہ بولو، ہر مدرسہ دہشت گردی کی تعلیم نہیں دیتا میں سب کچھ معلوم کر چکا ہوں۔ سیف اللہ دینی مدرسہ، اپنے علاقے میں نیکی و بھلائی کی تبلیغ کی بنا پر خاصی اچھی شہرت کا حامل ہے، اس لیے اس طرح کے فضول خیالات اپنے ذہن میں مت پالو، ہو سکتا ہے اس کی نیکیاں ہمارا بڑھاپا سنوارنے کے کام آجائیں یا شاید اسی کی بدولت ہم بھی بخشے جائیں۔'' انہیں سمجھاتے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''میں اسپتال جا رہا ہوں اور ہاں میرا مشورہ مانو تو تم بھی کوشش کرو خود کو بدلنے کی۔''

ان کا اشارہ غالباً بیگم کی سلیو لیس قمیص کی جانب تھا جس پر انہوں نے کوئی توجہ نہ دی ورنہ اس وقت لاؤنج میدانِ حشر کا منظر پیش کرتا وہ تو صرف ایک ہی سوچ میں گم تھیں کہ ذوحان میں پیدا ہونے والی اتنی بڑی تبدیلی کا پس منظر کیا تھا اور پھر جلد ہی ساری بات کھل کر سامنے آگئی جو ان کے لیے مزید حیرت کا باعث بنی۔

☆☆☆

آخری پیریڈ فری تھا سر حیدر آج نہیں آئے تھے جبکہ وین اپنے ٹائم پر ہی آتی تھی اس لیے زلف خاموشی سے باہر گراؤنڈ میں موجود بینچ پر جا بیٹھی وہ بے دھیانی میں سامنے درخت پر چڑھتی اترتی گلہری کو دیکھ رہی تھی جب وہ اس کے قریب آن بیٹھا، زلف نے پلٹ کر ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور پھر سے گلہری کو

## اندازِ تربیت

منقول ہے کہ بادشاہ کسریٰ نے اپنے بیٹے کو ادب سکھانے کے لیے ایک استاد رکھا۔ جب بچہ خوب علم و ادب والا ہو گیا تو ایک روز استاد نے بچے کو بلایا اور اسے بغیر جرم کے اور بے سبب خوب مارا۔ بچے نے استاد کے خلاف غصہ چھپائے رکھا۔ جب کسریٰ فوت ہوا تو یہ لڑکا بادشاہ بنا۔ ایک دن اس نے اپنے اس استاد کو دربار میں بلایا اور پوچھا۔

''تم نے مجھے فلاں دن اس طرح بغیر کسی جرم و سبب اس قدر کیوں مارا؟''

استاد نے کہا۔

''اے بادشاہ تو بہت ہی کمال و فضیلت والا بن چکا تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ تو اپنے باپ کے بعد بادشاہ ہوگا۔ اس لیے میرا ارادہ ہوا کہ تجھے بلا قصور، بلا عذر مارنے کا مزہ اور ظلم کا دکھ چکھاؤں تاکہ اس کے بعد تو کسی پر ناجائز ظلم نہ کرے۔'' یہ سن کر بادشاہ نے کہا۔

''اے استاد اللہ تجھے جزائے خیر دے۔''

پھر اسے انعام دے کر رخصت کیا۔

مرسلہ: ماہ زیب، چونیاں

## حضرت رابعہ بصریؒ آخری ایام میں

حضرت رابعہ بصریؒ آخری ایام زندگی عبادت اور یادِ الٰہی میں ہمہ تن معروف رہتی تھیں۔ دنیا سے یکسر تعلق قطع کر دیا تھا، گریہ و زاری کا یہ حال تھا، ان کے آنسو کبھی خشک نہ ہوتے تھے۔ اگر کسی سے بات بھی کرتیں تو قرآن کی آیات کے ذریعہ کچھ کہنا ہوتا کہتیں۔

حضرت رابعہؒ بصری سے جب دریافت کیا گیا کہ آپ ایسا کیوں کرتی ہیں تو آپ نے فرمایا۔

''انسان جو کچھ بولتا ہے، فرشتے اسے لکھتے جاتے ہیں، میں قرآن پاک کی آیتوں کے سوا کچھ نہیں بولتی، اس لیے کہ میرے منہ سے کوئی بری بات نہ نکلے، جسے وہ لکھ لیں، میں آیتیں پڑھتی ہوں اور فرشتے وہ ہی لکھ لیتے ہیں۔''

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

دیکھنے میں مشغول ہوگئی۔

''زِلف......'' کچھ دیر انتظار کے بعد وہ بالآخر بول ہی اٹھا۔

''ہاں......'' وہ بدستور سامنے ہی دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

''مجھے تمہاری ساری رپورٹس چاہئیں۔''

''کیوں، خیریت......؟'' ذوحان کی بات اتنی غیر متوقع تھی کہ وہ فوراً اس کی جانب پلٹی۔

''میرے پاپا کینسر کے ہی ڈاکٹر ہیں شاید تم نے نام سنا ہو فہد علی خان، میں ان سے تمہارا کیس ڈسکس کرنا چاہتا ہوں جس کے لیے میرے پاس تمہاری ساری رپورٹس کا ہونا ضروری ہے۔''

زِلف بنا جواب دیے اپنا بیگ کندھے پر ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میری بات کا جواب دو زِلف......'' وہ بھی اس کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

''کون سی بات کا؟'' وہ چلتے، چلتے رک گئی۔

''تم کیا سمجھ رہے ہو کہ میرے والدین میرے علاج کی استطاعت نہیں رکھتے؟'' شاید ذوحان کی بات سے اس نے یہ ہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔

''ایسا نہیں ہے زِلف، تم نے شاید سنا نہیں، میرے پاپا کینسر کے ہی بڑے ڈاکٹر ہیں اور مجھے سو فیصد امید ہے وہ اپنی کوشش سے تمہیں جلد صحت یاب کردیں گے اور انشاء اللہ تم جلد ہی اس بیماری سے نجات حاصل کرلوگی، ان کی پوری ٹیم بہت قابل ڈاکٹرز پر مشتمل ہے۔''

''ٹھیک ہے میں اپنے بابا سے بات کروں گی اگر وہ اور میرے بڑے بھائی آمادہ ہوگئے تو پھر میں فائل لے آؤں گی۔'' آہستہ سے کہتی وہ پھر آگے کی جانب چل دی۔

''اگر تم کہو تو میں خود تمہارے گھر والوں سے بات کرنے کو تیار ہوں، مجھے امید ہے کہ میری بات تمہارے بابا ضرور مانیں گے۔'' وہ زِلف کے ساتھ، ساتھ ہی چلتے ہوئے بولا۔

''اور تمہیں یہ امید کیسے پیدا ہوئی کہ وہ تمہاری بات مان جائیں گے؟'' حسب عادت اپنے سر کے اسکارف کو درست کرتے ہوئے اس نے پن لگائی اور ذوحان کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرادی۔

''کیونکہ میں ان کے پاس......'' وہ کہتے، کہتے رک گیا، زِلف کی شکل دیکھی ......سمجھ میں نہ آیا کہ بتائے یا نہ بتائے، کہیں وہ برا ہی نہ مان جائے یہ سوچ کر خاموش ہوگیا۔

''میں جانتی ہوں تم مدرسے آتے ہوئے میرے بابا کے پاس دینی تعلیم حاصل کرنے۔'' وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔

''اوہ تو تمہیں پتا ہے، شکر ہے تم نے برا نہیں مانا، ورنہ میں تو ڈر رہا تھا کہ اگر تمہیں پتا چلے تو کہیں تم ناراض ہی نہیں ہو جاؤ۔''

''جب سے تم وہاں جا رہے ہوناں ذوحان علی خان تب سے ہی میں جانتی ہوں، اور اگر کسی شخص میں میری یا میرے والد کی بدولت دینی شعور پیدا ہو جائے تو ہمارے لیے یہ اعزاز کی بات ہے ناراضی کی نہیں۔'' زِلف کی وضاحت نے اسے پُرسکون کردیا۔

''پھر تم کل اپنی رپورٹس لا رہی ہوناں......'' اس نے اپنی پہلے والی بات کو ایک بار پھر سے دہرایا۔

''انشاء اللہ ضرور......'' مختصر جواب دے کر زِلف آگے کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

''کس کی رپورٹس ہیں یہ؟'' پاپا نے اپنے سامنے رکھی فائل کا ایک سرسری سا جائزہ لیتے ہوئے ذوحان کی جانب دیکھا۔

''میری دوست ہے، آپ پلیز ان فائلز کو اچھی طرح دیکھیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ زِلف کا علاج کریں پاپا......اسے ٹھیک کردیں بالکل اچھا کردیں۔ میری خاطر پاپا......''

وہ ان کے سامنے بیٹھا گڑگڑا رہا تھا۔ فہد صاحب

نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر اپنے سامنے رکھی فائل کو کھول کر اس کا مطالعہ کرنے لگے۔ ذوھان خاموشی سے ان کی جانب تک رہا تھا۔ فہد صاحب نے اچھی طرح دیکھنے کے بعد فائل بند کر دی۔ چشمہ اتارا اور اس کی جانب دیکھنے لگے۔

''کب سے جانتے ہو تم اس لڑکی کو...... ؟ میرا مطلب ہے کہ...'' ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اپنی بات کی وضاحت کس طرح کریں۔

''آپ ٹھیک سمجھے ہیں پاپا، یہ لڑکی میری زندگی ہے، یہ ہی وہ لڑکی ہے جس نے مجھے سکھایا کہ بڑوں سے بات کس طرح کی جاتی ہے، جسے دیکھ کر مجھے پتا چلا کہ دنیا کے ہر کام سے زیادہ ضروری فرض عبادت ہے جسے وقت پر ادا کرنا ایک اہم فریضہ ہے۔''

وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا اور فہد صاحب اس کی شکل دیکھ رہے تھے ان کے بدترین خدشات درست ثابت ہو گئے تھے ان کے بیٹے کو ایک ایسی لڑکی سے محبت ہو گئی تھی جو کینسر کے آخری اسٹیج پر تھی، وہ کتنا وقت اور جی سکے گی۔ یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے سامنے بیٹھے... اپنے لختِ جگر کو کیا جواب دیں۔

''زلف ٹھیک ہو جائے گی ناں پاپا؟'' وہ امید بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

''ہاں اگر اللہ نے چاہا تو...... کیونکہ اس معاملے میں صرف ایک وہ ہی ذات ہے جو ہماری مدد کر سکتی ہے ورنہ کچھ نہیں ہو سکتا۔'' وہ ڈاکٹر تھے کسی کو مایوس نہیں کر سکتے تھے اسی لیے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولے۔

''زلف کینسر کے آخری اسٹیج پر ہے بیٹا۔ اب کوئی معجزہ ہی ہے جو اس لڑکی کو بچا سکے۔'' وہ آہستہ، آہستہ اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

''پاپا پلیز اس طرح نہ کہیں، میں مر جاؤں گا اگر زلف کو کچھ ہو گیا۔''

اسے یقین ہی نہیں آیا، ایک ہنستی کھیلتی لڑکی کس طرح موت کے منہ میں جا رہی تھی اور سب جانتے ہوئے بھی کوئی اسے نہیں بچا سکتا تھا پھر شاید ایسے وقت میں ہمارا یقین اللہ پر مضبوط ہو جاتا ہے، بے شک وہ ہی ہر چیز پر قادرِ مطلق ہے۔

''میں اپنی پوری کوشش کروں گا تم دعا کرو شاید کوئی بات اثر کر جائے اور ہم اس کی زندگی بچانے میں کامیاب ہو جائیں۔'' ایک پیشہ ورانہ تسلی جو یقین سے خالی تھی، انہوں نے اپنے بیٹے کو دی جو ٹیبل پر سر رکھے سسک رہا تھا۔

محبت کسی انسان کو اتنا بدل دیتی ہے یہ حادثہ اگر ان کی سگی اولاد کے ساتھ نہ ہوا ہوتا تو شاید وہ بھی کبھی یقین نہ کرتے۔

''تم اس کے والد سے بات کر کے اسے میرے پاس لے آؤ، میں جہاں تک ہو سکا اس کے علاج میں تعاون کروں گا۔'' فہد صاحب نے ذوھان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا مگر زلف کو ان کی مدد کی ضرورت ہی نہ پڑی یہاں تک کہ ذوھان اسے یہ سب بتا ہی نہیں سکا اور وہ ایک بار پھر اسپتال جا پہنچی۔

☆☆☆

ان کے کالج کے آخری دن چل رہے تھے کیونکہ امتحانات سر پر آ گئے تھے اس لیے وہ دو دن سے روزانہ یہ ارادہ کر کے آتا تھا کہ زلف سے آج اپنے پاپا کے سلسلے میں بات کرے گا مگر جانے کیوں وہ اسے فائل دینے کے بعد کالج ہی نہ آئی اور آج کالج کا آخری دن تھا اب سب نے ایڈمٹ کارڈ لینے ہی آنا تھا اور پھر امتحانات شروع...... وہ مدرسے تو روز جاتا تھا مگر کبھی ہمت نہ ہوئی کہ قاری صاحب سے زلف کی بابت دریافت کرتا وہ ان ہی سوچوں میں غلطاں گیٹ کی طرف جا رہا تھا جب اچانک اس کی نگاہ ارسل پر پڑی اور وہ ایک سیکنڈ میں ہی اس تک جا پہنچا، وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ مصروفِ گفتگو تھا۔ ذوھان نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

''ایکسکیوز می ارسل! مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' ارسل اپنے دوست سے معذرت کرتا اس کے

ساتھ آ گیا۔

''زلف، کالج نہیں آ رہی، تم جانتے ہو کیوں؟''
پنا تمہید کہ وہ کھٹ سے بولا۔

''اس کی طبیعت خراب ہے شاید پھر سے اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔'' ارسل نے اسے اتنی ہی بات بتا دی جتنی وہ جانتا تھا۔

''تمہیں پتا ہے وہ کس اسپتال میں ہے۔'' ذوحان نے جلدی سے پوچھا مبادا ارسل چلا نہ جائے۔

''سوری یار، یہ میں نہیں جانتا۔'' جواب دے کر ارسل واپس پلٹ گیا تھا۔

''زلف اسپتال میں ہے۔'' یہ بات اسے پریشان کر گئی اور وہ سارا دن اسی الجھن میں گھرا رہا کہ کس طرح معلوم کر سکے کہ اس کی طبیعت کیسی ہے، عصر کی نماز پڑھ کر کتنی دیر ہی اپنے رب کے آگے سجدہ ریز رہا، زلف کی صحت یابی کی دعا مانگتے، مانگتے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

تکلیف تو کسی غیر کی ہو تو وہ بھی دل دکھا دیتی ہے یہاں تو پھر وہ ہستی تھی جو شاید اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہو چکی تھی۔ زلف کا درد اس کی تکلیف ذوحان اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا۔ روتے، روتے اسے امید کی ایک کرن نظر آئی ایسے جیسے اندھیرے میں چمکنے والا جگنو...... قاری سیف اللہ، وہ سجدے سے اٹھ بیٹھا، جلدی، جلدی تیار ہوا اور اگلے پندرہ منٹ میں ہی دار العلوم سیف اللہ جا پہنچا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک بے نام سی خاموشی اس کے من میں اتر گئی۔ شاید وہ خاموشی جو پہلے ہی دل میں بسیرا کیے ہوئے تھی نکل کر چاروں اور پھیل گئی اور آہستہ، آہستہ چلتا وہ اندرونی حصے میں داخل ہو گیا، غیر معمولی طور پر آج مدرسہ خالی تھا۔ شاید جمعے کے سبب چھٹی تھی، اس نے دیکھا قاری صاحب کہیں نہیں تھے۔

''کہیں زلف کی حالت زیادہ خراب نہ ہو گئی ہو ورنہ قاری صاحب تو ہمیشہ اس وقت مدرسے میں ہی ہوتے ہیں۔'' یہ خیال اسے شدید بے چین کر گیا جب اسی پل اس کی نگاہ مدرسے سے ملحقہ مسجد میں پڑی جس کے صحن میں بچھی دری پر قاری سیف اللہ بیٹھے شاید وظائف پڑھ رہے تھے۔ ذوحان نے مدرسے اور مسجد کا درمیانی دروازہ پار کیا اور اگلے پانچ سیکنڈ میں قاری صاحب کے سامنے جا بیٹھا، وہ اپنی آنکھیں بند کیے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہے تھے؟ ذوحان پنا انہیں مخاطب کیے ان کے سامنے اس وقت تک بیٹھا رہا جب تک انہوں نے خود اپنی آنکھیں کھول کر اسے نہ دیکھا۔

''کیا بات ہے بچے، کیوں اتنے پریشان ہو؟''
آنکھیں کھولتے ہی انہیں ذوحان کے چہرے پر واضح پریشانی کے آثار دکھائی دیے۔ جبکہ وہ خود دیکھنے میں ذوحان سے بھی زیادہ پریشانی لگ رہے تھے۔ اب یہاں تک تو وہ آ گیا تھا مگر اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سامنے بیٹھے اس دین دار شخص سے کس طرح اس کی بیٹی کی بابت دریافت کرے یقیناً ذوحان کے منہ سے نکلا کوئی بھی لفظ انہیں غصہ بھی دلا سکتا تھا۔ ویسے بھی اس نے ہمیشہ اپنی ماں کی زبان سے مولوی لوگوں کے لیے غلط بات ہی سنی تھی۔ جبکہ خود اس نے ایسا کبھی نہیں دیکھا تھا، وہ اسی الجھن میں تھا جب سیف اللہ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے، ذوحان بھی ان کی تقلید میں کھڑا ہو گیا، انہوں نے آگے بڑھ کر زمین پر رکھے باجرے کی تھیلی اٹھائی اب وہ صحن میں یہاں وہاں پھیلے کبوتروں کو دانہ ڈال رہے تھے انہوں نے ذوحان کی وہاں موجودگی کو قطعی نظر انداز کر دیا تھا ان کے منہ سے نکلنے والی آواز سن کر سارا صحن کبوتروں سے بھر گیا تھا۔
ذوحان دل کڑا کر کے ان کے قریب جا پہنچا۔

''مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے اگر آپ ناراض نہ ہوں تو......'' اتنی بڑی بات کرنے سے پہلے چھوٹی سی تمہید باندھنا تو ضروری تھا ورنہ بات کس طرح شروع کی جاتی۔ سیف اللہ صاحب نے پلٹ کر اس کی شکل دیکھی، بولے کچھ نہیں شاید ان کی خاموشی نیم رضامندی تھی وہ اسے بات شروع کرنے کی اجازت دے چکے تھے۔

''سر میں آپ سے آپ کی بیٹی محترمہ زلف کے

متعلق کچھ بات کرنا چاہتا ہوں...... پلیز آپ بیٹھ کر دھیان سے میری بات سن لیں۔ شاید آپ کو علم نہیں کہ ہم دونوں پچھلے چار سالوں سے ایک ہی کالج میں ہیں۔'' اس نے اپنے تئیں بہت ادب لحاظ سے اس کا نام لیا تھا۔ زِلف کا نام سنتے ہی قاری صاحب کے دانہ پھینکتے ہوئے ہاتھ رک گئے، انہوں نے پلٹ کر ذوھان کو دیکھا، ان کی آنکھیں قدرے سرخ ہو چکی تھیں، غالباً غصہ ان کی آنکھوں میں اتر آیا تھا، ذوھان تھوڑا سا گھبرا گیا۔

''پلیز سر آپ کچھ غلط مت سمجھیں۔''

''احمد...... احمد......'' انہوں نے مدرسے میں موجود اپنے معاونِ خصوصی کو آواز دی جو ان کی آواز سنتے ہی دوڑا چلا آیا۔

''یہ دانہ لے اور کبوتروں کو ڈال دے، یہاں پورا ہوگیا ہے اب چھت پر چلا جا۔'' اسے ہدایت دیتے تیزی سے صحن عبور کر کے وہ مدرسے کی عمارت میں داخل ہوگئے، ذوھان بھی ان کے ساتھ ہی آ گیا، قاری صاحب اندر اپنے کمرے میں جا کر بیٹھ گئے، وہ ان کے قدموں میں ہی بیٹھ گیا۔

''ہاں بولو کیا کہنا ہے تمہیں میری بیٹی کے متعلق......'' باوجود ضبط کے ان کی آواز بھرا گئی اور چہرے پر پھیلی سرخی ان کے اندرونی غصے کو ظاہر کر رہی تھی۔

''سر میں زِلف سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' جانے وہ کیا بات کرنے آیا تھا مگر زبان سے یہ جملہ... بے اختیار ہی پھسل گیا، اس نے وہاں بیٹھے، بیٹھے ہی ایک سیکنڈ میں فیصلہ کیا اور مدعا ان کے سامنے پیش کر دیا، سیف اللہ صاحب نے کوئی جواب نہ دیا صرف ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی، ایسی نظر جس نے اسے پانی، پانی کر دیا۔

''کیا جانتے ہو تم میری بیٹی کے متعلق۔'' اس دفعہ ان کی آواز میں پہلے والا غصہ مفقود ہو چکا تھا۔

''سب کچھ، ہر وہ بات جو آپ جانتے ہیں پھر بھی میں چاہوں گا کہ آپ مجھے اپنی فرزندگی میں لے لیں۔'' ذوھان نے اپنے کپکپاتے ہاتھ ان کے پاؤں پر رکھ دیے۔ سیف اللہ نے تیزی سے اپنے پاؤں پیچھے کیے۔

''سر ہم کسی بیمار شخص کی موت سے پہلے اس سے جینے کا حق نہیں چھین سکتے، اسے کسی بھی خوشی سے صرف یہ کہہ کر نہیں روکا جا سکتا کہ وہ بیمار ہے یا اس کی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں، بھروسا تو سر میری اور آپ کی زندگی کا بھی نہیں، کیا پتا میں یہاں سے اٹھ کر جاؤں تو گھر تک ہی نہ پہنچ سکوں۔''

اپنی بات ختم کر کے اس نے سر اٹھایا، دیکھا قاری صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر ان کی داڑھی بھگو رہے تھے، وہ رو رہے تھے۔

''سر میری ہر خوشی صرف زِلف کی ذات سے وابستہ ہے، وہ کتنا جیتی ہے یا اس کی بیماری کس قدر جان لیوا اور تھکا دینے والی ہے مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں، میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ ایک جائز طریقے سے اسے سنبھالنے، اسے دیکھنے کا حق مجھے دے دیں، جتنی زندگی میرے رب نے اس کے نصیب میں لکھی ہے وہ جیے گی اور اگر یہ زندگی وہ میرے ساتھ جیے تو میں بھی جی لوں گا سر۔'' وہ اب ان کے ہاتھ تھام کر رو رہا تھا جبکہ قاری سیف اللہ بالکل خاموش تھے شاید ضبط گریہ نے ان سے بولنے کی صلاحیت چھین لی تھی۔

''چند روز ہی سہی مگر مجھے زِلف کے ساتھ جی لینے دیں میری بات مان جائیں سر......'' وہ سر جھکائے رو رہا تھا، سسک رہا تھا جب دھیرے سے کپکپاتا ہوا قاری صاحب کا ہاتھ اس کے سر پر آ کر رک گیا، ذوھان نے سر اٹھایا وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

''سر اگر آپ اجازت دیں گے تو میں کل ہی اپنے ممی، پاپا کو بھی لے آؤں گا۔''

''نہیں، فی الحال تم کل صبح نو بجے آ جانا ہم زِلف سے ملنے اسپتال جائیں گے، ایک بار تم اس سے مل لو پھر کوئی فیصلہ کرنا۔'' تھکے، تھکے انداز میں کہہ کر

انہوں نے ٹانگیں لمبی کر کے بیٹھے، بیٹھے سرد یوار سے لگا کر آنکھیں موند لیں یعنی اب ان کی طرف سے گفتگو کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا ذوحان اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی صرف شام کے سات بجے تھے درمیان میں پوری ایک رات تھی تقریباً پندرہ گھنٹے انتظار کے بعد ہی زلف کو دیکھ پائے گا اس سے ملنے، اسے دیکھنے کی خواہش اتنی شدید تھی کہ رات کا سفر گزارنا مشکل ہو گیا۔ دھیرے، دھیرے گزرتی رات اس کے اعصاب کو شل کرتی اس طرح بیت رہی تھی جیسے لمحہ، لمحہ پگھلتی شمع، پندرہ گھنٹے کا یہ وقت اس نے صرف چند گھنٹے ہی سو کر گزارا اور پورے نو بجے سیف اللہ صاحب کے بتائے ہوئے اسپتال کے سامنے جا پہنچا۔ وہاں کھڑے ذوحان کو کئی پل بیت گئے خود کو یہ یقین دلانے میں کہ یہاں وہ زلف سے ملنے آیا ہے جب اسے یہ یقین آ گیا تو وہ واپس گاڑی تک گیا، اندر سے بہت سارے گلاب کے پھولوں سے بھری خوب صورت سی باسکٹ باہر نکالی، اسے یقین ہو چلا تھا کہ چند روز ہی میں وہ زلف کا ساتھ پانے میں کامیاب ہو جائے گا صرف ایک دفعہ اس کے ہاں کرنے کی دیر تھی، وہ ہاں کر دیتی، سیف اللہ صاحب مان جاتے تو ذوحان کے لیے ہر مشکل آسان ہو جاتی کیونکہ اپنے ماں، باپ کو منانا اس کے لیے کچھ زیادہ مشکل عمل نہ تھا۔ اس پھولوں کی باسکٹ کے علاوہ وہ بہت ساری چاکلیٹس بھی لایا تھا۔ اس نے اکثر زلف کو چاکلیٹ کھاتے دیکھا تھا شاید اسے چاکلیٹ پسند تھی ان ہی سوچوں میں گھرا وہ گیٹ سے اندر داخل ہو گیا، اسپتال کا بڑا سا لان زرد پتوں سے بھرا ہوا تھا۔ شاید خزاں آ گئی تھی باہر لگی اکا دکا بینچوں پر مریضوں سے ملنے آنے والوں کا رش تھا۔ وہ ان سب کو دیکھتا اسپتال کے داخلی دروازے سے اندر داخل ہوا سامنے ہی کاؤنٹر سے تھوڑا ہٹ کر سیف اللہ صاحب کھڑے تھے ان کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا ذوحان انہیں دیکھ کر اسی طرف چلا گیا جہاں وہ کھڑے تھے۔

''السلام علیکم سر......!''

''وعلیکم السلام بیٹا......'' تھکے، تھکے لہجے میں اس کی بات کا جواب دیتے وہ اپنے ساتھ کھڑے نوجوان سے مخاطب ہوئے۔ ''یہ ذوحان ہے۔'' یقیناً وہ اس کے متعلق اس نوجوان کو ساری تفصیل بتا چکے تھے جس کا اندازہ اس کے چہرے پر پھیلی اپنائیت دیکھ کر بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔

''اور یہ میرا بیٹا بالاج ہے۔''

''السلام علیکم......'' ذوحان نے بالاج سے ہاتھ ملایا، بالاج اس کا ہاتھ تھامے اسے اپنے ساتھ لیے اوپر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا یقیناً وہ اسے زلف کے پاس لے جا رہا تھا۔ اور وہ بنا کچھ پوچھے خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا گیا بالآخران کا یہ سفر ختم ہوا۔ بالاج نے اسے لے جا کر ایک شیشے کے بڑے سے دروازے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ ذوحان نے دیکھا دروازے کے باہر آئی سی یو جلی حروف میں لکھا تھا، اس نے گھبرا کر بالاج کی جانب دیکھا جو شیشے کی اس دیوار کے پاس دیکھ رہا تھا۔ جہاں بالکل سامنے والے بیڈ پر زلف لیٹی تھی بالکل ساکت وصامت زلف......اسے آکسیجن لگی ہوئی تھی...... ذوحان میں ہمت نہ ہوئی دوبارہ اسے دیکھنے کی، سامنے لیٹی زلف اس زلف سے بہت مختلف تھی جسے وہ جانتا تھا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ کوئی انسان ایک بیماری کے ہاتھوں چند دنوں میں اس طرح ختم ہو سکتا ہے۔

''اندر جا کر اس سے مل لو، جوتے وہاں سامنے اتار کر اندر جانا۔'' بالاج نے اس سے نظریں ملائے بنا کہا، ذوحان سمجھ گیا وہ رو رہا تھا۔

''مجھ میں ہمت نہیں ہے، میں اس حال میں اسے نہیں دیکھ سکتا، میں اس کا تصور ہمیشہ اپنے ساتھ ایک بہادر اور مضبوط لڑکی کا رکھنا چاہتا ہوں اس زلف کا نہیں...... میں زلف کو اس بے بسی کے عالم میں نہیں دیکھ سکتا کبھی نہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا چند ماہ میں اس لڑکی کا یہ حشر ہو گیا، مجھے یقین نہیں آ رہا یہ زلف ہے۔'' وہ شیشے کے اس پار دیکھتے ہوئے رو رہا

تھا، سسک رہا تھا۔

"اس کی بیماری چند ماہ پرانی نہیں ہے، جانے یہ روگ اسے کب لگا تھا۔ ہمیں علم ہی دیر سے ہوا اس وقت جب یہ بیماری اپنے آخری اسٹیج پر پہنچ گئی۔" بالاج جانے اور بھی کیا، کیا کہہ رہا تھا اس نے نہیں سنا، اپنے ہاتھ میں پکڑا زلف کا ایڈمٹ کارڈ جو وہ کالج سے لایا تھا بالاج کے ہاتھ میں تھمایا، وہ باہر نکل آیا اس شخص کی طرح جو خوشیوں کی آس میں گیا ہو اور غم کی جھولی بھر کر لوٹ آیا ہو، وہ ایک لٹے ہوئے تھکے ماندے شخص کی طرح باہر روڈ پر آ گیا...... سامنے گاڑی کا شیشہ صاف کرنے والا ایک بچہ کھڑا تھا ذوحان نے ساری چاکلیٹ اور پھول کی باسکٹ اسے تھما دی، بچہ یہ سب ہاتھ میں لیے حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"دعا کرنا اللہ میرے مقدر میں خوشیاں لکھ دے۔"

اس بچے کے سر پر ہاتھ رکھ کر وہ آہستہ سے بولا ...... جانتا تھا اس کی خوشیاں زلف کی زندگی سے وابستہ ہیں، در پردہ یہ دعا زلف کے لیے تھی، سچ ہے انسان کو ہر حال میں اپنے رب پر بھروسا رکھنا چاہیے کیونکہ مایوسی کفر کی نشانی ہے اور وہ مایوس نہیں ہونا چاہتا تھا شاید اسی لیے وہ زلف کو دیکھے بنا، ملے بنا واپس آ گیا۔ زلف کا تصور کھونا نہیں چاہتا تھا، وہ تصور جو چار سال سے اس کے ذہن میں تھا، ایک مضبوط لڑکی کا تصور اور اسے اپنے رب سے امید تھی کہ وہ اسے کبھی مایوس نہیں کرے گا۔ گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے کئی آنسو اس کی پلکوں کا حصار توڑ کر بہہ نکلے، وہ کمزور ہو گیا تھا شاید محبت وہ جذبہ تھا جس نے اسے بزدل کر دیا تھا۔ زلف کی موت کے خوف نے اسے خوف زدہ کر دیا اور اسی عالم خوف میں وہ جانے کس طرح گاڑی چلاتا گھر پہنچا، اسے کچھ پتا ہی نہیں چلا۔

☆☆☆

آج پورے چار سال بعد بھی جب اس کے گمان میں وہ صبح آتی جب اس نے زلف کو آئی سی یو میں... بےبس پڑے دیکھا تھا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے، وہ زلف کا چیک اپ کروانے آیا تھا، اسے اندر روم میں چھوڑ کر کسی کام سے باہر نکل آیا جب آئی سی یو کے سامنے سے گزرتے وہ دن اور وہ پل یاد آ گیا جس میں اپنے تئیں وہ زلف کو کھو چکا تھا مگر پھر بھی مایوس نہیں ہوا تھا۔ اور شاید یہ امید ہی تھی جس نے اسے زلف لوٹا دی، وہ زلف جس کی زندگی چند لمحوں کی محتاج تھی آج پورے دو سال سے اس کے ساتھ تھی۔ معجزے بھی بے شک دنیا ہی میں ہوتے ہیں وہ کاؤنٹر کی جانب آ گیا۔

"السلام علیکم سر......!" اسے دیکھتے ہی وہاں موجود عملہ الرٹ ہو گیا۔

"وعلیکم السلام...... ساجد کہاں ہے؟"

ساجد اس کا دستِ راست تھا جس کے ذمے اس سارے اسپتال کی ذمے داری تھی، یہ ایک کینسر اسپتال تھا جو اس نے زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا زلف کو دیکھ کر بنوایا تھا، اس اسپتال کے ساتھ ایک ٹرسٹ بھی تھا جس کا سارا انتظام ساجد چلاتا تھا۔ ان کی پوری کوشش ہوتی کہ یہاں آنے والے ہر مریض کا علاج کم سے کم پیسوں میں کیا جائے، اس نے کچھ دیر کھڑے ہو کر وہاں موجود فائلز کا جائزہ لیا اور پھر اسپتال کا راؤنڈ لگاتے ہوئے باہر آ گیا۔ کیونکہ زلف کو اندر خاصا ٹائم لگنا تھا۔ اس ٹائم میں وہ وہیں ٹرسٹ کا راؤنڈ لے کر تمام مریضوں کو دیکھنا چاہتا تھا...... باہر نکل کر اس نے اسپتال کے بڑے سے بورڈ پر ایک نظر ڈالی۔

"امید فاؤنڈیشن" نام پڑھتے ہی وہ مسکرا دیا تھا۔ شاید یہ امید ہی تھی جو زلف کو آج تک زندہ رکھے ہوئے تھی اور اس کی زندگی کا ایک، ایک پل ذوحان کی جان تھا کیونکہ اس کی زندگی زلف کی خوشیوں سے وابستہ تھی اور اسے امید تھی وہ اپنی خوشیوں سے کبھی محروم نہ ہوگا اس وقت تک جب تک اللہ کی رضا شاملِ حال رہے گی۔ اور اسی امید کے ساتھ وہ دوسروں کی زندگی بچانے کی حتی الامکان کوششوں کے سفر پر گامزن تھا۔



منی ناول

# ہم کو محبت نے بدنام کیا

سیما رضا ردا

چوتھا حصہ

صبح کی سپیدی اب آہستہ، آہستہ پھیل رہی تھی اور ساتھ ہی پرندوں کی آواز بھی فضا میں گونجنے کے ساتھ نئی صبح کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جہاں ایک خوشگواری کا احساس دے رہے تھے وہیں جسم پر کپکپی بھی طاری کر دیتے تھے۔

وانیہ اعزاز نے ذرا سی آنکھیں کھول کر دیکھا اور پھر فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئی، ذہن آہستہ، آہستہ بیدار ہوا تو وہ کچھ سوچنے کے قابل ہوئی تھی اور پھر فوراً ہی اپنے



اطراف کا جائزہ لیا تھا۔ یہ ایک چھوٹا اور کچا سا گھر تھا جہاں وہ ایک کمرے میں ایک خستہ حال چارپائی پر قدرے صاف بچھے بستر پر بیٹھی تھی ساتھ ہی ایک کرسی رکھی تھی۔ کمرے میں ایک کھڑکی تھی جس سے باہر کھیت بھی نظر آرہے تھے سامنے ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جو اس وقت کھلا ہوا تھا۔ جہاں سے برآمدہ اور صحن نظر آنے کے ساتھ سامنے کونے میں بنے باورچی خانے میں کام کرتی خاتون بھی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اٹھ کر برآمدے میں چلی آئی سردی کافی تھی اس لیے اس نے اپنے ہاتھ ایک دوسرے میں پیوست کرلیے تھے مگر سردی کم ہونے کے بجائے مزید تیزی سے جسم میں داخل ہورہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا جہاں اب اجالا پھیل چکا تھا۔

''اٹھ گئی ہے ناشتا بناؤں تیرے لیے؟'' خاتون نے دیہاتی انداز میں پوچھا تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔ خاتون ناشتا بنانے کے ساتھ اس سے سوال و جواب کرنے لگی۔

''کہاں سے آئی ہے تو، تیرا گھر کدھر ہے؟''

''شہر سے۔'' اس نے مختصر جواب دیا...... شاید اسے یہ ہی بہتر لگا تھا۔

''کون، کون ہے تیرے گھر میں؟''

''سب ہیں......''

''پھر تو اِدھر کیوں آئی، کوئی فلم بنانی ہے؟'' وانیہ کو اس کا بولنا گراں گزر رہا تھا اس لیے خاموشی سے اندر کمرے میں آگئی تھی۔ پچھلی رات ہی پولیس مقابلہ ہونے پر وہ اغواکاروں سے بچ کر نکل گئی تھی اور جو پہلا گھر نظر آیا تھا اس میں داخل ہوکر جھوٹی کہانی سنا کر پناہ لی تھی۔ اب وہ دن چڑھنے کا انتظار کررہی تھی تاکہ یہاں سے نکل سکے، اسے یہ تو معلوم تھا کہ روزی اب تک اس کے انتظار میں وہاں نہیں رکی ہوگی اس لیے اس کا ارادہ اب واپس کراچی جانے کا تھا لیکن اس کے لیے کچھ پیسے بھی چاہیے تھے جو اس کے پاس نہیں تھے۔

''لے ناشتا کر......'' اس عورت نے آکر اس کی سوچیں منتشر کردیں تو وہ ناشتا کرنے کے ساتھ، ساتھ اس عورت کا جائزہ لینے لگی جو خالص دیسی مٹی سے بنائی گئی گھریلو خاتون تھی۔

''تمہارے پاس کچھ پیسے ہیں؟'' اس نے جواب دینے کے بجائے الٹا اس خاتون سے پوچھا تو وہ حیران ہوکر اسے دیکھنے لگی۔

''پیسے۔'' اسے اچنبھا ہوا تھا جبکہ وانیہ اعزاز زور، زور سے اثبات میں سر ہلانے لگی تھی۔

''میں کراچی جا کر تمہیں واپس بھیج دوں گی...... سچ۔''

''کراچی......؟'' اسے حیرت ہوئی وانیہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کس طرح قائل کرے تاکہ وہ اسے کراچی جانے کا کرایہ دے دے۔

''میرے پاس بہت پیسے ہیں وہاں کراچی میں۔'' وہ اسے کچھ سوچتا دیکھ کر مزید بولی۔ ''اور میں تمہیں بہت زیادہ پیسے دوں گی، اتنے کہ تم حیران ہوجاؤ گی۔''

''بس کر بی بی......'' وہ خاتون ہاتھ اٹھا کر سخت لہجے میں بولی۔ ''پہلے نہ جانے رات کے اندھیرے میں کہاں سے منہ کالا کرکے آئی ہے اور اب مجھ سے پیسے مانگ رہی ہے بند کر اپنا یہ امیری کا ناٹک اور ناشتا کرکے یہاں سے چلتی بن۔'' وانیہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اسے شاید اپنی سماعتوں پر شبہ ہوا تھا کیونکہ کل رات یہ عورت اپنے خاوند کو سمجھا کر یہاں اسے رات ٹھہرنے کی جگہ دینے کے ساتھ اس کے لیے کھانا بھی لے آئی تھی لیکن اب نہ جانے اسے کیا ہوگیا تھا وہ اپنے ٹھیٹھ لہجے میں مزید بھی کچھ بڑبڑا رہی تھی لیکن وانیہ کی سمجھ میں ایک لفظ بھی نہیں آرہا تھا وہ ناشتا کرنے کے ساتھ آگے کا لائحہ عمل ذہن میں ترتیب دینے لگی۔

☆☆☆

''میں صرف منگنی نہیں کروں گا۔'' قاطر نے تلملا کر کہا تو ابا جی اسے دیکھنے لگے۔ ''نکاح ہوگا اور آپ پھوپا صاحب سے نکاح کی تاریخ مانگیں۔'' ''منگنی کے

لفظ نے ہی اس کے اندر آگ لگا دی تھی جبکہ تشمیرہ سے شادی کے لیے اس نے کیا کچھ سوچ لیا تھا اور اب چاہتا تھا کہ وہ جلد ہی اس کی ہو جائے اس لیے جس وقت اس سے ابا جی کو بلانے کو کہا گیا تھا تو وہ فوراً ہی جہاز کی ٹکٹ کروا کر انہیں اپنے ساتھ ہی لے آیا تھا۔

''پتر اُن کی دھی ہے۔ وہ جو فیصلہ کریں گے سوچ کر ہی کریں گے ناں......'' ابا جی تحمل سے اسے سمجھاتے ہوئے بولے۔

''ابھی بچی پڑھ رہی ہے تو نے سنا تو ہے تیرے پھوپا صاحب نے کیا کہا ہے پھر تم کیوں تو م (غصہ) کھا رہا ہے۔''

''تو نہ کھاؤں؟ محبت کی ہے اس سے۔''

''تو پھر صبر بھی کر۔'' ابا جی نے کہنے کے ساتھ ہی تکیہ سیدھا کیا اور چادر اوڑھ کر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ اب وہ مزید اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتے۔ فاطر کچھ دیر تو انہیں دیکھتا رہا لیکن جب ان کے خراٹوں کی آواز کمرے میں گونجنے لگی تو وہ جھنجلا کر کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔

ٹی وی لاؤنج سے گزرتے ہوئے اس نے ایک نظر پھوپی کو دیکھا جو نہ جانے فون پر کس سے بات کر رہی تھیں، فاطر کو اشارے سے روکا اور اپنی بات مختصر کر کے سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔

''کیا بات ہے اتنے غصے میں کیوں ہو؟ اب تو سب کچھ تمہارے مطابق ہو رہا ہے ناں۔''

''کیا خاک ہو رہا ہے۔'' وہ غصے سے تلملا کر بولا۔ ''پھوپا صاحب اپنی مرضی سے سب کچھ طے کر رہے ہیں اور میں کٹھ پتلی بنا ان کے اشارے پر ناچ رہا ہوں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو جو بھی بات ہے کھل کر کہو۔'' فاطر کچھ دیر خاموش ہو کر انہیں دیکھ کر تصدیق کرنے لگا کہ وہ کہیں پھوپا صاحب کی کسی سازش میں تو شامل نہیں اور جب دل کو یقین ہو گیا تو ان کے سامنے صوفے پر بیٹھ کر نظروں کا زاویہ بدل کر بولا۔

''میں تشمیرہ سے منگنی نہیں نکاح کرنا چاہتا ہوں۔''

''سب ہو جائے گا اتنا جذباتی مت ہو۔'' وہ اس کی بے صبری پر اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گئیں، ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اسے تشمیرہ میں ایسا کیا نظر آیا جو وہ اس کا دیوانہ ہو بیٹھا تھا۔ اس کی فطرت سے وہ بخوبی واقف تھیں۔ کبھی، کبھی تشمیرہ کے لیے دل میں محبت جاگتی تھی شاید اس وجہ سے کہ انہوں نے بچپن سے اسے پالا تھا لیکن ان کی انا اور ضد اس محبت کو مار دیتی تھی، اللہ نے ہر انسان کے دل میں ایک نرم گوشہ ضرور رکھا ہے۔ جو وقت آنے پر ابھر کر سامنے آ ہی جاتا ہے۔

''اب بھی میں جذباتی نہ ہوں تو پھر کب ہوں۔'' وہ تڑپ کر بولا۔ ''مجھے ہر حال میں تشمیرہ چاہیے۔'' وہ یہ کہہ کر گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر پورچ میں آ گیا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے وہ مین روڈ پر لے آیا تھا، اس کا ارادہ کہیں جانے کا نہیں تھا بس یونہی سڑکوں پر گاڑی دوڑانے لگا کہ اچانک سڑک کے کنارے اسے روزی کھڑی نظر آئی تو اس کے قریب لے جا کر اس نے گاڑی روک دی۔

''تم؟'' روزی اسے دیکھ کر چونکی تھی۔

''جی میں۔'' اب وہ گاڑی سے اتر کر اس کے سامنے کھڑا کہہ رہا تھا۔ ''اب یہ مت کہیے گا کہ چلے جاؤ یہاں سے اور میرے راستے میں مت آیا کرو وغیرہ وغیرہ......''

''میں ایسا کچھ نہیں کہوں گی۔'' روزی کہتی ہوئی خود ہی اس کی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی تو اس نے بھی جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

''ویسے اس وقت آپ تیار ہو کر کہاں جا رہی تھیں؟''

''یہ میرا پرسنل میٹر ہے۔''

''اوہ سوری......'' وہ اتنا کہہ کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔ اسے روزی نے پہلے دن ہی اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا اور کوئی راز تو تھا اس کی ذات میں جسے وہ جاننا چاہتا تھا لیکن اس ملاقات میں اس پر واضح ہو گیا کہ وہ کبھی اپنے بارے میں خود کچھ نہیں بتائے گی،

روزی کو اس کی مطلوبہ جگہ پہنچا کر اس سے پھر ملنے کا کہتے ہوئے اس نے گاڑی واپسی کے لیے موڑ لی تھی۔

☆☆☆

وہ یونیورسٹی آ تو گئی تھی مگر اس کا دل نہیں لگ رہا تھا یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ریبال جاتے ہوئے اپنے ساتھ تمام شہر کو لے گیا ہو۔ اس کا دل بالکل نہیں لگ رہا تھا کیونکہ ہر جگہ ریبال کے ساتھ جڑی کچھ باتیں کچھ یادیں موجود تھیں۔ وہ لائبریری میں آ کر اپنے نوٹس تیار کرنے لگی کہ اچانک ہی شہر کے حالات خراب ہونے کی اطلاع اس تک پہنچی تو وہ گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھی گو کہ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا لیکن اب اکیلے پن سے وہ گھبرا رہی تھی، پہلے تو ریبال اس کی ڈھارس بنتا تھا، وہ گھر جانے کے راستوں اور بگڑتے حالات کو سوچتے ہوئے یونیورسٹی سے باہر نکلی تو فاطر گاڑی لیے اس کا منتظر کھڑا تھا۔

''اب نخرہ مت کرنا اور نہ ہی کوئی عذر تراشنا۔'' اسے یونیورسٹی سے نکلتا دیکھ کر وہ تیزی سے اس کی طرف آ کر حتمی انداز میں بولا۔

''میں کچھ بھی نہیں سنوں گا۔'' تشمیرہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کیونکہ اس کے ساتھ پیچھے کنواں اور آگے کھائی والا معاملہ تھا وہ شش و پنج میں کھڑی اسے دیکھ رہی تھی، فاطر نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے گاڑی میں لا بٹھایا، وہ خوفزدہ سی سمٹ کر بیٹھ گئی۔

''میں یہ تو جانتا ہوں کہ تم میرے بارے میں کچھ اچھا نہیں سوچتیں اور یہ بھی کہ تم مجھ سے شادی کرنا نہیں چاہتیں لیکن میں اپنی اس خواہش کو..... پایۂ تکمیل تک ضرور پہنچاؤں گا دیکھنا تم......''

''جو رشتے زور زبردستی سے طے کیے جائیں وہ کبھی پائیدار نہیں ہوتے۔'' تشمیرہ نے غصے سے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

''تم سے کس نے کہا کہ میں تمہیں بیوی بنا کر رکھوں گا۔ جب تک دل ہے رکھوں گا پھر نکال باہر کروں گا۔'' اس کی بات و انداز سے تشمیرہ کے جسم میں خوف کی جھرجھری سی طاری ہوئی تھی وہ مزید کچھ کہنے سے خود کو باز رکھتے ہوئے شیشے سے باہر دیکھنے لگی تھی کہ اچانک فائرنگ کی آواز آئی اور فاطر کی ہلکی سی چیخ نما آواز سے وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ گولی شاید اس کے بازو میں لگی تھی اور گاڑی اب اس سے سنبھالی نہیں جا رہی تھی جب ہی گاڑی بے قابو ہوتی ایک کھمبے سے جا ٹکرائی تھی۔ تشمیرہ نے خود کو چوٹ لگنے سے پتا نہیں کیسے بچالیا تھا، اب وہ فاطر... کی طرف متوجہ ہوئی تھی جو اپنے زخمی بازو کو دیکھ رہا تھا۔

''تمہیں گاڑی چلانی آتی ہے؟''

''نہیں......''

''میرے بازو پر گولی لگی ہے اور خون بہہ رہا ہے اگر زیادہ بہہ گیا تو مسئلہ ہو سکتا ہے۔''

''میں تایا جی کو فون کرتی ہوں۔'' اس نے کہنے کے ساتھ ہی اپنے بیگ سے موبائل نکال لیا تھا اور تایا جی کا نمبر نکالنے لگی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے فاطر نے موبائل فون اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

''یہاں کوئی قریبی اسپتال تو ہوگا''

''ہاں......'' تشمیرہ کو اس پر اچانک ترس آ گیا تھا کیونکہ اسے ڈرائیونگ آتی تھی لیکن اس نے مصلحتاً جھوٹ بولا تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے اس نے اپنی گندی سوچ اس پر واضح کر دی تھی اسپتال کے پاس گاڑی رکتے ہی فاطر بے ہوش ہو گیا تھا۔ وہ جلدی سے گاڑی سے اتر کر وہاں کے ملازمین کی مدد سے اسے اسٹریچر پر ڈال کر اندر ایمرجنسی میں لے گئی تھی۔

''جو بھی ہے، ہے تو ایک انسان اور اسی ناتے...... مجھے اس کی مدد کرنی چاہیے۔'' یہ سوچ آتے ہی تشمیرہ کو اپنے رویّے پر ندامت ہونے لگی تو وہ وہیں کاریڈور میں ٹہلنے لگی پھر جب تک ڈاکٹر نے اسے تسلی نہیں دے دی اسے چین نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

محبت، آزمائش ہے......اور جو اس پر پورا اتر گیا اس کے لیے تو پھر آسانیاں ہی لکھی ہیں لیکن جو پورا

نہیں اتر ا وہ پھر ہمیشہ بھٹکتا رہتا ہے، کبھی جنگل میں تو کبھی خواہشات کے پیکر میں خود کو قید کر لیتا ہے لیکن حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ ساری زندگی کی اداسیاں اور تلخیاں مقدر بن جاتی ہیں اور ریبال ان سب سے بچ رہا تھا...... وہ جرمنی کی رنگینیوں میں کھونا نہیں چاہتا تھا جبکہ جا بجا اس کا اہتمام تھا۔ وہ یونہی سڑکوں پر بے مقصد چلتے ہوئے اپنے اندر باہر کے سناٹے کو توڑنا چاہتا تھا مگر سب کچھ بے معنی تھا اسے اپنی یک طرفہ محبت کا اندازہ تو بہت پہلے ہو گیا تھا لیکن وہ اظہار سے کترا رہا تھا نہ جانے کیوں وہ ابھی خود کو کمزور کرنا نہیں چاہتا تھا، یہ اس کی اپنی سوچ تھی کہ محبت انسان کو کمزور تر کر دیتی ہے۔ وہ کچھ بننا چاہتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ تشمیرہ کے اپنے بھی کچھ خواب ہیں جس نے اس کی زندگی کو پابند کر رکھا ہے اس لیے وہ محبت کا اظہار کر کے اسے دکھ نہیں پہنچانا چاہ رہا تھا جبکہ اس سے ملے بغیر اتنی دور آنے پر دل میں ملال اور دکھ کے ساتھ جانے کیا۔ کچھ تھا۔ اس کی باتیں اس کا انداز اسے ہر وقت یاد آتا رہتا اور دل چاہتا کہ اس سے فون پر بات کرے اسے یہاں کے ماحول اور حالات کے بارے میں اور اپنے ملک سے دور ہو کر وہ کیسا محسوس کر رہا ہے، وہ سب باتیں بتائے لیکن وہ خود پر جبر کیے ہوئے تھا...... اس نے ابھی تک امی جی کو بھی فون نہیں کیا تھا اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ نمبر ڈائل کرے اور فون تشمیرہ کو نہ مل جائے وہ تو اس کی کیفیت جانے بغیر آ گیا تھا اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کیونکہ وہ اس کی خوشی و غم دونوں کا ساتھی تھا۔

''ہیلو فرینڈز......'' وہ ہاسٹل کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ سامنے سے آتی جینی نے کندھا اچکاتے ہوئے مسکرا کر کہا تو ریبال چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ جینی امریکا سے یہاں پڑھنے آئی تھی۔

''ہیلو!'' وہ کہہ کر آگے بڑھنا چاہتا تھا اس نے بے باکی سے اس کا ہاتھ تھام کر اس کی کمر میں اپنا ہاتھ ڈال دیا۔

''واٹ دا ہیل......'' وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا تھا، وہ قہقہہ لگا کر ہنستی ہوئی اس کا مذاق اڑانے لگی۔ وہ سر نخوت سے جھٹکتا ہوا سیڑھیاں چڑھ کر اپنے روم میں آ گیا تھا۔

☆☆☆

گو کہ فاطر کو صرف بازو میں گولی لگی تھی لیکن وہ ابھی تک بے ہوش تھا اور تشمیرہ اپنی حساس اور ذمے دار طبیعت کی وجہ سے جا نماز پر بیٹھی اس کے لیے مسلسل دعائیں مانگ رہی تھی، اس نے لاکھ تشمیرہ کے ساتھ بدتمیزی کی' اس کا راستہ روک کر نہ جانے کون، کون سے الفاظ استعمال کیے اس کے لیے اپنے دل میں کیسے گندے خیالات رکھتا تھا لیکن وہ ان سب سے انجان اس وقت اس کی سلامتی کے لیے رب کے آگے سجدہ ریز تھی۔ فاطر اگر ایک بار آنکھیں کھول کر اسے دیکھ لیتا تو حقیقت میں اس سے محبت کرنے لگتا...... اپنے دل کے تمام سچے جذبات اس لڑکی کے حق میں لکھ دیتا جو زار و قطار رو رہی تھی۔ گو کہ اس کے دل میں فاطر کے لیے وہ محبت نہیں تھی بس دل میں جو رحم تھا، وہ اسے مجبور کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے فاطر کی خیریت کی اطلاع دے کر اسے گھر جانے کے لیے بھی کہہ دیا تھا لیکن وہ اس کے ہوش میں آ جانے اور تایا جی کے آنے تک .... وہیں رہی تھی۔ پھر تایا جی کے ساتھ وہ گھر آئی تھی۔

''نامراد، کمبخت، منحوس......'' تائی جی اسے دیکھتے ہی شروع ہو گئیں۔'' پہلے پیدا ہوتے ہی اپنے ماں، باپ کو کھا گئی اب میرے معصوم بھتیجے کے پیچھے پڑ گئی۔'' تائی جی اس پر جھپٹنے کے سے انداز میں آگے بڑھی تھیں کہ اچانک تایا جی بیچ میں آ گئے اور ہاتھ اٹھا کر وارننگ دیتے ہوئے بولے۔

''بس بیگم...... بہت برداشت کر لیا میں نے، اب اگر اس کے بارے میں یا اسے کچھ کہا تو اپنا انجام بھی سوچ لینا۔'' تایا جی نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور سیڑھیاں چڑھ کر اسے اوپر کمرے میں لے آئے۔

''ڈرنے کی ضرورت نہیں، جو بھی ہوا اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں اور ایسی کوئی خطرے والی بات

بھی نہیں ہے وہ ٹھیک ہے انشاء اللہ ایک دو دن تک وہ گھر آجائے گا۔" تایا جی سائڈ ٹیبل پر رکھے پانی کے جگ سے پانی گلاس میں ڈال کر اسے تھماتے ہوئے بولے۔ وہ آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی گو کہ تائی جی کا رویّہ اس کے لیے نیا نہیں تھا لیکن ان کی باتوں سے ہمیشہ ہی اس کے دل کو تکلیف پہنچتی اور آج اگر تایا جی نہ ہوتے تو وہ اسے مارنے سے بھی دریغ نہ کرتیں یہی سوچ کر اسے مزید رونا آرہا تھا۔

"تایا جی میں ہاسٹل شفٹ ہو جاؤں؟" اس نے خوف میں گھر کر پوچھا۔

"میں ابھی زندہ ہوں۔ تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔" وہ اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر بولے۔

"لیکن......"

"لیکن ویکن کچھ نہیں...... تمہیں یہیں رہنا ہے۔" وہ حتمی انداز میں کہتے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "ابھی شہر کے حالات کچھ بہتر نہیں۔ ہو سکے تو تم یونیورسٹی مت جانا۔" اس نے تایا جی کی بات پر صرف اثبات میں سر ہلانے پر اتفاق کیا تھا اور ان کے جانے کے بعد وہ بیڈ کی پٹی سے سر ٹکا کر کمرے کی چھت کو تکنے لگی۔ وہ لاکھ کوشش کرتی کہ تائی جی کو اپنی ذات سے کوئی تکلیف نہ پہنچائے انہیں کوئی ایسا موقع نہ ملے جس میں وہ اس کی روح کو اپنی زبان کے نشتر سے چھلنی کرنے سے باز رہ سکیں لیکن وہ تو خود ہی کوئی پہلو نکال لیتی تھیں۔ اب تو کوئی دوست کوئی راز دار بھی نہیں رہا تھا جس کو وہ دل کا حال سناتی اور اپنے غم سے چور دل کا مداوا کرتی۔ اب صرف تنہائی اس کے آس پاس پھیلی تھی زندگی اس کے لیے روز ایک نئی شکل اور آزمائش لیے سامنے آرہی تھی۔

"اب جب دوست کی ضرورت تھی تو تم نے ہی منہ موڑ لیا۔" اس نے دل میں سوچا اور ذرا سی گردن موڑ کر سائڈ ٹیبل کی کھلی دراز میں سے جھانکتی ڈائری پر نظر پڑتے ہی اس نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر اسے اٹھالیا۔

"ہاں اب تم ہی ہو میری دوست......" اس نے آنسوؤں کے درمیان خود کلامی کی۔

☆☆☆

وانیہ اعزاز گاؤں کی پگڈنڈی پر چلتی ہوئی پکی سڑک پر آکر لفٹ کے لیے کسی گاڑی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے کپڑے بھی گاؤں کی مٹی کو چاٹ کر اب میلے ہو رہے تھے، بال بے ترتیب اور الجھے ہوئے اپنی کہانی بیان کر رہے تھے۔ وہ جو ہر وقت بن ٹھن کر رہتی تھی اس وقت خستہ حالی میں سڑک کنارے کھڑی شہر جانے والی گاڑی کے انتظار میں تھی اور اب تک کئی گاڑیاں اسے دیکھے بغیر تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ اسے اپنی خوب صورتی پر ناز ہونے کے ساتھ ساتھ غرور بھی تھا جو اب گاؤں کی مٹی میں مل کر اسے حقیقت کی دنیا دکھا رہا تھا مگر جب آنکھوں اور دل پر قفل پڑ جائیں تو پھر انسان ساری زندگی روشنی کے پیچھے بھاگ کر غفلت کی آگ میں جلتا رہتا ہے اور الزام دوسروں کے سر پر رکھ کر خود کو مظلوم تصور کرتا ہے جبکہ ساری کوتاہیاں اس کی اپنی ذات سے شروع ہوتی ہیں۔

وانیہ اعزاز بھی بھول گئی تھی کہ وہ ایک بہو، بیوی اور ماں ہے جب ہی خواب کے پیچھے چلتی ہوئی اندھی زندگی گزار رہی تھی اور ابھی تو حادثے کی شروعات تھی شاید سمجھنے کا ایک موقع دیا تھا لیکن وہ ضد میں خود کو ختم کر رہی تھی۔ اچانک ہی ایک گاڑی اس کے قریب آکر رکی۔ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ڈھلتی جوانی کو بحال رکھنے کی کوشش کرتے ایک شخص نے گاڑی کے بلیک شیشے نیچے کرتے ہوئے اسے بغور دیکھا اور اپنے دانتوں کی نمائش کرنے کے ساتھ مونچھوں کو بھی تاؤ دیا تھا۔

"کہاں جانا ہے بی بی؟"

"شہر......" ایک ادا سے کہا۔

"چلیں ہم چھوڑ دیں۔" اس نے کہنے کے ساتھ ہی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ وہ جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی، اس نے یہ سوچنے اور سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ اس شخص کی کیا نیت ہے بلکہ اسے غرض

صرف شہر جانے سے تھی اور گاڑی شہر جانے کے بجائے حویلی کی طرف مڑ گئی تو وہ حیران ہو کر مڑ میں سے اس شخص کو دیکھنے لگی جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”مجھے اصل میں حویلی میں کچھ کام ہے اس لیے پہلے وہ کام کرلوں پھر آپ کو شہر چھوڑ دوں گا۔“

”بہتر ......“ وہ کہہ کر کھیتوں میں کام کرتی خواتین کو دیکھنے لگی۔ ”یہاں بھی خواتین مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں۔“

”ہاں اب زمانہ بدل گیا ہے۔“ وہ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے مسکرایا۔ ”ویسے آپ شہر سے یہاں کام سے آئی تھیں؟“

”کسی کام سے نہیں۔ دوست کے ساتھ آئی تھی۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سچ بول گئی تو اس شخص کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔

”تو وہ کہاں ہیں؟“

”میں اس سے بچھڑ کر راستہ بھول گئی۔“

”اوہ اس کا مطلب ہمارا ملنا مقصود تھا۔“ اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ ”آیئے پہلے ہمیں مہمان نوازی کا حق ادا کرنے دیں، اس کے بعد ہم کو آپ کی منزل تک پہنچا دیں گے۔“ وانیہ اس کی پیروی کرتی گاڑی سے اتر کر اس کے ساتھ قدم ملا کر چلتی کئی راہداریوں کو عبور کرتی بڑے سے ہال نما کمرے جیسے ڈرائنگ روم میں داخل ہوگئی تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے پورے کمرے کا جائزہ لیا یہ جدید اور پرانے طرز کے فرنیچر سے سجایا گیا تھا، پیروں کے نیچے مخملی دبیز کارپٹ بچھا ہوا تھا۔

”آپ بیٹھیں...... ہم آپ کی مہمان نوازی کا بندوبست کرتے ہیں۔“ وہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا تو وانیہ ایک صوفے پر بیٹھ کر سامنے دیوار پر لگی بے حد خوب صورت گھوڑوں کی تصویر دیکھنے لگی جو سمندر کنارے اپنے پیروں سے پانی اچھالتے بھاگ رہے تھے۔ اسے بھی اپنا آپ ان گھوڑوں کے مانند لگا، وہ بھی تو نہ جانے کہاں سے بھاگتی ہوئی آرہی تھی اور اب

جسم تھک کر چور ہو رہا تھا۔ اس نے صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ اور نہ ہی اس کے دل میں کسی چیز کی ہوس تھی...... ماں، باپ کی طرف سے ملنے والی زمین اور نقد رقم اب بھی اس کے پاس محفوظ تھے۔ اس کے اپنے اندر ایک بے نام سی خلش تھی جسے وہ دوسروں کے گھر میں تلاش کرتی اور اسے وقتی محبت وسکون کا نام دے کر کچھ عرصے بعد بھول بھی جاتی اب بھی اس کے اندر وہی محبت انگڑائی لینے لگی تو اس نے آنکھیں کھول دیں، سامنے وہی شخص ہاتھ میں لوازمات سے بھری ٹرے اور چائے لیے کھڑا تھا۔

”ارے آپ خود ہی لے آئے ویسے میں پہلے فریش ہونا چاہتی ہوں۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں۔“ اس نے ٹرے شیشے کی ٹیبل پر رکھ دی اور اسے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے ڈرائنگ روم سے نکل کر وسیع سٹنگ روم سے ہوتا ہوا اپنے شاندار کمرے میں لے گیا تھا۔

☆☆☆

اس نے اپنی زندگی میں سب کچھ بن مانگے حاصل کیا تھا اور اب بھی اسے ذرا سی کوشش کے بعد تشمیرہ جیسا پھل ملنے والا تھا لیکن اب اسے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا اور شاید اس کی وجہ وہ معصوم لڑکی تھی جو اس کی ہوس کا شکار ہونے کے بعد اس دنیا میں نہیں رہی تھی لیکن اس کے خوابوں اور خیالوں پر چھائی ہوئی ضرور تھی اور ہر وقت اسے اس کے جرم کی سزا سناتی اور اس کا مذاق اڑاتی اور پھر رونے لگتی...... نہ جانے کیوں اس کے رونے سے فاطر خوفزدہ ہو جاتا اور اس سے معافی مانگنے لگتا، اس کے معافی مانگنے پر وہ اسے خونخوار نظروں سے اسے دیکھتی اور پھر قہقہہ لگا کر ہنستی اور ہنستی چلی جاتی تھی اور وہ مزید خوفزدہ ہو جاتا تھا اب بھی اسی خوف کے تحت اس نے آنکھیں کھولیں تو سامنے ڈاکٹر کو کھڑے دیکھ کر وہ بوکھلا گیا۔

”کیا ہوا ہے مجھے؟“

''گولی لگی تھی آپ کو.....؟'' ڈاکٹر نے بتا کر اسے اچنبھے سے دیکھا۔ ''آپ کو یاد نہیں؟''

''آں.....یاد ہے۔'' وہ کہہ کر کمر کے پیچھے تکیہ رکھ کر سیدھا بیٹھ گیا۔

''میرے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی، وہ کہاں ہے؟''
''اس کو اس کے انکل لے گئے۔''
''کب......؟''
''کافی دیر ہوگئی...... آپ کی کون ہے وہ؟'' ڈاکٹر کے سوال پر فاطر نے کوئی جواب نہیں دیا تو ڈاکٹر خود ہی کہنے لگا۔

''بہت محبت کرتی ہے وہ آپ سے۔ یہیں جائے نماز بچھا کر بہت دعائیں کر رہی تھی آپ کے لیے۔''
''کیا؟'' اسے شدید حیرت ہوئی۔
''ہاں، وہ جانا بھی نہیں چاہتی تھی لیکن وہ صاحب زبردستی لے گئے۔''
ڈاکٹر کہہ کر چلا گیا تو وہ اس آخری جملوں میں الجھ سا گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ تشمیرہ اس کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی۔ اس نے اس لڑکی کے ساتھ ایسا کوئی مخلص رویہ نہیں رکھا تھا جو وہ اس کی سلامتی کے لیے دعائیں کرتی پھرتی کیا وجہ تھی؟ وہ جتنا سوچ رہا تھا مزید الجھتا جا رہا تھا۔
وہ تشمیرہ کو صرف اپنی ہوس کے لیے حاصل کرنا چاہتا تھا اور جب ناکام ہوا تو جھوٹی محبت کا ڈھونگ پھوپی کے سامنے رچا ڈالا۔ اب جب سب کچھ اس کی سوچ کے مطابق ہونے جا رہا تھا تو وہ پچھتا رہا تھا اور اس کی وجہ اس کے اندر کا ڈر تھا۔
''ہائے میرا بچہ......'' پھوپی کی آواز پر اس نے ذرا سی آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا جو بے قراری سے اس کی طرف بڑھ رہی تھیں جبکہ دروازے پر اس کے ابا جی کچھ سوچتے ہوئے انداز میں سینے پر ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔
''منحوس نے تجھے بھی اپنے عذاب سے نہیں چھوڑا......میں تو یہ رشتہ چاہتی ہی نہیں پھر بھی تیری ضد تھی۔''
''ہم آج ہی اس شہر سے چلے جائیں گے۔'' ابا جی نے حتمی انداز میں کہا تو وہ انہیں دیکھنے لگا۔ ''اور بھول جا اس لڑکی کو، میں تیری شادی اس سے کہیں زیادہ حسین لڑکی سے کروادوں گا۔''
وہ اب بھی کچھ نہیں بولا بس یونہی خالی خالی نظروں سے پھوپی اور ابا جی کو دیکھے گیا تھا اس کی سمجھ میں شاید ان دونوں کی باتیں نہیں آ رہی تھیں یا پھر اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔
''تو کچھ بولتا کیوں نہیں ہے؟'' ابا جی نے اس کے قریب آ کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔
''تشمیرہ ٹھیک ہے، اسے تو کچھ نہیں ہوا؟'' نہ جانے کس جذبے کے تحت اس کی زبان سے یہ جملے ادا ہوئے تھے، ابا جی اور پھوپی اپنی جگہ حیران کھڑے ایک دوسرے کو دیکھنے کے بعد اسے دیکھ رہے تھے جبکہ اب ابا جی کا ضبط جواب دے گیا تھا۔
''بکواس بند کر اپنی......اور بھول جا اس چھوکری کو۔''
''نہیں بھول سکتا......'' وہ تحمل سے بولا۔
''تو پھر سن لے، میرے جیتے جی وہ بھی تیری نہیں ہوسکتی۔'' ابا جی کہہ کر تیزی سے کمرے سے نکل گئے پھوپی نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر روم سے باہر نکلنا چاہتی تھیں کہ اس نے پکار لیا۔
''تشمیرہ میری امانت ہے آپ کے پاس، اس کا خیال رکھیے گا۔'' انہوں نے ایک نظر تاسف سے فاطر کو دیکھا اور چلی گئیں اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے بیڈ کی پٹی سے سر ٹکا لیا، ساتھ ہی دل و دماغ میں جھگڑے شروع ہوگئے تھے اور پھر وہی ایک چہرہ اس کی بند آنکھوں کے پردوں میں جھانک کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

''ماں جی، ریبال سے کوئی رابطہ......؟'' اعزاز شاہ نے کھانے کی میز پر امی جی کو کھانے کے برتن اٹھاتے دیکھ کر پوچھا تو وہ انہیں دیکھنے لگیں۔

’’میرا مطلب ہے اس نے آپ سے کوئی رابطہ کیا جرمنی جا کر۔‘‘

’’ہاں بے حد مختصر سا......‘‘ امی جی نے ٹھنڈی سانس لی۔ ’’پتا نہیں کس حال میں ہوگا۔‘‘

’’یہ تو بہت ہی غلط حرکت ہے اس کی، کم سے کم فون کر کے اپنی تفصیلی خیریت سے آگاہ کرنا چاہیے تھا۔ خیر چھوڑیں، ہوسکتا ہے فوراً مصروف ہوگیا ہو۔‘‘ وہ کہہ کر وہیں صوفے پر بیٹھ گئے۔ ’’میں بھی تو آپ کا بیٹا ہوں، آپ یقین رکھیں کہ وہ خیریت سے ہی ہوگا۔‘‘

’’ہاں، ابھی وہاں کے مسائل دیکھ رہا ہوگا۔‘‘

امی جی اعزاز کی بات پر ذرا سا مسکرائیں گو کہ ان کا دل بھی مطمئن تھا لیکن پھر بھی وہ تھوڑی سی فکر مند ضرور تھیں۔

’’آپ ریبال کی شادی کیوں نہیں کر دیتیں؟‘‘ اعزاز شاہ نے موضوع بدلا۔ ’’گھر میں ایک عورت کا اضافہ بھی ہوگا اور کچھ نئے مہمان بھی۔‘‘

’’شادی کا مطلب ہے ذمے داری میں اضافہ اور ابھی میں اس پر ذمے داری ڈالنا نہیں چاہتی، چائے پیوگے؟‘‘ انہوں نے ان کی بات کا سرسری انداز میں جواب دیا تھا۔

’’نہیں، اب میں چلوں گا۔‘‘ وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے شاید سمجھ گئے تھے کہ اب امی جی ان کی ذات کو کریدیں گی اس لیے سلام دعا لیتے جلدی سے گھر سے نکل کر گاڑی میں آبیٹھے۔

اعزاز شاہ نے گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے سگریٹ سلگائی اور پھر اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھالی تھی۔ انہیں ہمیشہ یہاں آکر محرومی کا احساس ہوتا، نہ جانے کیوں وہ خود کو یہاں آنے سے جاننے کے باوجود بھی روک نہیں پاتے تھے۔ کچھ عجیب سی کشش انہیں یہاں لے آتی اور انہیں یوں محسوس ہوتا جیسے وہ برسوں سے ان کے درمیان تھے لیکن وقت نے کروٹ لے کر انہیں ان سے جدا کر دیا ہو۔

اعزاز شاہ کا ارادہ گھر جانے کا نہیں تھا اس لیے

وہ ساحل سمندر پر بنے ریستوران میں آکر بیٹھ گئے اور کافی کا آرڈر دے کر یونہی سمندر کی لہروں کو ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھ رہے تھے کہ اچانک ایک مانوس سی مردانہ ہنسی پر وہ بری طرح چونکے، ساتھ ہی انہوں نے گردن گھما کر اس سمت دیکھا تو چکرا کر رہ گئے۔

وہ نہ جانے کس خاتون کے ساتھ بیٹھے دنیا و مافیہا سے بے خبر اس کی تعریف کسی بے باک نوجوان کی طرح کر رہے تھے اور وہ خاتون اپنے بھاری جسم کو سمیٹ کر شرمانے کی ناکام اداکاری کر رہی تھیں۔

اعزاز شاہ کو شرم کے ساتھ غصہ نے آن گھیرا عین ممکن تھا کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے سامنے جا کھڑے ہوتے لیکن اسی وقت ویٹر کافی لے کر آگیا تھا اور ساتھ ہی موبائل فون بھی بجنے لگا۔ انہوں نے لائن ڈسکنکٹ کی اور پھر سے گردن گھما کر اس منظر کو دیکھنے کی کوشش کی مگر اب وہ ٹیبل خالی تھی اعزاز شاہ نے ان کے تعاقب میں نظریں گھمائیں تو وہ اس خاتون کے ساتھ ریستوران سے باہر نکلتے اور پھر جلد ہی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے نظر آئے، دکھ اور غصہ کی کیفیت میں اعزاز شاہ نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔

☆☆☆

اس کے سامنے پانچ سال کا بچہ ہاتھ میں پھول لیے کھڑا مسکرا رہا تھا، وہ ایک لمحے کو ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگی۔ شکل میں کسی کی ہلکی سی شباہت موجود تھی جو اسے مسلسل اپنی طرف دیکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔

''کون ہے یہ؟'' تشمیرہ نے سوچنے کی کوشش کی لیکن زندگی میں اتنے حادثے رونما ہو چکے تھے کہ اب اسے کچھ بھی یاد کرنے میں بھی بہت مشکل پیش آتی تھی۔

''آپ تشمیرہ ہیں ناں...... تشمیرہ بانو۔'' بچے نے مسکرا کر محبت سے پوچھا تو وہ جواب دینے کے بجائے دو زانو بیٹھ کر اسے بغور دیکھنے لگی۔

''آپ کو میرا نام کیسے معلوم؟'' کچھ دیر بعد اس نے پوچھا تو بچہ کندھے اچکا کر رہ گیا پھر فوراً ہی گلاب کا پھول اس کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ آپ کے لیے۔''

''تھینکس؟ مگر کس خوشی میں؟''

''اس خوشی میں کہ آج آپ مجھے ملیں......'' وہ کہہ کر ہنستا ہوا ایک طرف بھاگ گیا جبکہ وہ اپنی جگہ الجھ کر رہ گئی تھی...... کوئی شناسا عکس کوئی شبیہہ اس کے ذہن کے نہاں خانوں پر واضح نہیں ہو رہی تھی۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' تانیہ نے حیرت وطنز کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ پوچھا تو وہ چونک کر سیدھی کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔

''کچھ نہیں!''

''میرا خیال ہے فنکشن ختم ہو گیا ہے اور سب لوگ جا رہے ہیں، تم یہاں کسی کا انتظار کرو گی یا ہمارے ساتھ چلو گی؟'' تشمیرہ کے خیال سے وہ ایسی ہی فضول بکواس کرتی تھی۔

''ڈرائیور نظر نہیں آرہا؟'' اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے وہ ذرا سا نظروں کا زاویہ بدل کر بولی تھی۔

''یہاں سے باہر نکلیں گے تو وہ آجائے گا۔'' اب کی بار تشمیرہ کچھ نہیں بولی۔ خاموشی سے تانیہ کے ساتھ چلنے لگی جبکہ وہ مسلسل شاعر حضرات کی شان میں قصیدے پڑھ رہی تھی۔

''اچھی شاعری کرتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے آنے والے کل میں یہ فیض سے بھی بڑے شاعر ہوں گے۔''

''فیض کی شاعری سے ہی فیض یاب ہو جائیں یہ ہی بہت ہے۔'' تشمیرہ کی زبان سے بے ساختہ یہ جملہ پھسلا تو وہ قدرے خفگی سے اسے دیکھنے لگی اور وہ تانیہ کے غصے سے سہم کر تیزی سے چلتی ہوئی ایک طرف کھڑے اعزاز شاہ کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی تھی اور پھر اچانک ہی وہ بچہ اسے دوبارہ نظر آیا جو مسکراتا ہوا اسے ہاتھ ہلاتا باہر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی سوچ ایک بار پھر اس بچے میں اٹک گئی تھی۔

☆☆☆

وانیہ نے دو تین بار اعزاز شاہ کا نمبر ٹرائی کیا لیکن

جب مستقل اعزاز شاہ کی طرف سے جواب موصول نہیں ہوا تو اس نے جھنجلا کر ریسیور رکھ دیا۔

''سوچتا ہوگا جان چھوٹ گئی۔'' اس نے تلملا کر سوچا اور وہیں صوفے پر بیٹھ گئی تب ہی ملازم چائے لے کر آ گیا تو وہ اسے یونہی سرسری سا دیکھ کر رہ گئی۔

''صاحب کہیں کام سے باہر گئے ہیں، کہہ رہے تھے کہ شام تک آئیں گے جب تک آپ یہیں رہیں۔''

''کیا مطلب ہے یہیں رہوں؟'' اس نے غصے سے پوچھا۔ ملازم کوئی جواب دیے بغیر ہی وہاں سے چلا گیا تھا۔ شاید اسے یہ حکم ملا تھا۔ وہ کچھ دیر تو وہیں بیٹھی نہ جانے کیا کچھ سوچتی رہی پھر تلملا کر لان میں نکل آئی اور باہر جانے کے لیے گیٹ کی طرف بڑھنے لگی تھی کہ اچانک ہی دو خواتین نے اس کا راستہ روک لیا۔

''بی بی ہمیں حکم ہے کہ جب تک صاحب نہ آجائیں آپ کو باہر جانے نہ دیا جائے۔''

''تمہیں حکم ہے، مجھے نہیں۔'' وہ کہہ کر جانا چاہتی تھی کہ دونوں مسٹنڈی خواتین نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ وہ ماہیٔ بے آب کی طرح ان کے بازوؤں میں مچلنے لگی۔

''چھوڑو مجھے...... جانے دو، تم نہیں جانتی میں کون ہوں۔'' وہ چیخ، چیخ کر کہہ رہی تھی مگر انہوں نے کہاں سننا تھا۔ وہ اسے زبردستی ایک کمرے میں بند کر کے چلی گئی تھیں۔ وہ غصے وحیرت سے اس کمرے کو دیکھنے لگی جہاں ایک طرف بڑی سی کھڑکی میں لوہے کی جالیاں لگی تھیں تو دوسری طرف ذرا سے فاصلے پر واش روم تھا۔ یہ بہت مختصر اور باقی کمروں سے چھوٹا کمرا تھا۔ اس میں سامان بھی کوئی خاص نہیں رکھا گیا تھا......لیکن اس وقت وانیہ کو اس کمرے یا یہاں کے کسی سامان سے نہیں بلکہ یہاں سے باہر نکلنے سے غرض تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ یہاں سے جلد از جلد نکل کر واپس اپنے شہر جائے اور دوبارہ روزی کے ساتھ مل کر ان رنگینیوں میں کھو جائے۔ روزی کا خیال ذہن میں آتے ہی اسے افسوس ہونے لگا کہ اس نے اعزاز شاہ کے بجائے روزی کو فون کیوں نہیں ملایا۔ وہ یقیناً یہاں سے نکلنے میں اس کی مدد ضرور کرتی۔ وہ اپنا سر پکڑ کر بیڈ کے ایک سائڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ شاید یہ اس کے گناہوں کی سزا تھی جو اسے مل رہی تھی۔

انسان کبھی اپنی غلطی نہیں سوچتا، وہ ہمیشہ دوسروں کے سر الزام رکھتا ہے اس لیے خسارہ اٹھاتا ہے بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اپنی غلطی جان کر اس سے توبہ کرتے ہیں اور اسے دوبارہ نہیں دُہراتے لیکن وانیہ اعزاز غلط ہوتے ہوئے بھی دوسروں کے سر الزام رکھ رہی تھی۔ وہ اگر اعزاز سے عمر میں بڑی تھی تو یہ بات تسلیم کرتے ہوئے بیوی ہونے کے ناتے اس کے حقوق ادا کرتی نہ کہ اپنی مرضی سے اسے چلانے کی کوشش کی، اسی وجہ سے دونوں فریقین میں تصادم چل رہا تھا اور دونوں ہی ایک دوسرے کو تسلیم کرنے سے انکاری تھے جبکہ میاں، بیوی کے رشتے میں محبت نہ بھی رہے تو بھی سمجھوتے پر رشتہ چل ہی جاتا ہے مگر یہاں تو اب سمجھوتا بھی ممکن نہیں رہا تھا بلکہ دونوں ایک چھت کے نیچے ساتھ رہتے ہوئے بھی بس ایک دوسرے کو برداشت کر رہے تھے۔

اچانک دروازہ کھلا اور ملازم اندر داخل ہوا تھا۔

''صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔'' وہ کچھ نہیں بولی خاموشی سے اٹھ کر اس کے ساتھ چلنے لگی اور جب ڈرائنگ روم میں آئی تو پھٹ پڑی۔

''تم مجھے یوں قید نہیں کر سکتے۔''

''قید کس نے کیا ہے میری جان......ہم نے تو بس شام کے لیے رکھا ہے۔ کچھ وقت گزاری کے لیے۔'' وہ کہہ کر مسکرایا تو وانیہ اندر تک سلگ گئی مگر... فی الحال کچھ بھی کرنے اور کہنے سے قاصر تھی کیونکہ اس وقت یہ شخص یہاں سے نکلنے اور شہر پہنچانے کا واحد ذریعہ تھا۔ وہ اسے خونخوار نظروں سے دیکھ کر ایک طرف صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب جینی لڑکھڑاتے

قدموں کے ساتھ ہاسٹل کی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی روم میں آئی تھی اور اپنے بستر پر گرتے ہی سو گئی تھی۔

ریبال واش روم سے نکلا تو اسے جوتوں سمیت سوتا دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھٹکا تھا پھر لائٹ آف کرتا جا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ ذہنی رو ایک بار پھر پاکستان میں بسے لوگوں کے درمیان اسے لے آئی تھی۔ وہ ایک، ایک کے بارے میں سوچنے لگا اور ان کے درمیان خود کو محسوس کرتا وہ سو گیا تھا۔

صبح اس کی آنکھ گھڑی کے الارم سے کھلی تھی۔ اس نے جلدی سے الارم بند کیا اور تیار ہونے کے لیے واش روم میں چلا گیا۔ جب فریش ہو کر نکلا تو جینی انگڑائی لے کر اٹھتی ہوئی اپنے بال سمیٹ رہی تھی۔

''ہیلو......'' اس پر اب بھی رات والا نشہ تھا اس لیے آنکھیں ٹھیک سے کھول نہیں پا رہی تھی۔

''چائے پیوگی؟'' ریبال نے کچن کی طرف بڑھتے ہوئے اس سے پوچھا تو وہ مسکرا کر آنکھیں بند کرتی پھر سے بستر پر لیٹ گئی تھی۔

''عجیب لڑکی ہے۔'' اس نے دل میں سوچا اور اپنا ناشتا بنانے لگا۔ ناشتے کے بعد اس نے اپنا بیگ سنبھالا، آئینے پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی اور یونیورسٹی کے لیے نکلنے سے پہلے ایک نظر جینی کو دیکھا اور پھر... غیر ارادی طور پر وہ جینی اور تشمیرہ کا موازنہ کرنے لگا۔ گھڑی پر نظر گئی تو تیزی سے روم سے نکل گیا لیکن ذہن و دل الجھ گئے تھے۔

وہ جب سے یہاں آیا تھا ایک لمحہ بھی تشمیرہ کی یاد سے غافل نہیں رہ سکا تھا۔ دل نے محبت کا راگ تو وہیں پاکستان میں رہتے ہوئے ہی الاپنا شروع کر دیا تھا اور وہ چاہتے ہوئے بھی اس کو اپنی کیفیت سے آگاہ نہیں کر سکا تھا۔ اس وقت تو تشمیرہ سے سامنا نہ ہونے پر اس نے سوچا تھا کہ ابھی وقت بھی نہیں تھا اور...... ''میں پہلے کچھ بن جاؤں پھر اس سے بات کروں گا۔'' لیکن اب اسے لگ رہا تھا کہ وہ اسے اپنے دل کے حالات سے آگاہ کر کے آتا تو شاید اتنی بے چینی نہ ہوتی اور ابھی اس کو فون کرنے سے گریز بھی کر رہا تھا، اس نے تو ابھی تک امی سے بھی بات نہیں کی تھی۔

محبت انسان کو کمزور اور بزدل بنا دیتی ہے اور ریبال کمزور تو نہیں بس ایک انجانے خوف نے اسے بزدل ضرور بنا دیا تھا کہ جب ہی اس رات جینی کے کلب جاتے ہی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے تشمیرہ کا نمبر ملایا تھا۔

''ہیلو...... ہیلو تشمیرہ......'' شاید سگنل پرابلم تھی جو ریبال کی آواز اس تک نہیں پہنچ سکی اور بالآخر دوسری طرف سے مایوس ہو کر لائن کاٹ دی گئی تھی اس نے کچھ دیر سوچتے ہوئے انداز میں فون کو دیکھا اور پھر امی کو فون ملایا تھا۔

''ہیلو......''

''جی امی...... میں ریبال، آپ کیسی ہیں؟'' دوسری طرف سے زندگی سے بھرپور آواز سنائی دی تھی۔

''ریبال بیٹا میں ٹھیک ہوں، تم کیسے ہو؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں۔'' آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔ ''بس آپ سے دور ہوں۔ آپ کے بغیر کچھ اچھا نہیں لگ رہا...... کچھ بھی نہیں۔''

''وقت کے ساتھ دوریاں تو آ ہی جاتی ہیں اور اب تو سائنس نے ترقی اتنی کر لی ہے کہ یہ دوریاں زیادہ محسوس نہیں ہوتیں۔''

امی اس کو بہلانے لگیں جبکہ ایک ہفتے بعد اس کی آواز سن کر وہ خود بھی رنجیدہ ہو گئی تھیں۔ ریبال نے ان کی خیریت دریافت کرنے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا تھا کیونکہ وہ ان سے جتنی باتیں کر رہا تھا اتنا ہی دل بھر آ رہا تھا۔ اور اس مرتبہ بھی وہ دل بھر کے باتیں نہیں کر پایا تھا۔

☆☆☆

تشمیرہ یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی، فاطر والے واقعے کو ایک ہفتہ گزر گیا تھا اس کے بعد سے اب تک گھر کے ماحول میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی اور نہ ہی فاطر اس کے سامنے اپنی محبت کا

دم بھرنے آیا تھا، اس لیے وہ ایک بار پھر یکسوئی سے اپنی پڑھائی پر توجہ دینے لگی۔

اس نے یہی سمجھ لیا تھا کہ زندگی کسی بھی فرد کے جانے سے ٹھہرتی نہیں بلکہ اپنی منزل کی طرف بڑھتی رہتی ہے اور ان لوگوں کی جگہ دوسرے لوگ لے لیتے ہیں گو کہ بہت جلدی نہیں مگر کچھ وقت کے بعد وہ خود آپ کی زندگی میں شامل ہوجاتے ہیں اور یہ سوچ اس کے لیے بہت حد تک بہتر بھی ثابت ہوئی۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بال بنارہی تھی کہ اچانک موبائل فون بجنے لگا تو اس نے اجنبی نمبر دیکھ کر کال ریسیو کی تھی، اس یقین کے ساتھ کہ دوسری طرف ریبال ہی ہوگا...... لیکن دوسری طرف سے آواز نہ آنے کی وجہ سے اس نے لائن ڈسکنکٹ کردی تھی اگر یونیورسٹی سے دیر نہ ہورہی ہوتی تو وہ کال بیک کرتی مگر پھر بعد کا سوچ کر وہ ایک چھوٹے سے بیگ میں اپنی ضروری چیزیں رکھ کر کمرے سے نکل کر تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تو فاطر آخری سیڑھی پر کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھٹکی...... وہ ہمیشہ سے کچھ مختلف نظر آرہا تھا، وہ سر جھٹک کر آگے بڑھنے لگی تو اس نے پکارلیا۔

”تشمیرہ......!“ وہ رک گئی مگر اس کی طرف دیکھا نہیں۔

”اگر تمہیں برا نہیں لگے تو میں تمہیں یونیورسٹی ڈراپ کردوں؟“ وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کہہ سکی نہ جانے کیوں دل نے خاموش رہنے کا حکم صادر کیا ہوا تھا۔

”بیٹا تشمیرہ...... آپ فاطر کے ساتھ یونیورسٹی چلی جاؤ۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔“ تایا جی تیزی سے اپنے کمرے سے نکلے اور ایک لمحے کو اس کے قریب رک کر کہتے ہوئے اسی تیزی سے باہر کی طرف نکل گئے تھے۔ اس نے ایک نظر فاطر کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر ہلکا سا اطمینان تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ قدم ملا کر چلتی ہوئی گاڑی میں آبیٹھی تھی۔

جب انسان سب کچھ خدا پر چھوڑ دے تو پھر وہ خود مطمئن ہوجاتا ہے۔ تشمیرہ نے اللہ کی مرضی کے آگے سر جھکا دیا تھا اس لیے اب اسے فاطر سے کسی قسم کا ڈر محسوس نہیں ہورہا تھا بلکہ وہ بہت خاموشی سے گاڑی میں بیٹھی شیشے سے باہر بھاگتے دوڑتے ہوئے منظر دیکھ رہی تھی۔

”ناراض ہو؟“ فاطر نے بات کرنے کی غرض سے پوچھا۔ اس نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر باہر دیکھنے لگی۔

”میں مانتا ہوں کہ میں بہت برا ہوں، بہت ساری خامیاں ہیں مجھ میں لیکن ان خامیوں کو نکال کر دیکھا جائے تو میں ایک اچھا انسان ہوں۔“ وہ کچھ دیر خاموش ہوکر اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا لیکن جب خاموشی طویل ہونے لگی تو پھر وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتا ہوا بولا۔

”میں نے آپ سے محبت کا اعتراف سب کے سامنے کیا یہ میری غلطی تھی، میں مانتا ہوں، محبت کرنا گناہ نہیں اور نہ ہی اس پر کسی کا اختیار ہے۔“

”جس طرح کی محبت آپ کرتے ہیں وہ گناہ ہے۔“ وہ فوراً بولی۔ ”خدا نے عورت کی نظر وسوچ بہت وسیع رکھی ہے۔ وہ کسی بھی مرد کی نظر کو بہ آسانی پہچان سکتی ہے اور آپ کی نظر میں میرے لیے محبت نہیں، ہوس ہے۔“ اس نے دوٹوک الفاظ اس کے منہ پر مارے تھے۔ وہ ایک لمحے کو ساکت ہوا تھا۔ فاطر سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کس حد تک اس کی سوچ پڑھ سکتی ہے۔

”ٹھیک ہے، مان لیا کہ میری یہی سوچ ہے مگر میں جائز طریقے سے تمہیں اپنانا چاہتا ہوں۔“

”یہ باتیں انسان کے اختیار میں نہیں، موت سے لے کر رزق اور نکاح تک شادی کے سارے کام اللہ کے اختیار میں ہیں، اسے جب منظور ہوگا سب ہوجائے گا۔“

”بہت گہری بات کی آپ نے۔“ اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی یونیورسٹی کے گیٹ کے سامنے روک دی۔ تشمیرہ اتر کر جانے لگی تو اس نے فوراً پکارلیا۔

''تشمیرہ......!'' وہ رک گئی۔
''میں اپنے گزشتہ تمام رویّوں کی تم سے معافی مانگتا ہوں اگر تمہیں میں پسند نہیں تو اس رشتے سے میں خود ہی انکار کر دیتا ہوں۔'' تشمیرہ نے مڑ کر اسے ایک نظر دیکھا تھا اس کے چہرے پر اس کی بات کی سچائی کے ساتھ اس کے تمام جذبات کا عکس بھی تھا۔
''میں تم سے بہت محبت کرنے لگا ہوں اس لیے تمہارے لیے میں خود کو بدل دوں گا۔'' وہ قدرے توقف کے بعد پھر بولا۔ ''لیکن جب تمہارے دل میں میرے لیے محبت کے جذبات ابھریں تو میرا ہاتھ ضرور تھامنا......'' وہ کہہ کر زن سے گاڑی بھگا لے گیا جبکہ وہ وہیں گیٹ پر کھڑی اس کی باتوں میں بہہ کر نہ جانے کہاں پہنچ گئی تھی۔

☆☆☆

شام کے سائے جب گہرے ہونے لگے تو اس نے گاڑی گھر کی طرف موڑ دی تھی کہ اچانک سامنے سے آتی لڑکی کو دیکھ کر گاڑی کے بریک چرچرائے تھے۔ ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی تھی۔
''ارے آپ......!'' فاطر گاڑی کا دروازہ کھول کر روزی کی طرف آیا تھا۔ ''اس وقت کہاں سے آرہی ہیں؟''
''میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ میں اپنے پرسنل میٹر کسی سے شیئر نہیں کرتی۔''
''چلیں ٹھیک ہے لیکن آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑنے کی اجازت تو مل سکتی ہے ناں؟''
''بالکل......'' وہ کندھے اچکا کر ایک ادا سے بولی اور پھر اس کے ساتھ چلتی ہوئی گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔
''ویسے عجیب اتفاق ہے ہماری ملاقات یونہی راستے میں ہی ہوئی ہے اور ہم ابھی تک ایک دوسرے سے ٹھیک سے آشنا بھی نہیں ہیں۔''
''یہ بیچ کی اجنبیت ہی ہمارے تعلق کے لیے بہت ہے۔ جس دم ہم ایک دوسرے کے بارے میں جان گئے، ہمارے لیے مشکل کھڑی ہو جائے گی۔''
بات کرتے ہوئے روزی کے ہونٹوں پر جاذب مسکراہٹ آ ٹھہری اور فاطر لاکھ چالاک و ہوشیار سہی مگر اس وقت وہ اس کی اور اس کی باتوں کی خوب صورتی کے سحر میں جکڑ گیا تھا۔
''یوں بھی تو ہو سکتا ہے کہ ذرا سی شناسائی ہمیں ایک کر دے۔''
''یہ ہی تو میں نہیں چاہتی۔''
''پھر آپ کیا چاہتی ہیں؟''
''میں......؟'' وہ خواہ مخواہ کھلکھلا کر ہنسی۔ ''میں جو چاہتی ہوں وہ وقت آنے پر بتا دوں گی۔ ابھی آپ فی الحال گاڑی یہیں روک دیں میری منزل آ گئی۔''
''کیا مطلب......؟'' اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی روکنے کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ مسکرا کر اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتر گئی۔
''بس میرا اور آپ کا ساتھ یہیں تک تھا۔''
''اس کا مطلب آج بھی آپ مجھے چائے نہیں پلائیں گی؟'' اس نے اپنے چہرے پر معصومیت طاری کرنے کی کوشش کی تو وہ نفی میں سر ہلا کر ذرا سا پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی تو فاطر مزید کچھ کہے بغیر گاڑی آگے بڑھا گیا لیکن بیک مرر میں اسے دیکھ ضرور رہا تھا جو ایک طرف چل رہی تھی۔ اچانک اس کے دل میں ایک خیال آیا تو گاڑی ریورس کر کے بہت محتاط انداز میں روزی کا پیچھا کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

اس نے ایک جھٹکے سے اس بنگلے کے آگے گاڑی روکی جس میں کچھ دیر پہلے روزی داخل ہوئی تھی اس نے گاڑی میں بیٹھے، بیٹھے ہی اس بنگلے کا پورا جائزہ لے لیا تھا بہت پُراسرار خاموشی اس بنگلے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ گاڑی سے اتر کر گیٹ کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور اندر کا جائزہ لینے کی کوشش کرنے لگا کہ اچانک ہی چوکیدار نے متصل چھوٹا گیٹ کھول کر غصے سے فاطر کو گھورا تھا۔

''کس سے ملنا ہے؟''

''وہ ابھی جو میڈم اندر گئی ہیں ان سے۔'' اس نے اپنے لہجے کو نارمل رکھنے کی کوشش کی۔

''اوہ......روزی میڈم سے۔'' چوکیدار نے کہنے کے ساتھ اسے اندر آنے کا راستہ دیا تو وہ لمحے کی تاخیر کے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ پورچ کے ساتھ بڑا سا لان ہونے کے ساتھ ایک چھوٹا سا حوض بھی لائٹوں سے جھلملا رہا تھا جس میں چھوٹے چھوٹے پھوؤں کے ساتھ مختلف مچھلیاں بھی تیر رہی تھیں فاطر نے ایک نظر انہیں دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر گھر کے داخلی دروازے کی جانب بڑھ گیا جو ادھ کھلا سا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا تو سامنے وسیع لابی کے دائیں طرف والے کمرے پر نظر پڑی جو یقیناً اس گھر کا ڈرائنگ روم ہی ہوگا جو جدید طرز کے فرنیچر سے آراستہ ہونے کے ساتھ، ساتھ مختلف ممالک سے خریدے گئے ڈیکوریشن پیس سے بھی سجایا گیا تھا۔ اس کی قیمتی سجاوٹ وہ وہیں کھڑے، کھڑے دیکھ سکتا تھا۔ ابھی وہ سب طرف کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ ایک ملازم نے روزی کے کمرے کی جانب اس کی رہنمائی کی اور وہ خود باہر چلا گیا۔ فاطر نے سر ہلا کر گویا شکریہ ادا کیا اور آگے بڑھ گیا۔ اس نے بہت محتاط انداز میں دروازے کا ہینڈل گھما کر دروازہ اندر کی طرف دھکیلا تو وہ بغیر کسی آواز کے کھلتا چلا گیا اس نے اندر داخل ہو کر دروازہ لاک کر دیا۔ اٹیچ باتھ سے مسلسل پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی جس سے ظاہر تھا کہ اس وقت کوئی اندر موجود ہے۔ یقیناً روزی ہی ہوگی وہ سوچ کر کمرے کی ایک، ایک چیز کو غور سے دیکھنے لگا اس نے الماری بھی کھول کر اس میں موجود ہر چیز کا جائزہ لیا۔ وہ اس وقت ایک عام شخص نہیں بلکہ ایک پولیس آفیسر زیادہ لگ رہا تھا پھر جیسے ہی واش روم سے پانی گرنے کی آواز بند ہوئی تو وہ بیڈ پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔

''اوہ تو تم یہاں تک پہنچ گئے؟'' کچھ دیر بعد واش روم کا دروازہ کھلا وہ چوکنا ہوا۔ روزی نائٹ سوٹ پہنے اور گیلے بال بکھرائے باہر آئی اور اسے دیکھ کر مسکرا کر بولی۔ اس نے حیرت کا چنداں اظہار نہیں کیا تھا۔

''یہاں مجھے آنا ہی تھا مس......''

''روزی......'' وہ فوراً بولی۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم میرے بارے میں بہت کچھ جان گئے ہو گے لیکن تمہارے لیے یہ ہی بہت ہے کہ مجھے سب روزی کہتے ہیں۔''

''تو پھر یہ تانیہ کون ہے، جو فرم میں جاب کرتی ہے؟''

''اس سے تمہارا کوئی مطلب نہیں۔'' وہ تقریباً چیخی تھی اور فاطر گہری مسکراہٹ کے ساتھ اس کے قریب آیا تھا۔

''میرا جو مطلب ہے وہ پورا کر دو۔ تمہاری قسم یہاں سے چلا جاؤں گا۔'' فاطر نے اس کے گیلے بالوں کی ایک لٹ اپنی شہادت کی انگلی پر لپیٹ کر ہلکا سا جھٹکا دیا تو وہ ناگواری سے اسے دیکھنے لگی۔

''چائے یہیں پیو گے یا ڈرائنگ روم میں؟''

''جیسا تم کہو ڈیئر......'' فاطر عجیب انداز میں مسکرا کر بولا۔ روزی ایک جھٹکے سے بالوں کو لہرا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

پانی کی چھینٹیں اس کے کپڑوں پر پڑی تھیں......وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اس کے پیچھے، پیچھے چل دیا تھا۔

☆☆☆

ہر انسان محبت کا بھوکا ہے، یہ چیز ہی ایسی ہے بس دو بول میں خود بخود انسان اس میں بندھ جاتا ہے اور دنیا کی خوب صورتی کو محسوس کرنے لگتا ہے یہ بھول کر کہ محبت خواب کا نام ہے اس کے بعد جب آنکھ کھلے گی تو دنیا تہس نہس ہو جائے گی اور ہاتھ میں کچھ نہیں رہ جائے گا سوائے تلخ یادوں کے جو ہر پل اذیت دیتی زندگی کو اختتام کی طرف لے جاتی ہیں۔

وہ بھی اس وقت سب کچھ بھول کر فاطر کو سوچ رہی تھی اس کی تمام باتیں ایک طرف لیکن صبح محبت کے الفاظ تمام جذبات لیے اس کے دل کے دروازے پر دستک دے رہے تھے اور وہ بے حس نہیں تھی جو منہ موڑ لیتی بلکہ اس نے دل کے تمام دروازے کھول کر اسے

خوش آمدید کہا تھا۔
وہ یہ سوچ کر خوش تھی کہ فاطر اس کی محبت میں خود کو بدل رہا ہے مگر حقیقت سے انجان کہ وہ اب بھی صرف اسے حاصل کرنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لے رہا تھا جبکہ وہ حادثے اسے اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔ فاطر تو نہیں البتہ تشمیرہ ان حادثوں کے زیر اثر تھی اور اس کی وجہ اس کا نرم اور حساس دل تھا جو کسی کو بھی کبھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔
تایا جی بھی اس کی بدلی ہوئی کیفیت نوٹ کر رہے تھے جو بات بے بات کھلکھلا کر ہنس رہی تھی انہیں یاد نہیں تھا کہ کب انہوں نے اسے یوں ہنستے ہوئے دیکھا تھا انہیں تعجب ہو رہا تھا۔
''تشمیرہ بیٹا...... میں اسٹڈی روم میں ہوں، چائے کی طلب ہو رہی ہے اگر اچھی سی مل جائے۔'' وہ رات کے کھانے کے بعد ڈائننگ ٹیبل سے اٹھتے ہوئے بولے تو تشمیرہ سر ہلا کر رہ گئی اور پھر برتن سمیٹ کر کچن میں رکھتے ہوئے ساتھ ہی اس نے چائے کا پانی بھی چولھے پر رکھ دیا تھا پھر برتن دھونے کے ساتھ وہ... غیر ارادی طور پر فاطر کی آہٹ کی بھی منتظر رہی تھی لیکن نہ جانے وہ آج کہاں رہ گیا تھا جو ابھی کھانے پر بھی موجود نہیں تھا جبکہ اس کے ابا جی تو صبح ہی واپس چلے گئے تھے۔
وہ چائے بنا کر تایا جی کے اسٹڈی روم میں ہی آ گئی۔ تایا جی کتاب پڑھنے میں مصروف تھے اس کی آمد محسوس کرتے ہی انہوں نے کتاب ٹیبل پر رکھ دی اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بغور اسے دیکھنے لگے۔ وہ ٹیبل پر چائے رکھ کر ان کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔
''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں تایا جی؟''
''یہ دیکھ رہا ہوں کہ وقت نے کتنی تیزی سے سفر کیا ہے، کل کی بات لگتی ہے جب گلابی نرم گرم کمبل میں لپٹی تم میری گود میں آئی تھیں۔ اور آج وقت تمہارے دلہن بننے کا آ پہنچا ہے۔'' تایا جی کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تو وہ تشمیرہ نے ان کے ہاتھ تھام لیے وہ دوزانو ان کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔
''میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔''
''اوں ہوں...... ایسے نہیں کہتے۔ رخصت تو ہر لڑکی کو ہونا پڑتا ہے۔'' وہ ذرا سا مسکرائے۔ ''اب بتاؤ فاطر کے حق میں ہاں کر دوں؟'' وہ کچھ نہیں بولی خاموشی سے اپنے لب دانتوں سے کاٹنے لگی۔
''کیا بات ہے، کہیں اور......''
''نہیں تایا جی......'' وہ تڑپ کر فوراً بولی...... ''میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی آپ جہاں کہیں گے، جس سے کہیں گے میرے لیے وہ ہی اہم ہوگا۔'' اس کی پلکوں پر آنسو کسی ستارے کی طرح جگمگانے لگے تو تایا جی نے محبت سے اس کی پیشانی چوم لی۔
''مجھے یقین ہے تم پر...... بس کچھ وقت نے اور کچھ لوگوں نے غلط بیانی سے مجھے بہکا دیا تھا اور میں بھی عقل کا اندھا ان کی باتوں پر ایمان لے آیا یہ بھی نہیں سوچا کہ سامنے میرا اپنا خون ہے۔'' وہ خاموش ہو کر شاید اپنے آنسوؤں پر بند باندھ رہے تھے۔
''پچھلی باتیں بھول جائیں تایا جی...... اب تو سب ٹھیک ہو گیا ہے۔''
''نہیں بیٹا ابھی کچھ ٹھیک نہیں ہوا۔'' وہ نہ جانے کس سوچ کے تحت کہہ رہے تھے وہ سمجھ نہیں سکی اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتی، وہ چائے کا آخری گھونٹ بھر کر اٹھ کھڑے ہوئے۔
''چلو رات بہت ہو گئی ہے اب سو جاؤ......'' وہ کچھ نہیں بولی بلکہ اثبات میں سر ہلا کر ان سے پہلے ہی کمرے سے نکل گئی تھی۔
سیڑھیاں چڑھنے سے پہلے اس نے ایک نظر فاطر کے کمرے کی طرف دیکھا تھا اور کمرے کی جلتی لائٹ سے اس بات کا یقین کر کے کہ وہ گھر آ گیا ہے دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔
(باقی آئندہ)

"کیا ہوا بہت تھک گئی ہو کیا؟" عائشہ نے مجھے یوں آتے ہی صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے دیکھا تو قریب آ کر پوچھا۔

"ہاں شاید۔" میں نے مزید ایزی ہو کر لیٹتے ہی آنکھیں موند لیں۔

"تم نرالی ہو جو شادی اٹینڈ کرنے جاتی ہو تو دو گھنٹوں میں بجائے انجوائے کرنے کے تھک کر واپس آتی ہو۔ سوفی....." اس نے تعجب کرتے ہوئے کہا۔

# یہ میرے دکھ عجیب سے

طاہرہ اشفاق



''انجوائے کرنے کا مادہ شاید میرے اندر ہے ہی نہیں۔'' میں اپنی بے بسی پر خود ہی شرمندہ ہوگئی۔

''چھوڑو آپی، تمہاری یہ نرالی منطق میری سمجھ سے باہر ہے، دو گھنٹے کی تقریب میں بندہ ہنس کھیل کر انجوائے کرتا ہے، چل کرتا ہے، ایک آپ ہیں کہ خوشی کے موقع پر بھی کوئی دکھ ڈھونڈ کے لے آتی ہیں۔'' وہ میری چھوٹی بہن تھی اور میری اس عادت سے اچھی طرح واقف بھی تھی۔ جبھی قیاس کرلیا۔ ابھی وہ اور بھی کچھ کہتی مگر میرے موبائل کی بپ نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا جبکہ عائشہ کچھ یاد آنے پر کچن کی طرف بھاگ گئی۔ شاید چولھے پہ دودھ چڑھا کے آئی تھی۔

میں آنکھیں موندے لیٹی تھی کہ فون کی گھنٹی پر چونک اٹھی۔ موبائل فون پر میری دوست سعدیہ کا نمبر جگمگا رہا تھا۔

''کیسی ہو، اتنے دنوں سے کال کیوں نہیں کی۔'' یس کا نشان پنچ کرتے ہی اس کی آواز ابھری۔ اسے ہمیشہ یہی شکوہ رہتا تھا حالانکہ اکثر کال میں ہی کرتی تھی۔

'' رونے لگا ہوں پہلے سے زیادہ
پہلے سے زیادہ
خود پہ ہنسنے لگا ہوں......''

میں یہی کہہ سکی۔

میرے پاس اس سے بہتر اور جامع جواب شاید اور کوئی نہیں تھا۔

جبکہ دوسری طرف سعدیہ کو گویا ہزار واٹ سے زیادہ کا کرنٹ لگا تھا۔

''واٹ......!'' وہ بہت زور سے چیخی تھی۔

''مر ہی جاؤ تم......؟'' اس کا آخری جملہ یہی ہوتا تھا اور کچھ دنوں کی ناراضی کا اظہار بھی......

مگر تین دن بعد سب کچھ بھلائے وہ میرا دکھ سننے اور چننے چلی آئی تھی۔

''کیا ہوا تھا وہاں؟ تم نے پھر کچھ اپنی طبیعت کے برعکس دیکھ لیا ہوگا۔ ایک تو تم سا نرالا کوئی نہیں ہوگا دنیا میں۔'' ٹھنڈی آہ بھر کر اس نے سامنے رکھے پانی کے جگ سے گلاس بھر لیا اور گھونٹ، گھونٹ حلق سے اتارنے لگی۔

''چلو اب شروع ہو جاؤ۔'' وہ گویا ہمہ تن گوش تھی۔

میرے شوہر کی کسی کزن کی شادی تھی۔ شادی سے پہلے اپنے خاندان کے تقریباً سبھی گھرانوں نے لڑکے، لڑکی اور ان کے والدین کے لیے سوٹ اور دیگر تحفے تحائف لیے تھے اور سبھی کا مشترکہ پلان تھا کہ بری آنے سے دو دن پہلے سب اکٹھے ہوکر گاجوں باجوں کے ساتھ اپنے تحفے تحائف لے جائیں گے۔ سو ہمارے گھر سے لازماً مجھے ہی جانا تھا۔ میں نے بہت انکار کیا مگر امی نے میری ایک نہیں سنی لازماً مجھے جانا پڑا۔

وہاں پہلے تو اتنا رش دیکھ کر ہی مجھے کوفت ہونے لگی۔ اوپر سے فل والیوم میں دونوں طرف کے شامیانوں سے فل ڈھولک، ٹیپ ڈیک اور باجوں کی آواز سے مجھے اور ہی وحشت ہونے لگی۔ سب گروپس نے اپنے ساتھ علیحدہ ،علیحدہ ڈومنوں یعنی گانے والیوں کا بندوبست کر رکھا تھا۔ اُدھر مردانہ شامیانے میں فائرنگ پٹاخوں کے شور، اچھل کود، گانا بجانا اور ہونٹنگ میرے سر میں تو عجیب سا درد شروع ہوگیا۔ لیکن مجبور تھی کہ اتنی دور سے تنہا واپس آ بھی نہیں سکتی تھی۔ سو مجبوراً بیٹھی رہی۔

ہر گروپ کی لڑکیاں اپنے ڈھولک بجانے والی کی تھاپ پر رقص کرتی جاتیں اور ان کی عزیز رشتے دار عورتیں حسب توفیق ان کے سروں پر دس، بیس، پچاس یا سو کے نوٹ رکھتی جاتیں اور گانے والیوں کی ساتھی لڑکیاں وہ نوٹ اٹھاتی جاتیں۔

مگر ان سب میں دو بڑی ادھیڑ عمر کی ڈومنوں کو دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے عجیب سے دکھ نے آگھیرا۔

شاید ان کی آخری عمر اور پیٹ کی بھوک کے لیے ایسی جدوجہد نے مجھے غم زدہ کر دیا تھا۔ کتنی مشکل سے وہ پورے ناتواں جسم کی طاقت صرف کر کے ڈھولک پہ تھاپ لگاتی تھیں اور ان کے جھریوں زدہ چہروں پر اس مشقت کی تھکن کے آثار صاف نظر آرہے تھے۔

دوسری لڑکیوں کی طرح نہ تو ان کی آواز سُریلی تھی نہ ان کے بھاگتے' دوڑتے یا ڈھولک کی تھاپ میں پھرتی تھی۔

دس، بیس کے کچھ نوٹوں کے لیے اس آخری عمر میں بھی انہیں کتنی مشقت اور ذلت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

پتا نہیں یہ پیٹ کی آگ مرتے دم تک انسان کے وجود سے کیوں چمٹی رہتی ہے۔ یہ انسان کے بڑھاپے' ...۔ کمزوری اور نقاہت کا لحاظ کیوں نہیں کرتی۔

بہت سے نمکین آنسو ان جھریوں زدہ چہروں کو دیکھ، دیکھ کر اندر ہی اندر میرے دل میں گر رہے تھے مگر ظاہراً کوئی تماشا نہ کھڑا ہو جائے سوچ کر میں خود پر ضبط کیے ہوئے تھی۔

''سعدیہ...ہم لوگوں میں اتنا ظرف کیوں نہیں ہوتا کہ ہم بغیر کچھ وصول کیے بھی کسی نادار، مسکین، غریب یا ایسے مجبور کو کچھ عنایت کر دیں جو اتنی مشقت اور ذلت اٹھائے بغیر بھی اپنا پیٹ بھر سکے۔ ہمیں خوشیوں کے موقعوں پر صرف اپنی خوشیاں ہی کیوں نظر آتی ہیں، آس پاس کئی ایسے غم زدہ چہرے کیوں نظر نہیں آتے۔'' شاید اب میں سعدیہ کے بجائے ساری دنیا سے مخاطب تھی۔

''مگر مجھے اچھی طرح پتا ہے سعدیہ کہ تم سمیت پوری دنیا اس سوال کو ٹال جائے گی، آئیں، بائیں' شائیں کر کے خود کو کسی اور طرف لگا دے گی یا کم از کم اتنا تو ضرور ہی کہے گی...... ''یہ تو پیشہ ور لوگ ہیں ان کا تو کام ہی یہی ہے۔''

سعدیہ .... چپ سادھے پہلے میری بات سنتی رہی اور بات ختم ہونے پر میری کمر پر تھپکی دے کر مجھے خود سے لگا کر میرے دکھ کو کم کرنے کی کوشش میں صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

''یار تم کچھ حد سے زیادہ ہی حساس ہو......وہ تو تھی ہی گانے والیاں......اب ہر ایک کے دکھ ہم اکیلے تو نہیں بانٹ سکتے ناں۔'' اور میں ایک سرد آہ بھر کے رہ گئی تھی کہ یہ میرا دکھ تھا اور مجھے اکیلے ہی جھیلنا تھا۔

## نئے سال کی آمد پر

پیارے پڑھنے والو آپ کو نیا سال 2017 مبارک ہو۔

خدا کرے یہ پچھلے سال سے بہتر ہو۔

ہم سب کو خوشیاں دے اور بلاؤں سے دور رکھے۔

خدا کرے ہمارے حالات بدلیں۔

ہمیں مشکلات سے نجات ملے۔

بجلی کی گیس کی لوڈشیڈنگ سے نجات ملے۔

بھوک، افلاس، مہنگائی اور بیماری سے رہائی ملے۔

خدا کرے ہماری حکومتوں اور حکمرانوں کے فاصلے عوام سے کم ہوں۔

خدا کرے ہم جو چاند تک پہنچ گئے ہیں پڑوسی کے دل تک بھی پہنچ سکیں۔

خدا کرے حکمرانوں کو عام آدمی کے دکھ درد کا احساس ہو۔

خدا کرے دہشت گردی، لاقانونیت اور ظلم وزیادتی ہمارا پیچھا چھوڑ دیں۔

خدا کرے پاکستان کا نظام بدل جائے اور جبر و استحصال سے عام آدمی کو چھٹکارا مل جائے۔

خدا کرے ہماری عدالتوں سے انصاف سستا ملے اور جلد جو غریب اور محروم کی دسترس میں ہو۔

خدا کرے ہمارے سرکاری دفتروں سے رشوت اور سفارش کی لعنتیں ختم ہو جائیں۔

بے شک یہ ہر محب وطن پاکستانی کے دل سے نکلی دعائیں ہیں جو اس سال یقیناً پوری ہوں گی۔

از: مہ وش جواد......لیہ

# ......یہ کہاں آ بچیں کہ دل ہے

رفعت سراج

بنی اسرائیل کا سونے کا بچھڑا آج ڈالر، پونڈ، یورو، درہم و دینار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔
دل جذبات کا استعارہ ہے مگر اب وہ دل کہاں . . .
سونے کے بچھڑے میں دل بھی سونے کا ہے . . .
دل کو رو یا جاتا ہے، جگر کو پیٹا جاتا ہے . . .
کبھی ناقدروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے، یاریاں ٹوٹ جاتی ہیں۔
الزام تراشیوں کا ایک طوفان بدتمیزی برپا ہو جاتا ہے۔
دل سے دل کو راہ بھی ہوتی ہے . . .
آج کا انسان بہ راہ سٹیلائٹ کے ذریعے search کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
دل اور سونے کا بچھڑا . . .
عبادات، معاملات . . .
جنتِ گم گشتہ کے بے دخل باسیوں کی ازلی کہانی . . .

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

قسط 6

بچے کی دعا بہت طویل تھی، آنسو لگاتار...... پرنس اسے اس کیفیت میں چھوڑ کر مسجد سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ ایک تڑپا دینے والا تجسس لاحق ہو چکا تھا۔ رو، رو کر دعا مانگتا معصوم بچہ...... دنیا کے نامور مصوروں کے شاہکاروں کا منہ چڑا رہا تھا۔

آہستہ، آہستہ آخری نمازی بھی مسجد سے رخصت ہوا...... امام صاحب اپنے حجرے میں جا چکے تھے اب پرنس اور اس بچے کے علاوہ وہاں تیسرا صرف اللہ تھا۔

بچہ گھٹی، گھٹی سسکیاں لے رہا تھا...... آخر وہ کیا دعا تھی جو ختم ہو کر نہیں دے رہی تھی۔ معرفت کی لطافتیں اس معصوم سے وجود پر ہی کیوں نثار ہو رہی تھیں...... بلاشبہ وہ جس ہستی کے ساتھ پوری یکسوئی، یقین و مان کے ساتھ رابطے میں تھا معرفت انہی قیمتی لمحات کا دمکتا ہوا عنوان ہے۔

بڑی بے اختیاری کیفیت میں پرنس نے بچے کے سر پر نرمی سے ہاتھ پھیرا ...... بچہ جیسے کرنٹ کھا کر پرے ہوا تھا۔

اس نے آنسوؤں سے لبریز نگاہوں سے پرنس کی طرف دیکھا۔



پرنس مسکرا دیا اور ہاتھ بڑھا کر بچے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا...... تھوڑا سا آگے کھسکا اور بچے کے ہاتھ کی پشت پر وہ بوسہ دیا جس میں لازوال آفاقی محبت کا ہوش رُبا پیغام تھا۔

''اب چلیں؟ آپ کو پتا ہے آپ کی دعا اللہ تعالیٰ نے سن لی...... قبول بھی ہوگئی...... اب اللہ تعالیٰ فرشتوں کو آرڈر کریں گے کہ جو کچھ اس پیارے سے بچے نے مانگا ہے اس کے انتظامات میں مصروف ہو جاؤ...... اگر دیر کی تو سزا ملے گی۔''

پرنس اس سے یوں ہمکلام ہوا گویا روز کی بات چیت رہتی تھی۔

بچہ اب شرمسار سا مگر ٹکر ٹکر پرنس کی طرف دیکھ رہا تھا...... لب بستہ تھا...... قوتِ گویائی وقتی طور پر سلب ہوگئی تھی۔

پرنس براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

فطرت بغیر رکاوٹ کے اس سے ہمکلام تھی۔ بچہ اب گھبرا کر آنسو پونچھتے ہوئے اٹھنے کے لیے پر تول رہا تھا۔

پرنس اس سے پہلے اٹھ کھڑا ہوا...... بچہ اٹھتے ہوئے ہچکچا رہا تھا...... شاید وہ چاہتا تھا پرنس اس سے پہلے مسجد سے چلا جائے۔

مگر پرنس نے دوستانہ انداز میں اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا...... خلوص کی قوت نے بچے کو زیر کر کے رکھ دیا...... اس نے پرنس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ پرنس نے ذرا سا زور دے کر اسے اٹھا کر کھڑا کیا...... باہر آکر دونوں نے اپنے، اپنے سلیپرز پاؤں میں ڈالے...... پرنس کے ہاتھ کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ بچے نے اپنی استطاعت کے مطابق زور لگا کر ہاتھ چھڑانے کی سعی ضرور کی تھی۔

مسجد سے باہر آکر اس نے بچے کی طرف بہت پیار سے دیکھا۔

''اتنے پیارے سے بچے ہو، آپ کا ایک پیارا سا نام بھی ہوگا؟'' پرنس نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کمالِ اپنائیت سے اس کا نام جاننا چاہا۔

''ثوبان......'' بچے نے جھجکتے ہوئے بالآخر نام بتا دیا۔

''او رگڈ...... ''س'' سے سوبان......؟'' پرنس کی اردو اتنی اچھی نہیں تھی اس لیے اس نے لگے ہاتھ معلومات میں اضافہ کرنے کی بھی کوشش کی۔

''نہیں...... وہ جو پوائنٹ والا ''ث'' ہوتا ہے۔'' بچے کی آواز بہت خوب صورت اور واضح تھی...... پرنس نثار ہی ہوگیا۔

بچہ ذہین ہے اسے سوال کا جواب دینا آتا ہے، بچے کی آنکھوں کے آنسو خشک ہو چکے تھے وہ گاہے گاہے، چوری، چوری پرنس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اسے اب گھر جانے کی جلدی ہو اور وہ بھاگ جانا چاہتا ہو۔

''آپ کا گھر یہاں سے قریب ہے؟''

بچے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''C-51'' اس نے معصومیت سے گھر کا نمبر تک بتا دیا۔

''اوہ......!'' پرنس نے اپنے سامنے تعمیرات کے شاہکار بنگلوز پر نگاہ کی...... C-51 تو چار قدم کے فاصلے پر تھا۔

''مغرب کی نماز میں تھوڑا سا وقت رہ گیا ہے، آپ مغرب کی نماز پڑھنے مسجد آئیں گے ناں......؟''

بچے نے بلا توقف انکار میں سر ہلا دیا...... پرنس حیران بہت ہوا......

''کیوں......؟ آپ کا گھر تو مسجد سے بہت قریب ہے۔ آپ تو سب نمازیں مسجد میں پڑھ سکتے ہیں۔'' پرنس الجھن میں مبتلا ہوا...... بچے کا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

''ماما آنے نہیں دیتیں، وہ کہتی ہیں گھر میں پڑھو جیسے میں پڑھتی ہوں۔'' معصوم سے بچے نے کمالِ سادگی سے جواب دیا تھا۔





''تو آج آپ ماما سے چھپ کر مسجد آئے تھے؟'' پرنس نے سوچتی، جانچتی نظروں سے بچے کی طرف دیکھا...... اب وہ اس کے لیے قطعی انجان نہیں تھا اس پر نگاہ ڈالتے ہوئے اس کا نام ثوبان ذہن میں جگہ بنالیتا تھا۔

بچے نے بلا ردوکد اثبات میں سر ہلا کر سچ کہہ دیا۔

اب پرنس درحقیقت بہت پریشان ہوا تھا...... وہ کب سے اس کو باتوں میں لگائے ہوئے ہے اس کی ماں پریشان ہورہی ہوگی...... جبکہ یہ اسے بتا کر بھی نہیں آیا۔

بچہ مسجد کے لیے بھی allowed نہیں ہے تو اس کا سیدھا سا مطلب ہے آج کل کے حالات میں کون ماں سات آٹھ سال کے بچے کو اکیلا گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دے سکتی ہے۔

''اوہ سوری آپ کی ماما تو پریشان ہورہی ہوں گی، چلیں میں آپ کو گیٹ تک چھوڑ دیتا ہوں، آپ کے سرونٹ کو بتا دیتا ہوں کہ آپ میری وجہ سے لیٹ ہوئے ہو۔'' پرنس اب سب کچھ بھلا کر ایک پریشان ماں کے ذہن میں اترا ہوا تھا۔

''ماما گھر میں نہیں ہیں۔'' اتنی دیر میں پہلی بار بچے نے مکمل جملہ ادا کیا۔

''اوہ گڈ گاڈ......'' پرنس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔ وہ بچے کے ساتھ بڑھتے ہوئے تقریباً C.51 کے

مین گیٹ کے سامنے پہنچ چکا تھا۔
ڈارک گرے اور بلیو کا زبردست اسٹون ورک کیا گیا تھا۔ وسیع و عریض چوبی گیٹ جس پر بھاری بھرکم پیتل کا کام تھا۔ گیٹ کے دائیں جانب نیم پلیٹ روشن تھی۔ پرنس نے گھر کے مالک کا نام بہت توجہ سے دیکھا...... بہت زبردست عالیشان گھر کو کسی خاتون "دل آرام" سے زینت دی گئی تھی۔ "کاشانۂ دل آرام" ڈاکٹر ازمیر حسن۔
بچے نے خود کو گھر کے سامنے پا کر بڑی بے ساختگی و بے تکلفی سے انٹر کام کا بٹن پش کر دیا تھا اور سر اٹھا کر پرنس کی طرف دیکھا...... پرنس کو یوں لگا جیسے وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔
اس سے پیشتر کہ وہ کچھ پوچھتا...... وسیع گیٹ کا بغلی دروازہ کھل گیا تھا۔ ایک چودہ پندرہ سال کا پختون بیک گراؤنڈ کا حامل سرخ و سفید ملازم ۔لڑکا نمودار ہوا...... اس نے بڑی حیرت سے پرنس کی طرف دیکھنے کے بعد سوالیہ نظروں سے ثوبان کی طرف دیکھا تھا۔
"ابھی آپ اس کو کدھر سے لاتا اے سر؟" ملازم نے فکرمند ہو کر پوچھا تھا۔
"ہم مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے۔ میرا گھر یہاں بالکل پاس ہی ہے، بس اس سے باتیں کرتے کرتے یہاں تک آ گیا۔"
"اوہ...... تم مسجد میں تھا...... ام سمجھا تم سوتا اے...... بابا لوگ! آپ کا ماما ام کو نوکری سے نکالے گا...... تم اِدھر کس کو بتایا؟" ثوبان ملازم کے سوالات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا تھا۔ ذرا سی راہ پا کر اندر دوڑ گیا۔
"صاحب آپ کا بوت مہربانی...... یہ چھوٹا بچہ ہے، مالکن اس کو گھر سے اکیلا جانے نہیں دیتا...... اس کو پتا چلے گا بوت غصہ کرے گا۔" ملازم لڑکا بہت سہمے، سہمے اور پریشان انداز میں کہہ رہا تھا۔ یعنی اس کی سمجھ سے باہر تھا کہ آخر یہ کس طرح گھر سے باہر چلا گیا۔
"ہاں...... ثوبان نے مجھے بتایا ہے کہ اس کی ماما گھر پر نہیں ہیں۔" پرنس نے اپنی ایک بے ترتیب منتشر سوچ کے درمیان جواب دینے کی راہ نکالی۔
ثوبان شاید شرمندہ تھا اس لیے اس نے قطعاً خدا حافظ کہنے کی زحمت بھی نہیں کی اور سیدھا اندر دوڑ گیا۔
"اس کا ماما...... دوسرا شہر گیا ہے، پتا نہیں کب واپسی آتا ہے۔" بے وقوف سا سیدھا سادہ ملازم ہونقوں کے انداز میں خود کلامی کر رہا تھا۔
"دوسرا شہر......؟" پرنس چونک پڑا...... مگر سامنے گیٹ بند ہو چکا تھا۔ مغرب کی اذانیں قریب سے سنائی دینے لگیں۔ اس کے وہاں سے ہٹنے سے پہلے غالباً اسی ملازم لڑکے نے گھر کی لائٹس روشن کر دی تھیں۔
عالیشان کوٹھی روشنیوں میں نہا گئی...... اگرچہ یہ کوٹھی پرنس کے "خانۂ آباد" کے ٹکر کی تو نہیں تھی مگر نوتعمیر شدہ اور الٹرا ماڈرن تھی اور فنِ تعمیرات کے موجودہ رجحانات کی عکاس تھی۔
اس نے نیم پلیٹ پر الوداعی نظر ڈالی اور اللہ کی ایک لاجواب و حسین تخلیق پر غور کرتا ہوا پھر مسجد کی طرف بڑھ گیا۔
"وہ ماں جو گھر میں نماز پڑھنے کی تاکید کرتی ہے دوسرے شہر میں ہے...... شاید وہ مسجد میں ماں کو یاد کر کے رو رہا تھا۔" کئی سوالات کے کنکر خیال کی جھیل میں گرے مگر سوائے دائروں کے کچھ ہاتھ نہ لگا۔

☆☆☆

رات کے ساڑھے آٹھ بجے کے لگ بھگ سفینہ گھر پہنچ گئی تھی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اسے غیر معمولی خاموشی کا ادراک ہوا۔
ملازم لڑکا بشیر کاندھے پر ڈسٹر رکھے اِدھر اُدھر جاتا نظر آیا۔ کچن میں بھی مکمل خاموشی تھی برتنوں کی معمولی سی کھٹر پٹر بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔

سفینہ نے زینہ چڑھتے لڑکے کو آواز دی جس کی نظر ابھی تک سفینہ پر نہیں پڑی تھی۔

''بشیر......!''

بشیر یوں چونکا گویا جنگل میں عین پشت سے شیر کی دہاڑ سنی ہو۔ پاؤں جہاں تھے وہیں رک گئے ایک اوپر ایک نیچے......

''جلدی سے ایک گلاس پانی لاؤ۔'' سفینہ نے بیگ کا ہینڈل پریس کرتے ہوئے کہا اور بیگ ایک طرف ٹکا کر مخملی صوفے میں دھنس گئی۔

بشیر جو سفینہ کو اچانک سر پر دیکھ کر بری طرح بوکھلا گیا تھا، پانی لینے سرپٹ دوڑ گیا۔ سفینہ نے نظریں گھما کر وسیع و عریض لاؤنج کا جائزہ لیا اور پھر جیسے تھکے، تھکے انداز میں آنکھیں موند لیں۔

''بی بی جی پانی......'' چند لمحوں بعد بشیر اس کے بالکل قریب کھڑا تھا۔

سفینہ نے بلوریں گلاس اس کے ہاتھ سے لے لیا...... قدرے پرسکون انداز میں پانی پیا پھر گلاس واپس کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''اماں تو گھر پر ہی ہیں ناں......؟''

''جی...... بیگم صاحب اور چھوٹی بی بی تو شام کو ہی آ گئی تھیں۔'' بشیر نے مؤدبانہ جواب دیا۔

''چھوٹی بی بی...... یعنی زارا!'' اس نے اماں کا پوچھا تھا۔ بشیر، زارا کا بھی بتا رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آئی۔

''کھانا کھا لیا سب لوگوں نے......؟'' سفینہ نے بڑے سے قطر کے گھڑیال کی طرف دیکھا جس کے ہندسے اور سوئیاں اتنے بڑے، بڑے تھے کہ دور کی نظر کی عینک لگانے والے کو بغیر عینک کے نظر آ سکتے تھے۔

''نہیں...... بیگم صاحبہ کی طبیعت ٹھیک نہیں...... چھوٹی بی بی نے بولا تھا وہ اپنے کمرے میں ہی منگالیں گی۔ اس لیے خانساماں اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔'' بشیر کو مکمل معلومات تھیں، بڑا مفصل جواب دیا تھا۔

''اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں۔''

سارا سرپرائز دھرے کا دھرا رہ گیا۔

بشیر نے اس کی خود کلامی کو قابلِ اعتنا نہ جانا۔ پلٹ کر چلتا بنا۔

''زارا کمرے میں ہے...... یہ اس کے سونے کا ٹائم تو نہیں ہے۔ لگی ہوگی فیس بک پر۔'' اس نے اٹھتے ہوئے سوچا۔

آہستہ، آہستہ چلتی زینے کی طرف بڑھی۔ فرسٹ فلور پر تینوں کے بیڈ روم تھے اور ایک گیسٹ روم...... نیچے لاؤنج، ڈرائنگ، ڈائننگ کے علاوہ ایک گیسٹ روم بھی تھا۔ جس میں آئے دن تاجور کا کوئی نہ کوئی مہمان آ کر قیام کیا کرتا تھا۔

سفینہ اوپر آئی تو سب سے پہلے تاجور کے بیڈ روم کے بند دروازے کی طرف دیکھا پھر چند قدم آگے بڑھ کر ناک کی سیدھ میں زارا کے بیڈ روم کی طرف بڑھی۔

ہلکی سی دستک دی...... اور ردِ عمل کا انتظار کیا...... خاموشی پا کر دوبارہ دستک دی۔ اس مرتبہ ذرا زیادہ آواز پیدا کرنے کی کوشش کی۔

''بھئی کہہ دیا تھا ناں مجھے کھانا کھانا ہوگا تو بتا دوں گی...... کیا مسئلہ ہے؟'' زارا کی جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی اور چند لمحوں کے اندر دھاڑ سے دروازہ بھی کھل گیا۔ سفینہ کو اچانک سامنے پا کر اسے ضرور چونکنا چاہیے تھا مگر وہ تو ایک دم بدحواس ہو گئی۔

''تت...... تت...... تم سفینہ...... اوہ...... گاڈ......!'' زارا پہلے گڑبڑائی پھر گلے لگ گئی۔

''تم کب آئیں......؟ اماں کو پتا تھا کہ تم آ رہی ہو......؟'' سفینہ نے اسے کندھوں سے تھام کر غور سے دیکھا اور مسکرا پڑی۔

"کیا بات ہے تم خوش ہونے کے بجائے پریشان سی ہوگئیں..... جیسے میں نے اچانک آکر کوئی چوری پکڑی ہو....."
سفینہ کو زارا کے اندازِ ملاقات میں کچھ غیر معمولی پن محسوس ہوا تھا..... پہلے جیسی بے ساختگی نہیں تھی...... قدرے جھینپی، جھینپی دکھائی دے رہی تھی۔
"میں نے تو سرپرائز دینے کی کوشش کی تھی..... مگر سارے سرپرائز کی ایسی کی تیسی ہوگئی۔" سفینہ اب راہ پا کر اندر داخل ہوئی ایک نگاہ میں کمرے کا جائزہ لیا تاکہ اندازہ لگا سکے کہ زارا کی کیا مصروفیات چل رہی تھیں۔
بیڈ پر اس کا لیپ ٹاپ رکھا ہوا تھا اور آن تھا۔ کتابیں وغیرہ ایک طرف سمٹی ہوئی تھیں۔
"لگتا ہے تمہارا Apple پھر Guava بن گیا ہے..... تب ہی اس لیپ ٹاپ کی اتنی عزت ہورہی ہے۔"
سفینہ ہنستی ہوئی بیڈ پر ڈھے گئی..... زارا بہت گہری نظروں سے سفینہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔
سفینہ نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے اپنی کار کا missing ہونا نوٹ نہیں کیا..... ورنہ سب سے پہلے وہ اسی کا پوچھتی..... سرپرائز نے حواس پر قبضہ کیا ہوا تھا۔
"کتنی دیر ہوئی ہے تمہیں گھر آئے.....؟" زارا نے مجرموں کے انداز میں ڈرتے ڈرتے سوال کیا تھا۔
"بس تھوڑی ہی دیر ہوئی ہے شاید دس پندرہ منٹ..... میں تو سوچ رہی تھی تم اور اماں مجھے نیچے ہی نظر آجاؤ گی..... اور میں ہاؤ کہہ کر ڈرا دوں گی۔ cab سے اتر کر میں بس دوڑتی ہوئی سمجھو اندر آئی تھی..... مگر پھُس سے ساری بیلون کی ہوا نکل گئی۔ ویسے اماں کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں..... ریسٹ کررہی ہیں یا آفس کا کوئی کام.....؟" سفینہ نے دونوں بازو شہتیر کی طرح بیڈ پر پھیلاتے ہوئے فرصت و سکون کے لمحات کو بھرپور انجوائے کرتے ہوئے ماں کی خیر خیریت لی.....
"پتا نہیں..... کافی دیر سے اماں کو نہیں دیکھا....." زارا نے لاشعوری طور پر نظریں چراتے ہوئے جواب دیا تھا۔
"کیا بات ہے.....؟ آج تمہارے پاس کوئی تھرلنگ نیوز کوئی ایڈونچر سنانے کو نہیں ہے بڑی چینج سی فیل ہورہی ہو۔" سفینہ کو زارا کی کم گوئی پر ازحد تعجب ہونے لگا..... کئی ماہ کے یا صرف چند ہفتوں کے وقفے سے ہونے والی ملاقات میں زارا کے پاس اتنی باتیں ہوتی تھیں کہ سفینہ کو اپنی بات کہنے کا موقع بہت مشکل سے مل پاتا تھا۔ جوش و خروش سے.... بھرپور اور ہر پل بے ساختگی کا مظاہرہ کرنے والی زارا آج اپنی طرف سے بات کرنے میں پہل ہی نہیں کررہی تھی۔
"نہیں کوئی خاص نہیں..... بس آج کل میں اپنی اسٹڈی پر focused ہوں۔" زارا نے دھیمی آواز اور جھکی نظروں سے جواب دے کر سفینہ کی حیرت میں مزید اضافہ کردیا۔
"اوہ..... گڈ چینج..... کہیں حیرت سے میں مر ہی نہ جاؤں....." سفینہ اب اٹھتے ہوئے کہہ رہی تھی..... بات کے اختتام پر چھوٹا سا قہقہہ بھی لگایا تھا۔
"انسان میں کبھی، کبھی چینج بھی آجاتا ہے..... اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟" زارا نے چوری، چوری اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔
"چینج اگر اچھا ہو تو پھر کیا بات ہے..... میں بھی ذرا چینج کرلوں..... پھر دیکھتی ہوں اماں کیا کررہی ہیں۔"
"اماں بہت تھکی ہوئی تھیں..... میرا خیال ہے وہ سوگئی ہیں....." زارا نے یوں کہا جیسے وہ لاشعوری طور پر تاجور اور سفینہ کو ملنے سے روک رہی ہو۔
"ہاں دیکھتی ہوں، ابھی تو میں کئی دن ادھر ہی ہوں۔" سفینہ نے باہر نکلتے ہوئے زارا کے بیڈ کے سرہانے لگی پرنس کی شاہکار پینٹنگ کی طرف دیکھا بقول تاجور تالاب میں مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ اور جب زارا خرید کر لائی تھی تو اس نے بھی سوچا تھا کہ کس قدر مہنگی پینٹنگ خرید لائی ہے۔ دو سال کی جمع پونجی ایک پینٹنگ پر لٹا بیٹھی۔

پر اس نے تو زارا سے بھی زیادہ مہنگا سودا کیا ہے...... خود کو اس ذات سے وابستہ کر بیٹھی...... جو شاید غلطی سے بھی اس کے بارے میں نہیں سوچتا ہوگا۔

''وہ ایک نگاہ جو دل پر بجلی بن کر گری تھی...... بے ساختہ اتفاقیہ بھی تو ہوسکتی تھی...... جس کو مفہوم پہناتے ہوئے ہوسکتا ہے وہ خطا کھا گئی ہو۔ جب تک الفاظ زنجیر نہ پہنائیں تو خیال کے ہزار معنی نکالے جاسکتے ہیں...... شاید ایک منفرد جواں، حسین وجیہہ، رئیس مرد کسی کو بھی توجہ کی نظر سے دیکھتا ہوگا تو غیب سے ایسے ہی مضامین اترتے ہوں گے......'' وہ زارا کے بیڈروم سے باہر آتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

اور غیر ارادی طور پر خوش فہمی کے ریشمی تاروں سے بنے جال سے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

ایک منطقی ذہن رکھنے والی عورت خواب و خوش فہمیوں سے بوجھ محسوس کرتی ہے۔

عقل کو پاسبانِ دل کی طرح ساتھ، ساتھ رکھنے والے دل کی آزادی سے لطف اندوز ہونے کے لیے بھی تڑپ اٹھتے ہیں...... کیونکہ یہ عین فطرت ہے...... اور فطرت کے انتہائی سادہ معنی بے ساختگی کے ہیں...... کہ کائنات فطرت کی بے ساختگی کا مظاہرہ ہے...... ہر شے بس ہو جاتی ہے...... جب اس کا ہونا طے ہو جاتا ہے۔ شاید وہ خود کو آسانی سے قائل کر سکتی اگر فنِ مصوری کا یہ شاہکار اس گھر میں آویزاں نہ ہوتا...... یہ تو وہ دستک تھی جو دروازہ کھلنے تک دقفے، وقفے سے ہوتی رہتی ہے۔

ہندسوں، اعداد و شمار کا کھیل سیکھنے کے مراحل سے گزرنے والی ایک اکیس بائیس سال کی لڑکی ابھی زندگی کو اتنا نہیں جانتی تھی جتنا زندگی خود کو سکھانا جانتی ہے......

پرنس کی شخصیت کی ''جاذبیت'' سب کے لیے یکساں تھی...... ایک معصوم بچہ، ایک نوخیز دوشیزہ، ایک منجھی ہوئی عورت، ایک گھاگ بڈھا...... ایک شاطر مفاد پرست، مجرم، معتوب، انا کے ڈنک کا زخمی، حماقتوں کا مارا، اللہ لوک، مخلص، بے غرض، معتمد، معتبر، بے لوث، انسانیت کا شرف اجاگر کرنے کی سعادت حاصل کرنے والا......

پرنس کی ایک ہی حقیقی تصویر تھی...... سب پر اس کا اثر یکساں تھا۔

شخصی مقناطیسیت ایک کلیے کی پابند ہے۔

اور وہ کلیہ ہے صداقت کی راہ...... خواہش اور حق کے درمیان واضح فرق کا شعور

کیونکہ انسان کی خواہش، خواہش ہی ہے...... اپنی خواہش کو حق کی آواز سمجھ کر اصرار کرنے والے اندھیروں میں بھٹکتے ہیں...... جو خود اندھیروں میں بھٹکتا ہو...... اس سے روشنی کیسے پھوٹ سکتی ہے، سفینہ، زارا، ثوبان، ا، ب ج، د...... زید بکر...... اکبری، اصغری...... غریب کی جورو، رئیس کی بیگم، محلے کی نانی، استاد، استاد کا چھوٹا......

زندگی کے اسٹیج پر کھیلتے مختلف کرداروں پر مقناطیسیت کا یکساں اثر ہوتا ہے۔

سرخ رنگ ہے تو سب کو سرخ ہی دکھائی دے گا۔

سنہری ہے تو رنگ کا ادراک رکھنے والا اسے کبھی سبز نہیں کہے گا۔ کشش و مقناطیسیت موجودگی کی بھی محتاج نہیں ہوتی...... لاکھوں، ہزاروں میل کے فاصلے بھی مقناطیسیت کی اثر انگیزی میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتے۔

بادلوں کی گرج سے پہلے روشنی کا لپکا واضح کرتا ہے کہ روشنی کو غالب آنے کی ''عادت'' عطا کی گئی ہے۔ روشنی کے بہت سے نام و عنوان ہیں...... مقناطیسیت میں ہمہ گیریت ہے اس لیے شخصی کشش کے لیے یہ لفظ بہت جاندار محسوس ہوتا ہے۔ سفینہ...... کو ابھی یہ ادراک حاصل نہیں تھا کہ زارا کو دیکھ کر اسے وہ ستم گر زیادہ شدت سے کیوں یاد آنے لگتا ہے...... جس کی ایک نگاہ نے اس کی زندگی کا مفہوم ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔

دروازہ بند ہوتے ہی زارا نے اپنی جگہ کھل کر سانس لی تھی۔ یوں جیسے کوئی مجرم گرفتار ہوتے، ہوتے بچ نکلا ہو......

☆☆☆

تاجور کے ہاتھ میں وہ کاغذ تھا جو بیتا، ساحل کا استعفیٰ سمجھ کر ان کے پاس لائی تھی اور کھول کر دیکھنے پر پتا چلا تھا وہ تو کوئی بے سروپا اشعار ہیں...... اشعار پہلی بار میں بے سروپا ضرور محسوس ہوتے تھے مگر وہ ایسے نوجوان کے ہاتھ سے لکھے گئے تھے جو ''بیروزگاری'' کے بدترین عہد میں ایک پُرکشش تنخواہ والی ملازمت کو لات مار کر چلا گیا تھا۔

جبکہ اپنے پہلے انٹرویو میں اس نے انتہائی صاف گوئی سے کہا تھا کہ اگر اسے کچھ دن مزید بیروزگاری کا سامنا کرنا پڑا تو وہ کسی مزار پر جاکر بیٹھ جائے گا جہاں لنگر کھانے کی وجہ سے وہ کرمنل ایکٹویٹیز سے بچ سکتا ہے۔ اس کی فطرت میں کرائم نہیں ہے لیکن تیسرے دن تو بھوکے کو مردار کھانے کی بھی اجازت ہے۔

اس کی اسی صاف گوئی اور اعتماد کی وجہ سے تاجور نے اس کا انتخاب کیا تھا۔ اگرچہ اس کے پاس مطلوبہ ڈگری موجود تھی مگر تجربہ صفر تھا۔ انہوں نے پوچھا تھا کہ وہ کتنی تنخواہ کی توقع کر کے آیا ہے؟ تو اس کے جواب نے تاجور کو چونکا کر رکھ دیا تھا۔

اس نے جواب میں کہا تھا۔ ''آج کل تین ٹائم کا ناشتا کھانا جو بالکل غریبانہ ہو وہ تین سو سے کم میں ہو ہی نہیں سکتا۔ اس طرح تیس دن کے نو ہزار بنتے ہیں، آٹھ ہزار بجلی، گیس کا بل، آنے جانے کا کرایہ چھ ہزار، ڈاکٹر کے پانچ ہزار، ٹیلی فون کا خرچہ تین ہزار، دو جوڑے کپڑے چھ ہزار...... اگر چالیس ہزار روپے بھی ملتے ہیں تو سمجھوں گا کہ سیٹھ نے میرے ساتھ ظلم نہیں کیا بلکہ میری دعا میں لی ہیں۔''

تاجور تو یہ سن کر ششدر رہ گئی تھیں اتنا منطقی اور صاف جواب انہوں نے شاید پہلی بار سنا تھا بلکہ لاجواب سی ہو کر رہ گئی تھیں۔ انہوں نے اس کا تعلیمی ریکارڈ مدِنظر رکھتے ہوئے اسے پچپن ہزار ماہانہ تنخواہ پر رکھ لیا تھا۔

اور ایک سال میں اس کی پیشہ ورانہ لیاقت ثابت ہونے پر دو انکریمنٹ دے دیے تھے اور اب وہ ستر ہزار تنخواہ پر کام کر رہا تھا۔ آج کے زمانے میں ستر ہزار کی تنخواہ کے خواب تو صرف lums جیسی یونیورسٹی میں پڑھنے والے ہی دیکھ سکتے ہیں۔

ساحل نے تو اسکالرشپ کی بنیاد پر اعلیٰ ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ ماں، باپ کے لاکھوں بچائے تھے۔

''کس قدر زہر بھرا ہوا ہے ایک، ایک لفظ میں...... کتنی فرسٹریشن جھلک رہی ہے۔''

وہ اشعار پر بار، بار نظر دوڑا رہی تھیں۔

رات کے نو بج چکے تھے، دس منٹ پہلے تک اس کا نمبر ''پاورڈ آف'' مل رہا تھا۔

ساحل کا نوکری چھوڑ کر چلے جانا مسئلہ نہیں تھا...... مسئلہ یہ تھا کہ جواز کیا ہے......؟

تاجور کی کمپنیز کی تجارتی دنیا میں جو ساکھ تھی انہیں ملازمین کی کمی نہیں ہو سکتی تھی...... درجنوں درخواستیں ہر وقت سسٹم میں موجود رہتی تھیں۔

لیکن ''بددعا'' کے انداز میں بغیر سلام کے رخصت ہونا ان کے دل پر بوجھ بن رہا تھا۔ ایک کانٹا تھا...... کوئی خلش تھی...... جو انہیں بے عمل بنا رہی تھی کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

اتنے شدید احساسِ محرومی میں مبتلا ہے یہ شخص...... یہ تو کسی بھی وقت بہت آسانی سے کسی بھی انتہائی منفی سوچ کی طرف جا سکتا ہے اچھی بھلی باعزت ملازمت ٹھکرا کر چلا گیا......

کچھ تو ہے...... مگر پتا کیسے چلے کہ کیا ہے؟ تاجور نے اضطراری کیفیت میں پھر ساحل کا نمبر ڈائل کیا...... اور سیل کان سے لگا لیا اب ایک امید افزا حیرت نے آلیا...... رِنگ جا رہی تھی...... انہوں نے جلدی سے پہلا سوال مرتب کرنا شروع کر دیا کہ سلام و خیریت کے بعد سوال ہونا طے تھا مگر حیرت و امید یکلخت مایوسی میں تبدیل ہو گئی...... ساحل نے ان کی کال نہیں اٹھائی تھی گویا وہ یہ طے کر کے روانہ ہوا تھا کہ پلٹ کر نہیں دیکھنا...... اپنے

واجبات تک کا مطالبہ نہیں کرتا......

درحقیقت اصل بات یہ تھی کہ وہ سادہ سا استعفیٰ لکھ کر بھی چلا جاتا تو بھی کوئی خاص بات نہیں تھی...... یہی سوچ آتی کہ کہیں سے اسے زیادہ بہتر آفر آگئی ہوگی اس لیے فوراً چلا گیا۔

مگر وہ تو طنز کے زہر میں بجھے ہوئے ایسے "نظمیہ نشتر" روح میں گاڑ کر بھاگا تھا کہ اذیت ناک تلملاہٹ سے جان نہیں چھوٹ رہی تھی۔

انہوں نے دوبارہ نمبر ملایا بیل جاتی رہی مگر کال ریسیو نہیں ہوئی...... تب انہوں نے اسے ایک میسج ٹائپ کرنا شروع کر دیا۔

"میں آپ کے گھر آ کر بھی بات کر سکتی ہوں...... آپ میرے لیے بالکل بھی اہم نہیں ہیں...... مگر ہر پروفیشنل رولز اینڈ ریگولیشن کا پابند ہوتا ہے...... اور میں اس غیر ذمے دارانہ رویے کو کسی صورت نہ برداشت کروں گی اور نہ ہی نظر انداز...... فوری رابطہ کریں ورنہ مجھے اچھا نہیں لگے گا کہ میرے ایکس ایمپلائی کو پولیس گرفتار کر کے میرے سامنے پیش کرے...... کیونکہ آفس میں بہت اہم فائلیں مسنگ ہیں۔"

تاجور نے میسج سینڈ کیا اور اپنی جذباتی کیفیت کو قابو کیا جو الفاظ کے چناؤ کے دوران ان پر حاوی ہو گئی تھی۔

اب وہ اس کے جواب کے انتظار میں مزید اذیت برداشت کرنے کے موڈ میں نہیں تھیں...... آئی فون بیڈ پر بے پروائی سے پھینک کر بیڈ روم سے باہر آ گئی تھیں۔

☆☆☆

سفینہ گھر کو انجوائے کرنے کے موڈ میں تھی...... ادھر اُدھر کا چکر لگا کر کچن میں چلی آئی اور دیکھنے لگی کہ آج کھانے کا مینیو کیا رہا۔

مکس سبزی دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی...... ڈھکن اٹھاتے ہی ایک پیاری سی مہک اطراف میں پھیل گئی۔

فریج کھول کر جھانکا تو تازہ بنے ہوئے چپلی کباب ایک خوب صورت پلیٹ میں قرینے سے سجے نظر آئے جو غالباً تلنے کے لیے اسٹینڈ بائی رکھے گئے تھے۔ ایک شیشے کے باؤل میں فروٹ کاک ٹیل اور دوسرے باؤل میں کھیر بھی تھی...... جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس گھر میں ابھی تک رات کے کھانے کی میز نہیں لگی۔

اس کا ذہن تاجور کی طرف چلا گیا۔

"اماں گھر پر ہوتی ہیں تو ساڑھے آٹھ بجے تک رات کا کھانا کھا لیتی ہیں...... پتا نہیں آج کیا ہوا؟ کیا ان کا دروازہ ناک کروں؟ لیکن کہیں سو نہ رہی ہوں۔"

پلین میں ریفریشمنٹ کرنے کی وجہ سے بھوک تو بالکل بھی نہیں تھی اس لیے وہ بغیر رد و کد کے دوبارہ کچن سے باہر آ گئی تھی۔ جب تک ماں سے ملاقات نہ ہوتی وہ کوئی اور کام تو نہیں کر سکتی تھی۔ گھر آ کر ماں سے پیار لیے بغیر یقین ہی نہیں آ سکتا تھا کہ اس وقت وہ اپنے گھر میں ہے۔

وہ اسی طرح الجھی، الجھی کیفیت میں دوبارہ زینہ چڑھنے لگی۔

☆☆☆

"اماں...... میں آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بول سکتی...... believe me" زارا کی آنکھیں ڈبڈبانے لگی تھیں۔

"لیکن تم نے ایسا آخر کیا، کیا کہ وہ جاب چھوڑ کر چلا گیا......"

تاجور بہت غور سے زارا کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

"اماں وہ بہت اوور ہو جاتا ہے، پرسنل ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اٹس ٹو مچ......!" چند قطرے آنکھوں سے ٹپک ہی گئے۔ تاجور کے دل کی وقتی سختی پگھلنے لگی۔

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



''اگر ایسا کچھ تھا تو تم نے مجھ سے شیئر کیوں نہیں کیا...... میں نے تم دونوں بہنوں کو ہمیشہ یہی تاکید کی ہے کہ سب کچھ ماں سے کہتے ہیں...... لوگ ''نہ ہوئی'' بھی داستان کی طرح سناتے ہیں اور ماں بڑی سے بڑی غلطی پر بھی پردہ ڈالتی ہے۔ ماں سے اچھا اور بہترین دوست کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔''

''مجھے غصہ آ گیا تھا اماں......'' زارا نے یوں کہا جیسے اعتراف جرم کر رہی ہو۔

تاجور نے گہری سانس لے کر اس کی طرف دیکھا۔

''دیکھو زارا مجھ سے کچھ نہ چھپانا...... ساحل نے تم سے جو کہا...... کسی بھی طرح کی کوئی بات کی تو مجھے بتاؤ۔ کیونکہ میں اس کے ساتھ ہمدردی کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں...... لیکن تمہاری بات سننے کے بعد اب مجھے فیصلہ کرنا ہے کہ وہ ہمدردی کے لائق بھی ہے یا نہیں۔''

وہ اب زارا کے قریب بیٹھ گئیں۔ انداز میں صبر سکون تھا...... ہر طرح کی عجلت و بے چینی اب رخصت ہو چکی تھی۔

''اماں...... وہ بالکل بھی ہمدردی ڈیزرو نہیں کرتا...... اگر وہ چلا گیا ہے تو پروا نہ کریں......'' زارا کے لیے یہ امر قابلِ طمانیت بن رہا تھا کہ تاجور کار میکیٹی فراموش کر کے اچھی سی ماں بن کر اس کا مسئلہ جاننے اور حل کرنے کی کوشش کرتی نظر آ رہی تھیں...... اور وہ ان کی زیادہ سے زیادہ ہمدردیاں سمیٹ کر کسی relief کی خوش فہمی میں مبتلا ہونے جا رہی تھی۔

''زارا...... میں کسی کے بھی ساتھ زیادتی کرنا نہیں چاہتی...... یہ دعائیں اور بددعائیں انسان کا قبر تک پیچھا کرتی ہیں...... میرے کاندھوں پر بہت بھاری ذمے داریاں ہیں...... جب تک تم دونوں بہنوں کی شادی نہیں ہو جاتی، مجھے یہ سب بہت اچھی طرح سنبھالنا ہے۔'' وہ بہت آرام سے بات کر رہی تھیں۔

''میں اولاد کی محبت میں کسی بھی انسان کے ساتھ زیادتی نہیں کرنا چاہتی، اس لیے میں کسی کے ساتھ زیادتی کروں گی تو میری اپنی اولاد اس کا رزلٹ فیس کرے گی۔ میری ساری بھاگ دوڑ، ساری کوششیں، محنتیں تم دونوں کی خوشیوں اور سکھ کے لیے ہیں...... مجھ سے سب کچھ کہہ دو زارا...... تاکہ میں فیصلہ کر سکوں کہ امیر الدین ساحل کو واپس لانا ہے یا اسے چارج شیٹ کرنا ہے۔'' تاجور بہت مشکل سے خود کو غصہ کھانے سے بچا رہی تھیں...... تاکہ اس نشست میں حقیقت واضح ہو جائے۔

''اماں...... اسے بالکل بھی تمیز نہیں ہے...... وہ ہماری ''کلاس'' کا نہیں ہے مگر ہم میں سے نظر آنے کی کوشش کرتا ہے۔ فلرٹی لگتا ہے اماں...... بہت فضول باتیں کرتا ہے۔'' زارا نے حافظے پر زور ڈال کر ساحل کی برائیاں گنوانا شروع کیں۔

تاجور بہت توجہ سے سن رہی تھیں...... وہ بھی کبھی دوشیزہ رہی تھیں...... حسن اور دوشیزگی اکٹھے ہوئے تو قدم، قدم پر امتحان درپیش ہوئے تھے جو اُن سے ملتا ان کا طلبگار ہو جاتا...... دانش مند و دولت مند ماں، باپ نے بہت احتیاط سے ان کے لیے جیون ساتھی کا انتخاب کیا تھا۔

ان کی ماں کا خیال تھا کہ حسین اور دولت مند بیٹی کی شادی کم عمری میں کسی سمجھدار بندے سے کر دینی چاہیے...... بہت سے لوگوں کو امان مل جاتی ہے حسین اور دولت مند لڑکی highly risk پر ہوتی ہے۔ کوئی بھی شاطر مفاد پرست اپنی چال میں کامیاب ہو کر زندگی کو تلپٹ کر کے رکھ سکتا ہے۔

''بہرحال...... یہ تو تمہاری بات تھی...... جو میں نے سن لی۔'' تاجور توقف کے بعد گویا ہوئیں۔

''مگر میں ساحل کی بات بھی ضرور سننا چاہوں گی...... چاہے اس کی بات ہلکی ہو...... بے وزن ہو...... جہالت سے بھری ہوئی ہو...... بے مغز ہو...... مگر میں اس کی بات سنے بغیر انصاف نہیں کر پاؤں گی...... تمہاری تو ماں ہوں...... تمہیں تو ہمیشہ مجھ سے فائدہ ہی ملے گا...... اس لیے تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔''

☆☆☆

سفینہ، تاجور کے بیڈروم کا ادھ کھلا دروازہ دیکھ کر اندر جھانک کر فارغ ہو چکی تھی اور ماں کی تلاش میں دوبارہ زارا کے بیڈروم تک آئی تھی...... اندر سے آتی آوازوں نے اسے پتھر کی طرح ایک جگہ جامد کر دیا تھا۔ دونوں کے درمیان ازحد سنجیدہ بات چیت ہو رہی تھی...... ساحل کا نام اس نے بہت واضح سن لیا تھا۔

''ایسا کیا ہو گیا کہ اماں اتنی بچی ہو کر جسٹس کی بات کرنے لگیں؟'' سفینہ کو تھوڑی بہت نہیں...... خوفناک قسم کی تشویش لاحق ہو رہی تھی۔

''لیکن اماں...... آپ ساحل سے جب بھی بات کریں گی میرے سامنے کریں گی۔ مجھے یقین نہیں کہ وہ ہر بات سچ، سچ کر دے گا۔''

زارا کی آواز کمرے سے باہر آ کر سفینہ کی سماعت سے ٹکرائی۔

''یہ بعد کی بات ہے......'' سفینہ کو لگا تاجور دروازے سے قریب ہیں...... اس نے جلدی سے خود کو سنبھال کر دروازے پر دستک دی۔ اس کا اندازہ بالکل درست نکلا...... اگلے ہی لمحے دروازہ تاجور نے کھول دیا تھا۔ سفینہ کو سامنے پا کر ایک فطری اور بے ساختہ خوشی کا تاثر ان کی آنکھوں میں جھلکا اور بڑی بے ساختگی سے اسے گلے سے لگا لیا تھا۔

''سفینہ، میری جان، تم کب آئیں......؟ اور یہ کیا حرکت ہے؟ مجھے کیوں نہیں بتایا کہ آج آ رہی ہو......'' وہ اس کے دونوں گالوں پر بوسہ دیتے ہوئے فطری والو ہی خوشی سے سرشار ہو رہی تھیں۔

''آج میں نے ذرا سا زارا بننے کی کوشش کی تھی...... سوچا اماں کو سرپرائز دیتی ہوں۔'' سفینہ نے بھی ماں سے والہانہ لپٹ کر پیار کا بھرپور اظہار کیا۔

زارا بھی بیڈ سے اتر کر ان دونوں کے قریب آ چکی تھی......

''لیکن زارا تم سے تو میں مل چکی تھی...... تم نے اماں کو نہیں بتایا......؟ کمال ہے تمہارے پیٹ میں تو کوئی خبر رکتی ہی نہیں ہے۔''

وہ ماں سے الگ ہوتے ہوئے بڑی حیرت سے زارا کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''وہ...... ایکچو ئیلی اماں آتے ہی اپنی کوئی بات کرنے لگیں...... مجھے خیال ہی نہیں رہا۔'' اس نے صفائی پیش کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا...... تم زارا سے مل چکی ہو......؟'' تاجور نے بھی اب گہری نظر سے زارا کے تاثرات سے کچھ خاص اخذ کرنے کی کوشش کی۔

''اوکے، چھوڑیں اسے۔ بہرحال سرپرائز تو آپ کو دے دیا ناں!'' سفینہ ایک بار پھر ماں سے والہانہ لپٹ گئی۔

''سرپرائز کی بچی......'' انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی...... وہ سچ مچ اچانک سفینہ کو اپنے قریب پا کر بے حد خوش نظر آ رہی تھیں۔

''اماں تاجور کو انگلش میں سرپرائز کہتے ہیں......؟ کیونکہ میں تو تاجور کی بچی ہوں......'' سفینہ شریر انداز میں مسکرائی۔

''ہاں، یہی سمجھ لو...... اس میں تو کوئی شک نہیں کہ تم تاجور کی بیٹی ہو۔'' تاجور کی نگاہ غیر ارادی طور پر زارا کی طرف اٹھ گئی تھی...... جو بہت الجھی، الجھی اور غائب دماغی کی کیفیت میں مبتلا نظر آ رہی تھی۔

''چلو...... تم فریش ہو جاؤ...... پھر کہیں باہر چل کر ڈنر کرتے ہیں۔'' تاجور نے پیار سے سفینہ کا گال چھو کر کہا۔

''اماں گھر آ کر بھی باہر ڈنر...... پھر گھر آنے کا کیا فائدہ......؟ میں کچن میں جا کر دیکھ آئی ہوں...... اتنی پیاری

مکس ویجی ٹیبل اور خوب صورت سے چپلی کباب بنے ہوئے ہیں...... آج ڈنر گھر پر ہی ہوگا...... اور آپ سے بہت ساری باتیں بھی ہوں گی...... اور زارا کے پاس تو سنانے کے لیے اتنا کچھ ہوتا ہے پھر اس کی باری لگے گی۔'' سفینہ نے ہنستے ہوئے زارا کی طرف دیکھا۔

زارا نظر چرا کر وہاں سے ہٹ گئی۔

تاجور کے چہرے پر گہری سنجیدگی کا سایہ نظر آیا...... مگر فوراً ہی غائب ہوگیا۔

''چلو ٹھیک ہے، میں تو تمہاری وجہ سے کہہ رہی تھی کہ شاید تمہارا آؤٹنگ کا موڈ ہو۔'' تاجور نے زبردستی لہجے میں بشاشت پیدا کرتے ہوئے کہا اور سفینہ کو ساتھ لگا کر اس کا گال چوم لیا۔

ان کا ذہن چرخی کی طرح گھوم رہا تھا۔ سفینہ کو ایک دھچکا لگنے والا تھا اگرچہ تاثر وقتی ہونا تھا مگر ایک اعصاب شکن مرحلہ تو ابھی باقی تھا جس سے نمٹنے کی پیش بندی شروع ہو چکی تھی۔

''میں کھانا لگواتی ہوں تم دس منٹ تک ڈائننگ میں آجاؤ۔'' انہوں نے خیالات کے اژدہام کے درمیان معمول کے انداز میں کہا اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔

سفینہ نے زارا کی طرف دیکھ کر اپنی دو انگلیاں لہرائیں۔

''جلدی سے نیچے آجاؤ، کھانا کھا کر بہت ساری باتیں کریں گے۔'' یہ کہتے ہی وہ بھی باہر چلی گئی۔

زارا اپنی جگہ گم صم سی کھڑی سوچ رہی تھی۔

''جیسے ہی سفینہ کو پتا چلے گا کہ میں نے اس کا کتنا بڑا نقصان کر دیا ہے اس کے انداز بدل جائیں گے...... مگر وہ مجھے کہے گی کیا؟''

☆☆☆

برٹرینڈ رسل (Bertrand Russell) نے کہا تھا۔

"the trouble with the world is that the stupids are cocksure and the intelligents are full of doubt" (اس دنیا میں تکلیفیں اس وجہ سے ہیں کہ احمق غیر ضروری خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ذہین لوگ شک میں پڑے رہتے ہیں) ڈنر کے بعد پرنس اور لیڈی صوفیہ لاؤنج میں کافی ٹیبل پر ہلکی پھلکی بات چیت کے ساتھ کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

کسی سیاست دان کے سطحی سے بیان پر لیڈی صوفیہ تبصرہ کر رہی تھیں۔ لاؤنج کے مرکز میں بڑی سی اسکرین پر نیوز چینل لگا ہوا تھا اور کوئی ٹاک شو آن ائر تھا۔

''اوہ یس......!'' پرنس اپنے گہرے خیال سے غوطہ لگا کر باہر آیا۔

''جھک مار رہے ہیں...... مغز سے خالی باتیں...... اس سے بڑا اسٹوپڈ کون ہو سکتا ہے جو ہمیشہ دوسروں کو اسٹوپڈ سمجھتا ہے۔'' لیڈی صوفیہ نے کڑے تیور کے ساتھ ٹاک شو کے مہمان کے جملے پر تبصرہ کیا۔

''یس مام......'' پرنس نے غائب دماغی کی کیفیت میں کافی کا چھوٹا سا گھونٹ بھرا۔

''تعلیم دنیا میں تبدیلی لانے کے لیے مؤثر ترین ہتھیار ہے۔ نیلسن منڈیلا تو ابھی بالکل ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے کہہ کر گیا ہے یہ تو ایک زندہ حقیقت ہے...... یہ اس کو رول ماڈل کیوں نہیں بناتے...... کیوں نہیں سیکھتے؟''

''صرف اس لیے کہ ان میں سے کسی میں نیلسن منڈیلا کی کیمسٹری نہیں ہے۔ یہ ابن الوقت ہیں...... بنیادی انسانی حقوق پامال کرنے کے لیے appear ہوتے ہیں۔''

''یس آف کورس......'' پرنس نے پھر مختصر ردِعمل ظاہر کیا۔

اب لیڈی صوفیہ نے چونک کر پرنس کی طرف دیکھا تھا۔

''کیا بات ہے پرنس......؟ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟''

پرنس اب چونک پڑا تھا...... دادی کے سوال نے اسے احساس دلایا کہ وہ ایمانداری سے دادی کو کمپنی نہیں دے رہا ہے...... اور دادی نے اس کی چوری پکڑلی ہے۔

''یس مام...... میں ٹھیک ہوں...... ڈونٹ وری......''

''اوکے...... شاید تم اس کے خیال میں ہو...... اور میں چاہتی ہوں کہ اب تم خیال سے نکل کر عمل کی دنیا میں آجاؤ...... ہماری کوئی مجبوری نہیں ہے، ہم ایک ہفتے میں شادی کرسکتے ہیں...... مجھے یقین ہے کہ میں اس زندہ دل اور خوب صورت لڑکی کی کمپنی انجوائے کروں گی، کیا ہم کل اس کے گھر جاسکتے ہیں؟''

لیڈی صوفیہ نے ایک بھرپور جوان مرد کے دل کی کتاب پڑھنے کی کوشش کی تھی۔

''اوہ...... نو۔'' پرنس کے منہ سے بے اختیاری کیفیت میں نکلا تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' لیڈی صوفیہ کے لائٹ براؤن ابرو تن گئے...... سرمئی چمکدار چلیوں میں خفگی کی چمک واضح ہوگئی۔

''میں کچھ سوچ رہا تھا...... مگر اس کے بارے میں نہیں...... کسی اور کے بارے میں......'' پرنس نے اپنے مخصوص پُرسکون لب ولہجے میں سیدھی، سیدھی بات کی۔

''کسی اور کے بارے میں...... لیکن کون ہے وہ......'' لیڈی صوفیہ ایک دم چوکس و مستعد ہوگئیں۔ اور بغیر پلکیں جھپکائے پرنس کی طرف گھورنے لگیں۔

''ایک چھوٹا سا بچہ...... جو مسجد میں دعا مانگتے ہوئے رو رہا تھا...... یا رو، روکر دعا مانگ رہا تھا......'' پرنس ایک گہرے تصور میں کھوکر گویا ہوا۔

''ویری انٹرسٹنگ۔'' لیڈی صوفیہ کی نگاہ میں شوق کے ہزار رنگ چمکے...... ہونٹوں پر غیرارادی مسکراہٹ بھی چھلک رہی تھی۔

''اپنے فادر یا گرینڈ فادر کے ساتھ آیا ہوگا......؟ وہ بھلا کیوں رو رہا تھا پرنس؟'' لیڈی صوفیہ کافی ختم کرنا بھول گئیں اور مگ ٹیبل پر رکھ دیا۔

''اکیلا آیا تھا۔'' پرنس نے فوراً جواب دیا تھا۔

''اکیلا......؟ کیا عمر ہوگی اس کی؟'' اب سوال میں حیرانی کا غلبہ تھا۔

''شاید سات سال...... شاید آٹھ سال......'' پرنس نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''اوہ گاڈ...... بہت چھوٹا ہے شاید بیچارہ غریب ہوگا۔ اللہ سے کوئی قیمتی کھلونا مانگنے مسجد آیا ہوگا۔'' لیڈی صوفیہ نے عمر بھر کی ریاضتوں میں سے قریب ترین اندازے کا بار اٹھایا۔

''ویل آف ہے...... کروڑوں کے گھر میں رہتا ہے۔'' پرنس یوں بات کررہا تھا جیسے مراقبے یا گہری نیند میں ہو۔

''اوہ وَنڈرفل!'' لیڈی صوفیہ نے شوق کی انتہا تک اڑان بھری اور بڑی معصومیت سے آنکھیں پٹپٹا کر پرنس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''میں اس کے بارے میں وہ سب جاننا چاہوں گی جتنا تم جانتے ہو...... مجھے بتاؤ پرنس، وہ کون ہے...... تم کیا جانتے ہو؟ معصوم بچہ بوڑھوں کی طرح مسجد میں کیوں رو رہا تھا؟''

پرنس نے مسکرا کر گہری سانس لی...... وہ دادی کے سوالات کے جوابات دینے کا پابند تھا کیونکہ اس نے خبر دی تھی۔

☆☆☆

کھانا کھانے کے بعد وہ تاجور سے تھوڑی بہت بات چیت کرنے کے بعد اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اسے ماہین کو فون کرنا تھا، کل کا شیڈول مرتب کرنا تھا اسی کی مناسبت سے ڈریس کا انتخاب کرنا تھا۔

اس نے کمرے میں آتے ہی سب سے پہلے ماہین کو فون ملایا مگر اس کا نمبر بزی ملا۔

''لگی ہو گی اپنی بچھڑی ہوئی دوست سے گپیں لگانے میں......'' اس نے مسکراتے ہوئے سیل سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور وارڈ روب کھول کر کھڑی ہو گئی۔ موسم کے لحاظ سے بہت سے ڈریسز اس کی آنکھوں کے سامنے تھے...... جن میں سے کئی ڈریسز ایسے تھے جو اس نے صرف ایک مرتبہ پہنے تھے...... بلیک میکسی پر اس کی نظر ٹھہر گئی جس پر میرون ریشم سے شیشے کا کام بنا ہوا تھا۔

اس سے پیشتر کہ وہ اسے باہر نکالتی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی...... سفینہ چونک پڑی آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو سامنے زارا کو پایا۔

''ارے تم سوئی نہیں؟ تم نے ڈنر بھی نہیں کیا...... اب بھوک لگی ہو گی؟'' سفینہ نے زارا کو اندر آنے کے لیے راستہ دیتے ہوئے مسکرا کر ہلکے پھلکے انداز میں بات کی۔

''نہیں...... میں نے بہت ساری چاکلیٹ کھائی تھی ساتھ ہی دو میگنم (آئس کریم) بھی بھوک لگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

زارا بہت سنجیدگی سے کہہ رہی تھی...... حالانکہ ایسی بات چیت میں بہت زیادہ سنجیدہ ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔

''اُف...... اتنی زیادہ کیلوریز لی ہیں تم نے...... تم نے تو ڈبل ڈنر کیا ہوا ہے۔'' سفینہ نے آگے بڑھ کر وارڈ روب کے پٹ بند کیے۔

''بہت اچھی بچی بنی ہوئی ہو...... بہت سیریس، سیریس لگ رہی ہو؟ لگتا ہے کچھ خاص ہے...... اور تم اس وقت وہی مجھے بتانے آئی ہو......'' سفینہ نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

بیٹھتے ہی زارا نے سفینہ کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' سفینہ حیرت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئی۔

''وہ...... سفینہ...... اماں نے تمہیں کچھ بتایا......؟'' زارا ہچکچاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''کیا بتانا چاہیے تھا اماں کو......؟ جو انہوں نے مجھے ابھی تک نہیں بتایا۔''

سفینہ اب سچ مچ بری طرح چونک پڑی تھی...... اور زارا کی طرف بغور دیکھ رہی تھی۔

زارا کی آنکھوں میں نمی اتر رہی تھی جو وہ پلکیں جھپک، جھپک کر روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

سفینہ پر تو گویا حیرت کا پہاڑ ٹوٹ رہا تھا...... وہ جب سے گھر میں داخل ہو کر زارا سے ملی تھی اسے اس کے رویے میں غیر معمولی پن محسوس ہو رہا تھا۔ مگر کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''اماں نے کچھ کہا ہے؟'' سفینہ کے دل میں پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔

زارا نے انکار میں سر ہلایا۔

''پھر......؟'' سفینہ کی حیرت سوا ہو گئی۔

زارا ایک دم سفینہ کے گلے سے لگ گئی اور پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔ حساس سی سفینہ تو جیسے تڑپ اٹھی...... اس نے فوراً بہن کو اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا اور اس کے بالوں پر پیار سے بوسہ دیا۔

''زارا...... کیا ہوا ہے؟ کیوں رو رہی ہو......؟ پلیز زارا میں بہت زیادہ پریشان ہو رہی ہوں...... جلدی سے بتاؤ...... پلیز......''

''آئی ایم سوری...... سفینہ...... ایکسٹریملی آئی ایم سوری......'' زارا ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی...... سفینہ کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔''اوہ مائی گاڈ...... زارا...... مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا...... جلدی سے بتاؤ...... ورنہ میں بھی رونا شروع کر دوں گی۔'' سفینہ نے اسے خود سے الگ کیا اور اس کی ٹھوڑی کو انگلی سے چھو کر چہرہ اوپر کرنے کی کوشش کی۔

زارا کا چہرہ آنسوؤں سے تربتر تھا...... سفینہ نے اپنی انگلیوں سے اس کے آنسو پونچھے...... اس کے رخسار پر پیار بھرا بوسہ دیا۔

''سفینہ...... میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی...... مگر مجھے نہیں پتا تھا کہ ایسا کچھ ہو جائے گا...... میری کلاس فیلو سمیٹی لینڈ کروزر ڈرائیو کرتی ہے اور بجل تو اکثر مرسڈیز لے کر کالج آجاتی ہے۔''

''تم مجھے کیوں بتا رہی ہو......؟'' سفینہ الجھی...... اور زارا کو کندھوں سے پکڑ کر بغور دیکھا۔

''میں تمہاری کار لے گئی تھی...... وہ راستے میں چھن گئی......'' زارا نے بدقت تمام جملہ مکمل کیا۔

سفینہ کے ہاتھ زارا کے کندھوں سے یوں پھسلے جیسے کٹا ہوا درخت زمین پر گرتا ہے۔

چند لمحے تو اسے کچھ ہی نہیں آئی کہ زارا نے کیا کہا...... آنکھیں پھیلا کر دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

زارا شاید سفینہ کا یہ ردِعمل سہہ نہ سکی گھبرا کر اس کے کندھے سے سر ٹکا کر دوبارہ رونا شروع کر دیا۔

سفینہ ہنوز دم بخود بیٹھی تھی۔ اس نے اب زارا کے رونے پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا...... کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی یوں جیسے حواس باختگی میں انسان آئیں بائیں شائیں کرتا ہے کوئی نظم و ترتیب نظر نہیں آتی...... بس ذہن خواہ مخواہ کی قلابازیاں لگا رہا ہوتا ہے۔

''سفینہ...... میں نے جان بوجھ کر تو تمہیں شاک نہیں لگایا...... میرے شولڈر بیگ میں تو بہت سی کام کی چیزیں تھیں...... میرا لائسنس، کالج کا کارڈ، جم کی ممبر شپ کا کارڈ...... اور...... تو اور ابھی تو میں نے اس میں سے وہ فائیو تھاؤزینڈ کا نوٹ بھی نکال کر فائل نہیں کیا تھا جس پر پرنس سے آٹو گراف لیا تھا۔''

رم جھم...... ساون کی پہلی پھوار کا ترنم فضا میں بکھرا...... پرنس...... کیا نام میں اتنا جادو ہوتا ہے کہ وقت بدل کر رکھ دے...... اتنی دل شکن خبر کے درمیان ایک نام نے یوں اثر پھیلایا جیسے جنگل کی آگ پر بھادوں کے بادل برس پڑے ہوں۔

''وری سیڈ......'' سفینہ نے اب خود کو مرتب کرنے کی کوشش کی۔

''کار تو گئی...... ہمارے ملک میں...... missing person کا پتا نہیں چلتا۔ ابھی تک تو ایسا کوئی نہیں دیکھا جس کی کار چھنی یا چوری ہوئی ہو تو اسے مل بھی گئی ہو...... پولیس گرفتاریاں بھی ظاہر کرتی ہے مگر لٹنے والوں کو اپنی چوری ہونے والی یا چھن جانے والی چیزیں کبھی ملتی نہیں دیکھیں اس لیے اب میں تمہیں کیا کہوں......؟'' سفینہ کے انداز میں دکھ اور بے بسی کی ملی جلی کیفیت تھی...... اسے اب سے کچھ دیر پہلے تک کا زارا کا رویہ بھی سمجھ آ گیا تھا...... ایک من چاہی پسندیدہ کار سے محرومی کا فوری اگرچہ کہ وقتی تاثر تھا کہ اسے زارا کی قربت بوجھ محسوس ہونے لگی...... لہجے کی اپنائیت میں لاشعوری طور پر بیزاری اور کوفت گھل مل رہی تھی۔

''میں بہت گلٹی فیل کر رہی ہوں سفینہ......'' زارا بدقت گویا ہوئی۔

''It is so natural کرنا بھی چاہیے......'' سفینہ کہتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

زارا کو سفینہ کے رویے میں ہونے والی فطری و فوری تبدیلی کا شدت سے احساس ہوا۔

''تم جس طرح نان سیریس انداز میں لائف گزار رہی ہو...... اس میں ایکسیڈنٹ بہت ہوتے ہیں۔ cautions and pre cautions کی ذرا برابر awarness نہیں ہے۔'' سفینہ گویا اپنے مخصوص انداز میں برس پڑی تھی...... کیونکہ وہ زارا کی بے پروائیوں اور غیر ذمے داریوں پر شاید تاجور سے بڑی نقاد تھی۔

زارا چونکہ ہر طرح کے ردِعمل کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو کر آئی تھی اس لیے مزید کچھ بولے آہستگی سے کھڑی ہوگئی اور ہتھیلیوں سے چہرہ صاف کرنے لگی۔

"sorry again" وہ اب منہ ہی منہ میں منمنائی۔

''اٹس اوکے...... پلیز اب تم مجھے ریسٹ کرنے دو......'' سفینہ کے اعصاب کو جھٹکا لگا تھا وہ یکلخت تھکاوٹ محسوس کرنے لگی تھی۔

''سفینہ......'' زارا جاتے، جاتے پلٹی۔ اور کچھ کہنا چاہا۔

"no more" سفینہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

زارا چپ چاپ باہر چلی گئی۔

سفینہ نے اضطراری کیفیت میں سائڈ ٹیبل کی دراز کھولی، گٹار والی key ring جس میں اس کی کار کی چابی تھی وہاں نہیں تھی...... اس نے کسی وہمی کی طرح اِدھر اُدھر دراز میں ہاتھ مارا...... جیسے معجزاتی طور پر چابی ہاتھ میں آجائے گی۔

چند لمحے بعد ہار کے دراز بند کردی...... چند قطرے آنکھوں سے ٹپکے...... آنکھوں کے سامنے چمکتی ہوئی لش، پلش کار تھی...... آنسوؤں میں مادہ پرستی کے حیوانی جذبات پوشیدہ نہیں تھے۔ ایک حسین خواب ٹوٹنے کی چھن، چھن تھی...... کربناک چھناکے تھے...... اس کے باوجود کہ ایک یقین محکم تھا کہ اس سے بھی بہترین کار اس کی دسترس میں ہے بلکہ اس کی زندگی میں کار کا حصول تو مسئلہ ہی نہیں ہے۔

☆☆☆

''وہ تو مادرزاد ولی ہے...... جس کو ابھی سے رابطہ کرنے کا شعور ہے...... وہ تو بہت جلد لوگوں اور رشتوں سے بے نیاز ہوجائے گا۔'' لیڈی صوفیہ ہنوز عالمِ تحیر میں تھیں۔

''میں اس سے دوستی کرنا چاہتا ہوں گرینڈ مام......'' پرنس کو اپنی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی۔

''ہاں مگر اس کے لیے تمہیں پرمیشن لینا ہوگی۔'' لیڈی صوفیہ اب بیڈروم میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

''پرمیشن......؟'' پرنس نے سوالیہ اور متعجب انداز میں دیکھا۔

''ہاں...... اس سے جس کا تم نے کاغذ پر اسکیچ بنایا...... مگر گرینڈ مام کو ابھی تک اس کا نام نہیں بتایا۔''

''اوہ......'' پرنس کے منہ سے بے ساختہ نکلا...... گویا غبارے سے ہوا نکل گئی ہو۔

''مگر ابھی وہ میری زندگی کا حصہ نہیں ہے، میں پابند نہیں ہوں......'' پرنس نے دادی کی پُر اعتماد گھورتی نگاہ سے بچنے کی کوشش کی...... گویا کھلے میدان میں مختلف سمتوں سے آتے ہوئے تیروں سے بچنے کی کوشش کررہا ہو۔

''روحانی کمٹ منٹ...... ڈاکومنٹس سے زیادہ پاورفل اور اسٹرانگ ہوتی ہے۔'' لیڈی صوفیہ مسکرائیں...... تجربے سے لبریز زندگی میں اب کسی بات پر متردد ہو کر ردِعمل نہیں کرتی تھیں۔

دوٹوک، واضح، پُریقین، آہنی اور پُراعتماد ہو کر بڑی ذمے داری سے بات کرتی تھیں۔

فطرت سے دوستی کا یہ عالم تھا کہ ایک باضمیر، غیر جانبدار منصف کی طرح اپنی رائے کا اظہار کرتی تھیں...... عشق کی آنچ سے پگھلتے آنسوؤں نے نفس کے سارے کھوٹ دھو ڈالے تھے...... خالص پن روح کو اجالتا رہتا تھا

ملاوٹ سے پاک زندگی اس عمر میں بھی پُر لطف تھی۔

پرنس لاجواب ہو کر رہ گیا تھا۔

''وہ معصوم بچہ ہے پرنس...... اس سے کبھی ایسی کمٹ منٹ نہ کرنا جسے نباہ نہ سکو......'' یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ چھڑی پر زور ڈالتی آگے بڑھنے لگیں۔ پرنس مبہوت سا کھڑا دادی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

یوں جیسے نظروں ہی نظروں میں نثار ہو رہا ہو۔

''گرینڈ مام کی وجہ سے میری زندگی کتنی خوب صورت ہے۔ بقول جون ایلیا...... ہم گھنٹوں بات کرتے ہیں...... غور کیا جائے تو چند منٹ کام کی بات کرتے ہیں...... باقی بکواس کرتے ہیں۔ لیکن گرینڈ مام سے جتنی دیر بات ہوتی...... کمال بات ہوتی ہے۔ وہ زیرِ لب مسکرایا۔

''آئی ایم سوری گرینڈ مام ...... میں نے آپ سے جھوٹ بولا...... اس لیے کہ جو سچ ہے وہ کہہ نہیں سکتا...... میرے اس سچ سے آپ کو تکلیف ہو گی۔ سفینہ...... کیا شاعرانہ نام ہے......'' وہ بیڈ روم کی طرف بڑھتے ہوئے معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔

دل دریا سمندروں ڈونگے
کون دلاں دیاں جانے ہو

''مگر میں اپنے دل کی جانتا ہوں...... دل کے سمندر میں ایک سفینہ اترا ہے۔'' سیراب سی مسکراہٹ ہونٹوں پر کھیلنے لگی وہ دروازہ کھول کر اپنی خواب ناک خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔

ایئر فریشنر کی مسحور کن خوشبو، دل کو خوش آتی اسپلٹ کی ٹھنڈک...... اندھیارے پر غالب آتی چھت ئے کناروں سے پھوٹتی نیلی روشنیاں...... وہ اس طرف بڑھ گیا جو اس کی جائے خاص تھی اور نماز و مراقبے کے لیے مخصوص تھی۔

☆☆☆

تاجور علی الصباح حسبِ عادت بیدار ہو گئی تھیں۔ واش روم سے وضو کر کے باہر آئیں تو سب سے پہلے ڈرائیور کو فون کیا اور اسے گاڑی تیار کرنے کی تاکید کی اور مطلع کیا کہ وہ سات بجے باہر آ جائیں گی اور فیڈرل بی ایریا چلنے کا کہہ کر نماز ادا کی۔

نماز اور مخصوص تسبیحات سے فارغ ہو کر خانساماں کو انٹر کام پر چائے اور دو سلائس لانے کو کہا۔

پھر شب خوابی کا لباس بدل کر سادہ شلوار قمیص زیب تن کیا...... اس کے بعد دراز سے کچھ کیش نکال کر لفافے میں ڈالا۔ بال سنوار کر فارغ ہوئیں تو خانساماں ٹرے میں چائے اور سلائس لے کر آ گیا۔

''دیکھو میں سات بجے چلی جاؤں گی...... کسی کے گھر ضروری کام سے جانا ہے۔ وہیں سے آفس چلی جاؤں گی اور لنچ گھر آ کر کروں گی...... سفینہ سو کر اٹھے تو بتا دینا۔''

خانساماں نے سر جھکا کر سنا گردن ہلائی اور کچھ بولے بغیر باہر چلا گیا...... ہلکا پھلکا ناشتا کر کے وہ تھوڑی دیر کے لیے لیٹ گئیں...... آنکھیں بند کرتے ہی ذہن مختلف سمتوں میں دوڑنے لگا......

☆☆☆

مالک مکان کو غالباً فرشتوں نے بتا دیا تھا کہ آنے والا کرائے دار گھوڑے بیچ کر سونے کا عادی ہوگا اور ''بگیر حشر'' ٹائپ کی کال بیل ہی اسے سوٹ کرے گی۔ چھانٹ کر سستی ترین کال بیل لگائی تھی جو پوری قوت سے چلاتی تھی اور بٹن سے انگلی ہٹانے کے بعد بھی چند سیکنڈ چوں چوں کرتی تھی...... جیسے مرتے ہوئے کی آخری ہچکیاں۔

وہ اوڑھا ہوا بلینکٹ ہی لپیٹ کر دروازے تک آ گیا تھا۔

''اب کون ہے؟'' نیند بھری جھلائی ہوئی آواز تھی۔
نو وارد نے جواب دینے کے بجائے پھر بزر پر انگلی رکھ دی اور رکھ کر ہٹائی نہیں۔
''یہ کیا طریقہ ہے؟ منہ میں زبان نہیں ہے؟'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے چوپٹ دروازہ کھول دیا۔
جتنی شدت و بیزاری سے دروازہ کھولا تھا اس سے زیادہ ہزار گنا قوت نے اسے پیچھے دھکیلا تھا۔
سامنے تاجور اسے کڑے تیور سے گھور رہی تھیں۔
''آپ...... آ...... آپ...... '' ساحل پر تو گویا آسمان گر پڑا...... ''آپ، آپ'' کہتے ہوئے غیر ارادی طور پر انہیں اندر آنے کا راستہ بھی دیتا جاتا تھا۔
''نہ سلام نہ آداب...... یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' تاجور نے ڈپٹ کر کہا تو ساحل کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے...... دانتوں تلے پسینہ آگیا۔
''مم...... مم...... میم...... جی...... جی...... السلام علیکم...... آئی ایم سوری I can,t expect'' وہ کچھ کہنے جا رہا تھا مگر بدحواسی میں الفاظ گم ہو رہے تھے۔
''پلیز...... تشریف لائیں......'' اس نے اندر آنے کو کہہ تو دیا مگر فوراً ہی اپنے بے ترتیب لونگ روم کا خیال آیا...... سرپٹ اندر دوڑا...... جلدی سے اِدھر اُدھر پڑے کپڑے، گیلا تولیا اٹھایا اسٹور کی طرف بھاگا...... دروازے سے ہی ہاتھ بڑھا کر اندر پھینک دیے فائیو سیٹر صوفہ سیٹ، دو سائڈ ٹیبل، ایک سینٹر ٹیبل، جس پر سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ایش ٹرے...... مونگ پھلی کے چھلکوں سے بھرا شاپر...... پرانے اخبار، کافی کا مگ جس میں بچی ہوئی کافی سوکھ کر جم چکی تھی۔ برگر کھا کر پلیٹ اٹھانا بھول گیا تھا، جس میں بچے ہوئے فرائز اور ٹشو پیپر مڑے تڑے پڑے تھے۔
''have a seat please'' اس نے گھبراہٹ اور خجالت کے ساتھ تاجور کو بیٹھنے کے لیے کہا۔
''میں آرام سے بیٹھی ہوں...... آپ یہ ٹیبل صاف کر سکتے ہیں۔'' تاجور نے بیٹھتے ہوئے انگلی سے ٹیبل کی طرف اشارہ کیا...... اس پر تو جیسے ساحل پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔
ایک ہی ''راؤنڈ'' میں اس نے سب چیزیں اٹھانے کی کوشش کی تو پلیٹ گرتے گرتے بچی...... سنبھالنے کی کوشش میں فرائز فرش پر گر گئے...... جھک کر فرائز چن کر پلیٹ میں رکھنے لگا۔
''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں...... آپ اپنے گھر میں ہیں، آنے والے مہمان کی عزت میزبان کے ہاتھ میں ہوتی ہے...... آپ مجھے اندر آنے سے منع بھی کر سکتے تھے...... ریلیکس، یہ رکھ کر آئیں...... مجھے کوئی جلدی نہیں ہے...... میں آپ سے آرام سے بات کروں گی، آپ خود بھی ایزی فیل کریں۔'' انہیں اس کی بدحواسی دیکھ کر بہت عجیب سا محسوس ہو رہا تھا...... اس لیے اسے پُرسکون کرنے کے لیے بڑے نرم اور مہربان لہجے میں بات کی...... جس کا ساحل پر خاطر خواہ اثر ہوا...... قدرے اعتماد بحال ہوا......
ٹیبل صاف کرنے کے بعد وہ ہچکچاتا ہوا تاجور کے مقابل بیٹھ گیا۔
''آئی ایم سوری...... یہ کسی کے گھر بغیر اطلاع کے جانے کا مناسب وقت تو نہیں ہے مگر آپ کو پکڑنے کے لیے اس سے زیادہ اچھا وقت نہیں ہو سکتا تھا۔ لیٹ آورز میں، میں رسک نہیں لے سکتی...... کیونکہ مجھے نہیں پتا آپ اگر لیٹ گھر آتے ہوں گے تو کتنا لیٹ آتے ہوں گے ویسے بھی آپ جیسے نان سیریس، غیر ذمے دار لڑکوں کا اصل میں کوئی گھر نہیں ہوتا۔ وہ چند گھنٹے ایک چار دیواری میں ریسٹ کرنے آتے ہیں اور اس ریسٹ ہاؤس کو ہی اپنا گھر کہتے ہیں۔'' تاجور مہربان و دھیمے لہجے میں جس طرح عتاب برسا رہی تھیں، ساحل سکتے کی کیفیت میں بیٹھا وہ سب سنا کیا نظر اٹھا کر دیکھنے کا یارا نہ تھا۔

(جاری ہے)

"میں اب مزید اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔"
فیصلہ کن انداز میں کہہ کر اس نے ننھے حماد کو اٹھا کر کندھے سے لگایا۔ دوسرے کندھے پر کپڑوں اور دیگر ضروری چیزوں سے بھرا بیگ لٹکایا جو رات یقیناً جانے کے خیال سے ہی پیک کر کے رکھا گیا تھا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔

"خیر تو ہے، بہو! صبح صبح اکیلی کہاں جا رہی ہو؟"
ناشتا بناتی نفیسہ بیگم نے حیرانی سے اس کے اس انداز کو دیکھا اور پوچھے بغیر نہ رہ سکیں۔

"یہ تو آپ اپنے بیٹے سے پوچھیے گا۔" وہ تڑخ کر بولی اور بیرونی دروازہ پار کر گئی۔

نفیسہ بیگم نے پریشان ہو کر چولہا بند کیا اور جلدی سے بیٹے کے کمرے کی جانب چلی آئیں، جہاں عادل کو دونوں ہاتھوں سے سر تھامے دیکھ کر حقیقتاً بے حد

# فرق

ام ایمان



پریشان ہو گئیں۔

''کیا بات ہے بیٹا، اتنی صبح تمہاری بیوی بھی ناراضی میں گئی ہے، تم الگ سر تھامے بیٹھے ہو۔ کچھ بتاؤ کیا ہوا، مجھے تو ہول اٹھ رہے ہیں۔'' وہ روہانسے لہجے میں کہتے ہوئے اس کے برابر بیٹھ گئیں۔

''آپ نے اپنی بیٹی کا گھر بسانا تھا اماں......! وہ بس گیا، میرا کیا ہے زندگی جتنی بھی ہے رو پیٹ کے گزر ہی جائے گی۔ اور جہاں تک آپ کی بہو بیگم کی ناراضی کا سوال ہے تو وہ کوئی نئی بات تو ہے نہیں کہ آپ فکر مند ہو رہی ہیں۔ ہفتے میں ہر دوسرے دن تو یہ ڈراما چلتا ہے، اب تو آپ کو عادی ہو جانا چاہیے۔ غصہ اتر جائے گا تو آ جائے گی واپس۔'' اس نے رنجیدگی سے کہا تو نفیسہ بیگم کا دل کٹ کے رہ گیا۔

''مجھے معاف کر دے میرے چاند...... میرا اپنا دل بہت کڑھتا ہے تیرا یہ حال دیکھ کے...... جس بیٹی کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ پیا تھا خوش تو وہ بھی نہیں ہے۔ بس پتا نہیں عقل پر پتھر پڑ گئے تھے یا نصیب کے ہی کھیل تھے۔'' وہ دوپٹا منہ پر رکھ کر پھپک کر رو دیں تو عادل بے حد گھبرا گیا۔

''اماں...... اماں آپ حوصلہ کریں انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ اماں کی طبیعت کے خراب ہونے کے پیشِ نظر انہیں تسلی دیتے ہوئے بولا۔ پتا تھا کہ ذرا سا اسٹریس لینے پر ان کا بلڈ پریشر بہت شوٹ کر جاتا تھا۔

''آئیں ہم ماں، بیٹا کچن میں چلتے ہیں اور آج میں اپنی پیاری سی اماں کو ناشتا اپنے ہاتھوں سے بنا کر کھلاتا ہوں۔'' وہ اماں کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولا تو اس کا...دل رکھنے کی خاطر وہ قصداً مسکرا کر اس کے ساتھ کچن میں چلی آئیں ورنہ دل تو اب بھی قسمت کی ستم ظریفی پر کڑھ رہا تھا۔ وہ اپنے شاندار بیٹے کو دیکھے گئیں کہ کیا وہ اس گنوار لڑکی کے قابل تھا؟ لیکن ماں اور بہن کی خاطر اس نے اپنے ارمانوں کا خون کر کے یہ قربانی دی تھی لیکن آج جب ان کی بیٹی ہی خوش نہیں تھی تو انہیں ہر وقت یہ خیال ستاتا تھا کہ انہوں نے بیٹی کی خوشی کے لیے اپنے بیٹے کی زندگی برباد کر دی۔

☆☆☆

نفیسہ بیگم کے فقط دو ہی بچے تھے عادل اور دعا...... دعا، عادل سے پانچ سال چھوٹی تھی......

حیات صاحب ان کے شریکِ حیات ہیڈ کلرک تھے۔ گھر میں بہت خوشحالی نہ سہی تنگدستی بھی نہ تھی وجہ ان دونوں میاں بیوی کا قناعت کی دولت سے مالا مال ہونا تھا۔ ان کی یہ عادت بچوں میں بھی آئی تھی۔ حیات صاحب کے چھوٹے بھائی امان ایک امیر گھرانے کی عورت بیاہ کر لائے اور ساری زندگی اس کی امارت کے بوجھ تلے دب کر گزار دی کہ بینک میں ان کی اکاؤنٹنٹ کی نوکری تھی ان کے بھی دو ہی بچے تھے۔ بیٹے طلحہ کو پڑھائی میں دلچسپی تھی اس نے تعلیمی مدارج کو طے کرتے ہوئے جونہی بینک میں جاب حاصل کی دونوں بھائیوں نے مل کر طلحہ اور دعا کا رشتہ طے کر دیا اگرچہ دعا ابھی فرسٹ ایئر میں تھی۔ جبکہ امان صاحب کی بیٹی کو پڑھائی میں چنداں دلچسپی نہیں تھی یہ مشکل مڈل پاس کیا اور پارلر کا کورس کرنے لگی۔ زبان کی دھار ماں رقیہ بیگم کی طرح تیز اور طور طریقوں اور انداز و اطوار میں ماں کی پرتو تھی۔ وہ بیٹی کا رشتہ اپنے میکے میں کرنے کی خواہاں تھیں جبکہ دعا کا رشتہ لینے میں بھی پس و پیش سے کام لیا تھا لیکن ساری زندگی ہر معاملے میں دب کر رہنے والے ان کے مجازی خدا اس معاملے میں اڑ گئے تھے۔ اور طلحہ کا نکاح دعا سے کروا کے ہی دم لیا تھا۔ دعا ابھی سیکنڈ ائیر میں تھی اور عادل نے ابھی ایم بی اے کا اسٹارٹ ہی لیا تھا کہ حیات صاحب کو دفتر میں بیٹھے، بیٹھے دل کا دورہ پڑا اور وہ جان لیوا ثابت ہوا۔ نفیسہ بیگم نے جہاں بیوگی کا پہاڑ جیسا دکھ سہا وہاں بچوں کی یتیمی کا غم انہیں چین نہ لینے دیتا۔ وہ تو شکر تھا کہ گھر ان کا اپنا اور ڈبل پورشن کا تھا۔ جبھی ایک حصہ کرائے پر اٹھا دیا تھا۔ ورنہ میاں کے بعد معاشی طور پر بہت سے مسائل کا شکار تو ہوئیں لیکن

بچوں کی پڑھائی میں رکاوٹ نہ پیدا ہونے دی۔ عادل نے بھی ٹیوشنز پڑھانی شروع کر دی تھیں۔ دعا کا ایف ایس سی مکمل ہو چکا تھا۔ اب وہ بی ایس سی میں داخلہ لینے کے لیے بضد تھی لیکن چچا جان شادی پر زور دے رہے تھے کیونکہ وہ اپنی بیگم کے بدلتے تیور نوٹ کر رہے تھے۔ جن سے کوئی بعید نہیں تھی کہ اچھا بھلا رشتہ ختم کر دیتیں کیونکہ آج کل اٹھتے بیٹھتے ہی سناتیں کہ پتا نہیں کن ٹٹ پونجیوں سے رشتہ جوڑ لیا جو بیٹی کو ایسا جہیز ہی نہ دے سکیں کہ جو اُن کے رشتے داروں میں ان کی ناک اونچی کر دیتا۔ بقول ان کے اگر وہ اپنے خاندان سے بیٹے کا رشتہ لاتیں تو ٹرک بھر، بھر کے ان کے گھر جہیز آتا۔ سو دعا کی مزید پڑھنے کی خواہش سے نظر چرا کر نفیسہ بیگم کو شادی کے لیے ہاں کرنی پڑی۔ خاوند کے ملنے والے واجبات جو بینک میں اسی مقصد کے لیے رکھوائے تھے کہ بچوں کی شادی میں کام آئیں گے اس سے اپنی حیثیت سے بڑھ کر بیٹی کو جہیز اور ضرورت کی ہر چیز دے کر رخصت کیا کیونکہ دیورانی کی حریص اور لالچی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھیں۔ طلحہ کے ساتھ کے خواب اس نے اسی روز سے بننے شروع کیے تھے جب پہلی بار اپنے نام کے ساتھ اس کا نام سنا تھا سو آنکھوں میں بے شمار روپہلے سپنے لیے وہ پیا آنگن اتری تھی۔ طلحہ کو بھی اپنی نازک اور پیاری سی یہ کزن دل و جان سے عزیز تھی۔ وہ بھی اس کا ساتھ پا کر بے حد مسرور تھا۔

زندگی کے بھی رنگ ویسے نہیں ہوتے جیسے آنکھ سپنوں میں دیکھتی ہے بلکہ حقیقت میں زندگی ان رنگوں پر جب تلخی اور دکھ کا خول سجا کر سامنے لاتی ہے اور قہقہہ لگا کر کہتی ہے کہ سپنے وہ نہیں تھے جو تم نے دیکھے تھے بلکہ سپنوں کی تعبیر یہ ہے جو نظر آ رہی ہے تو آنکھ دکھ سے اشک بار بھی نہیں ہو پاتی اور دکھ ساکن ہو کر اس آنکھ کا حصہ بن جاتا ہے۔ دعا کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔ وہ ماں، باپ کی شفقت اور محبتوں بھرے سائے میں پروان چڑھی تھی۔ جتنا پُرسکون اور محبتوں بھرا ان کے گھر کا ماحول تھا اگلے گھر بھی وہ اسی ماحول اور اسی فضا کی متمنی تھی لیکن یہاں قدم دھرتے ہی پہلے قدم پر تو طلحہ کی محبتیں اسے اڑا کر آسمان تک لے گئیں لیکن رقیہ بیگم اور ان کی بیٹی کو بیٹے کا بہو سے یہ التفات ذرا نہ بھایا تھا۔ انہوں نے دعا کو محبتوں بھرے آسمان سے اتارنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگایا تھا۔ شادی کے دوسرے ہی روز جب آئینے کے سامنے بیٹھی وہ اپنی قسمت پر نازاں ہو کر مسکرائی تھی تو تقدیر اس کی اس خوش فہمی پر مسکرا دی تھی۔ دروازہ اتنی زور سے... دھڑ دھڑایا گیا کہ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی اور جلدی سے آگے بڑھ کر چٹخنی گرائی جہاں اپنی نند نازیہ جو کزن بھی تھی کو کھڑا شعلہ بار نگاہوں سے خود کو دیکھتا پا کر مزید گھبرا گئی۔

”جلدی سے باہر آؤ تمہیں امی بلا رہی ہیں۔“ حکم دینے والے انداز میں پیغام دے کر وہ چلی گئی۔ دعا نے دوپٹا صحیح کر کے اوڑھا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ ایک دن کی دلہن کو اس طرح اکیلے جانا شرم سے دو چار کیے دے رہا تھا لیکن بہر حال جلدی سے اپنی ساس جنہیں وہ چچی کہتی تھی کہ کمرے میں داخل ہوئی جہاں وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے تکیوں کے سہارے نیم دراز نظر آئیں جبکہ ان کے دائیں جانب نازیہ.... بے نیازی سے اپنے ناخن فائل کرنے میں مصروف تھی۔

”آ گئیں تم ...... بیٹھو۔“ اس کی ساس نے ہنکارا بھر کے کہا۔

”دیکھو بی بی، تم کوئی ننھی بچی تو ہو نہیں کہ بتایا جائے کہ بھرا پُرا گھر ہے۔ جوان بیٹی ہے یہاں تو اتنی دیر تک تمہارا کمرے میں بند رہنا ہمیں پسند نہیں آیا نہ ہی آئندہ ایسے چلے گا۔ صبح سویرے ہم سب کے بیدار ہونے سے پہلے کچن میں پہنچ جایا کرو، میں صبح، صبح بیڈ ٹی پینا پسند کرتی ہوں، اس کے بعد تمہارے چچا نے اور طلحہ نے کام پر جانا ہوتا ہے تو ان کو ناشتا جلدی چاہیے ہوتا ہے، نازیہ کو دودھ اور سیب دے دیا کرو۔ یہ ناشتا ذرا دیر سے کر کے پھر پارلر جاتی ہے، ہمارے کوئی دس بارہ

بیٹے تو ہیں نہیں بس ایک ہی ایک ہے تو تمام تر توقعات بھی اسی سے اور اس کی بیوی سے ہیں۔" وہ اپنا حکم نامہ روانی سے جاری کرتے ہوئے مسلسل اسے دیکھ رہی تھی۔ "ہمیں تو بہت لوگ رشتہ دینے کے لیے تیار تھے وہ تو ہم نے کہا بھئی اپنی ہو، یتیم ہو، ہم سر پر ہاتھ نہیں رکھیں گے تو اور کون رکھے گا۔" اب ان کے لہجے میں غرور بھی در آیا تھا جس نے دعا کے حواس مزید گم کیے۔ وہ کم از کم آج کے دن اپنے ساتھ اس قسم کے سلوک کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو... بمشکل پیچھے دھکیلا اور دھیان دوبارہ سے ان کی باتوں کی طرف لگایا جواب ان نوازشات کے نام گنوا رہی تھیں جو دوسروں کے ہاں رشتہ کرنے کی صورت میں ان کے بیٹے کو ملنی تھیں بقول ان کے بعض لوگوں نے تو انہیں جہیز میں کوٹھی، کار کی بھی آفر کی تھی لیکن انہوں نے احسان کیا تھا جو اس غریب لڑکی کو بیاہ کر لائی تھیں۔

دعا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ جواب میں کیا کہے ان کی اس تقریر کو کن الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرے، نازیہ اس دوران اپنے کام میں بدستور محو رہی۔

"اچھا چچی...... میں ناشتا بنا لوں۔" وہ آہستگی سے کہتی اٹھی اور کچن میں آگئی۔ ایک دو دفعہ یہاں آچکی تھی تو یاد تھا ورنہ اسے تو گھر دکھانے کی زحمت بھی کسی نے نہیں کی تھی۔ ناشتا کرنے کے لیے سب ٹیبل پر بیٹھے ہی تھے کہ اماں اور عادل بھائی اس کا ناشتا لے کر چلے آئے جنہیں دیکھ کر اس کی آنکھیں بے ساختہ بھیگی تھیں۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ میکے سے آنے والی گرم ہوا بھی ٹھنڈی لگتی ہے یہ تو پھر اس کی جان سے پیاری اماں اور عزیز از جان بھائی تھے۔ چچا اور طلحہ دونوں بہت گرمجوشی سے ملے البتہ چچی اور نازیہ کا رویہ لیے دیے والا رہا۔ جنہیں محسوس کر کے وہ لوگ بھی جلد ہی اٹھ گئے تھے۔

شام کو ولیمہ تھا۔ نازیہ نے ہی اسے گھر پر ہی تیار کیا تھا۔ آج بھی اس جوڑی کو سراہا جا رہا تھا۔ طلحہ کی رفاقت کا خیال وقتی طور پر اسے سب بھلا گیا اور رات گئے فنکشن سے فارغ ہونے کے بعد گھر آ کر تھک کر ایسے سوئے کہ صبح کی ہی خبر لائے۔ دعا میں فطری طور پر معصومیت اور سادہ پن تھا اور سب سے بڑی بات اپنی ماں کو مزید دکھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی سو جیسا اور جو کچھ اسے رقیہ بیگم کہتیں بلا چون و چرا... مان لیتی۔ جز وقتی ملازمہ کی دعا کے آتے ہی چھٹی کر دی گئی۔ چچا نے تو حرفِ وعدہ نبھایا تھا اور ان کے خیال میں بھائی کی روح کے آگے سرخرو ہو گئے تھے، ان کی بیگم دعا سے جیسا سلوک روا رکھتیں انہیں اس کا کوئی علم نہیں تھا اگر نظر بھی آتا تو قصداً نظرانداز کر جاتے کیونکہ بیوی کے تیز مزاج کے سبب خائف رہا کرتے تھے۔ ہاں، طلحہ کا فرحت انگیز ساتھ تھا جو اسے ہمت بندھاتا، اس کی ہمت بندھاتا اور وہ ہر قسم کے حالات میں سرنڈر کیے رہی۔ مہینے میں کہیں ایک آدھ بار ہی اماں کے گھر جانے کی اجازت ملتی وہ بھی ہزار حیلوں، بہانوں کے بعد ورنہ اس کی ساس کے خیال میں گھر بسانے والی بہویں روز میکے نہیں جاتیں۔ انہی دنوں جہاں اسے اپنے اندر نئی تبدیلی کا احساس ہوا وہاں عادل بھائی کی نوکری ملنے کی خوشی نے اسے مسرور کر دیا۔ نازیہ کا رشتہ آج کل اس کے ماموں زاد سے ہونا متوقع تھا سو وہ خوب اترائی پھر رہی تھی۔ موبائل پر سارا سارا دن اس سے بات چیت ہوتی۔ دونوں ماں، بیٹی کبھی شاپنگ کرنے نکل جاتیں تو کبھی دعا سے اسٹور روم میں پیٹیاں کھلوا کھلوا کر جمع کیے گئے جہیز کا ازسرِنو جائزہ لیا جاتا لیکن یہ تھا کہ آج کل ان دونوں کی طرف سے طنز و حقارت کا سلسلہ کچھ کم تھا، دعا اسی میں بہت خوش تھی کیونکہ آج کل اس کی اپنی طبیعت ٹھیک نہیں تھی جی ہر وقت متلایا، متلایا رہتا، کھانا پکانے کھڑی ہوتی تو سالن کی بو ایسے دماغ گھماتی کہ الٹیاں کر، کر کے... بے حال ہو جاتی ایسے میں اس کی التجائیہ نظریں کبھی ساس اور کبھی اگر نازیہ پارلر سے گھر آگئی ہوتی تو اس کی طرف اٹھتیں کہ شاید وہ کام میں تھوڑی مدد کرا لیں کیونکہ ایسے میں ہمت بالکل جواب دے جاتی تھی۔

"بس کرو بی بی...... ایک انوکھا بچہ تم ہی تو پیدا نہیں کرنے جا رہیں جو اٹواٹی کھٹواٹی لیے پڑ جاتی ہو۔ ہم بھی تھے، بچے بھی پیدا کیے، چولھا چوکی بھی کی اور ساس، سسر کی بھی خدمت کی۔" یہ تو دعا بہت بہتر جانتی تھی کہ انہوں نے کتنی ساس، سسر کی خدمتیں کی ہوں گی... بہرحال بدتمیزی اس کی تربیت کا حصہ نہ تھی سو خاموشی سے اٹھ کر ادھورا کام سمیٹنے میں لگ جاتی...... ایسے ہی جانگسل بے شمار دنوں کے بعد رواج کے مطابق اماں اسے لینے آئیں تو اس کی ساس نے اسے بھیجنے سے انکار کر دیا بقول ان کے کہ جب تکلیف ہوگی چلی جائے گی ماں کے گھر۔ یہ کیا کہ مہینہ پہلے ہی منہ اٹھا کر چل دیا جائے...... آج کل وہ زمانے گئے جب ایسی خرافات ہوتی تھیں۔ اماں جہاں اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھیں وہاں دعا کی آنکھیں بھی اپنی ماں کی اس بے عزتی پر بھر آئی تھیں اس نے بے ساختہ نظر اٹھا کر طلحہ کو دیکھا کہ شاید وہ ہی کچھ اس کی حمایت میں بولیں لیکن انہوں نے بھی یہ کہہ کر ہری جھنڈی دکھائی۔

"ہاں، ہاں تائی اماں...... امی ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں، دعا ماشاء اللہ ٹھیک ہے، جب ڈلیوری ڈیٹ آئے گی تو میں خود ہی اسے چھوڑ جاؤں گا۔" اماں نے اسے بہت پیار کیا اور دل گرفتہ ہو کر گھر واپس چلی گئیں۔

وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا کہ دعا نے طلحہ کے جاتے ہی واشنگ مشین لگائی ہوئی تھی۔ چھت پر دھلے کپڑوں سے بھری بالٹی لے کر جاتے ہوئے کمر میں شدید اینٹھن کا احساس ہوا اتنا زیادہ کہ بالٹی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ بڑی مشکل سے آدھی سیڑھیوں سے وہ واپس آئی تو جسم پسینے میں شرابور تھا۔ اس نے اپنی ساس کو اپنی طبیعت کا بتایا اور پاس بیٹھی نازیہ سے کہا کہ طلحہ کو فون کرے تاکہ اسے اسپتال لے جایا جاسکے۔ اور خود نڈھال سی صوفے پر بیٹھ گئی۔ نازیہ اٹھ کر فون پر نمبر ملانے لگی۔ جبھی ساس کی کرخت آواز گونجی۔

"نازیہ اپنے بھائی کو مت فون کرو ابھی تو دفتر جانے کے لیے نکلا ہے، راستے میں خواہ مخواہ پریشان

## دانش مند کون ہے

☆ڈاکٹر مریض سے: "تم دوا ہلا کر لیتے ہوناں......"

مریض: "نہیں۔"

ڈاکٹر۔ "کیوں نہیں؟"

مریض معصومیت سے۔ "وہ جی ڈاکٹر صاحب ہلانے سے دوائی چمچے سے گر جاتی ہے پھر زمین سے چاٹنا اچھا نہیں لگتا۔"

☆☆☆

☆مریض، حکیم سے۔ "مجھے عجیب سی بیماری ہوگئی ہے جب میری بیوی بولتی ہے تو مجھے کچھ سنائی نہیں دیتا۔"

حکیم۔ "یہ بیماری نہیں تم پر اللہ کی رحمت ہے۔"

مرسلہ: زرین زبیر کوٹھاری، کراچی

ہوگا، تم ایسا کرو اس سے نمبر لے کر اس کے بھائی کو فون کرو، وہ اسے اسپتال لے جائے۔" ساس کی بات پر زندگی میں پہلی بار اسے ایسی شقی القلب عورت سے نفرت محسوس ہوئی۔ اس کے نمبر بتاتے ہی نازیہ نے عادل بھائی کو کال کی تقریباً آدھے گھنٹے بعد افتاں و خیزاں عادل بھائی گھر میں داخل ہوئے اور اس کی غیر حالت دیکھ کر ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ خیر کسی طرح اسپتال پہنچے جہاں ڈاکٹرز نے اس کے لیے فوری آپریشن تجویز کیا تھا تو عادل بھائی بے طرح گھبرا گئے انہوں نے فوراً طلحہ سے رابطہ کیا اور صورت حال سے آگاہ کیا اس کی حالت کا سن کر طلحہ بھی فوراً ہی چلا آیا اور بگڑنے لگا کہ اسے پہلے کیوں نہ اطلاع دی گئی۔ عادل بھائی نے ساری تفصیل سے آگاہ کیا کہ انہیں کچھ پتا نہیں وہ تو آفس پہنچے ہی تھے کہ نازیہ کی کال آئی... بہرحال طلحہ ازحد پریشان تھا اور آپریشن تھیٹر کے باہر ٹہل رہا تھا۔ جبھی ایک نرس نے آکر اس کا نام پکارا اور ایک گلابی سی گڑیا طلحہ کو تھما گئی کہ مبارک ہو بیٹی ہوئی ہے۔

بچی کو دیکھ کر باپ اور ماموں دونوں تھوڑی دیر پہلے کی پریشانی بھول گئے۔ عادل، دعا کی خیریت پتا کرنے کے بعد سیدھا اماں کو لینے بھاگا جبکہ طلحہ نے اپنے گھر اپنی امی کو کال کر کے خوشخبری دی۔

''امی بیٹی ہوئی ہے۔''

''ہاں، ہاں...... مجھے پتا تھا ایسی رونی صورت صرف بیٹیاں ہی پیدا کر سکتی ہیں۔'' سنتے ہی انہوں نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں تمہارے ابا کو بتا دوں گی۔'' کہہ کر ٹھک سے فون بند کر دیا۔ اسپتال سے ڈسچارج ہوتے ہی اماں اور عادل بھائی اسے گھر لے آئے۔ بچی ایک ہفتے کی ہو چکی تھی ابھی تک اس کی دادی اور پھوپی تشریف نہیں لائی تھیں۔ ہاں دادا ضرور آئے تھے دوسرے دن بچی کے لیے بہت سے تحائف لے کر اور جاتے سمے دعا کو چپکے سے ہاتھ میں پانچ ہزار پکڑا گئے تھے۔ طلحہ البتہ روزانہ چکر لگاتا، آفس جانے سے پہلے اور واپسی پر بھی...... انہوں نے اپنی بچی کا نام عانیہ رکھا تھا۔

دسویں روز مارے باندھے اس کی ساس اور نند صاحبہ تشریف لے آئیں اور ایسے منہ بنائے بیٹھی رہیں جیسے دعا کی ذات پر بہت بڑا احسان کیا ہو۔

''کہتے ہیں پہلی بار بیٹی پیدا ہو تو آگے بھی بیٹیاں ہی ہوتی ہیں۔ آگے اللہ خیر کرے میرا تو ایک ہی ایک بیٹا ہے۔'' اس کی ساس کے منہ سے آتے ہی یہ پہلا فقرہ ادا ہوا تھا۔ بچی کی طرف نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا۔ دعا، اماں کو دیکھ کر رنجیدہ ہو رہی تھی جو اُن ماں، بیٹی کے آگے بچھی جا رہی تھیں۔ کھانے پینے کے لوازمات کا ڈھیر لگا دیا تھا لیکن ان دونوں نے صرف چائے پی کر ان پر گویا احسان کیا تھا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ چلی گئیں تو دعا نے سکون کی سانس لی لیکن آگے آنے والے دنوں کا تصور کر کے وہ افسردہ ہو گئی کہ بیٹی پیدا کر کے اپنی ساس کی دانست میں اس نے کوئی جرم تو کر دیا تھا اب پتا نہیں کیسی سزا سہنی تھی۔ ہاں اماں کو اپنی طرف سے مطمئن رکھنے کی کوشش کرتی کہ وہ وہاں بہت خوش ہے، طلحہ اور چچا جان اس کا بہت خیال کرتے ہیں۔ چچی زبان کی کڑوی ہیں پر دل کی بے حد اچھی ہیں۔

اماں کے گھر پر دن کیسے پر لگا کر اڑ گئے پتا ہی نہیں چلا۔ وہ تو طلحہ اسے ایک دن لینے چلا آیا تو اماں سے رخصت ہو کر وہ دوبارہ اسی سرد فضا میں لوٹ آئی لیکن یہ ہے کہ عانیہ کا ننھا وجود اسے کسی اور طرف دھیان ہی نہیں کرنے دیتا اس کی مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں۔ گھر کے کاموں کے ساتھ، ساتھ عانیہ کے بے شمار کام اپنی طرف توجہ دلوائے رکھتے۔ انہی دنوں چچی اور نازیہ کے خواب بری طرح چکنا چور ہوئے جب پتا چلا کہ چچی کے بھائی نے اپنے بیٹے کا رشتہ اپنے سے زیادہ امیر لوگوں میں طے کر دیا۔ اور لڑکے نے بھی نازیہ کو ہری جھنڈی دکھا دی۔ چچی تو اپنے بھائی اور بھابی کو خوب سنا کر آئیں اور ہمیشہ کے لیے تعلق توڑ دینے کی دھمکی بھی دے آئی تھیں ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ ان کے بیٹے سے پہلے اپنی نازیہ کا رشتہ اس سے بھی اچھے لڑکے سے طے کر کے دکھائیں گی۔

اگلے دن اس نے سب کو چائے دی اور اپنا کپ لے کر بیٹھی ہی تھی کہ چچی کی بات نے اس کے حواس گم کر دیے۔

''بات سنو لڑکی! آج تم چلی جاؤ اپنی ماں کے گھر اور اپنے بھائی سے نازیہ کی بات پکی کر آؤ۔ اگلے مہینے شادی کی ڈیٹ رکھ لیں گے۔'' انہوں نے اپنے مخصوص حکمیہ انداز میں کہا۔ دعا نے مدد طلب نظروں سے چائے پیتے طلحہ اور اپنے چچا جان کی طرف نگاہ کی۔

''ہاں، ہاں اس میں حرج تو کوئی نہیں، آخر تو عادل کو شادی کرنی ہی ہے تو جب گھر کی لڑکی موجود ہے تو دور کیوں جایا جائے۔'' طلحہ نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا تو دعا کچھ کہنے کے بجائے صرف ملامتی نظروں سے اس کی جانب دیکھ کر رہ گئی۔

گویا بالا ہی بالا سارا پروگرام طے کر کے اسے اب اطلاع دی جا رہی تھی۔

''اور ہاں...... جواب ہاں میں لے کر آنا ورنہ سوچ کر جانا کہ اس گھر میں مزید تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔'' کچن میں خالی کپ لے جاتی دعا کی

سماعتوں میں اس کی ساس کی کراری آواز نے زہر گھولا تو اس نے اپنی آنکھوں میں آئی نمی کو...... بے ساختہ پیچھے دھکیلا پتا تھا کہ ان کی فیملی کی زندگی کی بساط اس کی چچی نے بچھائی تھی۔ جہاں وہ اپنی مرضی کے سہرے سجاتی اور اٹھاتی تھیں اور اپنے حسبِ مرضی کھیل میں جسے چاہتی شہہ دیتیں جسے چاہے مات...... وہ یہ بھی جانتی تھی کہ گردشِ ایام نے اس کی اماں کو اپنے جال میں کچھ ایسا پھانسا تھا کہ وہ اس سے نکلنے کے لیے بے حال ہو گئیں لیکن پھر اللہ کی رضا پر راضی ہو گئیں...... ان کے لیے ہر خوشی ان کی اولاد سے وابستہ تھی، اسے یقین تھا کہ چچی ہر بار کی طرح اس بار بھی اپنی منوا کر دم لیں گی کہ ان کی بساط کا سب سے اہم مہرہ دعا کی صورت تھا جسے اپنی مرضی سے چلا کر وہ من پسند مقاصد حاصل کرتی تھیں۔

سو دل نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اماں کے پاس جب اپنی ساس کی مرضی بلکہ حکم لے کر گئی تو اماں چپ کی چپ بیٹھی رہ گئیں، تصور میں بیٹے کا بانکا سجیلا سراپا در آیا جسے اپنے ایک دوست کی بہن پسند آگئی تھی اور وہ اپنی بات دو دن پہلے اماں سے منوا بھی چکا تھا اور دعا کے آنے پر رشتہ لے کر جانا مقصود تھا۔ دعا تو آئی تھی ساتھ ہی جو حکم لائی تھی اس حکم کے نہ ماننے کی صورت میں بیٹی کی زندگی کے بسنے یا اجڑنے کا دارومدار تھا اور مان لینے سے بیٹے کے دل کی بستی اجڑتی، عادل کی دفتر سے واپسی پر اماں نے کھانا کھلانے کے بعد سارا معاملہ اٹھا کر اس کے سامنے رکھا جسے سن کر عادل تو ایک لمحے کو چکرا گیا تھا لیکن جب نظر ایک طرف بیٹھی بہن کی سرخ آنکھوں اور پژمردہ چہرے پر پڑی وہاں فیصلہ ایک لمحے میں ہو گیا جب دل کا مکین وہ نہیں جو وہ چاہتا تھا تو کوئی بھی ہو اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ اٹھ کر دعا کے قریب آیا اس کے سر پر ہاتھ پھیرا ہی تھا کہ دعا اٹھ کر اس کے سینے سے لگ کر رو دی۔ ضبط کے بندھن جیسے ٹوٹ گئے۔ عادل نے بہ مشکل خود پر ضبط کیا اسے آہستگی سے الگ کر کے بٹھایا اور خود بھی اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''اماں آپ چچی کو ہاں کہلوا بھیجیں اور جیسا کہتی ہیں ویسے کیجیے...... ہاں بھئی عانی گڑیا ماموں کی شادی پر کیسے کپڑے پہنے گی۔'' بھانجی کو گدگدا کر وہ کہنے لگا تو دعا نے ایک پیار بھری نظر اپنے دلارے پر ڈالی اور اس کی دائمی خوشیوں کے لیے دعا کی۔ آگے کے معاملات تیزی سے طے ہوتے چلے گئے۔

نازیہ دلہن بن کر اس گھر میں آگئی تھی لیکن نہ تو اس کے مزاج کا رنگ بدلا نہ طور اطوار...... دن چڑھے تک سونا اس کا معمول تھا۔ عادل کے لیے بدستور ناشتا اماں بناتیں اور وہ آفس روانہ ہو جاتا۔ نازیہ جب اٹھتی اماں اس کے لیے الگ سے تازہ ناشتا بناتیں، ناشتے کے بعد وہ تیار ہو کر اپنی امی کے ہاں چلی جاتیں جہاں سے اس کی واپسی عادل کے واپس آنے سے ذرا پہلے ہوتی۔ شادی کے تین ماہ تک یہی دستور رہا۔ ایک دن عادل نے دبے لفظوں میں اسے اس کی گھریلو ذمے داریوں کا احساس کیا دلایا کہ گھر میں جیسے ایک طوفان برپا ہو گیا۔ اس نے اپنی ساس کو وہ سنائیں کہ وہ بیچاری خود پریشان ہو کر عادل کو ٹوک بیٹھیں کہ وہ اسے آئندہ سے کچھ نہ کہے...... عادل جو بہت غصے کی حالت میں تھا ماں کے سمجھانے بجھانے پر اور شاید بہن کا خیال کر کے چپ رہ گیا تھا۔ اس دن کے بعد سے نازیہ کو مزید شہہ مل گئی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے اٹھتی، سوتی اور مرضی آنے پر ماں کے گھر چلی جاتی...... ماں بننے کی خوشخبری نے اسے مزید عرش پر چڑھا ڈالا۔ خود ساختہ بیڈ ریسٹ اس نے اپنی ڈلیوری تک جاری رکھا اور بیٹے کو جنم دے کر گویا ساتویں آسمان پر جا بیٹھی...... اماں کی ذمے داریاں بہو آنے سے زیادہ ہی ہوئی تھیں اور پوتے کو تو صرف دودھ پلا کر اس کی ماں احسان کرتی تھی، وہ دادی کے پاس ہی ہوتا، نازیہ کی کارگزاریاں وہی تھیں۔ عادل اس سلسلے میں کچھ بھی نہ کر سکا بس خود ہی کڑھتا رہتا۔ نتیجتاً اس نے پارٹ ٹائم جاب کر کے خود کو مصروف سے مصروف کر ڈالا۔

گھر میں دو تین دن سے بدمزگی کی فضا طاری تھی اب کے پتا نہیں بہو بیگم کے مزاج کس بات پر بگڑے،

بگڑے سے تھے اور صبح کے وقت ہی وہ حماد کو لے کر روٹھ کر چلی گئی تھی۔ لیکن جب عادل نے دھیرے سے اس کی خواہش کا بتایا تو اماں کا چہرہ دھواں، دھواں ہوگیا۔ بقول نازیہ اسے اس گھر میں آزادی نصیب نہ تھی اس کے ہر کام کی نگران اس کی ساس تھیں تو اس قدر پابندیوں میں اس کا دم گھٹتا تھا اس نے عادل سے الگ گھر لینے کا مطالبہ کیا تھا اور آج تک ہر بات خاموشی سے سہتا ہوا عادل اس بات پر آکر اڑ گیا اور اسے کہا تھا کہ وہ بخوشی یہ گھر چھوڑ کر جاسکتی ہے لیکن وہ اپنی بوڑھی ماں کو زمانے کے دھکے کھانے کے لیے اکیلا نہیں چھوڑے گا۔

دعا کے لیے حالات مزید کشیدہ ہوگئے جب پتا چلا نازیہ بی بی اس دفعہ پھر خفا ہو کر آئی ہیں لیکن وہ کیوں گھر چھوڑ کر آئی تھی یہ اسے آج اس کی ساس کی زبانی پتا چلا تھا، جب وہ کچن میں کھانا بنا رہی تھی تو لاؤنج سے بلند آواز میں اس کی ساس نے جتایا تھا کہ

”عادل آخر اتنا کماتا کس لیے ہے؟ کیا ہے اگر بیوی کی چھوٹی سی خواہش پوری کردے گا۔ اس کی ماں کون سی معذور، لاچار ہیں جو الگ نہیں رہ سکتیں؟“

”تو آپ کون سی لاچار، معذور ہیں جو میرے بغیر ایک دن بھی گزارنا محال ہوجاتا ہے۔“ اس نے کڑھتے ہوئے دل میں سوچا اور جب سے عادل کا پتا چلا تھا کہ اس نے دوٹوک اس کی خواہش ماننے سے انکار کردیا ہے، اس کے دل میں عجیب سی خوشی کا احساس جاگا تھا۔ پتا نہیں کیسی ماں، بیٹی ہیں جن کے اصول خود کے لیے کچھ اور دوسروں کے لیے کچھ اور تھے۔ اس کی ساس اس کا مہینے میں ایک دفعہ بھی میکے جانا ناپسند کرتیں اور اپنی بیٹی کا چہرہ اگر کسی روز دیر سے نظر آتا تو انہیں اس کی ساس سے ڈھیروں شکوے ہونے لگتے کہ ضرور اسی نے نہیں آنے دیا ہوگا۔ دعا کی شادی کے بعد نوکرانی کو ہٹالیا گیا تھا جبکہ نازیہ غلطی سے ہی کسی کام کا ذکر کردیتی کہ اس نے کیا تھا تو اس کی ساس کو ڈھیروں صلواتیں سنائی جاتیں۔ اپنے بیٹے کا سسرال جانا انہیں کھٹکتا تھا اور اسے دعا کو باہر سے ہی چھوڑ آنے کا حکم نامہ جاری کرتیں اور داماد کے لیے قلق رہتا کہ وہ کیوں ان سے اتنی اجنبیت برتتا ہے ضرور ماں کی سکھائی گئی پٹی ہوگی۔ دعا نے تو اب کسی حد تک ان باتوں کا اثر لینا ہی چھوڑ دیا تھا...... پتا تھا کہ ایسے جان لیوا اعصاب شکن حالات میں اسے ان باتوں کا یا تو مقابلہ کرنا ہوگا یا نظر انداز کرنے کی پالیسی اپنانی ہوگی۔ مقابلہ کرتی تو کس برتے پر، مقابلہ تو دو برابر کے لوگوں کا جچتا ہے یہاں نہ وہ عمر میں ان کے برابر تھی نہ رشتے و مرتبے میں ہم پلہ......

نظر اندازی کی اس پالیسی نے اسے عجیب سی طمانیت بخشی تھی۔ وہ اپنی بچی میں مصروف رہتی جبکہ اپنے تمام ہتھیار آزمانے کے بعد چچی جان اسے اتنا پرسکون دیکھ کر آگ بگولا رہ جاتیں پتا نہیں اسے روتا، چیختا اور دکھ تکلیف میں دیکھ کر انہیں کون سی تسکین ملتی۔

رات کو معمول کے مطابق اس نے کھانا ٹیبل پر لگایا۔ فریش ہو کر طلحہ نے عانیہ کو گود میں لیا اور ٹیبل پر آگیا۔ نازیہ بھی منہ سجائے بیٹھی تھی جب اس کی ساس نے دوبارہ موضوع چھیڑا۔

”میں نے بھی فیصلہ کرلیا ہے کہ اگر عادل، نازیہ کو الگ گھر نہیں دے گا تو دعا بھی یہاں نہیں رہے گی۔ اسے میں اس کے اونچی ناک والے بھائی کے پاس بھیجوں گی پھر پتا چلے گا کہ کس سے ٹکر لے رہا ہے۔“

گرم پھلکے کچن سے ٹیبل تک لاتی دعا جہاں یہ سن کر ٹھٹک کر رکی تھی وہاں عانیہ کے منہ میں نوالہ ڈالتا طلحہ بھی چونک کر سیدھا ہوا، چچا جان نے ہاتھ میں لیا نوالہ واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

”لیکن یہ تو زیادتی ہے، گھر میں اور ہے ہی کون بھابی جان کے سوا جس سے مقابلہ کررہی ہے نازیہ......“ چچا نے ناگواری سے سوال کیا۔

”آپ چپ رہیں جی، بڑے بھتیجے، بھابی کے ہمدرد آگئے ہیں، بیٹی کا دکھ نظر نہیں آتا، دو دن میں میری بیٹی کا یہ حال ہوگیا رو، رو کر ان کی لڑکی تو کرے یہاں

عیش اور میری بیٹی کو رلائیں وہ خون کے آنسو...... ایسا تو میں ہونے نہیں دینے والی۔'' چچی سینہ ٹھونک کر گویا میدان میں اتر آئی تھیں۔

''کون سے عیش کرا رہی ہیں آپ دعا کو یہاں اور ذرا ان مظالم پر بھی روشنی ڈالیے جو آپ کی بیٹی پر اس گھر میں توڑے گئے ہیں۔'' چچا نے بھی اب ذرا ہمت دکھائی اور ذرا کی ذرا نگاہ اٹھا کر دعا کے سفید پڑتے چہرے کو دیکھا۔

''آپ سے تو میں بات ہی نہیں کر رہی، میں اپنے بیٹے سے کہہ رہی ہوں۔'' چچی تڑخ کر بولیں۔

''سن رہے ہو طلحہ...... عادل کو فون کر کے بتا دو کہ ہفتے کے اندر، اندر نازیہ کو الگ گھر لے کر دے...... نہیں تو تم اس کی بہن کو بھیج رہے ہو اس کے گھر۔'' چچی نے ترپ کا آخری پتا پھینکا اور طلحہ سے مخاطب ہوئیں جس کے ماتھے کی رگیں غصے سے ابھر آئی تھیں۔ دعا اپنی قسمت کا فیصلہ سنانے والے ان ناخداؤں کے درمیان خود کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی، اسے اپنے اعصاب جواب دیتے معلوم ہوئے پتا تھا کہ اس سے اور عانیہ سے محبت کے تقاضے ایک طرف، طلحہ کو اپنی ماں سے علیحدہ محبت تھی اور آج تک ان کی ہر جائز و ناجائز مانتا آیا تھا۔ ایسی مشکل کی ہر گھڑی میں وہ ہمیشہ اپنی ماں کے ساتھ ہی اسے کھڑا ملتا تھا۔ اور وہ مشکلات کے گرداب سے خود ڈوب، ڈوب کر ہی ابھر آتی۔ اسے اپنے مجازی غمگسار نے کبھی ہاتھ سے پکڑ کر باہر نہیں کھینچا تھا تو آج کیسے کھینچ لیتا۔ اپنے بوجھل اعصاب کو سنبھالے اس نے کرسی کی پشت کو مضبوطی سے تھام لیا کہ جسم و جاں سے طاقت نچڑ سی گئی تھی، واہ میرے مالک، کیسے دستور ہیں زمانے کے کہ گرہستی کو بنانے اور نبھانے میں عورت اپنا لہو تک جلا ڈالتی ہے۔ اور دنیا والے اسے اسی گرہستی سے بے دخل کرنے میں ایک سیکنڈ بھی نہیں لگاتے۔

''بس کریں امی! بس کریں۔'' طلحہ نے ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''کیا بگاڑا ہے دعا نے آپ کا...... پہلے دن سے جو بیر باندھا ہے، ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔'' طلحہ پھٹ ہی تو پڑا۔ دعا کی سماعتوں میں اس کے خاوند کے یہ الفاظ جیسے امرت دھارا بن کر اترے تھے۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

''آپ کیا سمجھتی ہیں، میں اندھا ہوں یا کان نہیں رکھتا، اس کے ساتھ جیسا سلوک بھی آپ نے روا رکھا باوجود کچھ کہنے کی خواہش رکھنے کے میں نے آپ کو بھی کچھ نہیں کہا کہ اس کی اطاعت، خدمت گزاری، محبت آخر آپ کا دل جیت لے گی...... لیکن آپ نے تو اسے تختۂ مشق ہی بنا ڈالا۔ امی......! کیا آپ نہیں جانتیں کہ نازیہ کی یہ ضد سراسر غلط ہے، بجائے اسے سمجھانے کے آپ اور شہہ دیے جا رہی ہیں۔'' وہ غصے سے نازیہ کو دیکھ کر بولا۔

''لیکن میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ اگر نازیہ نے اپنی ضد جاری رکھی اور منوانے میں کامیاب ہو گی تو میں بھی دعا اور عانیہ کے ساتھ الگ گھر میں شفٹ ہو جاؤں گا۔'' ماں، بہن کو انگلی سے خبردار کرتے ہوئے وہ عانیہ کو اٹھا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ آج دعا کو اپنے رب سے بے پناہ شرمندگی محسوس ہوئی جس سے اس نے شکوے، شکایتوں کے ڈھیر لگا دیے تھے۔ یہ بھول گئی تھی کہ وہ دکھ دیتا ہے تو صبر بھی عطا کرتا ہے۔ وہ ظالم کی رسی دراز کرتا ہے تو مظلوم کو اجر بھی دیتا ہے۔ آج اسے پتا چلا تھا کہ چچی نے اپنی بساط کا اہم مہرہ اپنی بے جا زیادتی کے باعث ہار دیا تھا۔ وہ اللہ کی رضا پر راضی ہوئی تھی تو اللہ نے بھی اس کی ریاضتوں کا صلہ اس کے شوہر کے مضبوط ساتھ کی صورت میں دیا تھا۔ نازیہ اور چچی حیرت کے مارے گم صم بیٹھی تھیں، ان کے تصور میں بھی کبھی نہیں آیا تھا کہ طلحہ بھی کبھی ان کی من مانیوں میں رکاوٹ بن سکتا ہے، اسے چچی کا چہرہ ایک معزول حکمران کا سا لگا تھا۔ ان پر ایک نظر ڈال کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اپنا مان رکھے جانے پر اسے اپنے ہم سفر کا شکریہ ادا کرنا تھا اور اپنا گھر بچا لیے جانے پر اپنے رب تعالیٰ کے حضور سر بسجود ہونا تھا۔

مکمل ناول

# صُورِ محبت

بنتِ سحر

''یہ میں نے کیا کیا...... خدا کے مقام پر انسان کو رکھ لیا...... اور میں جانتی ہوں، وہ مجھے معاف نہیں کرے گا...... مگر نہیں...... وہ تو سب کو معاف کر دیتا ہے...... مجھ پر بھی معافی کی نظر ڈالے گا...... ناراض ہوگا' جانتی ہوں مگر روؤں گی، گڑگڑاؤں گی...... تب تک اس کی چوکھٹ نہیں چھوڑوں گی جب تک کہہ نہیں دے گا کہ جاؤ شہر بانو تمہارا گناہ میری رحمت کے آگے تنکے سے بھی ہلکا ہے......'' وہ ٹھوکر کھا رہی تھی......



# پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

| | | | |
|---|---|---|---|
| عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عُشنا کوثر سردار | اشفاق احمد |
| نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی |
| فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایتُ اللّٰہ التمش |
| قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابر راجہ | ہاشم ندیم |
| نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | مُمتاز مُفتی |
| نگہت عبدُاللّٰہ | سباس گُل | عنیزہ سید | مُستنصر حُسین |
| رضیہ بٹ | رُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیمُ الحق |
| رفعت سراج | اُمِ مریم | نایاب جیلانی | ایماے راحت |

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔



اور بار، بار کھا رہی تھی۔

دسمبر کی دھواں، دھواں شام شہر بانو بنت فرہاد کے لیے پردہ بن گئی ہے...... اور سفید دودھ میں نہائی دھند اطراف میں سفید دیواریں کھڑی کر رہی ہے۔

اس نے سرد ہوا میں گم ہوتے دوپٹے کو ڈھونڈا تھا...... اور پاگلوں کی طرح ڈھونڈا تھا...... اور سرد دسمبر کے اس سرد پہر میں شہر بانو بنت فرہاد پر جیسے منکشف ہوا تھا...... اور وہ تارکول کی برف جیسی ٹھنڈی سڑک پر منہ کے بل گری تھی...... ''بنت حوا کے وجود پر چڑھا کپڑا عزت ہوتا ہے......''

اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں...... نیم کے زرد پتے اڑتے پھر رہے تھے...... وہ اٹھی...... گرتی پڑتی رہی۔ اور پھر گرتے پڑتے وہ اس دوپٹے تک پہنچ ہی گئی...... اور اسے سارے وجود پر لپیٹتی وہ بھاگنے لگی تھیں۔

''اور ثابت ہوا آپ حیات سے قیمتی چیز عزت ہوتی ہے۔''

دھند میں چمکتے، جگمگ کرتے نیون سائن دور ہوتے جا رہے تھے۔

''شہر بانو...... تم میں کچھ ہے جو سحر طاری کرتا ہے...... تمہارے لفظ، تمہاری ادائیں......''

وہ خوش ہوتی تھی...... پہروں سوچتی مسکراتی رہتی...... اور فاران حیدر جال کی ڈوریاں کستا......

''جانے کیوں مجھے لگتا ہے تمہاری آنکھیں گہری سیاہ ہوں گی...... سمندر جیسی اور تمہاری آواز تو یوں لگتا ہے کسی مصری گلوکارہ کی طرح ہے۔''

اور اسے کچھ یاد آیا تھا...... ''اور وہ تو بہترین دوست ہے۔ مشکل میں انسان چھوڑ جاتے ہیں مگر وہ نہیں چھوڑتا......''

اس کے آنسو جیسے برف ہوگئے...... ٹھنڈے، سخت...... ''میں نے کیوں...... آخر کیوں خسارے کا سودا کرلیا...... خدا کو بھول بیٹھی اور بشر کا ورد کرلیا...... اور بشر کی چاہ تو خسارے دیتی ہے۔'' اور وہیں بھاگتے، بھاگتے اس نے نیم کے پیڑ سے ٹیک لگالی تھی...... نیم کے پتے بھی رونے لگے...... ٹپ...... ٹپ...... اس نے سنا...... کہیں دور پار سے آواز آرہی تھی۔

''تم پر لعنت ہو شہر بانو بنت فرہاد......''

یہ...... آواز تو آشنا سی تھی...... وہ جانتی تھی......! یہ اس کی خود کی ہی آواز تھی...... وہ خود ہی اپنے آپ پر لعنت بھیج رہی تھی...... قطار در قطار پھیلے نیم کے پیڑوں نے اس لڑکی کو گھٹنوں پر سر کیے روتے دیکھا تھا...... جو دھاڑیں مار، مار کر روتی جا رہی تھی......

''اور اللہ کو حق ہے کہ وہ میری آج عدالت لگائے...... مجھے کوڑے مارے جائیں...... مجھ پر لعنت کی جائے۔'' نیم کے پتوں پر ٹھہرا پانی گر، گر کر اس کے بالوں میں جذب ہونے لگا ہے۔

''ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرتا ہے ناں وہ...... تو اسے کہو مجھ پر بھی ایک نظر ڈال لے...... صرف ایک نظر۔'' ایک نظر کا سوال تھا...... عمر بھر کی ریاضت تھی...... اور صورِ محبت پھونکنے والوں کے وجود جلے...... بھڑکے...... اور برف ہوگئے۔

☆☆☆

''اس نے اگر کٹہرے میں کھڑا کرلیا اور کہا جان ڈالو ان کپڑے کے بتوں میں تو......؟...... میں تجھے آگے کردوں گی۔ پھر دیتی رہنا صفائیاں......'' کپاس کو کپڑے میں ٹانکا لگاتی وہ مسکرائی تھی...... ایسی مسکراہٹ جو سو رازوں سے بھری تھی...... ہزاروں بھیدوں میں قید تھی...... اماں نے سر اٹھایا تھا۔

''جان ڈالنے کا حق صرف اسے ہے...... ہم کیا اور ہماری اوقات کیا...... ہمارا تو روزگار بندھا ہے اس کام سے...... اتنا تو اسے بھی علم ہے۔'' جواب میں دلیل نہ تھی...... اِک اپنائیت سی تھی جیسے کسی اپنے کے بارے میں بات ہو رہی ہو۔

''اسے منانا کتنا آسان ہے ناں اماں......'' وہ سوچتی ہوئی منڈیروں پر اترتی دھوپ کو دیکھے گئی...... وہ چپ بیٹھی رہیں...... کسی گہرے کنویں جیسی سوچوں میں

غرق...... پھر چونکی تھیں۔

''بانو...... جلدی، جلدی ہاتھ چلا...... آج ہائی اسکول کے ساتھ والے اسکول میں کوئی فنکشن ہے...... بہت سے بچے ہوں گے...... امید ہے سارا مال بک جائے گا...... تو خیال سے گھر پر رہنا...... میں سہ پہر سے پہلے آجاؤں گی۔'' وہ سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

''دروازہ اچھی طرح بند کرلینا...... زمانے کا پتا تو ہے......'' دوبارہ اسے ٹوک گئی تھیں، شہر بانو نے تھکی، تھکی نظر پورے گھر کی طرف دوڑائی تھی...... بھلا کچھ تھا اس مرگھٹ میں جو چوری ہوجاتا...... کچی دیواریں تھیں جن کا لیپ اکھڑ کر مٹی ہوچکا تھا...... آنگن میں واحد امرود کا ٹھگنا سا درخت تھا...... دو کمرے اور ایک غسل خانہ تھا...... جس کمرے میں وہ رہتی تھی وہ اکثر اندھیرے میں ڈوبا رہتا...... بلب ٹوٹ چکا تھا...... اس نے بھی بدلوانے کی کوشش نہ کی تھی...... بقول اس کے اب تو وہ اندھیروں کی عادی ہوچکی تھی۔ وہ اماں کی بات پر ہنسی تھی...... آنکھیں پانی چھلکا گئیں۔

''اماں یہاں ایسے کون سے خزانے دفن ہیں جن کے چوری ہوجانے کا خدشہ ہوگا؟'' اماں اس کی اس جلنے کڑھنے والی عادت سے خوب واقف تھیں۔

''عزت سے قیمتی کچھ نہ ہوئے...... تجھے کب عقل آئے گی...... لڑکی ذات کو سمجھدار ہونا چاہیے۔ مگر تو تو نری احمق ہے......'' یہ نصیحت نامہ روز نشر ہوتا تھا...... وہ سنتی اور اڑا دیتی تھی۔

''تیری بانو پر کوئی دوجی نظر وی نہ ڈالے...... کبھی، کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے میں ماسی شوکت کی بھدی مرغی کی طرح ہوں......'' اماں دہل گئیں۔

''بانو...... نہ میری دھی...... تو تو چاند جیسی ہے۔''

''ممتا کی نظر سے مت دیکھیں...... دو منٹ تو زمانے کی نظر بن جائیں...... کھرے کھوٹے کی خوب خبر ہوگی۔''

''میری طرف دیکھ بانو......'' وہ رو دی تھیں...... وہ منہ موڑے بیٹھی بولتی رہی۔

''وہ جو برکت ہے ناں جو محلے والوں کی مرغیاں چوری کرتا ہے، ایک دن مجھے ملا تو میں نے پوچھا ماسی شوکت کی مرغی تیری برق رفتار نظروں سے کیسے بچ گئی...... تو پتا ہے اماں اس نے کیا کہا؟''

''کیا کہا؟'' مردہ لہجہ تھا، موت کی بساند آتی تھی...... اماں کالے دھاگوں کی ڈوریاں کھول رہی تھیں۔ الجھے دار...... زندگی کی طرح......

''وہ کہنے لگا جس کا جسم اتنا بھدا اور بدصورت ہو اس کو کھانے کا کیا سواد آئے گا...... اگر کھایا بھی تو یوں لگے گا کتے کا کلیجا چبالیا ہو......'' شہر بانو کی سسکی نکلی تھی۔ اور اماں کے ہاتھ سے دھاگوں کی ڈوری نکل گئی...... وہ سکتے میں بیٹھی رہ گئیں...... وہ بھاگتی ہوئی کمرے میں بند ہوگئی تھی......

اور جاتے، جاتے وہ جو کہہ گئی تھی وہ اماں کو سن کر گیا تھا......'' میں بھی اسی بھدی مرغی کی طرح ہوں جو بدصورت ہے...... جو ہاتھ لگائے گا...... کراہت سے ہی مر جائے گا...... تو آرام سے کام پر جا...... ناکارہ وجود کا خیال نہیں رکھنا پڑتا......'' وہ روتی ہوئی دروازہ بجاتی رہیں۔

''بانو...... دروازہ تو کھولو......'' تھک ہار کر وہ ٹوکرا اٹھاتی آنسو پونچھتی باہر نکل گئی تھیں۔

وہ آئینے کے سامنے کھڑی تھی...... اس کا دل چاہا وہ سرگوشی میں آئینے سے پوچھے۔

''اے آئینے بتا سب سے سندر کون؟''

اور آئینہ چلا اٹھا تھا جیسے...... ''شہر بانو...... شہر بانو......''

وہ طلسم کی چوکھٹ پر کھڑی تھی۔

''شہر بانو کون؟'' جواب آیا۔

''شہر بانو بنت فرہاد......'' آئینہ بول اٹھا۔ اور دیواریں بھی آواز بن گئیں۔ وہ خوف سے پیچھے ہٹتے، ہٹتے دیوار سے جا لگی تھی...... سماعتوں پر ہاتھ رکھے۔

وہ یتیم شہر بانو تھی...... گہرے سانولے رنگ کی مالک...... گہرا سانولا رنگ جیسے کسی نے اخروٹ کی چھال پیس کر تھوپ دی ہو...... چھوٹی، چھوٹی آنکھوں

میں گدلا پانی ڈیرے ڈالے رکھتا تھا۔ ہاتھ، پاؤں، سخت اور پکے تھے کبھی کبھار جو چولھے میں آگ جل رہی ہوتی اور کوئی انگارہ پاؤں پر لڑھک آتا تو اطمینان سے اٹھا کر پرے کر دیتی...... چہرہ تکلیف سے عاری ہوتا...... اماں اور ابا کھلونوں والی فیکٹری میں کام کرتے تھے...... ابا کے گزر جانے کے بعد اماں فیکٹری جانا چھوڑ کر گھر پر ہی شہر بانو کے ساتھ مل کر کھلونے بنا کر بیچتی تھیں...... کپڑے میں روئی بھر کے کھلونے بنانے کے فن میں وہ طاق تھیں...... شہر بانو نے میٹرک تک پڑھا تھا...... ابا جب تک حیات تھے پڑھتی رہی...... ان کے گزر جانے کے بعد جیسے سب ختم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

فاران حیدر نے خطوط کے ڈھیر میں سے وہ خط اٹھایا...... ”فاران حیدر کے نام......“ ڈیڑھ سو خطوط کے ڈھیر میں بھی وہ مہکتا ہوا خط سب سے منفرد تھا۔ وہ ریوالونگ چیئر گھمانا روک کر وہ خط اٹھا کر پڑھنے لگا تھا...... ریڈیو اسٹیشن کے احاطے میں نارنجی سہ پہر اتری ہوئی تھی...... پام کے درخت جھوم رہے تھے۔ اسٹیشن کے کیفے سے کریم کافی کی اڑتی ہوئی مہک اعصاب کو تقویت دے رہی تھی۔ وہ کریم کافی سے لطف اٹھا رہا تھا اور خط بھی پڑھ رہا تھا۔

”آداب......!

نومبر کی خنک شام کا سلام قبول ہو...... یہ اس وجہ سے کہ میں نومبر کی خنک شام میں ہی آپ سے مخاطب ہونے کی جسارت کر رہی ہوں...... میں اس کشمکش میں گرفتار ہوں کہ آپ سے کیا کہوں......؟

خیر...... جو بھی کہنا ہے لازم ہے...... میں نے پہلی بار آپ کو 2 نومبر شام 7.00 بجے کے پروگرام میں سنا ہے...... جب آپ اس بات کا اظہار کر رہے تھے کہ آپ کی نیو انٹری ہوئی ہے...... اور آپ کا وہ پہلا پروگرام ہی مجھے اتنا متاثر کر گیا کہ میں نے پھر ہر شام کا انتظار کیا ہے صرف اور صرف آپ کی آواز سننے کے لیے...... آپ کی سحر طاری کرتی آواز...... دلنشیں لہجہ، اعلیٰ طرزِ گفتگو...... کیا کہوں...... آپ کی آواز ہر طرف سے دھیان ہٹا دیتی ہے۔

ہر موضوع پر جامع گفتگو آپ کا ہی فن ہے......

میں آپ سے ازحد متاثر ہوں...... میں آپ کی باتیں اپنی ڈائری میں نوٹ کرتی رہتی ہوں...... میں آپ کے بارے میں وہ سب یاد رکھتی ہوں جو بھی آپ کہتے ہیں...... جیسے...... ہاں...... جیسے نومبر کی سرد شام میں کریم کافی پینا آپ کو بہت پسند ہے۔ غزلوں میں آپ مہدی حسن کو زیادہ سنتے ہیں...... فان اور لائٹ گرین آپ کے فیورٹ کلر ہیں...... (جانے کیوں مجھے بھی یہ دو کلر بہت پسند ہیں......!) مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ آپ میرے آئیڈیل بن چکے ہیں......“ اور وہ خط کچھ دیر بعد وہ اپنے اسٹاف کے سامنے پڑھتا ہوا ہنس رہا تھا۔

”مجھے تو یار ان لڑکیوں کی سمجھ نہیں آتی بھلا صرف آواز پسند ہونے سے ہی کیا، کیا سوچ لیتی ہیں۔“ احمد رشک سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”ابے اتنی جلدی کوئی پاپولر نہیں ہوتا...... جتنی جلدی تو ہو گیا ہے۔“

”ہاں...... یہ تو ہے۔“

”بس یار...... یہ جو عورت ہوتی ہے ناں بڑی کمزور ہوتی ہے......“ احمد ہنسا تھا۔

”سچ کہتے ہو...... خیر...... ہمیں کیا...... ہم نے تو آواز بیچنی ہوتی ہے...... ہر کسی سے ہنس کر پیش آنا ہماری جاب کا حصہ جو ہے...... تو مجبوری ہے......“

اور یہ سچ تھا فاران حیدر گویا ساحر تھا...... اس کی آواز میں عجب سحر تھا۔ جو اسے سنتا...... ٹھٹک جاتا...... مقابل اسیر ہو جاتا تھا......!

☆☆☆

اور ابا کے گزر جانے کے بعد وہ جیسے بولائی، بولائی سی پھرتی رہتی...... اماں کام پر چلی جاتی تھیں...... تنہائی اور وحشتیں جیسے وجود کو دیمک کی طرح لگ گئی تھیں مگر بی بی کی آمد جیسے معطر ہوا کا جھونکا تھی...... بی بی ان کی نئی پڑوسن تھیں اور بہت مشفق اور

راست باز ہونے کے ساتھ، ساتھ انتہائی عبادت گزار بھی تھیں۔

''بی بی ..... کیا واقعی اللہ کو دوست بنایا جاسکتا ہے.....؟'' وہ حیران ہوتی اور اس کی آنکھیں پھیل جاتیں۔

''بانو ..... اللہ ہی تو دوست ہے باقی تو سب چھل ہے..... فریب ہے.....'' وہ ان کا نورانی چہرہ تکنے چلی جاتی۔

''وہ .....'' انگلیاں مروڑتی وہ جھجک کر کچھ پوچھنے لگی تھی۔ ''وہ میرا دوست بنے گا.....؟'' کیسا سوال تھا..... کیسی آس تھی..... برآمدے کے سامنے آبخوروں پر جھکے کبوتر سر اٹھا کر شہر بانو بنت فرہاد کو دیکھنے لگے تھے..... وہ انہیں بڑی بے بس اور بیچاری سی لگی تھی۔

''وہ ہر کسی کا دوست ہے..... ذات، رنگ و روپ کے دائرے نہیں بناتا..... سارے درجوں کو برابری میں بانٹ رکھا ہے.....'' کبوتر کی پھڑ پھڑاہٹ گونجتی رہ گئی تھی۔

''اسے کہیں ناں میرا بھی دوست بن جائے۔''

''تم خود اسے آواز دو..... ایک قدم آگے بڑھو..... سارے فاصلے وہ عبور کرلے گا..... اس کا وعدہ ہے.....'' اور شہر بانو نے اس عہد کو پرکھنا چاہا تھا..... اور حیرت زدہ رہ گئی تھی۔

''اور وہ ایسا ہے کہ پرکھ کے پیمانوں سے باہر ہے..... وہ لازوال ہے۔''

اور وہ گہری سانولی لڑکی اسے تلاش کر ہی گئی تھی..... بڑی ہی خاموشی اور سکون سے وہ شہ رگ میں آن بسا..... اور تب وہ قہقہے لگانے لگی..... اونچے..... اتنے اونچے کہ ''اس'' تک پہنچنے لگے تھے۔

''تف ہے مجھ پر جو انسانوں کے پیچھے خوار ہوتی رہی..... میں بھی کتنی جھلی ہوں ناں.....''

اور پاکیزگی کے ہالے اس کے وجود کے گرد بندھنے لگے..... اور وہ اس کی یاد کی ڈور میں پانچ پہر عبادتوں کے موتی پروتی رہی..... اور دنیا سے ایسی بے نیازی اختیار کی کہ بس.....

اور اماں انگشت بدنداں رہ گئیں..... ''بانو..... تو ٹھیک تو ہے ناں.....؟''

امرود کے پیڑ کے کمزور تنے سے ٹیک لگا کر کھڑی وہ ہنستی تھی۔ ''اب ہی تو ٹھیک ہوئی ہوں اماں.....''

واقعی اب ہی تو دوا ملی تھی..... اور وہ تنہا نہیں تھی..... کوئی بھی نہیں ہوتا پر..... ''وہ'' ہمارے ساتھ ہوتا ہے..... ہر کسی کے ساتھ..... بس اسے دیکھنے کے لیے ''نظر'' کی ضرورت ہوتی ہے.....

''اور سارے کمال نظر کے ہیں..... نظر..... ہاں..... نظر.....''

☆☆☆

در و دیوار پر دوپہر دراز ہو کر سہ پہر کے وجود میں جا داخل ہوئی تھی..... ہلکی سی ہوا امرود کے پتوں میں... سرسراہٹ پیدا کر رہی تھی..... شہر بانو نے سر اٹھا کر اس منظر نامے کو دیکھا اور پھر سر دوبارہ گھٹنوں میں دے لیا اور یہ کام جیسے وہ جانے کب سے کرتی آ رہی تھی.....

اماں نے پالک کترتے ہوئے اسے سات، آٹھ بار تو چور نظروں سے ضرور دیکھا ہوگا..... اور وہ اس بات سے بخوبی واقف تھی مگر بے نیازی بنی بیٹھی تھی۔

''بانو.....'' انہوں نے پالک کترتے ہوئے اسے آواز دی اور خود ہی پچھتائی بھی تھیں جانے وہ کن سوچوں میں گم تھی..... چونک کر آواز کی سمت نہ دیکھا بلکہ پتلیاں دیواروں پر ہلکی نارنجی دھوپ پر جما دیں۔

''ہاں.....'' یوں لگا کسی سوکھے کنویں میں ڈول پھینکا گیا تھا..... پھیکی سی بے ڈھب آواز.....

''کن سوچوں میں گم ہو.....؟''

''نہیں..... میں تو ایسے ہی بیٹھی تھی ذہن تو صاف سلیٹ سا ہے.....''

''میں تو جیسے تجھ سے واقف ہی نہیں..... ماں کو بہلاتی ہے!''

''ماؤں کو بہلاؤ تو بہل جاتی ہیں.....؟'' جیسے کسی سرد غار میں سے ٹھٹھرا ہوا سوال برآمد ہوا تھا۔

اماں کپکپا گئیں...... "ماں، باپ کو بہلانا تو سب سے آسان کام ہے...... آنکھیں بند کرلیتے ہیں......اولاد کو ناراض نہیں کرتے۔"

اور وہ ہنسی تھی......اور وہ خود لاعلم سی تھی کہ کیوں ہنس رہی تھی۔

"اور ......خدا بھی بہل جاتا ہے کیا؟" اور اماں کو یوں لگا تھا جیسے وہ ان کے وجود کے گرد برف کی دیواریں کھڑی کرتی جارہی ہو......ایک کے بعد دوسری......تیسری......

"مجھ سے میری سمجھ کے مطابق سوال کیا کر بانو...... ایسے اوکھے سوال نہ کیا کر......میں کون سا پڑھی لکھی ہوں۔" وہ تیزی سے پالک کترتی رہیں......بانو کو لگا کہیں وہ اس تیز رفتاری میں اپنی انگلیاں ہی نہ کتر ڈالیں۔

"یہ سوال کتابوں کی پڑھائی والا نہیں ہے اماں...... یہ تو زندگی سے جڑا ہوا ہے......"

"جو بھی ہے...... تیرے سوال میرے سر سے گزر جاتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ ٹوکری اٹھا کر اندر چل دیں۔ وہ چند ثانیے زمین پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچتی رہی......پھر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اماں کو اپنے جانے کا کہہ کر وہ بی بی کی طرف چلی آئی......دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی خاص چنبیلی کی خوشبو استقبال کرتی، سرخ ٹائلوں والا فرش جانے کیوں اسے بڑا اچھا لگتا تھا۔ اور وہ اکثر جوتے اتار کر ننگے پاؤں کچھ دیر وہاں ضرور ٹہلتی......خاص چنبیلی کے پودوں کو...... ہاتھوں سے سہلاتی وہ عقبی کمرے کی طرف آئی تھی۔ جہاں سے وقفے، وقفے سے کھٹر پٹر کی آوازیں آرہی تھیں۔

"السلام علیکم......" اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سلام کیا۔

"وعلیکم السلام...... آؤ شہر بانو، آج بہت دنوں بعد چکر لگایا......" وہ کوئی پرانا صندوق کھولے کھڑی تھیں......سامنے اشیا کا ڈھیر لگا ہوا تھا......اون کے گولے، قینچیاں، کترنیں، سلائیاں اور ایک طرف ریڈیو سیٹ پڑا تھا۔

"جی بی بی......بس وقت ہی نہیں ملتا۔"

"ارے وقت کی خوب کہی بھئی...... یہ تو خود نکالنا پڑتا ہے۔"

"بجا فرمایا...... آپ آج یہ سب کیوں کھولے کھڑی ہیں؟"

"بس...... کچھ کار آمد چیزیں پڑی تھیں...... وہ نکال رہی تھی...... تم خیر سے آئیں؟" وہ دوپٹے سے چہرہ صاف کرتی اس کی طرف متوجہ ہوئیں جو دروازے سے ٹیک لگائے کمرے میں نظریں دوڑا رہی تھی۔

"جی خیر ہی ہے، بس سوچا آپ کی طرف چکر لگا آؤں۔"

"یہ تو تم نے بالکل ٹھیک کہا......" وہ بھی سر ہلاتی ان کے ساتھ بکھرا ہوا سامان سمیٹنے لگ گئی تھی......کھڑکی کے دھندلے شیشوں سے بھی روشنی ٹوٹ، ٹوٹ کر جیسے اندر گر رہی تھی...... روشندان میں بیٹھے جنگلی کبوتر کھڑاک سے پھڑ پھڑاتے ہوئے اُڑے تھے یوں لگا جیسے کسی نے نرم، نرم ہاتھوں سے تالیاں پیٹی ہوں...... وہ انہیں حیران سی دیکھے گئی۔

بی بی نے اس کی حیرانی بھانپ لی تھی۔

"حیران مت ہو شہر بانو...... یہ سارے اللہ کے رنگ ہیں، اس نے عرش اور فرش کے درمیان اپنی مخلوق کے ٹھکانے بنا رکھے ہیں۔"

"اس اندھیرے کمرے میں گھٹن سے کبوتر مر نہیں جاتے......؟" اس سوال پر مسہری سے ٹرنک اٹھاتی وہ مسکرائی تھیں۔

"سارے کمال اس کمال والے کے ہیں...... ٹھکانا دیتا ہے تو باقی بھی ساری خبر رکھتا ہے...... وہ بڑا باکمال تخلیق کار ہے۔"

وہ دھندلے شیشوں پر پڑتی سہ پہر کی روشنیوں کے عکس دیکھے گئی۔

"پھر اس نے اپنی مخلوق کو درجوں میں کیوں

بانٹ رکھا ہے بی بی؟''

''وہ درجے نہیں بناتا...... ہم انسان خود بناتے ہیں اور پھر پچھتاتے بھی ہیں۔''

اب وہ آہستہ، آہستہ چلتی ہوئی مسہری کے کونے پر ٹک گئی تھی...... گرد و غبار کا طوفان بیٹھ گیا تھا۔

''بی بی...... خدا بھی بہل جاتا ہے......؟'' سوال عجیب تھا یا پھر اس کا لہجہ ایسا تھا...... شاید دونوں ہی عجیب تر تھے...... بی بی نے ٹرنک اٹھا کر صندوق کے اوپر رکھ دیا تھا۔

''پتا ہے شہر بانو...... یہ بہلاوے، دلاسے، تسلیاں بندوں کے لیے ہوتی ہیں...... اللہ کے لیے صرف عروج ہوتا ہے جو دائمی ہے...... ہم تو مخلوق ہیں احساسات، جذبے ہمارے لیے ضروری ہیں...... وہ یہ سب نہیں رکھتا...... اس کی اپنی ذات توحید کے دائرے میں مقید ہے ایسا دائرہ جو نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے...... جو بڑا مصور کُن ہے......'' اور وہ خود بھی جیسے نور کے لپیٹے میں تھیں...... پھڑاک...... پھڑاک کی آواز آئی تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا...... کبوتروں کا جوڑا روشندان میں واپس آ گیا تھا...... وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''بی بی، کافی وقت ہو گیا ہے چلتی ہوں۔''

''بانو، یہ دیکھ...... یہ ریڈیو سیٹ بڑا پرانا اور پائیدار ہے...... اسے رکھ لے...... جب فراغت ہو تو اس پر خبریں اور پروگرام سن لینا......'' وہ اس کی طرف ریڈیو بڑھا رہی تھیں...... اس نے ہچکچاتے ہوئے تھام لیا تھا۔

''یہ تو بہت قیمتی ہوگا۔''

وہ ہنسی تھیں ''جھلی نہ ہو تو...... یہ میرے کس کام کا ہے...... تم سے تو قیمتی نہیں ہے...... بس اس کے سیل ڈلوا لینا نئے......'' وہ سر ہلاتی ریڈیو سیٹ تھامے باہر نکلنے ہی لگی تھی جب انہوں نے اسے آواز دی۔

''شہر بانو......''

''جی بی بی!'' وہ پلٹ کر انہیں دیکھنے لگی......

خاص چنبیلی کے دودھ جیسے سفید پھول سورج کی روشنی میں رنگین ہونے لگے تھے...... خوشبو دائروں میں جیسے گھول دی گئی تھی۔

''نماز تو باقاعدگی سے پڑھ رہی ہو ناں؟'' وہ کھڑکیاں بند کر رہی تھیں...... کھڑکیاں بند کر کے وہ اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔ انہوں نے بغور اسے دیکھا وہ خوب صورت نہیں تھی مگر بڑی عجیب سی کشش رکھتی تھی۔

''جی بی بی...... پڑھتی ہوں۔''

بی بی نے صندوق کے اوپر اور مسہری پر ارغوانی پھولوں والی چادر چڑھا دی تھی...... اور خود شہر بانو کے ساتھ کمرے سے باہر آ گئی تھیں۔

''میری بات ہمیشہ یاد رکھنا بانو...... دل کو کبھی عبادت کے نور سے خالی نہ رکھنا...... دل کے دیے میں جب تک عبادت کا تیل نہیں پڑتا یہ روشنی نہیں دیتا...... اور مردہ دل تو حیات نہیں رہتے ناں...... انسانوں کی بے اعتنائیوں کے سوگ میں مبتلا رہنے سے کچھ ہاتھ نہیں آتا...... لوگ تمہیں دھتکارتے ہیں تو غمزدہ نہ ہونا...... اللہ تو تمہارا ہے...... جب آواز دو گی اسے اپنے آس پاس پاؤ گی۔''

وہ ٹھٹک گئی...... جیسے روشنیاں اور خوشبوئیں بھی جم گئی ہوں۔

''میری پکار کا وہ جواب دے گا؟'' یہ سوال وہ ہر بار پوچھتی تھی...... جیسے نئے سرے سے تسلی کا بیج بونا چاہتی ہو...... اور بی بی اس کے اندر وہ فصل جھٹ سے اگا دیتی تھیں۔

''ہاں، ضرور دے گا۔''

''میں خوب صورت نہیں ہوں بی بی......'' آنکھ سے آنسو پھسلتا ہوا ریڈیو کے کور پر پھیلی گرد میں گم ہوا تھا۔

''وہ خوب صورتی نہیں دیکھتا......''

''پھر کیا دیکھتا ہے؟''

''دل دیکھتا ہے؟''

"میرا ابھی دیکھے گا؟"

"ضرور دیکھے گا۔"

وہ مسکرائی تھی اور سر ہلاتی میکانکی کیفیت میں دروازہ پار کر گئی تھی...... سہ پہر کی دھوپ ڈھل، ڈھل کر آخری وقت میں تھی۔

بی بی کی نظریں وہاں جمی تھیں جہاں وہ ابھی کھڑی تھی۔

"شہر بانو...... لوگ ظاہر کے ہیں...... وہ باطن کا ہے...... دیکھے گا...... تمہیں ضرور دیکھے گا۔"

☆☆☆

سورج مغرب سے ملنے چلا گیا تھا...... آنگن میں ابھی ہلکا، ہلکا اندھیرا تھا...... وہ مغرب کی نماز پڑھ کر چولہے کی طرف آ کر کھڑی ہوئی تھی۔ اماں نے روٹیاں پکالی تھیں اور اب توے کو چولہے سے اٹھا کر کے کھڑا کر دیا تھا...... وہ توے پر چمکیلے ستاروں کو دلچسپی سے دیکھتی رہی...... بڑا دلچسپ مشغلہ ہاتھ آیا تھا...... اماں نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا اور پھر ہولے سے ہنس دیں۔

"جانے یہ کب بڑی ہوگی...... بچگانہ سا ذہن ہے۔" انہوں نے آنگن میں بکھرتی خاموشی کو بھگایا تھا...... "بی بی کیسی تھیں؟"

"اچھی تھیں اماں......! سامان کھنگال رہی تھیں......" وہ سر ہلا گئی تھیں۔

"یہ ریڈیو تم نے مانگا ان سے؟" شہر بانو کو ہنسی تو بہت آئی مگر چھپا گئی...... شکر یہ ہنر تھا۔

"میں آپ کو ایسی نظر آتی ہوں اماں......؟"

اماں بیچاری اتنا بوجھ نہ سہار پائی تھیں...... "نہ بیٹی نہ، بس ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔" ایک، ایک کر کے توے کے سرخ تارے بجھ گئے تھے...... جانے کیوں اسے افسوس ہوا تھا۔

"اماں، یہ اتنی جلدی کیوں بجھ گئے......؟" ایسا اداسی میں ہلکورے لیتا لہجہ تھا کہ بس......

"یہ توے کی تپش پر ابھرتے ہیں جیسے ہی تپش ختم ہوتی ہے دم توڑ جاتے ہیں۔" شہر بانو بنت فرہاد نے توے سے نگاہیں ہٹا کر ارد گرد دیکھا تھا...... یہاں سے وہاں تک کالا اندھیرا پھیلا تھا اور کوئی تارہ تک نہیں تھا...... گہری سانس بھری تو امرود کے پتوں کی باس نتھنوں میں گھس آئی۔

"پالک گوشت پکایا ہے، تمہیں بہت مرغوب ہے ناں......؟" اماں کے لہجے میں امید سفر کر رہی تھی۔ وہ ان کا دل رکھنے کو مسکرائی تھی...... شکر کہ یہ ہنر بھی آتا تھا۔

☆☆☆

رات کے پردے پر چاند کی ٹکیا کسی پتنگ کی طرح جھولتی جا رہی تھی جیسے کسی مسافر نے تانت کو ہلکا سا جھٹکا دیا ہو...... سنہری تتلیوں کے پروں کو توڑ مروڑ کر نذر آتش کر دیا گیا...... دریائے نیل پر چھائے تاریکی کے سائے مٹیالے گہرے ہوتے گئے...... دروازے کے بجتے کواڑوں سے کوئی ان دیکھا وجود آنگن میں چلا آیا جیسے سفید حریر کے لبادے میں لپٹا ہوا ہو...... کھڑکی میں سر کو ٹکائے نیم وا آنکھوں سے چاند کی زرد روشنی کو دیکھتی وہ لڑکی چونک گئی۔

"کون ہو تم......؟" سوال کیا گیا۔

"میں کون ہوں؟ یہ تو مجھے تم سے پوچھنا تھا......" سوال واپس پلٹا دیا گیا...... لڑکی کے چہرے پر درشتگی اتر آئی تھی جیسے وہ ابھی پھٹ پڑے گی۔ مگر وہ خاموش رہی۔

"مجھے خوش آمدید کہو لڑکی...... میں تمہاری مہمان ہوں...... اور مہمان تو رحمت ہوتے ہیں ناں......" جیسے تصدیق چاہی گئی...... لڑکی نے پیشانی پر ہاتھ پھیرا...... پسینہ ہیروں کی کنیوں کی طرح چمکنے لگا تھا۔

"میں پہیلی، پہیلی نہیں کھیلنا چاہتی...... تم کوئی آسیب ہو کیا؟" فضا میں لرزتے ساز کی سی آواز تھی۔

"میں آسیب تو نہیں مگر آسیب جیسی ضرور ہوں...... کبھی مجھے میم پر پیش ڈال کر پڑھا جاتا ہے اور کبھی میم پر زبر ڈال کر...... بتا ہے کون ہوں......؟" وہ لڑکی کے صبر کا امتحان تھا شاید۔

''کون ہو تم؟'' مقابل کے وجود میں رنگ اترنے لگے...... کاہی، زرد، سبز...... سحر طاری ہونے لگا......

''میں محبت ہوں شہر بانو...... مجھ پر میرے رب کے سوا کسی کا بس نہیں چلتا...... میں انسانوں کے دلوں میں گھر کر لیتی ہوں اور ان کے وجود نچوڑ لیتی ہوں...... انسان ''خیر و شر'' کا مجموعہ ہوتے ہیں...... میں خدا کے حکم سے ان کے وجود میں اترتی ہوں...... ''شر'' کو نکال کر باہر کرتی ہوں اور ''خیر'' چھوڑ جاتی ہوں...... خدا جس انسان سے زیادہ محبت کرتا ہے مجھے اس میں زندگی دے دیتا ہے......'' مقابل نے الوہی ساز پھونکا تھا۔ سارا ماحول طلسم جمود میں غرق ہو گیا...... وہ ساکت بیٹھی تھی...... پھر آواز ٹوٹ، ٹوٹ کر ابھری تھی۔

''میں وہ محبت ہوں جس میں دو نامحرم دل جڑتے ہیں، ٹوٹ جاتے ہیں اور پھر ٹوٹے خام دلوں کو ریاضت کی بھٹی میں کندن بنا کر خدا کے حضور پیش کر دیا جاتا ہے...... بس پھر دل سے انسان غائب اور خدا کسی سنہرے نور کی طرح براجمان ہوتا ہے۔''

شہر بانو کو لگا اس نے ایک ہچکی لی ہو...... اور پُر سکون ہو گئی ہو...... مگر دل نامی خانے میں ''کچھ'' ہے...... وہ کیا تھا...... کچھ خبر نہیں تھی...... رات کے پردے پر چاند کی ٹکیا زوال پذیری کی طرف گامزن ہوئی تھی...... آسمان پر دو دھارے بحکم خدا تقسیم ہوئے اور اندھیرے کے بطن سے روشنی بیانگِ دہل ارض پر پھیلتی گئی۔

☆☆☆

شہر بانو نے جیسے اپنی زندگی کا مصرف ڈھونڈ لیا تھا...... وہ جب سے ریڈیو سننے لگی تھی رات کے سناٹے میں ریڈیو سے ابھرتے مدھر نغمے دل و جاں میں عجیب سی طمانیت بھر دیتے...... بڑے اچھے، اچھے پروگرام آتے جو رات ایک، دو بجے تک چلتے رہتے...... وہ کھڑکی سے ٹیک لگائے ریڈیو سیٹ فرش پر رکھے رات کے دو بجے تک آواز کی دنیا کے سحر میں مگن رہتی تھی۔ ریڈیو پر ایک نیا آر جے آیا تھا...... جس کا نام ''فاران حیدر'' تھا۔ جو ہفتے میں چار دن آٹھ بجے رات سے لے کر گیارہ بجے تک پروگرام کرتا تھا...... ہر روز نئے ٹاپک پر بات کی جاتی تھی اور خطوط کی محفل بھی ہوا کرتی...... جس میں خط بھی سنائے جاتے...... وہ ایک سحر انگیز لہجے کا مالک تھا...... وہ کھڑکی میں بیٹھی تھی...... پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ فاران حیدر بول رہا تھا۔

''ڈیئر سامعین...... امید ہے کہ آپ ٹھیک ٹھاک ہوں گے...... فٹ فاٹ ہوں گے...... آپ کی دعائیں ہمیشہ میرے ساتھ رہیں...... پچھلا پروگرام جو ہم نے ترتیب دیا تھا وہ ''کردار'' کے حوالے سے تھا۔ جن سامعین کی الجھنیں تھیں انہوں نے ہمیں خطوط لکھے ہیں، ہم کوشش کریں گے کہ آپ کو مطمئن کر سکیں......'' لفظوں کا سنہری جال رات کے اس سے جوبن پر تھا...... بیک گراؤنڈ میوزک کی مدھم آواز بہت دلنشین سی تھی۔

''جی تو پہلا خط ہماری پیاری راج دلاری سامع شہر بانو کا ہے......'' اس کی آواز مدھم ہوئی...... پھر بلند......

''لکھتی ہیں کیا انسان کی پہچان اس کا کردار ہوتا ہے؟'' شہر بانو کی سماعتیں کان بن گئیں۔ اس نے فرش سے ریڈیو اٹھا کر کھڑکی میں رکھ لیا تھا۔

''آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ جی ہاں...... اصل چیز انسان کا کردار ہوتا ہے...... ظاہری طور پر خوب صورت ہونا یا نہ ہونا انسان کے اختیار میں نہیں ہوتا ہے مگر باکردار ہونا ضرور آپ کے اختیار میں ہوتا ہے...... مجھے بھی باکردار انسان پسند ہیں۔ میں خود بھی اس بات کو اہمیت دیتا ہوں کہ شکل صورت کے بجائے کردار ضروری ہے۔'' شہر بانو کے وجود میں جیسے کسی نے برف کی ڈلی ڈال دی تھی...... وجود میں ٹھنڈک ہی ٹھنڈک اتر گئی...... وہ جیسے کسی طلسم ہوشربا میں تھی...... فاران حیدر بول رہا تھا۔

''آپ کا پوچھنا ہے کہ میں اپنے لائف پارٹنر میں شکل ۔صورت کو ترجیح دوں گا یا کردار کو......تو ڈیئر سامعین میری پہلی ترجیح کردار ہوگا......عورت کا دوسرا نام ہی کردار ہے......'' وہ چونک گئی تھی۔

اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تھا۔ فاران حیدر کے جواب نے شاید اسے مطمئن کردیا تھا......سنہری پتنگے کھڑکی کے راستے کمرے کے درودیوار سے لپٹ گئے تھے......سنہری روشنی میں وہ کانسی کا مجسمہ لگنے لگی تھی......

''مجھے شہر بانو، آپ بہت عزیز ہیں......آپ کی ہینڈ رائٹنگ بھی آؤٹ اسٹینڈنگ ہے......آپ کے لفظ دل پر نقش چھوڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں...... مجھے یقین ہے جس کا نام اور الفاظ اتنے خوب صورت ہیں وہ خود بھی کتنی خوب صورت ہوگی۔''

کردار کی خوب صورتی کو زیرِ بحث لانے والا اب ظاہری خوب صورتی پر آگیا تھا...... وہ اس کی تعریف کررہا تھا۔ وہ نامحرم تھا......مگر محرمِ دل لگ رہا تھا......وہ کہیں کھوسی گئی تھی۔

لفظ، لہجے باندھ لیتے ہیں......وہ بھی بندھ گئی تھی یا باندھ دی گئی تھی۔

فاران حیدر پروگرام کو وائنڈ اپ کررہا تھا...... دوسری طرف وہ اداس ہوگئی تھی مگر وقت ختم ہوچکا تھا......وہ بول رہا تھا......وہ سن رہی تھی۔

''جی سامعین، وقت قلیل ہے......اب اجازت چاہوں گا...... اپنا خیال رکھیے گا...... دعاؤں میں یاد رکھیے گا...... ہمارا اگلا ٹاپک ہوگا......''محبت'' آپ کے خطوط وآرا کا انتظار رہے گا......''

پروگرام ختم ہوچکا تھا......جانے کتنی حوا کی بیٹیاں سرد آہ بھر کر رہ گئی تھیں......شہر بانو نے ریڈیو آف کردیا تھا۔ وہ اب کھڑکی کا پٹ تھامے کھڑی سوچ رہی تھی۔

''اگلے خط میں فاران حیدر سے ضرور پوچھوں گی کہ وہ بھی کسی سے محبت کرتا ہے۔ رات گئے کسی کی یاد میں چاند سے باتیں کرتا ہے؟'' چاند کی روشنی میں امرود کا پیڑ کسی کرسمس ٹری کی طرح چمک رہا تھا...... رات بھیگتی رہی......ہوائیں چلتی رہیں...... وہ کھڑکی میں کھڑی جاگتی رہی......چاند سے باتیں کرتی رہی......

''لفظ بڑے ہی ساحر ہوتے ہیں...... پہلے مسحور کرتے ہیں......اور پھر ہاں......پھر قتل کردیتے ہیں۔''

☆☆☆

وہ بھی ایک ایسے جال میں پھنس گئی تھی کہ جیسے نکل ہی نہیں پائے گی...... شب و روز کے سلسلوں میں جہاں عبادت کا وقت مقرر تھا اب وہ وقت بھی نہ رہا تھا......وہ بدل رہی تھی یا بدل گئی تھی۔

اماں حیران تھیں فجر سے رات ہوجاتی مگر وہ ریڈیو آن کیے روئی، دھاگے لیے بیٹھی رہتی۔ بہت کم ہنسنے والی اب قہقہے لگاتی تھی اور اماں کا دل جیسے ہول جاتا......دن میں چھ، چھ بار جھاڑو لگاتی۔

ہر بار پہلی روٹی جلانے والی کی روٹیوں کی گولائی پر اماں انگشتِ بدنداں رہ جاتی تھیں۔ تو کیا وہ درجوں کو زیروزبر کرنے جارہی تھی۔

''وہ سنبھلنے والے اتنی جلدی کہاں گرتے ہیں؟'' وہ سوچتی تھیں مگر جواب ہاتھ ہی نہیں آتا تھا۔ ابا کے گزر جانے کے بعد وہ بولائی، بولائی پھرتی جیسے احساسِ کمتری کے خول میں مقید ہوکر رہ گئی تھی۔ مگر بی بی کی آمد نے اس کے سیلن زدہ وجود کے کواڑ کھول کر روشنیوں کا سامان کردیا تھا۔ مگر اب جو ہورہا تھا......غلط تھا......وہ بار، بار اسے کہتیں۔

''بانو......ظہر کا وقت ہوگیا ہے۔''

''اماں......ابھی دل نہیں چاہ رہا......''

''فرض ہے......دل کو بیچ میں کیوں لاتی ہو؟''

''بات تو دل کی ہے اماں...... دکھاوے کی عبادتوں کا کیا فائدہ......''

''یہاں ایسا کون ہے جس کو دکھانا ہے تمہیں......؟'' سوال مشکل تھا۔

شہر بانو نے انہیں عجیب نظر سے دیکھا۔

''اماں، دل نہیں چاہتا...... کوشش تو کرتی

ہوں۔۔۔۔۔'' وہ شرمندہ ہو رہی تھی۔
''میرے آگے کیوں شرمندہ ہوتی ہو۔۔۔۔۔ اس کے آگے شرمندگی دکھاؤ تو فائدہ بھی ہو۔''
وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔
فجر رات تک کا سفر کر آتی مگر وہ ابھی تک دل راضی نہ کر پائی تھی۔
اس نے بی بی کے گھر آنا جانا بھی کم کر دیا تھا۔۔۔۔۔ جانے وہ ان سے چھپتی پھر رہی تھی، اپنے آپ سے یا پھر ان سوالوں سے جو بی بی نے اس سے کرنے تھے۔
امرود کے پتوں پر لک چھپ کھیلتی چڑیاں اسے دیکھے جاتیں۔۔۔۔۔ اور وہ ان قصوں سے خوب واقف تھیں۔
اور وقت بھی ساری خبر رکھتا تھا۔

☆☆☆

لفظوں کا کھیل عروج پر تھا۔۔۔۔۔ آواز کا طلسم جاری تھا۔۔۔۔۔ وہ معمول کی طرح بیٹھی تھی۔۔۔۔۔ کمرے میں بلب لگ چکا تھا۔۔۔۔۔ آج فرش پر روئی اور دھاگے پڑے تھے جبکہ ریڈیو کی جگہ بدل چکی تھی۔۔۔۔۔ اس نے وہ کھڑکی کے ساتھ لگی گرل پر رکھا ہوا تھا۔۔۔۔۔ محبت کے موضوع پر بات ہو رہی تھی۔
فاران حیدر کہہ رہا تھا۔ ''ڈیئر سامعین، محبت ایک ایسا تعلق ہے جو انسانوں کو جوڑے ہوئے ہے، محبت کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں جیسے خدا سے محبت، والدین کی محبت، اولاد کی محبت اور محبت کی ایک قسم اور بھی ہے۔۔۔۔۔'' آج بیک گراؤنڈ میوزک بھی محبت کی دھن پر تھا۔۔۔۔۔ سماعتیں مسحور ہوئی جا رہی تھیں، شہر بانو چونکی کہیں یہ وہ محبت تو نہیں جو اس کے وجود میں مہمان تھی۔۔۔۔۔ اس نے ریڈیو کے والیوم والا بٹن گھمایا۔۔۔۔۔ ایک دم آواز زیادہ ہوئی تھی۔
''محبت کی ایک قسم وہ ہے جو صنفِ مخالف دو بالغ دلوں کے مابین پروان چڑھتی ہے۔۔۔۔۔ یہ ایک آفاقی جذبہ ہے۔۔۔۔۔ یہ جذبہ جب وارد ہوتا ہے تو فضائیں مہکی، مہکی لگتی ہیں، جذبات بہکے، بہکے لگتے ہیں۔۔۔۔۔ موسم اپنے، اپنے لگتے ہیں، پرندوں کی آوازیں نغموں کی سی لگتی ہیں۔۔۔۔۔ یہ ایک بہت بڑا ایڈونچر ہوتا ہے۔۔۔۔۔ سامعین، سنا ہے یہ پہلی نظر میں بھی ہو جاتی ہے۔ بڑا بے اختیار جذبہ ہے۔''
محبتوں کی زبان میں رعبائیاں گنگناتا وہ صرف آواز سے آشنا شخص شہر بانو کے دل کی دھرتی پر قدم رکھ چکا تھا۔ وہ تو بس گم صم بیٹھی محبت کی ''چاپ'' سن رہی تھی جو کب کی اس کے وجود میں اتر چکی تھی۔۔۔۔۔ ریڈیو سے محظوظ ہوتا ہر شخص اس بازی گر کے سحر میں گرفتار ہو چکا تھا۔ وہ مگن سا اپنی کہے جا رہا تھا۔۔۔۔۔
''آج کا ٹاپک بہت دلچسپ ہے۔۔۔۔۔ بے شمار خطوط آئے ہیں اور فیس بک پر بھی پیغامات کی بھرمار ہے۔۔۔۔۔ کوشش کروں گا کہ آپ سب کو راضی کر سکوں۔۔۔۔۔ مگر آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اتنے قلیل وقت میں یہ بہت مشکل ہوگا۔۔۔۔۔ مگر میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔۔۔۔۔ آخر میں آپ کو کیسے ناراض کر سکتا ہوں۔''
جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔۔۔۔۔ دھڑکنیں ساکت لگ رہی تھیں۔۔۔۔۔ محبتوں کا موضوع ہو اور لوگ چپ رہیں ناممکن، پروگرام کا دورانیہ بڑھانے کا مطالبہ ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ رات سے لفظوں کا طلسم سر چڑھ کر مسحور کیے دے رہا تھا۔۔۔۔۔ شہر بانو دل پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔۔۔۔۔ فاران حیدر نے پہلے کسی لڑکی کی لائیو کال ریسیو کی تھی۔۔۔۔۔ لڑکی انتہائی دلنشیں لب ولہجے کی مالک تھی۔۔۔۔۔ اور اسی ٹاپک پر بات کر رہی تھی۔۔۔۔۔ محرم اور نامحرم کا فرق مٹ گیا تھا۔۔۔۔۔ دنیا کے کونے، کونے میں آواز سنی جا رہی تھی۔
''آپ کا پروگرام بہت اچھا ہے، آپ کی بہت بڑی فین ہوں۔۔۔۔۔ محبت کے حوالے سے اتنا کہوں گی، زندگی ''محبت'' ہے اور ''محبت'' ہی زندگی ہے، آج محبت کا دن ہے۔ جس کا بھی محبوب روٹھا ہوا منا لینا چاہیے۔ محبت صرف پانے کا نام نہیں، یہ تو روح کی سیرابی کا نام ہے، ہمیشہ خوش رہیں، محبتیں بانٹیں۔۔۔۔۔''
کال کٹ گئی تھی۔۔۔۔۔ اب بیک گراؤنڈ میوزک میں تیزی آ گئی تھی۔۔۔۔۔ چاند کی روشنی کھڑکی سے اندر

داخل ہو کر ہالہ سا بنائے ہوئے تھی...... شہر بانو اسی ہالے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی...... ریڈیو سے آوازیں نکل کر چاروں قطبین میں رقص کر رہی تھیں...... فاران حیدر مسحور کن آواز میں کہہ رہا تھا۔

''اوہ...... کال کٹ گئی...... چلو شکر ہے کہ آپ کا پیغام سب تک پہنچ گیا...... جی سامعین، روٹھے ہوؤں کو منائیں، دلوں کو جوڑیں، ہر کسی کا محبوب پیارا ہوتا ہے، کہتے ہیں ناں کہ محبت تو دیکھنے والی...... آنکھ میں ہوتی ہے۔ شاید سچ ہی کہتے ہیں، آیئے چلتے ہیں اب خطوط کی محفل کی طرف...... پہلا خط ہماری ہر دلعزیز، نفیس اور خوب صورت شہر بانو کا ہے...... آئی ہوپ یہ خود بھی اسی طرح پیاری ہوں گی۔'' یہ لفظ ہتھوڑے کی طرح شہر بانو بنت فرہاد کی سماعتوں میں لگے تھے...... وہ پیاری کہاں تھی؟'' جیسے کوئی چابک روح پر پڑا تھا...... روح نیل، نیل ہوگئی مگر روح کے نیل نظر نہیں آتے۔

آگے پڑھا جا رہا تھا......

''سویٹ شہر بانو لکھتی ہیں کہ آپ کا پروگرام آپ کی طرح بہت اچھا ہے...... ٹاپک کے حوالے سے کہا ہے کہ محبت روح کی سرحدوں پر پہنچتی ہے اور اڑان پکڑتی ہے۔ یہ جذبہ خدا کی دین ہوتا ہے اور خدا ہی ہے جو دلوں میں محبتیں ڈالتا ہے ورنہ انسان اس علم سے خالی ہے۔''

مدھم ہوتا بیک گراؤنڈ میوزک اور فاران حیدر کا خط پڑھنے کا انداز...... اور...... پھر...... بھید بھری رات......

''واہ، کیا خوب لکھا ہے شہر بانو نے...... بہت خوب...... پوچھتی ہیں آپ کو کسی سے محبت ہے؟'' وجود ایسے مواقع پر کان ہو جایا کرتے ہیں حق ہا...... اور راتیں راز دار سہیلیاں......

''مجھے آپ سے محبت ہے شہر بانو......'' دیوار پر بنے دودھیا حلقے پر نظریں جمائے وہ زبردست انداز میں چونکی تھی...... وہ کیا کہہ رہا تھا...... وہ کیا سن رہی تھی؟ اس نے بس اتنے الفاظ سنے تھے اس کے بعد تو جیسے سماعتیں سحر زدہ سی ہوگئی تھیں...... ریڈیو سے ابھرتی اس کی آواز رات کے سناٹے کو توڑ رہی تھی۔

''ڈیئر سامعین...... مجھے آپ سب سے محبت ہے...... آپ میرے لیے بہت اہم ہیں...... کسی بھی پروگرام کی کامیابی کا سہرا صرف آر جے کو نہیں جاتا بلکہ اس میں سامعین کی شرکت بھی بہت اہم اور ضروری ہے...... آپ لوگ میری زندگی ہیں...... آپ ہی کی وجہ سے میرے پروگرام میں رونق ہے۔'' شہر بانو بنت فرہاد پر جیسے کسی نے منتر پھونکا تھا...... ایسا منتر جو پتھر کر دیتا ہے...... پھر اس سحر سے آزاد ہونے میں زمانے لگا کرتے ہیں۔

پروگرام کب کا ختم ہو چکا تھا۔ مگر لفظ بار، بار بازگشت بنے گونجنے لگے...... دائیں بائیں...... اوپر نیچے...... دائرے......

''مجھے آپ سے محبت ہے شہر بانو......'' اس نے ریڈیو آف کر دیا تھا...... اب وہ کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے چاند کی روشنی میں اپنی ہتھیلیاں سامنے کی تھیں...... اور کھڑکی سے ٹیک لگالی تھی۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی یا چاند سے۔

''وہ مجھ سے محبت کرتا ہے...... میں خود کو کتنا ناکارہ سمجھتی تھی...... مگر اس نے مجھے انمول کر دیا...... اب لگتا ہے جیسے میری آنکھیں غزالی ہیں...... میرا سراپا اپسراؤں کی طرح ہے...... اور...... اور وہ میرا ہے۔''

وہ مسکرا رہی تھی...... شفاف مسکراہٹ...... جو صرف محبوب کے خیال پر ہی ہونٹوں پر ابھرتی ہے...... اور صورِ محبت کا نقارہ تھا ے محبت بڑے زور کا قہقہہ لگاتی ہے...... بے دھڑک سا...... بے نیاز سا...... اور بے خبر لوگوں کو ان کی بے خبری ایسی مات دیتی ہے جو ہر مات پر بھاری ہے...... حق ہا...... مات......

''آدھی، آدھی رات تک نامحرم آوازوں کو سماعتوں میں حلول کرنا'' بغاوت'' ساتھ لاتا ہے...... محبت کے نام پر جذبات چاک کیے جاتے ہیں جنہیں رفو کرتے، کرتے بنت حوا کو صدیاں لگتی ہیں،

عزتِ نفس، خود داری کو ختم کر دینے والی چیز ''محبت'' نہیں ہوتی...... یہ تو محبت کی کوئی متضاد کیفیت ہوتی ہے...... جو اچانک وارد ہوتی ہے۔''

اور یہ بلاشبہ شہر بانو پر وارد ہو چکی تھی...... اسے اپنے ہاتھوں، پیروں کی پختگی، چہرے کی گہری ہوتی لکیریں نظر نہیں آ رہی تھیں...... جو وہ خود کو اس شخص کی نظر سے دیکھ رہی تھی جس سے صرف آواز کا رشتہ تھا...... اور ثابت ہوا...... ''یہی وہ چیز ہے جو بنت حوا کو اپنی دہلیز، اپنا گھر چھوڑنے پر مجبور کرتی ہے...... انسان کو اپنی ذات سے خود آگاہی ضرور ہونی چاہیے۔''

☆☆☆

ہیڈ فون کان سے لگائے وہ آہستہ، آہستہ پاؤں جھلا رہا تھا...... آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر.... بے نیازی طاری تھی...... اسد دروازہ ناک کیے بغیر اندر داخل ہوا تھا...... فاران نے ہیڈ فون اتارے اور سامنے کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

''اتنے گم صم کیوں ہو؟'' یہ سوال سنجیدہ تو ہرگز بھی نہیں تھا...... شیشے سے مدھم روشنی اندر داخل ہو رہی تھی۔

''کون میں......؟ ارے نہیں...... بس تھوڑی طبیعت خراب ہے۔'' وہ ڈسپوزیبل کپ ڈسٹ بن میں پھینک رہا تھا...... اسد نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔

''علامات تشویش ناک ہیں۔''

''کیا مطلب......؟'' حیران سا لہجہ تھا۔

''تمہیں عشق وشق تو نہیں چمٹ گیا......'' یقین سے بھرپور لہجہ تھا...... فاران ہولے، ہولے چلتا کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔

''بکواس نہیں کرو۔'' بڑا بیزار لہجہ تھا۔

اسد ٹیبل بجانے لگا تھا۔

"look at me
I am here
just for yor dear"

''کیا میں یہ یقین رکھوں کہ تم اپنی یہ بکواس مزید جاری نہیں رکھو گے؟'' فاران نے ٹیبل پر اپنے ہاتھ رکھے۔

اسد نے ٹیبل سے اٹھا کر ہیڈ فون اپنے کانوں میں ٹھونسے۔

عشق نہ پچھے ذات......
عشق نہ پچھے ذات

''پہلے شک تھا اب یقین ہے۔'' اس نے ہیڈ فون اتارے اور دل جلے انداز میں کہا۔

''میں تمہارے دانت توڑ دوں گا۔'' فاران غرایا تھا۔

''عشق کی سرشت میں بغاوت ہے...... تم بھی باغی ہو رہے ہو۔''

''میں تمہیں قتل کر دوں گا۔''

''عشق قاتل بنا دیتا ہے، قتل کروا دیتا ہے۔''

''میں تمہیں دھکے دے کر باہر نکالوں یا خود دفعان ہو رہے ہو؟'' فاران نے پلٹ کر کہا۔

اسد اٹھ کھڑا ہوا...... ''بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے......''

فاران آہستہ، آہستہ چلتا اس کی طرف آیا۔

''میری زندگی میں عشق، محبت جیسی چیزوں کی کوئی جگہ نہیں...... ہیر رانجھا، سوہنی مہیوال پچھلے زمانوں کے قصے تھے...... اب نہ ویسے محبوب ہیں اور نہ ہی یہ معشوق...... سمجھے تم!''

اسد نے قہقہہ لگایا تھا...... ''خیر اب تو ویسے رقیب بھی نہیں رہے۔'' وہ دروازہ بند کرتا باہر نکل گیا تھا...... فاران حیدر سوچوں کے اژدھام میں جکڑا ہوا تھا۔

''کتنے فضول ہوتے ہیں ناں وہ لوگ جو عشق محبت جیسی فضولیات کے پیچھے زندگی برباد کر لیتے ہیں...... عشق، محبت بھی موسمی بخار کی طرح ہوتے ہیں...... کب چڑھتے ہیں، کب اترتے ہیں...... پتا نہیں چلتا...... اور خبر بھی نہیں ہوتی۔''

اب وہ سر جھٹکتا ہیڈ فون چڑھا کر ریوالونگ چیئر پر جھولنے لگا تھا...... دوپہر، سہ پہر کے سانچے میں ڈھل کر شام کی منتظر ریڈیو اسٹیشن کی دیواروں پر آ بیٹھی تھی۔

☆☆☆

"تم نے ظہر کی نماز پڑھی تھی؟" بی بی نے دیگچی میں چمچ چلاتے ہوئے پوچھا۔ وہ اپنی پرہیزی غذا تیار کررہی تھیں...... جبکہ شہر بانو اسٹول پر بیٹھی سلاد بنارہی تھی۔ تیز دھار والی چھری شہادت کی انگلی پر چل گئی تھی...... خون ٹپ، ٹپ ماربل پر گرنے لگا تھا...... اسے لگا جیسے درودیوار سرخ ہوگئے ہوں...... اسے اس سرخی سے خوف آیا تھا۔

بی بی سوال بھول چکی تھیں...... اور شہر بانو جواب بھول چکی تھی۔

"یہ کیا ہوا...... اِدھر دکھاؤ......" وہ تشویش سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"انگلی پر چھری چل گئی۔"

"احتیاط کرتے ہیں بانو......"

"احتیاط ہی تو نہیں کی۔"

بی بی چونک گئی تھیں۔ جانے کیوں کچھ بدلا، بدلا لگ رہا تھا...... موسم، وقت یا پھر دل......

"تم ٹھیک تو ہو؟"

"میں...... ہاں ...... میں ٹھیک ہوں بی بی...... بالکل ٹھیک......" وہ غائب دماغی میں باہر جانے لگی تھی۔

"شہر بانو رکو، کہاں جارہی ہو؟" آواز اس تک پہنچی ہی نہیں تھی شاید۔ وہ گرنے لگی تھی......

"بانو سنبھل کے گر جاؤ گی۔"

دیوار تھامی پلٹ کر انہیں دیکھا اور مسکرادی...... "گر چکی ہوں بی بی۔"

☆☆☆

وہ فجر کا وقت تھا...... اذان کی صدائیں بلند ہورہی تھیں۔ اور شہر بانو بے نیازی کا لبادہ اوڑھے "رب" کے بجائے "بشر" کا ورد الاپ رہی تھی۔

بشر خسارے کا ورد ہے......

بشر شرارے کا ورد ہے......

آگ کا، برزخ کا......

جو بھڑکے، خاک کرے......

اور وجود راکھ کرے......

اور خاموش ساعتوں کے لیے ورد بول اٹھا......

"صور محبت بھی استعارے کا ورد ہے...... جو انسان بھی اس کی لپیٹ میں آئے وہ خدا کا رستہ بھول جاتا ہے۔" وہ ننگے پاؤں پر زمین پر بیٹھی تھی۔

وہ مسکرا رہی تھی...... ایسی مسکراہٹ جو صرف محبوب کے ذکر پر ہونٹوں کی چوکھٹ پر لال کچنار کی طرح بھڑکتی ہے...... بھڑک، بھڑک جاتی ہے۔

"ساری زندگی اس کچے آنگن میں سینے، پرونے میں گزار دی...... ایسی زندگی جو بے مقصد سی تھی...... رنگوں سے خالی، اب میں زندگی سے اپنا حق مانگوں گی...... میں قاران کو ملنے جاؤں گی...... شکر ہے میں نے ریڈیو اسٹیشن دیکھا ہوا ہے...... بڑے بازار کے ساتھ ہی تو ہے...... قاران مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوگا...... ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرے گا تو منع کردوں گی...... کہوں گی پہلے وہ مجھ سے نکاح کرے...... اماں میری خوشی کی خاطر مان ہی جائیں گی...... نہ بھی مانیں تو خودکشی کی دھمکی دے دوں گی...... آخر لڑکیاں اپنی بات منوانے کے لیے یہی تو کرتی ہیں۔"

بغاوت وجود میں گھر بنا چکی تھی۔ آدھی، آدھی راتوں تک نامحرم آوازوں کو ساعتوں میں حلول کرنا، بغاوت ساتھ لاتا ہے۔ محبت کے نام پر جذبات چاک کیے جاتے ہیں، جنہیں رفو کرتے، کرتے بنت حوا کو صدیاں لگتی ہیں...... شہر بانو کو بھی صدیاں لگتی تھیں...... اماں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کیا قیامت ٹوٹنے والی تھی۔

"عزتِ نفس، خود داری کو ختم کردینے والی چیز "محبت" نہیں ہوتی...... یہ تو محبت کی کوئی متضاد کیفیت ہوتی ہے...... جو اچانک وارد ہوتی ہے۔

اور یہ بلا شہر بانو پر وارد ہوچکی تھی...... اسے اپنے ہاتھوں، پیروں کی پختگی اور چہرے کی گہری ہوتی لکیریں نظر نہیں آرہی تھیں...... وہ خود کو اس شخص کی نظر سے دیکھ رہی تھی جس سے صرف آواز کا رشتہ تھا۔ یہی وہ چیز ہوتی

ہے جو بنتِ حوا کو گھر چھوڑنے پر مجبور کرتی ہے...... انسان کو اپنی ذات سے خود آگاہی ضرور ہونی چاہیے۔

صورِ محبت پھونکا جاچکا ہے...... اثرات ظاہر ہونے لگے ہیں...... بغاوت جنم لے چکی ہے۔ عزت، خوداری وہ چیزیں بن چکی ہیں جن کی کوئی وقعت نہیں...... ایک چیز وقت ہوتا ہے جو بڑے گہرے سبق دیتا ہے...... اور وہی سبق شہر بانو بنت فرہاد کو ملنے والا تھا۔

☆☆☆

''بی بی آپ اسے سمجھائیں، میری بانو بدل گئی ہے وہ پہلے سی نہیں لگتی...... مجھے سمجھ نہیں آتا کہ کیا ہوا ہے...... کہیں آسیب وغیرہ کا چکر تو نہیں......'' اماں کی آواز انجانے خدشوں میں گھری ہوئی تھی۔

بی بی بکھری ہوئی تسبیح کو یکجا کررہی تھیں وہ مچھلی کی ڈور میں موتی پرورہی تھیں۔

''ارے وہم مت کرو...... بچی ہے ٹھیک ہوجائے گی۔''

''بیٹھے، بیٹھے ہنسنے لگتی ہے...... کبھی، کبھی اونچے قہقہے بھی لگاتی ہے...... دن میں چھ، چھ بار جھاڑو اٹھاتی ہے۔ اب تو روٹیاں بھی نہیں جلاتی......'' یہ اگر تشویش تھی تو بڑی عجیب تھی...... بی بی کو بے طرح ہنسی آئی تھی...... وہ خوب صورت فیروزی موتی پرورہی تھیں...... تسبیح مکمل ہونے والی تھی۔ بس آخری موتی پروکر گانٹھ لگانی تھی۔

''ارے...... کاہے پریشان ہوتی ہو...... یہ تو سدھار کی علامات ہیں......'' اماں نے اداسی سے انہیں دیکھا۔

''ایسا سدھار کس کام کا...... جب دل عبادت سے غافل ہوجائے۔''

''کیا مطلب......؟'' بی بی نے بڑی مشکل سے آواز پر قابو پایا تھا۔

''اس نے نمازوں میں دل لگانا چھوڑ دیا ہے...... ریڈیو سے چمٹی رہتی ہے۔'' بی بی کے ہاتھ تھمے تھے...... تسبیح کے موتی ایک، ایک کرکے دوبارہ بکھرتے جارہے تھے۔

## وہ لڑکی

گہری دھند میں لپٹی معصوم سی وہ لڑکی
سرخ ناک لیے آئس کریم کھاتی وہ لڑکی
سب جانے ٹھنڈ کی وجہ سے آنکھیں
پانی سے لبریز ہیں
کیا معلوم کسی کو وہ آنکھوں میں من بھرلائی ہے
ٹھنڈ کو برداشت کرتی سرخ ''ناک'' نشانی ہے
وہ اس کی نادانی ہے
اس کا وتیرہ ہے یہی
وہ جب بھی رونا چاہے
آئس کریم پارلر پہنچ جائے
وہ معصوم سی اِک لڑکی

از: بنت گاٹا، پنجاب

## محبت

سنو جاناں اِک بات میری
محبت ہم نے کی ہے
نبھا کر ہی دم لیں گے

شاعرہ: نگینہ ضیا بخش، کراچی

فیروزی...... سرخ...... زرد......

''وہ نماز نہیں پڑھتی؟''

''نہیں پڑھتی......''

''ایک بھی نہیں......؟'' موم کا شعلہ بجھنے لگا تھا۔

''وہ اللہ کو بھول بیٹھی ہے بی بی۔''

وہ گرے ہوئے موتی بی بی کے سامنے سوال بن گئے...... اور جواب اُڑ اُڑ کر صدا ہو گئے......

''مجھے لوگ توجہ نہیں دیتے۔''

''لوگوں کی توجہ چاہتی ہو؟''

''آپ نہیں چاہتیں؟''

''نہیں......''

"کیوں......؟"
"لوگوں کی توجہ خسارے دیتی ہے...... میں اللہ کی چاہ رکھتی ہوں۔"
"اللہ کی چاہ سے کیا ملتا ہے...... لوگ ملتے ہیں؟"
"نہیں...... زمانہ ملتا ہے......"
"لوگ زمانہ نہیں ہوتے......؟"
"نہیں...... ہم خود زمانہ ہوتے ہیں......"
"اگر میں اللہ کی چاہ رکھوں تو......؟" موم پر شعلہ جل بجھ رہا ہے......
"تو وہ تمہاری چاہ رکھے گا......" شعلہ جلا...... اور روشنی پھیل گئی۔
"میں خوب صورت نہیں ہوں......" آنکھیں برس پڑی تھیں......
"وہ خوب صورت ہے......" بی بی نے بغور اسے دیکھا تھا۔
"شہر بانو بنت فرہاد...... خوب صورت نہیں ہے بی بی......" وہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔
بی بی نے اسے لپٹا لیا تھا۔
"اللہ کو شفاف دلوں کی...... شفاف عبادتوں کی ضرورت ہے...... وہ سب کا سانجھا ہے بانو...... جمع، تفریق کرنے کے ہنر انسانوں میں ہوتے ہیں جو جواب میں خسارے دیتے ہیں...... اور اللہ بہترین دوست ہے...... جو آپ کو اکیلا نہیں کرتا......"
اماں نے تسبیح کے سارے موتی چن کر بی بی کے سامنے رکھ دیے اور جانے لگیں۔
بی بی نے پیچھے سے پکارا تو پلٹ کر انہیں دیکھا...... جانے کیوں ہر طرف دھند تھی...... سفید نابینا کر دینے والی...... غلافی دھند......
"اسے کچھ نہ کہنا...... وہ بڑے طویل سفر پر گئی ہے لوٹے گی تو تھکن سے چور، چور ہوگی...... جب نڈھال قدموں اور شکستہ چال کے ساتھ واپس پلٹے تو اسے میری طرف بھیج دینا۔"
"اگر وہ پلٹی ہی نہیں......؟" اماں جیسے قبر میں بند تھیں...... بی بی نے موتی پھر سے پرونے شروع کیے تھے۔
"اس تسبیح کو دیکھ رہی ہو...... ایک بات یاد رکھو...... اس کی ایک بار گانٹھ ٹوٹ چکی ہے مگر دوسری بار مضبوط گانٹھ باندھ کر اسے ٹوٹنے نہیں دوں گی...... بانو...... کو بھی ٹوٹنے دو، دوسری بار جڑے گی تو پھر کبھی نہیں ٹوٹے گی۔"
"اسے کون جوڑے گا بی بی؟"
"جو بناتا ہے...... توڑتا ہے پھر جوڑتا ہے...... اور تبھی ہم کندن ہوتے ہیں......" عقبی کمرے کے روشندان میں بیٹھے کبوتروں نے اپنے ننھے بچوں کو اڑان کے لیے گھونسلے سے گرا دیا...... اور یہی ہوتا ہے...... یہی ریت ہے...... یہی بقا سے فنا کا تعلق......

☆☆☆

تانگے والے اڈے پر بہت رش تھا...... یوں لگتا تھا ہر چیز کو آنکھ لگ چکی ہو...... کھوج کرتی ہوئی ترستی ہوئی...... دسمبر کی اس ڈھلتی ہوئی دوپہر میں وہ پسینہ، پسینہ ہو چکی تھی...... بلا کا ہجوم تھا یوں لگتا تھا جیسے ساری مخلوق ایک ساتھ کہیں آنے جانے پر کمربستہ ہو گئی تھی۔
"چاچا بڑے بازار جانا ہے......" شور میں رحمت کوچوان کو اس کی آواز بڑی مشکل سے سنائی دی تھی۔
"ارے بانو بیٹا...... اکیلی کہاں جا رہی ہو...... شریفاں کہاں ہے؟" اس سوال جواب کے مرحلے نے اسے کوفت میں مبتلا کر دیا تھا۔
"کچھ سینے پرونے کا سامان خریدنا تھا...... اماں...... نکڑ والے اسکول مال بیچنے گئی ہے۔"
"اچھا...... اچھا بیٹھ میری دھی تجھے چھوڑ آتا ہوں......" رحمت مسکرایا تھا۔ زمانوں کی کٹی پھٹی تارکول پر جیسے تانگا رینگ رہا تھا...... دھکے لگ رہے تھے یوں لگتا تھا کہ انتڑیاں باہر آجائیں گی...... تانگے کی ٹک، ٹک جیسے کھل جا سم سم کی آواز بن گئی وہ بھی جیسے مدار سے ہٹنے والی تھی۔
شہر بانو نے اپنا بنارسی دوپٹا اوڑھ رکھا تھا جو ہلکے

کاسنی رنگ کا تھا اور جس کی لیس جگہ، جگہ سے اکھڑ چکی تھیں...... اسی سے اس نے نقاب بنالیا تھا...... اس نے کھسا پہن رکھا تھا...... جو اماں میلے سے لائی تھیں...... ہاتھوں کو مہندی سے رنگا ہوا تھا۔ ناخن نیل پالش سے سجے ہوئے تھے جو ایک نظر میں ہی اپنے برانڈ کا پتا دیتے تھے...... جسے شہر بانو نے پانی ڈال کر تر کرنے کی کوشش کی تھی کیونکہ اس کی مدت پوری ہو چکی تھی اور وہ خشک ہو چکی تھی...... آنکھوں میں گہرا کاجل تھا اور کلائیاں کانچ کی چوڑیوں سے بھری ہوئی تھیں...... اور ان کی کھن، کھن بڑی عجیب سی تھی...... بلکہ عجیب تر سی...... دل پسلیاں توڑ کر باہر آرہا تھا...... وہ ریڈیو اسٹیشن کی عمارت کے سامنے کھڑی تھی...... اور اسے وہ عمارت بڑی بلند اور مقدس لگی تھی وہ پلکیں جھپکائے بغیر دیکھے گئی۔

تیرا درجہ اول، تیرا ٹھکانا اول......

چوکیدار نے اس سرپھری کو دیکھا...... شہر بانو بنت فرہاد کو اس کی آنکھوں سے بڑا خوف آیا تھا...... ان آنکھوں میں کچھ، تھا...... کچھ ایسا جو لعنت کی بڑی بھرپور وضاحت کرتا ہے۔

''کس سے ملنا ہے؟'' خشمگیں آنکھیں، کرخت لہجہ تھا۔

''فاران ، فاران حیدر سے......'' آواز ہزار گنبدوں کی دیواریں توڑ کر جیسے باہر نکلی تھی۔

چوکیدار اسے قریبی لان میں بٹھا کر اندر کہیں چلا گیا تھا...... یہ ایک وسیع و عریض سی جگہ تھی جہاں پھولوں کی بہتات تھی...... نیلے، پیلے، کاسنی، وہ لال گلاب ڈھونڈتی رہی...... جانے کیوں وہاں لال گلاب تھے ہی نہیں...... اسے خبر نہ تھی کہ وہاں لال گلاب کے ساتھ ''محبت'' بھی نہیں تھی۔

پھولوں پر اڑتی شہد کی مکھیوں میں سے کوئی مکھی اسے ہتھیلی پر کاٹ گئی...... وہ چپ چاپ سی بیٹھی وہ سرخ نشان دیکھے گئی...... نظر اوپر اٹھی اور اٹھی رہ گئی...... بت ہو گئی...... صنم نے اسے بت کر دیا تھا...... وہ آرہا تھا...... شہر بانو کو لگا ابھی دل پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا۔

یونانی دیوتاؤں سا حسین وہ شخص خراماں، خراماں چلتا آرہا تھا...... دلکش خدوخال، روشن پیشانی، گہری سیاہ آنکھیں تھیں...... بلیک جینز کے ساتھ اسکائی بلیو کلر کی شرٹ جچ رہی تھی...... ستواں کھڑی ناک، جیل سے کھڑے بال، وہ ساکت سی اسے دیکھے گئی...... وہ اسے بڑا اونچا لگا تھا...... بہت......

وہ قریب آکر اس کے سلام کا جواب دیتا اسے بینچ پر بیٹھنے کا کہہ رہا تھا۔

''بیٹھیے پلیز......'' وہ بیٹھ گئی تھی...... نروس سی...... دسمبر کی محبت یونہی پسینے میں نہلا دیتی ہے۔

''جی...... تو آپ کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہ رہی تھیں؟'' آواز کا جادو سر چڑھنے لگا تھا۔ وہ سوال جانے کیوں اسے برا لگا تھا...... دوبارہ ہتھیلی پر چبھن ہوئی...... سرخ نشان

''مجھے...... مجھے آپ کا پروگرام بہت پسند ہے...... میں بہت شوق سے سنتی ہوں، آپ کے پروگرام کے دوران تو میں اپنا سینے پرونے کا کام کرنا بھی چھوڑ دیتی ہوں......'' وہ سادہ سی لڑکی دل کی حکایت بتانے بہت دور سے سفر کر کے آئی تھی...... وہ مسکرایا تھا۔

''جی شکریہ...... کہ آپ کو میرا پروگرام پسند آیا اور آپ مجھ سے ملنے یہاں تک چلی آئیں......'' اتنی حسین مسکراہٹ شہر بانو کو لگا بیٹھے، بیٹھے وہ یہیں پتھر کا مجسمہ بن جائے گی۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' وہ اب پوچھ رہا تھا، کیا وہ اسے نہیں پہچان رہا تھا۔

شاید وہ مذاق کر رہا تھا، وہ پتھر کے پلر سے ٹیک لگائے کھڑا تھا...... سفیدے کے چھدرے پتوں سے ٹھنڈی ہلکی دھوپ اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی...... شہر بانو کا جی چاہا اس پر اپنی ہتھیلیاں رکھ دے۔

وہ پہیلی بن گئی تھی چاہتی تھی فاران حیدر اسے خود بوجھ لے...... فاران کے چہرے پر اکتاہٹ سی تھی۔

''آپ نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا؟'' وہ دوبارہ پوچھ رہا تھا۔

وہ مایوس ہوئی تھی۔ ''جی...... میں شہر بانو جو آپ کو خط لکھتی ہے۔'' وہ زبردست انداز میں چونکا تھا۔ غور سے اسے دیکھا۔ کہاں یہ لڑکی اور کہاں وہ موتیوں کی سی چمکدار لکھائی......

''اوہ...... آئی سی...... کیا واقعی وہ خطوط آپ لکھتی ہیں...... اگر وہ خط آپ لکھتی ہیں تو آپ پھر......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی...... اتنی خوب صورت لکھائی والی وہ خود کیسی تھی؟ میلی سی، دوپٹا نما چادر...... وہ یوں لگتا تھا جانوروں کے کسی ریوڑ میں رہتی تھی...... حیوانوں کی گردنوں میں بندھی گھنٹیوں کی آواز اس کی چوڑیوں کی آواز سے زیادہ اچھی تھی......

''جی...... آپ کچھ پوچھیں گی؟''

''نہ...... نہیں...... شکریہ۔'' زبان ہکلا گئی تھی...... فضا میں آوارہ پرندوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

فاران نے اسے دیکھا تھا۔

''کیا آپ کو کچھ اور بھی کہنا ہے؟'' وہ اکتا گیا تھا۔ اور شہر بانو بنت فرہاد پر جیسے لاج کا پہر آن ٹھہرا تھا...... جھجک اور محبت......

''آپ، آپ نے کہا تھا کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں......'' گنبدوں کی دیواریں دراڑوں سے اٹ گئیں۔

''میں...... میں بھی آپ کو سوچتی رہتی ہوں...... مجھے، مجھے آپ اچھے لگتے ہیں۔'' سادہ لوح لڑکی کی وہ مسکراہٹ بھی بڑی سادہ تھی...... گھماؤ پھیراؤ سے عاری...... وہ اب چپ سی ہو کر زمین کی طرف دیکھتی جا رہی تھی...... اور وہ آسمان کی طرح کھڑا رہا...... بے نیاز...... وہ حیران تھا...... شاید یہ کوئی خبطی لڑکی تھی، پروگرام کرتے وقت ہر کسی سے لگاوٹ کا مظاہرہ کرنا اس کے پروگرام کا حصہ تھا...... وہ لڑکی جانے کس امید پر سفر کر کے آئی تھی۔

''محترمہ...... یہ بات میں ہر سننے والے کو کہتا ہوں...... پروگرام کرتے وقت لوگوں کو متاثر کرنا ہماری مجبوری ہوتی ہے، لفظوں سے لوگوں کے دلوں میں گھر کرنا ہی ہمارا فن ہے اور اسی کے ہمیں پیسے ملتے ہیں...... تھوڑا سا ہنس کر بات کر لو تو جانے لوگ کیا سمجھنے لگ جاتے ہیں۔''

اور دسمبر کی ہوائیں وہ راز جان ہی گئی تھیں......

''جہاں محبت نہیں ہوتی وہاں لال گلاب بھی نہیں ہوتے......'' شہر بانو کو لگا تھا کسی نے اس پر انگاروں سے بھرا تھال اچھال دیا...... وجود پر آگ ہی آگ تھی...... آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''آپ...... آپ تو روز میری تعریفیں کرتے تھے؟'' وہ گواہی مانگ رہی تھی یا پھر تصدیق چاہ رہی تھی۔ خبر نہ تھی...... لفظوں کا ساحر سحر پھونک رہا تھا...... ایسا سحر جو پتھر نہیں کرتا، توڑ دیتا ہے۔ شہر بانو ٹوٹ رہی تھی۔

اذیت...... وحشت...... کیا کچھ نہ تھا......

''محترمہ کتنی بے وقوف ہیں آپ...... سوچے سمجھے بغیر گھر سے نکل پڑیں...... تم لڑکیوں سے ذرا سا ہنس کر بات کر لو فریفتہ ہی ہو جاتی ہیں۔ اگر مجھے محبت ہوئی بھی تو ہرگز تمہارے جیسی لڑکی سے کبھی نہیں ہوگی جس پر انسان دوسری نگاہ ڈالنا بھی گوارا نہیں کرے۔'' زمین پیروں کے نیچے سے کیسے کھسکتی ہے یہ آج پتا چل رہا تھا...... آسمان سر پر کیسے ٹوٹتا ہے آج خبر ہو رہی تھی۔

''ایک تو صورت شکل آپ کی صفر...... خیر وہ تو اللہ کی بنائی ہوئی ہے مگر آپ کا حلیہ...... اوپر سے آپ کے کردار کا پتا اس بات سے چل رہا ہے کہ ایک انجان شخص سے محبت کا دعوے کرنے گھر سے نکل پڑیں...... آپ تو کوئی سائیکو لگتی ہیں...... جائیں محترمہ اپنا علاج کروائیں، آپ کو علاج کی ضرورت ہے۔'' ہتھیلیوں کے سرخ نشان جلنے لگے...... جانے کہاں سے اردگرد دھواں جمع ہو گیا تھا...... وہ نابینا ہو گئی تھی جیسے...... وہ جا رہا تھا...... وہ اس کے پیچھے بھاگی تھی۔

وہ بازو چھڑاتا پلٹتا تھا......

"اپنی اوقات میں رہیں...... پانچ منٹ میں یہاں سے چلی جائیں اور اگر ایسا نہ ہوا تو چوکیدار آپ کو دھکے مار کر باہر نکال دے گا۔"

اور ٹھوکر تو وہ کھا چکی تھی...... اسے بی بی یاد آئی تھیں۔

"بانو...... کبھی خدا کے درجے پر انسان کو نہ رکھنا......" اور اس نے رکھا تھا اور پھر دیکھ بھی لیا تھا...... وہ کہتا ہوا جا رہا تھا۔

"جانے کہاں سے آجاتے ہیں بے وقوف لوگ......"

یونانی دیوتا کا بت پاش، پاش ہو چکا تھا۔ ہر ٹکڑے میں نیا چہرہ تھا۔

وہ روتی ہوئی وہاں سے بھاگی تھی...... ریڈیو اسٹیشن کی وہ عمارت تو ملمع تھی...... دھوکا، فریب، چھل...... بھروسے یوں ہی ٹوٹا کرتے ہیں...... آوازوں کے ساز محبت نہیں ہوتے۔ شہر بانو بنت فرہاد خود کو ادھیڑ بیٹھی تھی...... وہ سچ میں بھدی اور بد صورت تھی......؟ وہ شخص، کئی روپ رکھتا تھا...... چہرہ در چہرہ...... اور وہ جو محبت تھی بڑی باکمال تھی اس نے سچ کہا تھا...... وہ اسے توڑ گئی تھی...... دل سے شاید "شر" غائب ہو چکا تھا...... اور "خیر" باقی تھا......

☆☆☆

"دلوں سے انسان نکلتے ہیں تو پتا چلتا ہے ان کی ضرورت ہی نہیں...... ضرورت تو اللہ کی ہوتی ہے...... جو ہے...... اور جو ہمیشہ رہے گا۔"

دسمبر کی اس سرد شام میں وہ بی بی کے گھر کے صحن کی سرخ اینٹوں پر دیوانگی کے عالم میں بیٹھی تھی...... آنکھیں جیسے پنجر ہو چکی تھیں...... ہلکا ہلکا اندھیرا تھا...... برآمدے کے زرد بلب جل رہے تھے۔ مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں...... مقدس آواز...... مقدس ساعتیں......

بی بی باہر آئیں اور ٹھٹک گئیں۔

"آؤ کامیابی کی طرف......"

شہر بانو نے ڈبڈبائی آنکھوں سے انہیں دیکھا جو اس کے دل میں یقین کی فصل اگاتی تھیں......

"بی بی...... وہ معاف کر دے گا ناں......؟"

"تم نے معافی مانگی ہے؟" سوال کے اوپر سوال ٹھہر گیا۔

"اگر اس نے معاف نہیں کیا تو......؟" سب سوال تھے...... وہ آگے بڑھ کر اسے اٹھانے لگیں۔

"انسان ہمیشہ خسارے کا سودا کرتا ہے اور پھر ساری زندگی اسی جمع تفریق میں لگا رہتا ہے...... اور یہی سب سے بڑی غلطی ہوتی ہے...... معافی اگلے خساروں کو ختم کرتی ہے...... تم اسے ایک بار صدا دو...... شہر بانو...... وہ سو بار پلٹ کر جواب دے گا۔"

وہ ریت کا محل بن گئی...... ذرہ ذرہ گرتی جا رہی تھی۔

"میں نے اسے چھوڑ دیا تھا۔"

"وہ نہیں چھوڑتا......"

"میں نے اس کی پکار کو نظر انداز کیا......"

"وہ تمہاری صدا کو نظر انداز نہیں کرے گا۔"

سوال ہو رہے تھے...... جواب حاضر تھے...... سوال مشکل...... جواب سہل......

"وہ ایسا کیوں ہے؟" بی بی مسکرائی تھیں۔

"اس لیے کہ...... وہ اللہ ہے...... عروج...... ہم بشر ہیں زوال...... ہم گرتے ہیں، وہ اٹھاتا ہے...... گرنا ہماری عادت ہے، سنبھالنا اس کا وصف ہے......"

اور وہ گھر کی طرف جانے لگی...... عروج والے سے معافی لینی تھی...... اپنی غلطی کا اعتراف کرنا تھا...... اور اس کا وصف پرکھنا تھا...... اور پرکھ کے پیمانوں پر بھی اس کا عروج قائم ہوتا ہے۔

"اس کا ساز، اس کا وجود...... ندامت دیتا ہے مگر صورِ محبت اس کی محبت بھی دیتا ہے...... جو سارے درجوں کا عروج ہے۔

وہ مسکراتی ہوئی سوچ رہی تھی۔

"تیرا درجہ سب درجوں پر بھاری...... تیری محبت سب سے اعلیٰ...... ہے بھی نہیں اور ہر جا ہے بس تو ہی تو ہے۔"

# یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

## پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ایڈ فری لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

**Click on http://paksociety.com to Visit Us**

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-



"چھنو کی آنکھ میں اِک نشہ ہے۔" موبائل پر مشہور سونگ کی رنگ ٹون بجی تو ثمرہ نے لپک کر تکیے کے نیچے سے موبائل نکالا، وہ اس وقت آلتی پالتی مارے اپنے بیڈ پر بیٹھی ہوئی اپنی من پسند مصنفہ "روشنی بخاری" کا ناول "رودادِ قفس" پڑھ رہی تھی۔ ثمرہ کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا گھریلو ماحول خاصا روشن خیال تھا......

ثمرہ کے ابو خالد حمید گورنمنٹ کنٹریکٹر تھے جنھیں عرفِ عام میں ٹھیکدار کہا جاتا ہے۔ ان کا گھر خاصا کشادہ اور

# میں وہ نہیں ہوں

## سفینہ یاسمین



مالی حالات خاصے بہتر تھے۔ ثمرہ انجینئرنگ یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ تھی لیکن اسے مطالعے کا بے حد شوق تھا اور روشنی بخاری کی تحریر کی تو وہ دیوانی تھی..... اس وقت وہ اپنے بیڈ پر بڑے اطمینان سے لیٹی حسبِ معمول اپنے مطالعے کا شوق پورا کر رہی تھی کہ موبائل کی رنگ نے اس کے سارے تسلسل اور انہماک کا بیڑا غرق کر دیا۔ اس نے جلدی سے موبائل کی جلتی بجھتی ہوئی اسکرین پر نظر دوڑائی تو اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ موبائل اسکرین پر ایک نام جھلملا رہا تھا کمال..... اس نے جلدی سے گرین بٹن پش کیا اور پھر فون کان سے لگالیا۔

''ہیلو.....'' دوسری جانب سے وہی جادوئی آواز سنائی دی جو اس کے دل و دماغ پر سحر طاری کر دیتی تھی، اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ختم ہو کر رہ جاتی تھیں اور وہ جیسے ہواؤں میں پرواز کرتی کسی اور ہی دنیا میں پہنچ جاتی، کسی نئے جہان میں، جہاں ہر سو پرندے چہچہاتے تھے، جہاں پھول کھلتے تھے، جہاں جھرنے گنگناتے تھے اور جہاں ہوائیں گیت گاتی تھیں۔ وہ اپنی اس کیفیت پر سخت پریشان ہو جاتی بارہا اس نے خود کو سرزنش کی تھی بارہا اس نے ارادوں کے بند باندھے کہ اب وہ فون سنے گی تو اس کی باتوں کے سحر میں نہیں ڈوبے گی پھر اس کا دل احتجاج کرتا کہ ''وہ فون سنے گی ہی کیوں؟''

''ہاں! اب اس کا فون آئے گا تو میں کال ہی پک نہیں کروں گی۔'' لیکن یہ اب اس کے اختیار میں تھا ہی کہاں اس کا دل اس کے بس میں تھا ہی نہیں۔ اس کا دل تو جیسے اندر ہی اندر اس کے فون کا انتظار کرتا تھا.... جونہی اس کی کال آتی اس کی دھڑکنوں کی ترتیب بدل جاتی۔ اور وہ ایک انوکھی سی لذت، ایک عجیب سے خمار کا شکار ہو جاتی، اس کی تمام کوششیں بے سود رہتیں اس کے مضبوط ارادوں کے تمام بند ریت کی دیوار ثابت ہوتے اور وہ اپنے ہی ہاتھوں شکست کھا جاتی۔

''تم کرتے کیا ہو کمال؟'' وہ پوچھتی اور جواب میں ایک پُروقار سی ہنسی اور پھر وہی مخصوص سحر انگیز لہجہ وہی دلوں کو چھو جانے والی آواز.....

''جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں۔'' اور وہ خاموش رہ جاتی، وہ اس کے سامنے بول ہی کہاں پاتی تھی، وہ تو صرف سنتی رہتی تھی اس کی ٹھنڈی، میٹھی چشمے کی طرح پھوٹتی، مدہوش کرتی ہوئی جادو بھری باتیں کہ جن کو سنو تو سنتے ہی رہ جاؤ..... دل چاہے کہ وقت کی نبضیں ٹھہر جائیں، لمحے زنجیر ہو جائیں اور اس کی باتیں کبھی ختم نہ ہوں وہ بولتا رہے اور وہ بس سنتی ہی چلی جائے.....

بہت دنوں تک وہ الجھتی رہی خود سے لڑتی رہی اپنی اس کیفیت پر پریشان ہوتی رہی لیکن پھر رفتہ رفتہ وہ اس جادوگر کی باتوں میں آتی چلی گئی۔ اس کے اندر ایک تبدیلی رونما ہوئی تھی ایک چھوٹی سی کونپل پھوٹی تھی جسے وہ بہت دنوں تک کوئی نام نہیں دے پائی تھی لیکن جب اس نے اپنا تجزیہ کیا تو ہر راز کھلتا چلا گیا۔

یہ ننھی کونپل محبت کی کونپل تھی جو آہستہ، آہستہ پودے کی صورت پروان چڑھتی رہی۔

☆☆☆

رضوان نے اسے آئس کریم شاپ سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ حسن و خوب صورتی کا یہ شاہکار اس کے دل پر بجلی گرا گیا تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھا اس لڑکے کا انتظار کر رہا تھا جسے اس نے سو کا نوٹ پکڑاتے ہوئے سگریٹ لانے کو کہا تھا کہ اس دوران اچانک اس کی نظریں آئس کریم شاپ کی طرف اٹھی تھیں اور پھر جھپکنا بھول گئی تھیں۔ سرخ و سفید رنگ، متناسب وجود، بڑی، بڑی غزالی آنکھیں اور لمبے گھنے سیاہ بالوں والی یہ لڑکی اس وقت آسمانی کلر کے خوب صورت شلوار سوٹ میں ملبوس کوئی اپسرا دکھائی دے رہی تھی اور پتا نہیں کیوں رضوان کو خود پر اختیار نہیں رہا تھا۔ حالانکہ بذاتِ خود وہ ایک خوب صورت اور وجیہہ جوان تھا اور ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بطور منیجر جاب کر رہا تھا..... گھر اور گاڑی بھی کمپنی کی جانب سے ملی تھی لیکن وہ تنہائی کا شکار تھا۔ والدہ بچپن میں ہی وفات پا گئی تھیں اور کچھ عرصہ قبل والد بھی داغِ مفارقت دے گئے تھے۔ بہن

بھائی کوئی تھا نہیں..... اب وہ تن تنہا زندگی گزار رہا تھا۔

اس لڑکی کے سحر میں وہ اس قدر کھویا کہ اس کی نگاہیں اس کا تعاقب کرتی چلی گئیں اور اب وہ ست رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے اس پارک کی پارکنگ میں آپہنچا جس کے گیٹ میں آئس کریم کا ایک کپ ہاتھ میں تھامے وہی حسینہ ابھی ابھی داخل ہوئی تھی۔ گاڑی کھڑی کر کے وہ بھی پارک میں داخل ہو گیا تھا۔ اس کی متلاشی نظریں اس کے تعاقب میں تھیں۔ اور پھر جلد ہی وہ اسے نظر آگئی، پھولوں کے ایک کنج کے پاس مخملی گھاس پر بیٹھی وہ ایک کان سے موبائل لگائے اور دوسرے ہاتھ سے آئس کریم کھاتے ہوئے کسی سے محوِ گفتگو تھی۔ رضوان نے ایک لمحے کے لیے رک کے محتاط نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیا سب اپنے، اپنے حال میں مست تھے اور کوئی بھی اس کی جانب متوجہ نہیں تھا تب اس نے قدم آگے بڑھا دیے اور گھوم کر پھولوں کے کنج کی دوسری جانب آبیٹھا اور اب وہ پھولوں کی اوٹ میں تھی، نہ وہ اسے نظر آرہی تھی اور نہ ہی وہ اسے دیکھ رہی تھی لیکن ڈھائی فٹ کی اس دوری سے اس کی آواز اسے صاف سنائی دے رہی تھی اس کی آواز بھی اس کے اپنے وجود کی طرح خوب صورت تھی، اس کی سماعتیں پروانہ وار اس کے ایک، ایک لفظ پر نچھاور ہونے لگیں اور اس کا ذہن ان تمام باتوں کو محفوظ کرنے لگا، وہ کہہ رہی تھی۔

''لیکن کمال یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر تمہارے کورٹ میرج کرنے کے اس فیصلے سے اتفاق بھی کرلوں تو میں تو تمہیں اچھی طرح جانتی بھی نہیں ہوں۔ بے شک تم ایک پُرکشش اور وجیہہ جوان ہو لیکن بغیر سوچے سمجھے اتنا بڑا قدم.....'' پھر کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد آواز دوبارہ سنائی دی۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے کمال! لیکن جو کوئی بھی سنے گا وہ تو یہی کہے گا ناں کہ ثمرہ پاگل ہو گئی۔'' چند لمحوں کی مزید خاموشی اور پھر دوبارہ آواز سنائی دی۔

''ٹھیک ہے کمال تم سے دوری کے اس احساس کو مٹانے کے لیے میں اس اندھے کنویں میں چھلانگ لگانے کے لیے تیار ہوں، میں اب تم سے دور نہیں رہ سکتی جو تم کہو گے میں ویسا ہی کروں گی۔'' وہ پھر خاموش ہو گئی تھی شاید وہ دوسری طرف کی آواز سن رہی تھی۔ پھر وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

''ٹھیک ہے، میں کل گیارہ بجے تمہاری بتائی ہوئی جگہ پہنچ جاؤں گی۔'' پھر اس نے پتا دُہرایا تھا جسے رضوان نے بغور سنا اور حفظ کر لیا۔

''میں نے اسکائی بلیو کلر کا سوٹ پہنا ہو گا اور میرے ہاتھ میں گرین کلر کی فائل ہو گی۔'' چند لمحوں کی خاموشی پھر آواز دوبارہ سنائی دی۔

''ٹھیک ہے، میں نے سمجھ لیا تم نے گرے کلر کا سوٹ اور بلیک ٹائی لگا رکھی ہو گی، تمہارے ہاتھ میں سرخ رنگ کا ہینڈ کیری ہو گا یہی ناں؟'' اس کے بعد الوداعی کلمات کا تبادلہ ہوا اور سلسلۂ گفتگو ختم ہو گیا اور آئس کریم کا خالی کپ اڑتا ہوا رضوان کے قدموں میں آگرا پھر ہلکی، ہلکی آہٹیں بلند ہوئیں شاید وہ جا رہی تھی لیکن رضوان اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا، اس کی نظریں دور خلا میں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں اور وہ خاموش اور ساکت بیٹھا تھا۔

☆☆☆

''زائمہ! جلدی سے تیار ہو جاؤ بیٹا، اسکول نہیں جانا کیا؟'' ثمرہ نے ناشتا بناتے، بناتے کچن میں سے آواز لگائی تھی، آئمہ کی عمر سات سال تھی اور وہ اس کے قریب ہی بیٹھی ناشتا کر رہی تھی جبکہ زائمہ کو تقریباً بیس منٹ ہو گئے تھے، وہ واش روم سے باہر نہیں نکلی تھی۔ کمال حسبِ معمول تیار ہو کر آفس جا چکے تھے اور اسے اپنے روزمرہ کے معمول کے مطابق آئمہ اور زائمہ کو تیار کر کے ڈرائیور کے ساتھ دوسری گاڑی میں بھیجنا تھا۔ کمال کے پاس اب بھی وہی گاڑی تھی جو انہیں آفس کی طرف سے دی گئی تھی۔ اور شروع سے ان کے استعمال میں تھی جبکہ شادی کے بعد کمال نے دوسری گاڑی اور ڈرائیور کا انتظام ثمرہ کے لیے کیا تھا۔ اور اب

جبکہ وہ دو پیاری، پیاری خوب صورت بچیوں کی ماں ہونے کے درجے پر فائز ہو چکی تھی تو ڈرائیور کی صبح اٹھنے کے بعد اولین ذمے داری بچیوں کو اسکول پہنچانے کی ہوتی تھی اور اس کے بعد ڈرائیور اور گاڑی بچیوں کی چھٹی ہونے تک ثمرہ کی ڈیوٹی پر رہتے تھے۔ ثمرہ نے جلدی، جلدی بچیوں کو ناشتا کروایا، ان کو یونیفارم پہنایا ان کے بال سنوارے اور پھر گیٹ پر کھڑے ہو کر ہاتھ ہلاتے ہوئے ہمیشہ کی طرح دونوں بچیوں کو ڈرائیور کے ہمراہ اسکول روانہ کر دیا۔ اب وہ فری تھی سو وہ اپنے بیڈ روم کی طرف چلی آئی، کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نگاہ نیوی بلیو کلر کے سوٹ میں ملبوس شخص کی مسکراتی ہوئی تصویر پر پڑی جو ایک خوب صورت فریم میں سجی ہوئی سائڈ ٹیبل پر رکھی تھی۔ وہ بیڈ پر ڈھیر ہو گئی اور بڑی گہری نظروں سے اس تصویر کو تکنے لگی۔

اب اس کے ذہن کے پردوں پر وہ منظر کسی فلم کی طرح چلنے لگا تھا......

دس سال قبل کا وہ منظر جب وہ سکڑی، سمٹی، ڈری، سہمی اور شرمائی، لجائی سی مرزا امتیاز علیم بیگ ایڈووکیٹ کے چیمبر کے سامنے کھڑی کمال کی منتظر تھی بہت سے وہم بہت سے خدشات اسے لرزائے دے رہے تھے لیکن اس کا دل اسے سہارا دے رہا تھا کہ جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔ اور پھر ایک جانب سے وہ نمودار ہوا۔ گرے کلر کے خوب صورت سوٹ میں ملبوس بلیک ٹائی اور ہاتھ میں سرخ رنگ کا ہینڈ کیری لٹکائے وہ سیدھا اس کے قریب آ پہنچا تھا اور وہ جو محویت سے اسے دیکھ رہی تھی اس نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں مبادا اسے نظر لگ جائے۔ وہ اس کی سوچ سے زیادہ وجیہہ، اسمارٹ اور پرکشش تھا۔

''واؤ......'' اس نے مڑتے ہوئے کہا اور وہ اس کی پجارن بنی اس کے پیچھے چلتی چلی گئی بیانات کے بعد رجسٹرار کے پاس ان کے ناموں کا اندراج ہوا تو اس نے اپنا نام ثمرہ خالد درج کروایا اور اس نے رضوان کمال اور پھر وہ اس کے ساتھ ہو لی تھی۔ اس نے اپنا گھر اپنے بہن، بھائی عزیز و اقارب غرض کہ ہر رشتہ ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے فراموش کر دیا تھا کیونکہ اب وہ نئی دنیا کی مسافر تھی، جہاں رنگ تھے، روشنیاں تھیں، خوشبوئیں، پھول تھے اور...... اور اس کا کمال تھا... اور کمال نے بھی کبھی اسے کسی کمی کا، کسی تشنگی کا، کسی ادھورے پن کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ اس نے اس کے دامن میں اتنی خوشیاں ڈال دی تھیں کہ اس سے سمیٹنا مشکل ہو گئی تھیں اتنا پیار، اتنی چاہت، اتنا مان دیا تھا کہ اسے سب کچھ بھول گیا تھا۔

آج ان کی شادی کی دسویں سالگرہ تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ ہمیشہ کی طرح آج بھی کمال کو اپنی شادی کی سالگرہ یاد رہتی ہے یا نہیں؟ سوچوں کے اس پیچ و خم میں الجھتے ہوئے اسے نہ جانے کتنی دیر گزر چکی تھی کہ اچانک اس آواز کو سن کر اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔

''ہیپی ویڈنگ اینورسری ثمرہ ڈارلنگ......'' وہ بے اختیار ہو کر آواز کی سمت بھاگی۔

''اوہ کمال! تم کتنے اچھے ہو؟'' اس نے کمال کے ہاتھوں سے پھولوں کا گلدستہ اور کیک کا ڈبا پکڑتے ہوئے بے اختیار کہا۔ اور کمال کے چہرے پر ایک لمحے کو جیسے عجیب سے تاثرات نمودار ہوئے پھر اس نے ثمرہ کو کندھوں سے پکڑا اور اسے لے جا کر بیڈ پر بٹھا کر خود بھی ساتھ ہی بیٹھ گیا پھر دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ پکڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''ثمرہ! میں نے تمہیں پہلی مرتبہ آئس کریم شاپ پر دیکھا پھر اس دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہارا تعاقب کیا۔ پارک میں جو گفتگو تم نے موبائل پر کی اس کا ایک، ایک لفظ میں نے سن لیا تھا۔ شاید پہلی ہی نظر میں مجھے تم سے محبت ہو گئی تھی پھر میں نے قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا اور تمہارے لیے خود کو کمال بنا دیا۔ لیکن سچ یہی ہے کہ جس ''کمال'' سے تم نے محبت کی تھی میں وہ نہیں ہوں۔''

# برزخ

نگہت سیما





"اور یہ سب تمہارے کوتک ہیں، تمہارے کوتکوں نے اس حال میں پہنچایا ہے ہمیں۔"

بوڑھا سنان زمین پر اِدھر اُدھر لاٹھی مارتا اس کی طرف بڑھتا تھا اور وہ کمرے کے ایک کونے میں سہمی سی بیٹھی خوفزدہ نظروں سے اسے تکتی تھی اور دوسرے کونے میں چرخہ کاتتی نور فاطمہ تھی جو اپنے میں مگن چرخہ کاتتی تھی۔ کمرے میں چرخے کی گھوں، گھوں تھی اور زمین پر لاٹھی مارنے کی آواز تھی۔ جو اس

سہمی، سہمی لڑکی کی سمت بڑھتی تھی اور اسے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اس کی آنکھوں کا خوف بڑھ گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں کسی خوفزدہ ہرنی کا سا خوف تھا۔ اس کے گلابی ہونٹ بار، بار خشک ہو جاتے تھے اور وہ زبان پھیر، پھیر کر انہیں تر کرتی تھی اور لانبی خوب صورت پلکیں جھپک، جھپک کر آنسوؤں کو باہر آنے سے روکتی تھی اور بوڑھے سنان کی لاٹھی زمین پر گردش کرتی تھی۔ اسے دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن اس کا رخ اسی کی سمت تھا اور وہ لاٹھی کو زمین پر گردش دیتا بالکل اس کے سامنے پہنچ گیا اور اس کی لاٹھی نے اسے چھولیا اور اس کی گردش وہاں ہی رک گئی‘ اس نے لاٹھی کو دبایا اتنا کہ اسے لگا کہ وہ اس کی پنڈلی کے گوشت میں دھنسی جاتی ہو۔ اس کے بے آواز آنسو اس کے صبیح رخساروں پر خاموشی سے بہتے تھے اور اس نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیا تھا اور دونوں بازو گھٹنوں کے گرد حمائل کر لیے تھے‘ اب لاٹھی اس کی پسلیوں میں چبھتی تھی۔

''ہاں تمہارے کوتک......'' بوڑھے سنان نے لاٹھی پر دباؤ ڈالتے ہوئے دانت پیسے۔ ''تمہارے سیاہ اعمال......''

''یہ اس کے کوتک نہیں ہیں تمہارے کرموں کا پھل ہے جو ہم بھگت رہے ہیں...... تمہارے کرموں کا پھل سنان خاناں!'' دوسرے کونے میں چرخہ کاتتی عورت چلائی تھی۔

''بھول گئے جب تم اور کوشلیا...... اور جب موتی چمارن اور جب...... تمہارے کرتوتوں پر تب پردہ پڑ گیا تھا پر سزا تو ملنی تھی ناں...... سو اب ملی۔''

''کیا کہا...... کیا کہا تم نے جاہل عورت......؟'' بوڑھے سنان نے رخ موڑ لیا تھا اور اب اس کی...... لاٹھی عورت کی سمت زمین پر گردش کرتی تھی اور وہ زمین پر چاروں اور لاٹھی مارتا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سہمی، سہمی سی غزال آنکھوں والی لڑکی نے پسلیاں سہلاتے ہوئے گھٹنوں سے سر اٹھایا تھا اور اب کانپتی آواز میں کہہ رہی تھی۔

''بابا...... باہر کوئی ہے، کسی نے کنڈی بجائی ہے۔''

''کون ہوگا...... وہی تیرا......'' بوڑھا سنان نفرت سے چلّایا۔

''بس اس سے آگے ایک لفظ نہ کہنا‘ وہ تیری بیٹی ہے سنان......'' اب عورت کی آواز آہستہ ہو گئی تھی۔ ''تو اس کا یقین کیوں نہیں کرتا...... اس کی بات کیوں نہیں سنتا...... ایک بار سن لے اس کی بھی کیا کہتی ہے وہ۔''

''اس کی سنوں اور وہ بستی والے کیا جھوٹ بولتے ہیں‘ ان کی نہ سنوں جنہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا سب کچھ۔''

''کیا دیکھا آنکھوں سے؟'' اب کے چرخہ کاتتی عورت پھر بلند آواز سے چلائی۔

''بول کیا دیکھا؟'' بوڑھے کی زمین پر گردش کرتی لاٹھی چرخے سے ٹکرائی۔

''کیا تو نہیں جانتی کیا دیکھا...... بول کیا بہری تھی، کچھ نہیں سنا تو نے جب وہ سب کتوں کی طرح بھونک رہے تھے۔ وہ زمیندار کا بیٹا اکبر جو آنکھوں دیکھا حال سناتا تھا اور وہ جھورا (ظہورا) قصائی جو سینے پر ہاتھ مار، مار کر اس کی گواہی دیتا تھا کہ......''

''بس، بس سنان خاناں بس......'' اب عورت کی آواز بلند نہیں تھی لیکن وہ جو کہتی تھی اس سے اس کے دل کا درد جھلکتا تھا۔

''انہوں نے وہی دیکھا جو اُن کی آنکھوں نے انہیں دکھایا۔ آنکھوں کے آگے سرخ پٹی رکھ کر دیکھو تو سرخ دکھتا ہے نیلی پٹی چڑھا لو تو نیلا...... انہوں نے بھی اپنی آنکھوں پر غلاظت اور گندگی کی پٹی چڑھائی ہوئی تھی۔''

''چپ عورت چپ......'' بوڑھے نے دو تین بار اس کے چرخے پر اپنی لاٹھی ماری۔ ''میری استانی نہ بنا کر...... سبق نہ پڑھا مجھے۔'' کونے میں بیٹھی لڑکی کے آنسوؤں میں روانی آگئی۔ عورت نے تاسف سے اسے دیکھا۔ پتا نہیں کتنا سمندر چھپا تھا اس کے اندر کہ آنسو ختم ہی نہیں ہوتے تھے۔ کتنے دنوں سے وہ یونہی

روئے چلی جاتی تھی اور وہ ہونٹ سیئے بیٹھی تھی......اور اس سے نظریں چراتی تھی' ایک وہی تو تھی اکیلی وہی جو حقیقت جانتی تھی پر اس کی زبان پر تالے لگے تھے۔
صحن کے دروازے کی کنڈی پھر کھٹکی تھی اور ساتھ ہی آواز آئی تھی۔

''بابا سنان......بابا سنان......''

''پہلے جا کر دیکھ کون ہے دروازے پر۔'' نور فاطمہ اپنے تکلے کا جائزہ لینے لگی پھر پاس پڑی ٹوکری سے روئی کی پونی اٹھائی اب اس کی شہادت کی انگلی تیزی سے ہتھی پر حرکت کرتی تھی اور بوڑھا سنان لاٹھی کو گردش دیتا دروازے کی طرف جا رہا تھا۔لڑکی نے اٹھ کر اس کی لاٹھی پکڑی تو اس نے کہنی سے اسے پیچھے دھکا دیا......لڑکی دیوار سے لگ کر کھڑی ہوگئی لیکن نفرت کا یہ اظہار بنا منہ سے کوئی لفظ نکالے اس کے دل کو کرچی، کرچی کرتا تھا۔

''کون ہے بھئی، اندر صحن میں آجاؤ۔'' سنان کمرے کا دروازہ کھولے بلند آواز میں بولا تھا۔لکڑی کے سالخوردہ دروازے کے کھلنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی کسی نے بلند آواز میں جواب دیا۔

''میں ہوں کرم لاہی (الٰہی) جولاہا' سوت تیار ہے تو دے دو۔''

''کرم لاہی سوتر لینے آیا ہے۔'' بوڑھے نے پیچھے مڑ کر کہا۔

''ابھی تیار نہیں ہوا۔'' نور فاطمہ نے وہاں سے ہی جواب دیا۔

''کب کتے گا سوتر کب رنگا جائے گا......بتایا تو تھا زمیندار کی بیٹی کی شادی ہے۔ اس نے مجھے بارہ کھیس بننے کے لیے دیے ہیں......پورے بارہ کھیس، بارہ دریاں اور بستر دینے ہیں اس نے جہیز میں۔'' کرم الٰہی صحن کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔

''میرے دس ہاتھ نہیں ہیں، اب زمیندارنی بارہ کھیس، دریاں دے بیٹی کو یا چالیس جب تیار ہوگا سوتر تو لے جانا۔'' نور فاطمہ کا غصہ ابھی تک اس کے اندر کھولتا تھا۔

''اگر بہت جلدی ہے تو لے جا اپنی روئی اور دے، دے کسی اور کو کاتنے کے لیے۔''

اور کرم الٰہی جانتا تھا کہ کرماں بی بی اور نور حسین کے بعد اب وہی تھی جس کا کاتا سوت بہترین ہوتا تھا۔ ورنہ اسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ بستی سے بے عزت کر کے نکالے گئے اس خاندان کو منہ لگاتا۔

''اچھا ٹھیک ہے بہن پر جلدی کرنا اگلے چاند کی چودھویں کی تاریخ طے ہوئی ہے بیاہ کی اور اس سے پہلے مجھے کھیس تیار کرنے ہیں ڈبیوں والے کالے اور سرخ کھیس......''

نور فاطمہ نے جواب نہیں دیا تھا۔کرم الٰہی واپس جا رہا تھا اور بوڑھا سنان بھی زمین پر اِدھر اُدھر لاٹھی کو گردش دیتا بڑبڑاتا ہوا صحن میں جا کر ٹوٹے ہوئے بان والی چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔

یہ چھوٹا سا کچا کوٹھا تھا کھلا صحن اور صحن کے سامنے لمبائی میں دو کمرے ایک بڑا اور ایک اس سے ذرا چھوٹا، صحن میں دائیں بائیں دونوں طرف چھپر بنے تھے۔ ایک چھپر کے نیچے مٹی اور اینٹوں سے بنا چولھا تھا جبکہ دوسرے چھپر کے نیچے ایک بکری بندھی تھی۔ تین ماہ پہلے جب بستی والوں نے انہیں بستی سے نکالا تھا تو غلامو لکڑہارا انہیں اپنے اس کچے کوٹھے میں لے آیا تھا۔بہت سال پہلے غلام محمد اس بستی میں آیا تھا اور اس نے بستی میں رہنے کے بجائے بستی سے باہر اپنے لیے یہ کچا کوٹھا بنایا تھا۔وہ جنگل سے لکڑیاں کاٹتا اور بستی کے علاوہ آس پاس کے دوسرے گاؤں اور بستیوں میں جا کر فروخت کر دیتا تھا......کبھی، کبھی لوگ خود ہی ضرورت پڑنے پر لکڑیاں اس سے آ کر لے جاتے تھے۔صحن کے ایک حصے میں دیوار کے ساتھ وہ فالتو لکڑیوں کا ڈھیر لگاتا جاتا تھا۔بارشوں کے موسم میں وہ لکڑیاں اٹھا کر خالی کمرے میں رکھ دیتا تھا اور اب وہی کمرا خالی کر کے غلام محمد نے جسے سب غلامو کہتے تھے انہیں دے دیا تھا۔

اس روز جب بستی والوں نے انہیں نکالا تھا تو وہ

بستی میں ہی تھا اور جب وہ اپنے سامان کی گٹھریاں اٹھائے بستی سے باہر نکلے تھے تو غلاموان کے پیچھے تھا اور جب نور فاطمہ بین کرکر کے روتی تو بوڑھے غلامو کا دل تڑپ اٹھتا تھا۔ کوئی بھولا بسرا دکھ جیسے دل میں چٹکیاں بھرتا تھا...... اور نور فاطمہ روتے ہوئے بار، بار نابینا سنان خان سے پوچھتی تھی۔

''ہائے اب ہم کہاں جائیں گے سنان خاناں؟'' اور سنان خان اپنی لاٹھی اِدھر اُدھر گھماتے ہوئے چیختا تھا۔

''اس سے پوچھ...... اس سے...... جس کی وجہ سے ہمیں بستی سے نکلنا پڑا۔'' تب غلامو نے آگے بڑھ کر انہیں اپنے گھر چلنے کو کہا تھا۔

''اماں......!'' کونے میں کھڑی لڑکی نور فاطمہ کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔

''اماں کیا تم بھی...... کیا تمہیں بھی......''

تین ماہ بعد وہ پوچھ رہی تھی ننھی پر تیزی سے اس کی حرکت کرتی انگلی بس ایک لمحہ کے لیے رکی تھی اور اس نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

بھلا اس سے زیادہ کون جانتا تھا کہ اکبر نے پری جمال پر بہتان باندھا ہے اور ظہورا قصائی اس کا ساتھی جھوٹی گواہی دینے والا ہے۔

''اماں میں تو بس بانسری کی آواز سن کر......'' وہ تین ماہ کی چپ توڑ کر بتا رہی تھی۔

پتا نہیں کیوں بچپن سے ہی بانسری کی آواز اسے اسیر کر لیتی تھی۔ باندھ لیتی تھی اور بانسری کی لے اور سُر اس کے اندر ہلچل مچا دیتے تھے۔ فقیرا جو گاؤں کی گلیوں میں سارا دن ننگے پاؤں اِدھر سے اُدھر چلتے ہوئے ایک ہی مصرعہ گاتا رہتا تھا کبھی بلند آواز میں اور کبھی مدھم آواز میں......

ہیر آکھیا جوگیا جھوٹ آکھیں تے کون رٹھڑے یار ملاوندا اے

اور جب وہ ان کے گھر کے پاس سے گزرتا تو وہ جیسے اس کی آواز کے سوز کے سحر میں گرفتار ہو جاتی اور اس وقت تک دروازے کا پٹ پکڑے کھڑی رہتی جب تک اس کی آواز کانوں میں آتی رہتی اور جب وہ پلٹتی تو اس کی پلکیں بھیگی ہوتیں اور من گیلا ہو جاتا...... حالانکہ اس نے تو کسی کے بچھڑنے کا درد نہیں سہا تھا۔ ابھی وہ پورے سولہ سال کی بھی نہیں ہوئی تھی اور اس کا دل کسی انجانے وچھوڑے کا دکھ سہتا تھا اور اس رات جب چودھویں کا چاند آسمان پر چمکتا تھا اور زمین اس کی روشنی میں نہائی ہوئی تھی اور وہ کھڑکی سے لگی سامنے درختوں سے اوپر گول چاند کو دیکھتی تھی تو اس کی سماعتوں میں کہیں دور سے بانسری کی آواز آئی تھی۔

فقیرے کی آواز کا سارا سوز جیسے بانسری کے سُروں میں سما گیا تھا۔ کیا تھا اس کی آواز میں، ہیر کے بول تھے، وچھوڑے کا کرب تھا، دکھ تھا اور بے شمار آنسو تھے جو بانسری کے سُروں کے ساتھ فضا میں بکھرتے تھے، وہ بے اختیار ہی اپنے کچے گھر کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی تھی اور بانسری کے سُروں کے تعاقب میں وہ زمین پر بکھری چاندی میں چلتی ہوئی ایک جگہ ٹھٹک کر رک گئی۔ سامنے ہی کھیت کی منڈیر پر بیٹھا وہ اردگرد سے بے خبر آنکھیں بند کیے بانسری منہ سے لگائے بیٹھا تھا اور اس کی انگلیاں بانسری کے سوراخوں پر چابکدستی سے حرکت کرتی تھیں۔ چاندنی میں اس نے دیکھا اس کی انگلیاں لمبی اور پتلی تھیں اور اس کے ہاتھ بالکل عورتوں جیسے تھے اور چاندنی میں بالکل سنگ مرمر سے تراشے لگتے تھے۔ وہ وہاں ہی ٹاہلی سے ٹیک لگائے کھڑی رہی۔

مبہوت اور مسحور...... یہاں تک کہ اس نے بانسری ہونٹوں سے ہٹالی اور اپنے لمبے کُرتے کی جیب میں رکھ لی اور منڈیر سے اتر کر اِدھر اُدھر دیکھے بغیر سامنے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا اور وہ وہاں ہی ٹاہلی سے ٹیک لگائے جانے کتنی دیر کھڑی رہی یوں ہی مبہوت اور مسحور جیسے اس کی سماعتوں میں اب بھی بانسری کی آواز آتی ہو۔ اور اسے پتا ہی نہیں چلا کہ اس کے پیچھے، پیچھے آنے والی نور فاطمہ جو پیپل کے تنے کے پیچھے چھپی کھڑی جیسے اس کا پہرہ دیتی تھی۔ بہت آہستگی سے پیپل کے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئی تھی۔ فضا میں دھریک کے پھولوں کی باس تھی اور

زمین پر چاندنی بکھری ہوئی تھی جب وہ دھیرے، دھیرے چلتی واپس آئی تو نور فاطمہ اس سے کچھ ہی پہلے درختوں کے جھنڈ سے نکل کر پیچھے، پیچھے سے ہی گھر پہنچ گئی تھی۔ اور پری جمال کو پتا ہی نہیں چلا تھا کہ نور فاطمہ اپنے بستر پر دیوار کی طرف رخ کیے سوئی ہوئی نہیں تھی بلکہ جاگتی تھی اور اس کی بند آنکھوں سے آنسو خاموشی سے اس کے رخساروں پر بہتے اس کی گردن سے ہوتے اس کے گریبان میں جذب ہو رہے تھے۔

اور پھر یوں ہونے لگا کہ جب کبھی بانسری کے سُر ہوا کے دوش پر تیرتے ہوئے اس کے کانوں سے ٹکراتے تو وہ بے خودی ہو کر باہر نکل جاتی۔ وہ کون تھا اس نے کبھی جاننے کا تجسس نہیں کیا تھا بس وہ تو ٹاہلی سے ٹیک لگائے بے خودی اسے سنا کرتی اور اس پہلی رات کے بعد نور فاطمہ نے کبھی اس کا پیچھا نہیں کیا تھا ہاں جب وہ چپکے سے کنڈی کھولتی تو۔۔۔ ادھ کھلی آنکھوں سے اسے باہر جاتے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتی یا پھر کبھی، کبھی خود بھی کھڑکی کھول کر کھڑکی کا پٹ تھامے بانسری کی آواز سنتے ہوئے آنسو بہاتی رہتی اور سنان دوسرے کمرے میں افیون کھا کر گہری نیند سویا رہتا...... اور اس رات آخری راتوں کا زرد بیمار سا چاند درختوں کے پیچھے چھپا تھا اور زمین پر عجیب سی مُردنی چھائی تھی۔ درخت اور کھیت اس بیمار سی روشنی میں عجیب سے لگ رہے تھے اور وہ کھڑکی کھولے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ، پھاڑ کر دیکھتی تھی اور اس کی سماعتوں میں کوئی آواز نہ آتی تھی کتنی ساری راتیں گزر گئی تھیں۔ بانسری کی آواز سنائی نہ دی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا نور فاطمہ اپنے پیال کے بستر پر سو رہی تھی اور دیوار پر کیل سے لٹکے لالٹین کی لو مدھم تھی۔ پتا نہیں تیل ختم ہو گیا تھا یا نور فاطمہ نے سونے سے پہلے لالٹین کی جوت نیچے کی تھی۔ دوسرے کمرے سے سنان خان کے

خراٹوں کی آواز آتی تھی۔ وہ اداس سی کھڑکی کے پٹ پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی کہ ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی بانسری کی آواز نے کھڑکی پر دستک دی اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور آنکھوں میں جگنو دمکنے لگے۔ اس نے لالٹین کی جوت تھوڑی سی اونچی کی اور آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر نکلی، نور فاطمہ نے کروٹ بدل کر اسے دیکھا اور آنکھیں موند لیں اور باہر پری جمال ٹاہلی کے نیچے کھڑی اس کی بانسری سنتی تھی جس کے سُروں میں آج برہا کے گیتوں کا دکھ تھا۔ وچھوڑے کا کرب تھا۔ ہجر راتوں کی فریاد تھی، آنسو تھے اور یہ آنسو جیسے پری جمال کے دل پر گرتے تھے اور اس کی آنکھیں نیر بہاتی تھیں اور ٹاہلی کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑی تھی یوں ہی مبہوت اور مسحور اور اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب وہ چلا گیا، وہ جا چکا تھا لیکن اس کی بانسری کے سُراب بھی فضا میں کرلاتے تھے اور وہ ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھتی ہر قدم پر رکتی گھر کی طرف جاتی تھی۔

چاند جانے کب کا چھپ چکا تھا اور اندھیرا اسے ڈراتا نہیں تھا بس چند قدم پر تو اس کا گھر تھا۔ پہلا، دوسرا پھر تیسرا قدم اور چوتھے قدم پر وہ ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ سامنے زمیندار کے باڑے کا دروازہ آواز کے ساتھ کھلا تھا اور چھ، سات لالٹین حرکت کرتی نظر آئی تھیں۔ اس کے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے تھے اور وہ حیرت سے لالٹین اٹھائے لوگوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھتی تھی۔ پھر وہ سب اس کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ دبی، دبی آوازیں آہستہ، آہستہ بلند ہونے لگی تھیں۔ پھر ایک شخص لالٹین بلند کیے اس کی طرف بڑھا۔ یہ اکبر تھا بڑے زمیندار کا بیٹا تمسخر سے اسے دیکھتا۔

''تو......''

وہ ان کی طرف مڑا تھا۔ ''میں اور جھورا ساتھ والے گاؤں سے آرہے تھے وہاں سے نکلتے دیر ہو گئی تھی اور ہم نے دیکھا۔'' ''یہ۔'' اس نے ایک ہاتھ سے اس کی طرف اشارہ کیا۔

''اور وہ...... ٹاہلی کے نیچے جڑے بیٹھے تھے۔ وہ اسے گلے لگاتا تھا اور......''

''بے غیرت...... بے حیا......'' یک دم شور اٹھا تھا۔ پتا نہیں وہ کیا، کیا کہہ رہے تھے۔ اسے کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ جھورا قصائی سینے پر ہاتھ مار، مار کر قسمیں کھاتا تھا اور اس بے پناہ شور میں اس کی سماعتیں صرف لاٹھی کی آواز سنتی تھیں جو زمین پر ادھر اُدھر گردش کرتی قریب آتی تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل گر گئی۔ ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ بستی کے سارے گھروں سے مرد اور عورتیں باہر نکل آئے تھے اور ہاتھوں میں لالٹین اٹھائے اس سمت آتے تھے۔ اس کے کانوں میں صرف مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی آواز آتی تھی حالانکہ سب کی زبانوں پر سانپ پھن پھیلائے بیٹھے تھے اور زہر اگلتے تھے اور نور فاطمہ اس ہجوم میں کھڑی چلاتی، چلا کر اس زہر کا اثر کم کرنے کی کوشش کرتی تھی لیکن کوئی اس کی بات نہیں سنتا تھا۔ زمین پر بیٹھے، بیٹھے اس نے سر اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے اپنے سامنے کھڑے اکبر کو دیکھا تھا۔ جواب بھی اس کی طرف تمسخر سے دیکھتا تھا اور اس کے ہاتھ میں موجود لالٹین کی روشنی اس کے چہرے پر پڑتی تھی...... بڑے زمیندار کا چھوٹا بیٹا اکبر جو اکثر کھیتوں کی طرف جاتے اس کا راستہ روک لیتا تھا اور اسے اپنے ساتھ ڈیرے پر چلنے کو کہتا تھا اور اس روز جب اس نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا تھا تو اس نے اس کے منہ پر تھوک دیا تھا...... ہاں وہی اکبر اب ہجوم کی طرف پیٹھ کیے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''بہت شریف زادی بنتی ہے اور اب رات کے اندھیرے میں منہ کالا کر رہی تھی۔''

اس نے اس کے چہرے پر تھوک دیا پھر پہلی لات اس نے ماری تھی اس کے بعد کس، کس نے اس کارِ ثواب میں حصہ لیا تھا اسے خبر نہیں تھی اس نے اپنا منہ گھٹنوں میں چھپا لیا تھا اور پھر یہ نور فاطمہ ہی تھی جو لوگوں کی بھیڑ چیرتی اور چلاتی ہوئی اس کے اوپر آ کر گر گئی تھی اور اسے اپنے وجود کے نیچے چھپا لیا تھا۔ اب لاٹھیاں، لاتیں اور ٹھڈے نور فاطمہ پر پڑ رہے تھے۔

وہ تو شاید اسے مار ہی دیتے کہ بستی کی اکلوتی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔ اذان کا جلال زمین و آسمان پر منکشف ہوتا تھا اس جلال نے سب کے ہاتھ روک دیے تھے۔

''اس بے غیرت کا فیصلہ کل پنچایت میں ہوگا۔''

کسی نے بلند آواز میں کہا تھا اور لوگ ہولے، ہولے اپنے گھروں میں پلٹنے لگے تھے۔ صرف اکبر تھا جو جھورے قصائی کی پیٹھ تھپکتا تھا اور ان کی طرف ہنس، ہنس کر دیکھتا تھا۔ بوڑھا سنان، پری جمال کا بازو پکڑ کر اسے گھر کی طرف گھسیٹتا تھا اور نور فاطمہ نہ، نہ کرتی اس کا بازو چھڑاتی اس کے ساتھ، ساتھ جاتی تھی۔ بوڑھے سنان کے منہ سے جھاگ نکلتی تھی اور اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ لاٹھی مار، مار کر اس بے غیرت کا کام تمام کردے سو وہ گالیاں بکتا، جھاگ اڑاتا، لاٹھی کو زمین پر گردش دیتا چلتا تھا۔

اور اس آخری راتوں کے چاند کی صبح بھی پری جمال کے لیے اتنی ہی بے رونق اور اندھیری تھی، نور فاطمہ اور سنان کے کچے کوٹھے میں آج چولھا ٹھنڈا پڑا تھا۔ سنان بک جھک کر اپنی چارپائی پر اوندھا پڑا تھا اور اس کے خراٹوں کی آواز سکون کو توڑتی تھی۔ نور فاطمہ ادھ موئی پڑی پری جمال کو دیکھ کر آنسو بہاتی تھی اور اس کے جسم کے نیلوں پر ہاتھ پھیرتی خود اپنے جسم کے نیلوں کو بھولی ہوئی تھی...... اور باہر بستی میں جھورا لوگوں کو بڑے زمیندار کے ڈیرے پر ہونے والی پنچایت کے لیے بلاتا پھرتا تھا اور عورتیں اپنے گھروں کے دروازوں پر کھڑی اور کچی دیواروں پر اپلے تھاپتی ایک دوسرے سے پوچھتی تھیں۔

''ہائے کون تھا وہ کمبخت......؟''

''کس کے ساتھ؟''

کوئی دانتوں تلے انگلی دباتی۔

''یا اللہ! یہ نور فاطمہ کی کڑی (لڑکی) تو بڑی سیدھی سادی تھی۔''

''اکبر اور ظہورے نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔''

کوئی اپنے مردوں سے سنی سنائی کہتی۔

''بھاگ گیا...... شاید کسی دوسرے گاؤں سے آتا تھا۔ شکل نہیں دیکھ پائے وہ۔''

''پر ہائے جھورا تو کہتا پھرتا ہے کہ کئی بار اس نے دیکھا دونوں کو رات کے وقت کھیتوں میں ملتے۔''

پنچایت بیٹھی کہ 1935ء میں شہروں اور قصبوں سے دور اس بستی میں فیصلے پنچایت میں ہی ہوتے تھے۔

پری جمال، نور فاطمہ، سنان خان، اکبر کو بلایا گیا تھا۔ بڑا زمیندار سرپنچ (جج) تھا۔ چھوٹا زمیندار اور چندن مہاجن ..... کو پنچ چنا گیا تھا۔

''کون تھا وہ؟'' بڑے زمیندار نے پری جمال سے پوچھا۔

پری جمال نے متوحش نظروں سے سب کو دیکھا۔ کون تھا وہ...... اس نے تو کبھی اس کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ بات نہیں کی تھی، کیا بتاتی کہ وہ کون تھا...... اس کا سر نفی میں ہلا اور جھک گیا۔

''کب سے ملاقاتیں کر رہی ہو؟ جھورے نے کئی بار راتوں کو تمہیں گھر سے نکل کر باہر کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا ہے۔'' چھوٹے زمیندار نے بات آگے بڑھائی تھی۔

''کیا یہ سچ نہیں ہے؟''

وہ منہ سے کچھ نہ بولتی تھی اور آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔ اور رخساروں سے ہو کر گردن سے پھسلتے گریبان میں جذب ہوتے تھے۔ نور فاطمہ نے پوری کوشش کی کہ جھورے کو جھٹلا سکے۔

''پری جمال اپنی ضرورت کے تحت گھر سے نکلی تھی۔'' لیکن جھورا قرآن کی قسم اٹھانے کو تیار تھا اور اکبر اس کی تائید کرتا تھا۔

''وہ کون تھا؟'' چندن نے جھورے سے پوچھا تھا لیکن یہ جھورا بھی نہیں بتا سکتا تھا۔

''ہم اس کی شکل نہیں دیکھ سکے تھے؟'' اکبر نے وضاحت کی تھی۔

پنچوں میں دو رائے تھیں۔ چونکہ فریق ثانی

موجود نہیں تھا اس لیے متفقہ فیصلے سے نرمی برتتے ہوئے انہوں نے انہیں بستی سے نکل جانے کا فیصلہ سنایا...... اگر اس بچے کے متعلق علم ہو جاتا کہ وہ کون تھا تو رواج کے مطابق دونوں کو مار دیا جاتا لیکن اب فیصلے میں نرمی کی گئی تھی لیکن پھر بھی نور فاطمہ روتی رہی، چلاتی رہی تھی سب کی منتیں کرتی اور ہاتھ جوڑتی تھی کہ انہیں بستی سے نہ نکالا جائے لیکن فیصلہ تو ہو گیا تھا اور عورتیں چپکے، چپکے نور فاطمہ سے کہتی تھیں۔

''شکر کرو کہ جان بچ گئی۔''

اور اس روز جب وہ اپنا سامان لے کر بستی سے باہر نکلے تھے۔ اور نور فاطمہ روتی تھی اور سنان خان ہر قدم پر گالیاں دیتا تو غلام محمد لکڑہارے نے انہیں ٹھکانا دیا تھا اور یوں پچھلے تین ماہ سے وہ غلامو کے اس گھر میں رہ رہے تھے جو بستی سے دور جنگل کے قریب تھا۔ پورے ایک ماہ تو بستی والوں نے انہیں منہ نہیں لگایا تھا بلکہ غلامو بستی میں لکڑیاں بیچنے جاتا تو اسے بھی اکساتے کہ ایسی آوارہ لڑکی کو گھر سے نکال دے...... نور فاطمہ نور کے تڑکے ہی غلامو کے ساتھ جنگل میں چلی جاتی تھی اور درختوں کی خشک ٹہنیاں اکٹھی کر کے سنان کے ساتھ جا کر دوسری قریبی بستیوں اور ڈھوکوں پر بیچ آتی۔ یہ خشک ٹہنیاں تندور میں جلانے کے کام آجاتی تھیں...... بدلے میں وہ کچھ نہ کچھ کھانے پینے کے لیے لے آتی۔ کبھی غلامو دال ساگ لے آتا اور سب مل کر کھا لیتے تھے۔ نور فاطمہ اٹھتے، بیٹھتے غلامو کو دعا دیتی تھی جو اسے جنگل میں جا کر لکڑیاں اور ٹہنیاں اکٹھی کرنے سے منع کرتا رہتا۔ پھر سب سے پہلے نذیراں آئی تھی۔ سوت کتوانے۔

''نور فاطمہ یہ سوت کات دو۔'' وہ اسے دیتے ہوئے بولی تھی۔

''اور مجھے تو جھورے کی بات کا ذرا بھی یقین نہیں ہے۔ ہے ہی بکواسی اور اکبر کا چیلا اور اکبر کو کون نہیں جانتا۔ جھورا (ظہورا) کو بھی سب جانتے ہیں پر زمیندار کے سامنے کون بولے۔'' اور فاطمہ خاموش رہی تھی اور پھر نذیراں کے بعد دوسرے بھی آنے لگے تھے اور نور فاطمہ کا کام چل پڑا تھا۔ کوئی اناج دے جاتا...... کوئی بالن ڈال دیتا...... زمینداروں کے گھروں سے پیسہ، دھیلا بھی ملنے لگا تھا اب کرم الٰہی نے بارہ کھیسوں کے لیے سوت کاتنے کو کہا تھا تو وہ سوچ رہی تھی کہ وہ بھی اپنی پری جمال کے لیے ڈبیوں والے دو کھیس بنوا کر رکھ دے گی۔ اس کی انگلی چرخے کی ہتھی پر تیزی سے چلتی تھی اور پاس بیٹھی پری جمال آس بھری نظروں سے اسے تکتی تھی کہ وہ ایک بار زبان سے کہہ دے۔

''پری جمال مجھے تم پر یقین ہے، مجھے یقین ہے کہ جھورا (ظہورا) اور اکبر جھوٹ بولتے ہیں۔''

لیکن پتا نہیں کیوں وہ اس سے یہ سب کیوں نہیں کہتی تھی حالانکہ وہ سنان سے لڑتی تھی اور عورتیں جو بستی سے سوت کتوانے آتی تھیں انہیں قسمیں کھا، کھا کر یقین دلاتی تھی کہ پری جمال بے گناہ ہے، اس کی بیٹی معصوم ہے لیکن اس کی طرف دیکھتے ہوئے جانے کن کمھن گھیریوں میں پڑ جاتی تھی اور چرخے کی ہتھی گھمائے جاتی تھی۔

''رات بہت آندھی، طوفان آیا پورا صحن پتوں سے بھرا پڑا ہے، کیا کہتا ہوگا غلامو کہ دو، دو عورتیں گھر میں ہیں پھر بھی صحن میں اتنا گند...... جا کر جھاڑو ہی دے ڈال پری جمال۔''

نور فاطمہ نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ مایوس سی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اماں کو اس پر یقین نہیں ہے، وہ بھیگے من کے ساتھ باہر آئی۔ اور صحن میں ایک طرف دیوار کے ساتھ پڑا جھاڑو اٹھایا۔ بان کی ٹوٹی پھوٹی چارپائی میں دھنسا سنان چلایا۔

''صبر، صبر ساری دھول مٹی میرے حلق میں جا رہی ہے۔'' وہ کھانس رہا تھا۔

پری جمال نے جھاڑو دینا چھوڑ دیا تو وہ بہ مشکل چارپائی سے اٹھا۔ ٹٹول کر اپنی لاٹھی اٹھائی اور ادھر ادھر لاٹھی مارتا کھانستا ہوا اندر چلا گیا۔ وہ خواہش کے

باوجود اٹھ کر اسے سہارا نہیں دے سکی تھی۔ اسے سنان خان کے غصے سے ڈر لگتا تھا۔ کئی سال پہلے اسے کم کم دکھنے لگا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ کھیتوں میں تھوڑی بہت مزدوری کر لیتا تھا، نور فاطمہ اسے شہر کے بڑے اسپتال میں بھی لے کر گئی تھی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ چار سال پہلے اسے بالکل ہی نظر آنا بند ہو گیا تھا۔ اب چار سال سے وہ گھر میں رہتا تھا اور غصہ کرتا تھا۔ خاص طور پر جب اسے افیون نہیں ملتی تھی تو وہ نور فاطمہ پر بہت چلاتا تھا۔ وہ کمرے میں چلا گیا تھا۔ پری جمال نے پھر جھاڑو اٹھا لیا تھا۔ جھاڑو دیتے، دیتے وہ غلامو کے کمرے تک آ گئی تھی۔ اور پھر وہاں ہی بیٹھ گئی تھی۔ دور سے آٹا پیسنے کی چکی کی آواز آتی تھی۔ پن چکی کی آواز اور یہ آواز اسے مسحور کرتی تھی۔ پتا نہیں اس کا من کیسا تھا کہ جس چیز میں کوئی ردھم ہوتا وہ جکڑی جاتی۔ چرخے کی گھوں، گھوں، ریل کی چھک، چھک، چشمے کے پانی کی ترل، ترل اسے مسحور کرتی تھی...... جب وہ چھوٹی سی تھی اور وہ دوسرے گاؤں میں رہتے تھے تو وہ گاؤں سے باہر جہاں سے ریل گزرتی تھی ریل کی پٹری کے پاس جا کر گھنٹوں ریل کی چھک، چھک سننے کے لیے بیٹھی رہتی تھی۔ ریل کی پٹری ان کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھی کہ ان کا گھر گاؤں کا سب سے آخری گھر تھا۔ پھر پتا نہیں کیوں نور فاطمہ اور سنان نے وہ گاؤں چھوڑ دیا اور وہ سارے سفر میں بار، بار سنان سے پوچھتی تھی۔

''بابا وہاں ریل ہو گی ناں؟'' اس نے زندگی میں پہلی بار ریل کا سفر کیا تھا۔ ریل اس بستی تک نہیں آتی تھی۔ بہت پیچھے وہ قصبے میں ریل سے اتر کر تانگے میں بیٹھے تھے اور پھر تانگے سے اتر کر بیل گاڑی سے اس بستی میں آئے تھے یہ بستی جو سنان کے بقول اس کا نانکا گراں (ننھیالی گاؤں) تھا اور اس نے اپنے بچپن کا کچھ عرصہ یہاں گزارا تھا۔ لیکن پری جمال کو یہ بستی اچھی نہیں لگی تھی کیونکہ یہاں وہ ریل کی چھک، چھک نہیں سن سکتی تھی۔ ریل جو اس کے پرانے گاؤں کے

باہر سے دن میں ایک بار گزرتی تھی۔

وہ کچے صحن میں زمین پر بیٹھی تھی اور اس کے کانوں میں چکی کی آواز آتی تھی اور وہ ساکت بیٹھی سنتی تھی جب نور فاطمہ نے آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے مڑ کر نور فاطمہ کو دیکھا...... اس کی آنکھوں میں پانی جگمگاتا تھا اور وہ پلکیں جھپک، جھپک کر اس پانی کو باہر آنے سے روکتی تھی اور اس کے گلاب کی پتیوں جیسے ہونٹ کانپتے تھے۔

''اماں...... میں...... یہ آوازیں مجھے اسیر کرتی ہیں۔ یہ چکی کی آواز اور وہ اس رات بانسری کی آواز......''

''مجھے تیرا یقین ہے پری جمال...... ایسے ہی جیسے مجھے خود پر یقین ہے۔''

تین ماہ سے اس کی سماعتیں نور فاطمہ کے لبوں سے نکلنے والے ان چند لفظوں کی منتظر تھیں، نور فاطمہ اس کا یقین کرے نہ کرے تو بھی کچھ تو کہے...... اور اب نور فاطمہ نے کہا تھا اسے پری جمال پر یقین ہے تو وہ ہواؤں میں اڑنے لگی تھی، اس کی آنکھیں یوں جگمگانے لگی تھیں جیسے گنگا کے پانیوں میں منت کے دیے تیرتے ہوں۔ آنِ واحد میں وہ ہلکی پھلکی ہو گئی تھی، اس کی ماں کو اس پر یقین تھا اعتبار تھا اب بھلے پوری بستی اس پر اعتبار نہ کرتی ہو اسے پروا نہیں تھی۔ نور فاطمہ نے جھاڑو اٹھا لیا۔

''جا تو جا کر چولھا جلا تیرا بابا روٹی مانگ رہا ہے۔ میں اتنے میں باقی صحن صاف کر لیتی ہوں۔''

اور وہ جیسے ہوا میں اڑتی ہوئی چھپر میں آ گئی تھی۔ نور فاطمہ کے چند لفظوں نے سارے زخم بھر دیے تھے۔ لوگوں کی وہ نظریں، گالیاں، مار وہ سب کو فراموش کیے آگ جلاتی سوچتی تھی۔

''وہ پتا نہیں اب بھی چاندنی راتوں میں بانسری بجانے بستی میں آتا تھا یا نہیں...... پر وہ تو اماوس کی رات تھی جب...... اور اسے تو خبر بھی نہیں ہو گی کہ اس کی بانسری سننے کی پاداش میں ہمیں بے گھر کر دیا گیا ہے۔'' اس نے پھونکنی اٹھا کر پھونک ماری خشک لکڑیوں

نے آگ پکڑ لی تھی اور وہ اسے سوچ رہی تھی۔ ''پتا نہیں وہ کون تھا...... کہاں سے آیا تھا۔'' وہ اسے سوچتی تھی اور اس کے کانوں میں بانسری کی آواز آتی تھی اسے مبہوت اور مسحور کرتی۔

☆☆☆

اوپر آسمان پر چودھویں کا چاند پوری تابانی کے ساتھ چمکتا تھا اور نیچے زمین پر جیسے چاندی سی بکھری تھی اور وہ کچے صحن میں ٹوٹی چارپائی پر بیٹھی اوپر آسمان کی طرف تکتی تھی اور چاند کے گول تھال میں چرخہ کاتتی بڑھیا کو ڈھونڈتی تھی جو اسے نظر نہیں آتی تھی اور کچھ فاصلے پر دیوار کے ساتھ گھڑے رکھنے کے لیے بنائے گئے چبوترے پر غلامو بیٹھا تھا جو نہ جانے کب اپنے کمرے سے نکل کر وہاں آکر بیٹھ گیا تھا۔ لیکن اسے خبر نہیں ہوئی تھی، وہ تو چاندنی کے حسن میں کھوئی سوچتی تھی۔ یہ چاند دور بہت دور کسی اور جگہ پر بھی ایسے ہی چمکتا ہوگا اور شاید وہاں بھی کوئی دیوانہ اسے یوں تکتا ہوگا اور شاید کہیں کوئی بانسری بجاتا ہو۔

''مجھے بھی تمہاری عمر میں چاندنی راتیں یوں ہی مسحور کرتی تھیں۔ میں بھی پاگلوں کی طرح چاند کو تکتا رہتا تھا۔'' غلامو نے اسے دیکھے بغیر مخاطب کیے بغیر کہا تھا لیکن وہ جانتی تھی وہ اسے ہی بتا رہا ہے۔

''تو چاچا کیا اب چاندنی راتیں تمہیں مسحور نہیں کرتیں؟'' اس نے ذرا کی ذرا رخ موڑ کر اسے دیکھا۔

''پتا نہیں...... اب تو پتا ہی نہیں چلتا کہ کب چاندنی راتیں آتی ہیں اور کب اماوس کی...... بہت سال پہلے میں ہر چیز سے بیزار ہو گیا تھا۔''

''کیوں؟''

پری جمال پوچھنا چاہتی تھی لیکن وہ خود ہی بتا رہا تھا کہ شاید اسے بھی کسی سامع کی ضرورت تھی جس کے سامنے وہ اپنے دکھ رو سکے اور اسے اپنے زخم دکھا سکے۔

''میرے اپنوں نے میرے ساتھ بہت برا کیا...... والدین کے مرنے کے بعد مجھ سے سب کچھ چھین لیا، میرا گھر، میری زمینیں سب...... اور مجھ پر تہمت لگا کر مجھے گھر سے نکال دیا۔ مجھے وہ گاؤں چھوڑنا پڑا جو میرا تھا۔ وہاں سے نکلا تو در، در کی ٹھوکریں کھاتا اس بستی میں آیا اور یہاں بستی کے باہر ڈیرا ڈال لیا کہ انسانوں پر بھروسا نہیں رہا تھا۔ سب زہریلے ناگ......''

وہ بولتا تھا اور وہ چپ چاپ دودھیا چاندنی میں بان کی ٹوٹی چارپائی پر بیٹھی سنتی تھی۔

''ہاں تم سچ کہتے ہو چاچا، سب زہریلے ناگ......'' اس کی آنکھوں کے سامنے اس رات کا منظر آ گیا تھا اور آنکھیں بے اختیار امڈ آنے والے آنسوؤں سے دھندلا گئی تھیں۔

''میں جانتا ہوں، جھورا جھوٹ بولتا تھا اور اکبر بھی۔''

غلامو کی بات سن کر اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''تم کیسے جانتے ہو چاچا؟''

''اس رات میں بھی پار والے گاؤں سے جھورے اور اکبر کے پیچھے آ رہا تھا۔ یہاں تک آنے کے لیے مجھے بستی سے گزرنا پڑتا تھا۔ اور میں نے کسی کو ٹاہلی کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑے دیکھا تھا۔ اندھیرے میں مجھے لگا جیسے کوئی شر شرار بھوت یا چڑیل ہو۔ سچی بات میں خوفزدہ ہو کر پیپل کے بڑے درخت کے پیچھے چھپ گیا تھا۔''

غلامو ہولے سے ہنسا۔

''پھر میں نے باڑے سے سب کو نکلتے دیکھا اور لالٹین کی روشنی میں تم نظر آئیں۔ اکیلی کھڑی، ویسے تم رات کے اس پہر وہاں کھڑی کیا کر رہی تھیں؟''

غلامو تجسس سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''کوئی بانسری بجاتا تھا اور میں بانسری کی آواز سنتی تھی۔ پتا نہیں اتنا درد اور آنسو کہاں سے اس کی لے میں سمو گئے تھے۔''

''درد بجانے والے کے دل میں ہوتا ہے بیٹی...... اور آنسو بھی اس کے دل سے نکلتے ہیں۔''

غلامو کو یاد آیا کہ اس رات جب وہ پار گاؤں سے بستی میں داخل ہوا تھا تو اس کے کانوں میں بھی بانسری کی مدھم آواز آ گئی تھی اور فضا میں آنسو بکھرتے

محسوس ہوئے تھے۔

اس نے حیرت سے غلامو کی بات سنی تھی۔ اس کے دل میں بھی تو بہت درد تھا اور اندر بہت سارے آنسو اکٹھے ہوگئے تھے۔

''چاچا مجھے بھی ایک بانسری بنادو ناں، میں بھی بجاؤں گی۔'' غلامو اس کی معصومیت پر مسکرایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں تو نہیں بنا سکتا لیکن جب کبھی شہر گیا تو تمہیں لادوں گا۔''

''سچ چاچا!'' وہ خوش ہوگئی تھی۔ اور اس کی سماعتوں میں بانسری کی آواز آئی تھی۔ دور کہیں کوئی بانسری بجاتا تھا، ہوا کے دوش پر تیرتی بانسری کی لے کبھی قریب سے آتی اور کبھی دور سے۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ غلامو اپنے کمرے میں جا چکا تھا اور وہ جیسے کسی سحر میں جکڑی ہولے، ہولے دروازے کی طرف جاتی تھی۔ اسے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ تین ماہ پہلے کیا ہوا تھا۔

وہ تو بس اس کی لے میں بندھی آگے ہی آگے چلی جاتی تھی اوپر آسمان پر پورا چاند چمکتا تھا اور نیچے زمین پر پگھلی ہوئی چاندی کا فرش بچھا تھا۔ وہ مبہوت سی چلی جاتی تھی اور اسے نور فاطمہ کی آواز بھی نہیں آئی تھی جو اس کے پیچھے اسے پکارتی آئی تھی۔ پھر وہ اسے نظر آ گیا۔ بستی کے باہر ٹیلے پر بیٹھا بانسری بجاتا...... ارد گرد سے بے خبر آنکھیں بند کیے خود میں گم...... وہ اس کے بالکل سامنے کھڑی تھی، وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ یہ اتنے آنسو اس کے پاس کہاں سے آگئے ہیں اور یہ درد اسے کس نے دیا ہے لیکن اس نے نگاہ اٹھا کر بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ یونہی بانسری کو لبوں سے لگائے سُر بکھیرتا رہا اور وہ سنتی تھی مسحور اور مبہوت

...... جب انہوں نے اسے گھیر لیا وہ سب اونچا، اونچا بولتے تھے اور سب سے بلند آواز جھورے کی تھی جو بستی کے مردوں میں سب سے آگے تھا۔ وہ زیادہ نہیں تھے بس دس پندرہ تھے جنہیں جھورا اکٹھا کر کے لایا تھا سب کے سب اکبر کے بندے تھے بس وہ تین چار اور تھے جو

## کرنی کی بھرنی

ایک شخص نے بتایا کہ پچاس سال قبل انہوں نے ایک اونٹ والے قافلے کے ہمراہ اپنے والد کے ساتھ حج کیا۔ جب وہ عفیف کے علاقے سے گزرے تو والد کو رفع حاجت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بیٹے نے باپ کو اونٹ سے نیچے اتارا۔ باپ کو حاجت کے لیے گیا اور جاتے ہوئے بیٹے سے کہنے لگا تم قافلے کے ہمراہ آگے بڑھو۔ میں پیچھے، پیچھے آجاؤں گا۔

تھوڑی دیر بعد بیٹے نے دیکھا کہ قافلے والے تو دور نکل چکے ہیں اور باپ ابھی تک آیا نہیں۔ تو بیٹا دوڑا، دوڑا واپس آیا کہ والد کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے، بس اس نے اپنے والد کو کاندھوں پر اٹھالیا اور قافلے کی سمت دوڑنے لگا۔

بیٹے کا بیان ہے کہ اس دوران میں نے محسوس کیا کہ میرے چہرے پر نمی گر رہی ہے اور مجھے سمجھ میں آیا کہ یہ میرے والد کے آنسو ہیں میں نے کہا۔ ''اللہ کی قسم آپ تو میرے لیے ایک ریشے سے بھی زیادہ ہلکے ہیں۔''

باپ نے کہا کہ ''میں اس بات کے لیے نہیں روتا بلکہ اس لیے رو پڑا کہ اللہ کی قسم اسی جگہ میں نے اپنے والد کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا تھا۔''

مرسلہ: لاریب، چونیاں

پیچھے اکبر کے ساتھ بھاگے آئے تھے۔

''اور جب میں نے اپنے کوٹھے کی چھت سے اس لفنگے کو اپنی بستی میں داخل ہوتے اور پھر دوسری طرف مشرق کی طرف سے باہر جاتے دیکھا تو میں بھی چھت سے اتر کر اس کے پیچھے چھپ، چھپ کر چلنے لگا اور پھر میں نے دیکھا سنان خان اور نور فاطمہ کی کڑی کو ادھر آتے اور اس سے ملتے۔ اور یہ دونوں توبہ...... توبہ......'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''جو کچھ میں نے دیکھا بے حیائی کا منظر...... دل چاہا زندہ گاڑ دوں زمین میں...... پر...... پھر میں تمہیں

بلا لایا کہ تم بھی سب اپنی آنکھوں سے دیکھ لو اور تم سب نے دیکھا انہیں ایک ساتھ کھڑے۔"

"ہاں……ہاں……" گردنیں ہلنے کے ساتھ ساتھ آوازیں بھی بلند ہوئیں۔ چاندنی میں ان کے ہیولے بھوتوں کی طرح لگ رہے تھے اور وہ تھر، تھر کانپ رہی تھی۔

"مار ڈالو……زندہ نہ چھوڑنا بے حیاؤں کو۔" اکبر کی آواز بلند ہوئی تھی۔

اور پھر وہ سب دونوں پر پل پڑے تھے۔ بانسری اس کے ہاتھ سے گر پڑی تھی اور وہ زمین پر اوندھا گر پڑا تھا۔ اور پری جمال دونوں ہاتھوں سے اسے بچانے کی کوشش کرتی تھی اور آٹھ سال پہلے کی کوئی یاد کوئی بھولے بسرے نقوش ذہن پر دستک دیتے تھے۔

"مت مارو……مت مارو اسے……یہ تو……یہ بیچارہ تو……" لیکن شور میں کوئی اس کی آواز نہیں سنتا تھا۔ بستی سے لوگ شور سن کر لاٹھیاں اٹھائے بھاگے آئے تھے کہ شاید ڈاکو آگئے ہیں اور پھر وہ جھورا تھا جس نے کسی سے لاٹھی لے کر اس کے سر پر ماری تھی۔

"بدکاری کرتا ہے……حرام خوری کرنے آتا ہے۔ بتا کس کا تخم ہے کس گاؤں سے آتا ہے؟" خون کا فوارہ اس کے سر سے نکلا تھا اور پری جمال آنکھیں پھاڑے اوندھے پڑے لے نواز (بانسری بجانے والے) کے سر کے پچھلے حصے سے خون کو نکلتے دیکھتی تھی اور نور فاطمہ ہانپتی کانپتی آرہی تھی اور بوڑھا سنان……لاٹھی کو زمین پر گردش دیتا اس کے پیچھے تھا۔ لوگ آگے بڑھ، بڑھ کر انہیں مار رہے تھے۔ ٹھڈے، لاٹھیاں، جوتے جس کے ہاتھ میں جو کچھ آرہا تھا وہ آزما رہا تھا۔ نور فاطمہ بھیڑ کو چیرتی تیر کی سی تیزی سے ان کی طرف بڑھی تب ہی کسی نے ایک پتھر اٹھا کر مارا تھا جو سیدھا اس کی کھوپڑی میں لگا تھا۔ نور فاطمہ نے زمین پر بیٹھتے ہوئے اس کا سر گود میں رکھ لیا تھا۔ اس کے سر سے خون کے فوارے نکلتے تھے اور اس کی سانس مشکل سے آتی تھی اور نور فاطمہ ہاتھوں سے اس کا خون روکتی دیوانہ وار اسے پکارتی تھی۔

"میرا بچہ……میرا راجا، آنکھیں کھول ماں صدقے، ماں واری……"

"اماں……!" اس نے ذرا کی ذرا آنکھیں کھول کر نور فاطمہ کو دیکھا اور پھر ایک ہچکی کے ساتھ اس کا سر ڈھلک گیا۔

"سنگ دلو، ظالمو، نامرادو……" ہجوم کی طرف دیکھتے ہوئے وہ زور سے چیخی تھی۔ اور دیوانہ وار کبھی اس کی پیشانی چومی اور کبھی اس کے لڑکیوں ایسے نازک انگلیوں والے مومی ہاتھوں کو چومتی تھی۔ بیس سال پہلے اس نے اسے جنم دیا تھا اور اسے جنم دینے کے جرم میں اس کی سسرال والوں نے اس کا جینا دوبھر کر دیا تھا اور اس کے شوہر نے اسے تین لفظ بول کر گھر سے نکال دیا تھا۔ کیونکہ وہ اسے خود سے جدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ نامکمل تھا تو کیا تھا……تھا تو اس کا بچہ اس نے جنم دیا تھا اسے۔ اپنا خون پلایا تھا خوب صورت لانبی آنکھوں اور خوشنما نقوش والا اگر وہ لڑکا نہیں تھا تو کاش لڑکی ہی ہوتا لیکن وہ تو……

وہ اسے چھوڑ نہیں سکتی تھی اس لیے وہ اسے گود میں چھپائے ماں کے گھر آگئی تھی۔ ماں مر گئی تو وہ اکیلی ہوگئی۔ جس معاشرے میں اکبر اور جھورے جیسے لوگ رہتے ہوں اس معاشرے میں اکیلی عورت کا جینا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کا جینا بھی مشکل ہو گیا تو اس نے اپنے سے بیس سال بڑے سنان خان کے اپنی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا۔ لیکن سنان خان بھی تو اسی معاشرے کا مرد تھا۔ اس نے نور فاطمہ کو تو اپنا لیا تھا لیکن اسے قبول نہیں کیا تھا……وہ اس سے چڑتا تھا، بلاوجہ مارتا تھا اور پھر جب پری جمال پیدا ہوئی تو وہ اسے مجبور کرنے لگا کہ وہ اسے ان لوگوں کو دے دے جو اس جیسے ہیں۔

"اس کے ہوتے کوئی تیری بیٹی کو بیاہنے نہیں آئے گا۔" اس کا اصرار بڑھتا گیا پہلے اس نے زبانی دھمکایا پھر مار پیٹ کرنے لگا اور پھر آخری ہتھیار

طلاق کی دھمکی اور وہ ہار گئی۔ اس نے اکیلے جی کر دیکھ لیا تھا۔ اس جیسی بے آسرا عورت کو کئی درندے اور بھیڑیے پھاڑ کھانے کو معاشرے میں موجود ہوتے ہیں اور اب تو اس کے ساتھ پری جمال بھی تھی جسے کل کو جوان بھی ہونا تھا اور وہ اکیلی عورت کیسے اسے ان درندوں اور بھیڑیوں سے بچاتی۔ وہ اکیلے جینا نہیں چاہتی تھی۔ سو ایک روز دل پر پتھر رکھ کر اسے ان کے حوالے کر دیا جو ہر روز تالیاں پیٹتے، ناچتے، گاتے، ٹھمکتے اسے لینے اس کے دروازے پر آ جاتے تھے اور اپنے گرو کی طرف سے دھمکیاں دیتے...... وہ اسے لے گئے تھے لیکن اس کا دل وہاں نہیں لگتا تھا۔ بچہ ہی تو تھا۔ بھاگ، بھاگ کر ماں کے پاس آتا۔ اس سے لپٹتا...... روتا...... چھوٹی بہن کی طرف حسرت سے دیکھتا...... اور ایسے میں اگر سنان خان آ جاتا تو اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیتا۔ نور فاطمہ کو گالیاں دیتا کہ وہ اسے گھر میں کیوں گھسنے دیتی ہے۔ اور نور فاطمہ اسے سمجھا نہیں سکتی کہ وہ ماں ہے۔ اور کیا کوئی ماں اپنے معذور، ابنارمل بچے کو پھینک سکتی ہے؟ کسی کو دے سکتی ہے؟ وہ بھی تو ادھورا تھا، نامکمل تھا اور سمجھو تو نارمل نہیں تھا۔ تب آٹھ سال پہلے وہ اپنا گاؤں چھوڑ کر اس بستی میں آ گئے تھے۔ اور سنان خان نے اس سے کہا تھا کہ اب وہ اسے بھول جائے اور اگر وہ کبھی اس سے ملی تو وہ اسے طلاق دے دے گا اور پری جمال کو لے کر چلا جائے گا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس بستی کے لوگوں کو پتا چلے کہ ان کا ایک ایسا بچہ ہے اور وہ ان کا مذاق اڑائیں...... تب وہ بارہ سال کا تھا اور اب آٹھ سال بعد وہ اسے ڈھونڈتا ہوا یا محض اتفاقاً اس بستی میں آ گیا تھا۔ اس رات اس نے اسے کھیت کی منڈیر پر بیٹھے بانسری بجاتے اور پری جمال کو ٹاہلی تلے کھڑے مسحور ہوتے دیکھا تھا۔ تب وہ اسے پہچان گئی تھی حالانکہ اب وہ بارہ سال کا بچہ نہیں تھا، بیس سال کا نوجوان تھا لیکن وہ ماں تھی...... اس کی ناک کا تل اس کی خوشنما آنکھیں...... دل نے تصدیق کی تھی اور وہ اس کے پیچھے گئی اور دل کی گواہی پر یقین کی مہر ثبت ہو گئی تھی۔ وہ وہی تھا اس کا راجا...... پتا نہیں اس نے اتنی اچھی بانسری بجانا کہاں سے سیکھی تھی۔

اس روز وہ اس سے زیادہ دیر باتیں نہیں کر سکی تھی اسے ڈر تھا کہ کہیں سنان خان نہ آ جائے، پہلے اسے اپنے لیے سنان خان کی ضرورت تھی اور اب پری جمال کے لیے۔ بھلے وہ بوڑھا تھا اسے دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن وہ مرد تھا، پری جمال کا باپ تھا، محافظ تھا اور وہ پری جمال سے اس کا محافظ نہیں چھیننا چاہتی تھی۔ اس نے اس نے چپ سادھ لی تھی اور ہونٹ سی لیے تھے۔ نور فاطمہ اپنی بپتا سناتے اور روئے جاتی تھی۔

''اسے بچپن سے ہی بانسری بجانے کا شوق تھا لیکن تب وہ اتنی اچھی بانسری نہیں بجاتا تھا لیکن اب میری پری جمال کا دل اس کی بانسری کی آواز پر کھنچتا تھا۔ وہ دور بیٹھی اس کی بانسری سنتی تھی۔ اور تم نے ظالمو میری بچی پر بہتان لگایا، جھوٹ بولا اور اس جھورے نے کہانی گھڑ لی۔ اور وہ اکبر جس کی اپنی نیت میں کھوٹ تھا۔ انہوں نے اسے مار ڈالا۔ دیکھو، دیکھو اسے قریب آ کر یہ میرا راجا ہے۔ اور مختار گرو کے ڈیرے کی بلبل...... ظالمو ان دونوں نے ایک ہی ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔'' اب وہ سینے پر دوہتھڑ مار، مار کر بین کرتی تھی۔

''تمہارا ٹھکانا جہنم ہے اور تم لوگ آگ میں جلو گے۔'' پری جمال کی سانس مشکل سے آتی تھی اور وہ حیرت سے نور فاطمہ کی بات سنتی تھی اور اس کی آنکھوں کے کونوں سے آنسو بہتے تھے۔ لوگ نفرت اور ملامت سے جھورے اور اکبر کو دیکھتے تھے جو سر جھکائے اور منہ چھپائے ہجوم میں سے نکل کر بستی کی طرف واپس جا رہے تھے اور غلام موتا سف سے نور فاطمہ کو دیکھتا تھا۔ اور ارد گرد کھڑے لوگ بھی ہمدردی سے اسے دیکھتے تھے اور جھورے پر نفرین بھیجتے تھے اور غلامو کے کانوں میں مولوی صاحب کی آواز آتی تھی جب اس کے اپنوں نے اس پر تہمت لگا کر گھر سے بے دخل کر دیا تھا تو وہ

اسے تسلی دیتے تھے۔

''یاد رکھ غلام محمد کسی پر تہمت لگانے اور بہتان باندھنے والوں کا ٹھکانا جہنم ہے، دیکھ لینا یہ سب اس دنیا میں بھی اور اس دنیا میں بھی عذاب چکھیں گے اور ایسا ضرور ہوگا۔''

غلامو نے دور جاتے جھورے کو دیکھا اور اکبر کو جو اس کے ساتھ، ساتھ چلتا تھا اور دور افق پر سرخ آندھی کا غبار اٹھتا تھا ایک بے گناہ مارا گیا تھا۔ اور دوسرے کی سانس رک، رک کر چلتی تھی۔

''صبر، صبر نور فاطمہ بہن صبر......'' نور فاطمہ کے سر پر رکھا غلام محمد کا ہاتھ کانپا تھا۔

''انہوں نے برا کیا اور اپنے لیے آگ خریدی۔'' پر نور فاطمہ تڑپ، تڑپ کر روتی تھی اور پری جمال بار، بار سر اٹھا کر ہاتھ ٹوٹی ہوئی خون آلود بانسری کی طرف بڑھاتی اور پھر ہاتھ بانسری تک نہ پہنچ پاتا اور ناکام ہو کر وہ سر نیچے رکھ دیتی۔ کھلے آسمان تلے، نور فاطمہ اور غلامو اس کے بے جان جسم کو تکتے، روتے اور آسمان پر سرخ غبار پھیلا جا رہا تھا اور زمانوں پہلے کوئی آواز گونجی تھی۔ سورۂ نور کی تلاوت کرتی آواز نرم، دلنشین، میٹھی، شہد آگیں۔ زندگی کی نوید دیتی، جاں بخش صدا جیسے صحراؤں میں بادِ نسیم چلتی ہو جیسے گرم تڑپتی تڑختی زمین پر برستی بارش...... جیسے جلتے، بلتے پیاسے لبوں پر ٹھنڈے میٹھے پانی کے قطرے خوب صورت عربی لہجہ...... خوش الحانی سے تلاوت کرتی مسحور کر دینے والی آواز...... یثرب کی گھاٹیوں سے بلند ہوتی آواز دل کے گہرے گھاؤ کو بھرتی......

جلتے زخموں پر ہولے، ہولے نرمی سے مرہم لگاتے الفاظ ''اور جو کوئی پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں...... تو...... ان کی گواہی قبول نہ کرو...... اور یہی لوگ فاسق ہیں۔''

اور وہ جو چور چور بدن لیے زمین پر پڑی تھی۔ زخمی وجود اور خون بہاتے جسم کے ساتھ کل جہانوں کے خالق و مالک کا شکر ادا کرتے تھکتی نہ تھی۔ جس پر اس کی بریت ثابت کی تھی اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں چمکتی تھی اور ایک بھید بھری اسرار آمیز مسکراہٹ اور اس کے ارد گرد کھڑے لوگ دنگ تھے بے حد حیران اور متعجب...... کہ اتنے زخم، زخم اور دریدہ بدن کے ساتھ کوئی کیسے مسکرا سکتا ہے۔ اور پھر ایسی دہکتی مسکان، لب مسکراتے تھے اور آنکھیں نیر بہاتی تھیں...... اور وہ جس نے اسے جنم دیا تھا اور جو اس دہکتی مسکراہٹ کا بھید جانتی تھی جس نے اس کے اٹھتے ہاتھوں، خاموش لبوں اور آسمان کی طرف اٹھتی اس کی التجائی آنکھوں کو دیکھا تھا اور پھر اس کے گرتے ہاتھوں کو......

اور اپنی طرف تکتی اس کی پُر امید نظروں کو اور سوچا تھا کون آئے گا اس کی بَرِیّت کی گواہی دینے۔ کوئی فرشتہ، ولی یا کوئی برگزیدہ وجود...... کوئی نہیں، میں بھی نہیں...... جو سب جانتی ہوں کہ میرے لبوں پر قفل لگے ہیں اور اب سب کچھ روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گیا تھا...... وہ ساری احتیاطیں سارے خوف بھول گئی تھی۔ صرف یہ یاد رہا تھا کہ مرنے والے کو اس نے جنم دیا تھا، وہ جیسا بھی تھا اس کی پری جمال کا ماں جایا تھا۔

قفل ٹوٹ گئے تھے۔

پری جمال پر لگا میل دھل گیا تھا۔

وہ زار و قطار روتی اس کی زخمی پیشانی اور شکر آمیز نم آنکھوں کو بار، بار چومتی تھی اور اس کی آواز بس ایک ہی اسم کا ورد کیے جاتی تھی۔

''اللہ...... اللہ...... اللہ'' اور یہ پکار دور تک جاتی تھی...... آسمانوں سے پرے......

اور زمانوں پہلے ایک آواز گونجی تھی۔
سورۂ نور کی تلاوت کرتی آواز۔
میٹھی، دلنشین، نرم
زندگی کی نوید دیتی
دل کے گھاؤ بھرتی آواز......

مکمل ناول

# چلو پھر سے مسکرائیں

بشریٰ سیال






''آؤٹ۔'' لاؤنج سے دانی کی مایوس کن آواز ابھری تو اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ دعاؤں کی رفتار میں تیزی آگئی، ہاتھ پھیلائے سر کو جھکائے وہ خدا کے حضور گڑگڑا رہی تھی۔

''یا اللہ......! پاکستان یہ میچ جیت جائے، تو پاکستانی ٹیم کی مدد فرما......آج کا یہ میچ ہمارے نام کردے۔ پلیز اللہ......'' پاکستانی کھلاڑی ابھی گراؤنڈ میں آئے ہی تھے کہ وہ جائے نماز بچھا کر بیٹھ گئی تھی۔

''لو یہ دوسرا بھی گیا......اب نہیں پاکستان میچ جیتنے والا۔'' سیفی کی جھنجلائی ہوئی آواز آئی تو وہ سجدے میں گر گئی اور آنسوؤں میں روانی آگئی۔

''مجھے سمجھ نہیں آتی کہ ان کے ساتھ کھیلتے ہوئے ہماری ٹیم کو ہو کیا جاتا ہے۔ دنیا کے بہترین باؤلرز ہمارے پاس ہیں جبکہ بیٹسمین کی بھی کمی نہیں ہے، وہ بھی اچھے ہیں پھر کیا ہو جاتا ہے ان کو جو یہ لائن لگا کر آگے پیچھے آؤٹ ہوتے جاتے ہیں۔'' دانی بہت زیادہ زچ

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-





ہو رہا تھا، ان دونوں کے کمنٹس سن کر وہ اور زیادہ ڈسٹرب ہو رہی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ دعا کی قبولیت کا وقت نہیں ہے۔

''او یار...... ایمپائر نے غلط آؤٹ دے دیا، یہ دیکھو ناصر جمشید کا بیٹ تو گیند سے ٹچ بھی نہیں ہوا پھر کیسے آؤٹ ہوا؟ ان فیئر...... بالکل غلط فیصلہ...... میں نہیں مانتا اسے۔'' دانی نے غصے سے دائیں ہاتھ کا مکا بائیں ہتھیلی پر مارا...... ناصر جمشید بغیر کسی غلطی کے آؤٹ ہو جانے پر منہ لٹکائے باہر جا رہا تھا۔ تین کھلاڑیوں کے ابتدا ہی میں آؤٹ ہو جانے کے بعد پوری ٹیم، کوچ اور قوم کی امیدوں کا مرکز وہی تھا جو ایمپائر کے غلط فیصلے کا شکار ہو کر جا رہا تھا۔

''پاکستانی قوم کی عادت بن چکی ہے کہ جب ٹیم میچ ہار جاتی ہے تو یہ کہہ دینا کہ میچ فکسنگ ہوئی، ایمپائرز نے بے ایمانی کی دس اینڈ ڈیٹ...... بٹ آئی ایم شیور ایسا ریئل میں کچھ بھی نہیں ہے۔ جو ٹیم جب اچھا پرفارم کرتی ہے تو میچ جیت لیتی ہے اور وائز......'' سکندر حسبِ معمول بولتا ہوا لاؤنج میں داخل ہوا تھا۔ سیفی اور دانی کے اترے ہوئے چہرے دیکھ کر وہ زیرِ لب مسکرا دیا۔ جھک کر سینٹرل ٹیبل پر گاڑی کی چابی اور موبائل رکھا اور ریموٹ کنٹرول اٹھا کر ٹی وی آف کر دیا۔

''ارے ...... سکندر بھائی۔'' وہ دونوں ایک ساتھ چیخے تھے۔ دوسری طرف وہ ریلیکس انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''ٹی وی کیوں آف کیا آپ نے۔ پلیز جلدی سے آن کریں اسے۔'' دانی نے اٹھ کر ان سے ریموٹ کنٹرول لینا چاہا، جسے انہوں نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا تھا۔

''دفع کرو ایسے میچ کو جسے دیکھنے کے بعد تم لوگوں نے رونا ہے۔'' وہ بولا تو اس کا اطمینان قابلِ دید تھا۔

''ہم نہیں روتے، رونے والی پارٹی اندر بیٹھی دعائیں مانگ رہی ہے۔'' دانی منہ پھلا کر بولا۔ اس کی بات پر وہ ہنس دیا۔

''چلو تم لوگوں کو آئس کریم کھلانے لے کر جاتا ہوں، حبا کو بھی ساتھ لے لو۔'' اس نے محتاط نظروں سے اس کے روم کے ادھ کھلے دروازے کو دیکھ کر قصداً اونچی آواز میں کہا۔

''آئس کریم...... پاکستان کے ہارنے کی خوشی میں؟'' سیفی نے جل کر کہا تو وہ اپنی بے ساختہ امڈنے والی ہنسی کو نہ روک سکا۔ اس کی ہنسی کی آواز اندر زاروقطار روتی حبا کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی اور تیزی سے چلتی ہوئی لاؤنج میں آ گئی۔

''آئی ڈونٹ انڈر اسٹینڈ...... کہ جب پاکستان ہار جاتا ہے تو آپ اتنے خوش کیوں ہوتے ہیں، کیا آپ کا تعلق ان لوگوں سے ہے؟ اینڈ بائی دا وے آپ آج ہمارا تماشا دیکھنے آئے ہیں، مذاق اڑانے آئے ہیں، سو بی پی بی کاز پاکستان یہ میچ بھی ہارنے والا ہے آپ کی وش کے عین مطابق......'' برستی آنکھوں کے ساتھ کہتی ہوئی جس تیزی کے ساتھ وہ آئی تھی، اسی تیزی سے واپس پلٹ گئی۔ سکندر حیات اس کے نوکیلے الفاظ، چبھتی نگاہوں اور اندازِ گفتگو پر ششدر ہی تو رہ گیا تھا۔

''سوری سکندر بھائی! ایکچوئیلی وہ اس وقت اپنے حواسوں میں نہیں ہے۔ آپ کو تو پتا ہے وہ ان دو ٹیموں کے میچ کو بہت سیریس لیتی ہے۔'' دانی اس کے رویے پر سخت شرمندہ تھا۔ جبکہ سفیان بھی ندامت کی وجہ سے ایک لفظ نہ بول سکا۔

''اٹس اوکے......!'' ان دونوں کی شرمندگی مٹانے کی خاطر وہ نارمل لہجے میں کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کوٹ کی جیب سے ریموٹ کنٹرول نکال کر ٹی وی آن کیا اور ریموٹ کو پھر سے سینٹرل ٹیبل پر رکھ دیا۔ گاڑی کی چابی اور سیل فون اٹھا کر وہ خاموشی سے باہر کی جانب بڑھا۔

''سکندر بھائی، رکیں تو...... ایسے کیسے جا رہے ہیں آپ؟'' وہ دونوں اٹھ کر اس کے پیچھے بھاگے۔

''میں اب گھر چلوں گا۔ امی ویٹ کر رہی

ہوں گی، میں یہاں تم لوگوں کو صرف ریلیکس کرنے آیا تھا۔ اور تو کوئی کام نہیں تھا۔'' ان کی مزید کوئی بات سنے بغیر وہ پورچ کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

''حبا کدھر ہے؟'' وہ ڈنر کے لیے نہیں آئی تو پاپا کو تشویش ہوئی۔ وہ استفسار کرنے لگے۔

''وہ اپنے روم میں ہے۔'' دانی نے سیفی کو آنکھ مار کر جواب دیا۔

''کھانا نہیں کھائے گی کیا؟'' وہ مزید گویا ہوئے۔

''محترمہ سوگ منا رہی ہیں، رو، رو کر آنکھیں سرخ کرلی ہیں۔'' اب کی بار جواب ماما نے دیا، جسے سن کر وہ بے چین ہو اٹھے۔

''کیوں بھئی ایسا کیا ہوگیا؟ اور آپ لوگ اتنے اطمینان سے بیٹھے ہیں، مجھے آتے ہی بتایا ہوتا۔'' وہ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

''آپ پہلے میری بات تو سن لیں، سمجھا دیجیے گا اسے کہ آئندہ سکندر سے بدتمیزی کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا...... حد ہے بھئی، نہ کسی بڑے کا ادب نہ چھوٹے کا لحاظ...... عجیب جنون ہے۔'' ان کا موڈ سخت آف تھا۔ پاپا نے انہیں کوئی جواب نہ دیا اور بیٹی کی خیریت معلوم کرنے کے لیے اس کے روم کی جانب بڑھ گئے۔

اس کے ساتھ بیڈ پر بیٹھ کر اس کے بالوں کو محبت سے سمیٹتے ہوئے وہ اسے چپ کروا رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں وہ سب کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھی۔ پاپا اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلا رہے تھے۔ ماما نے اس پر ایک نگاہِ غلط بھی ڈالنا گوارا نہیں کیا۔ اس بات پر اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے جنہیں پاپا سے چھپانے کی خاطر وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی کھانے میں مصروف تھی۔

☆☆☆

ہفتہ بھر سے سکندر ان کے گھر نہیں آیا تھا۔ اور ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ ورنہ وہ ہفتے میں دو یا تین چکر تو ضرور لگاتا۔ اوپر سے غضب یہ ہوا کہ تایا ابا اور تائی اماں شادی کی ڈیٹ فکس کرنے آپہنچے...... دانی نے تب سے اس کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔

اس نے کچھ سوچتی ہوئی نگاہوں سے وال کلاک پر نظر ڈالی اور سکندر حیات کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ ایک انجانے خوف کے زیر اثر اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔

''ہیلو......'' دوسری طرف سے سکندر حیات کی نیند میں مخمور آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو اپنی حماقت کا احساس کر کے اس کا جی چاہا فون بند کردے۔

''حبا ایوری تھنگ از اوکے؟'' رات کے ساڑھے تین بجے اس کے فون نے سکندر کو درحقیقت پریشان کردیا تھا۔

''یس......'' وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی...... دوسری طرف وہ ایک لمبی سانس فضا کے سپرد کرتے ہوئے قدرے مطمئن ہوا۔

''میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟'' اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ مدعا کیسے بیان کرے...... اسی لیے کوئی ڈھنگ کی بات منہ سے نہیں نکل رہی تھی۔

''آئی تھنک رات کے ساڑھے تین بجے کسی شریف شخص کو پُرسکون اور گہری نیند سے جگا کر یہ سوال کرنا خاصی نامعقول سی بات ہے۔ بٹ اینی ویز...... فون کیوں کیا؟'' سرد اور سپاٹ انداز میں اس نے استفسار کیا تو حبا کے حوصلے ٹوٹنے لگے۔

''کیا آپ جانتے ہیں کہ آج کل ہمارے پیرنٹس کے درمیان کیا چل رہا ہے؟'' محتاط انداز میں لفظوں کو ترتیب دے کر وہ بولی تو سکندر حیات زیرِلب مسکراتے ہوئے تاسف سے سر ہلا کر رہ گیا۔

''تم پوچھ رہی ہو یا بتا رہی ہو؟'' وہ لطف لیتے ہوئے بظاہر سنجیدگی سے بولا۔ دوسری طرف وہ جل کر رہ گئی۔

''میں آپ سے پوچھ رہی ہوں۔'' وہ دانت پیس کر بولی۔

"اوہ۔ اچھا، نہیں مجھے کچھ نہیں معلوم...... آئی ڈونٹ نو کہ کیا چل رہا ہے۔" وہ تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے بولا۔

"تو پھر سن لیں، وہ ہم دونوں کی شادی کروا رہے ہیں۔" اپنی طرف سے اس نے دھماکا کیا تھا۔ لیکن اس کے سکون میں کوئی فرق نہیں آیا۔

"پھر......؟" وہ اطمینان سے بولا۔

"پھر؟" اس کے جواب پر وہ حیرت زدہ تھی۔ "کیا آپ خوش ہیں؟"

"آئی تھنک جو ہمارے پیرنٹس نے سوچا ہے تو بہتر ہی سوچا ہوگا ہمارے لیے۔ اس لیے فی الحال مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"مگر مجھے اعتراض ہے، میں یہ شادی کسی صورت نہیں ہونے دوں گی۔" وہ دوٹوک لہجے میں غصے سے بھڑک کر بولی۔

"اچھا تو پھر میں کیا کروں؟" خاصا دلچسپ سوال تھا۔

"آپ یہ کریں کہ اس شادی سے انکار کر کے میری مشکل آسان کردیں۔" وہ اس وقت لڑائی کر کے اپنا مسئلہ بڑھانا نہیں چاہتی تھی اس لیے غصہ دبا کر مصالحانہ انداز میں بولی۔

"لیکن میں کیوں انکار کروں، جب مجھے کوئی اعتراض ہے بھی نہیں۔" وہ پہلو بچاتے ہوئے بولا۔ حبا کو اس کی اس ڈرامے بازی پر طیش آیا تھا۔

"مگر مجھے اعتراض ہے۔" وہ زچ ہو رہی تھی۔

"ہاں...... تو تم انکار کرو، میرے کندھے پر رکھ کر کیوں بندوق چلا رہی ہو۔" وہ ایک مرتبہ پھر سنجیدہ ہو گیا تھا۔ حبا کی پے در پے بدتمیزی، اس سے جھگڑے اور اب شادی سے انکار نے اسے شاک لگایا تھا۔

"ٹھیک کہا آپ نے، مجھے خود ہی انکار کر دینا چاہیے۔ بہت بڑی غلطی ہوئی مجھ سے جو آپ سے مدد مانگی۔" سکندر حیات کے دوٹوک جواب دینے پر وہ حد درجہ دلگرفتہ اور اس سے مزید بدگمان ہو گئی تھی۔

"اوکے، گڈ نائٹ......" اس کی بات کا کوئی بھی جواب دیے بغیر اس نے فون بند کر دیا تھا۔ دوسری طرف وہ غصے سے تلملا کر رہ گئی۔

☆☆☆

"سکندر! ناشتا نہیں کرو گے؟" اسے صبح ہی صبح بہ عجلت گھر سے نکلتے دیکھ کر وہ پریشان ہو اٹھیں۔

"امی ایکچوئیلی میری ایک بہت امپورٹنٹ میٹنگ ہے آج، ناشتے کا بالکل ٹائم نہیں۔" اس نے کلائی پر بندھی قیمتی گھڑی کو ایک نظر دیکھ کر ہاتھ میں پکڑے بریف کیس کو دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے باہر کا رخ کیا۔

"سکندر! میری جان ایسے خالی پیٹ کیسے میٹنگ اٹینڈ کرو گے۔" ماں کی ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ ایک بار پھر اس کے پیچھے آئی تھیں۔

"ڈونٹ وری امی! میں کوئی بچہ نہیں ہوں، آپ فکر مت کریں، میں آفس میں کچھ کھا لوں گا۔" انہیں اپنے چوڑے شانے کے ساتھ لگا کر وہ پیار کرتے ہوئے گاڑی کی جانب بڑھا۔ پیچھے وہ اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

"سکندر!" وہ گاڑی میں بیٹھ چکا تھا جب ان کی آواز سن کر اسے رک جانا پڑا۔

"بیٹا شام کو جلدی آنے کی کوشش کرنا شیراز بھائی کی طرف جانا ہے۔" کھڑکی پر جھکی وہ اسے کہہ رہی تھیں۔

"اوکے امی، کوشش کروں گا۔" مختصر جواب دے کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کر لی تھی۔ گاڑی کے گیٹ سے باہر نکلنے کے بعد بھی چند ثانیے وہ پورچ میں کھڑی رہیں۔ ان کی سوچوں کا رخ مسلسل سکندر حیات کے الجھے رویے اور حد درجہ سنجیدگی کی طرف تھا۔

☆☆☆

وہ آفس میں داخل ہوا تو معمول کی طرح آج بھی لوگ اسے جھک جھک کر سلام کر رہے تھے۔ اس کی آمد پر صنفِ نازک کے دل معمول سے ہٹ کر دھڑکے تھے۔ وہ کسی سے بھی بات کیے بغیر سیدھا اپنے

روم کی طرف آیا تھا۔ باوردی گارڈ نے ہاتھ ماتھے تک لے جا کر اسے سلام کیا اور مستعدی سے آگے بڑھ کر گلاس ڈور کو کھولا...... وہ اندر داخل ہوا، بریف کیس صوفے پر اچھالا، کوٹ اتار کر چیئر کی بیک پر ڈالا اور کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔

''یس......!'' دروازے پر دستک ہوئی تو وہ ٹہلتے ٹہلتے رک گیا اور نظریں دروازے پر جما دیں۔

''گڈ مارننگ سر!'' اس کی سیکرٹری اندر آتے ہوئے بولی، اس نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''سر آج ہمدانی گروپ آف......''

''مس مایا آج کی تمام میٹنگز، اپائمنٹس، ڈنر اینڈ سائٹ کے وزٹس وغیرہ سب کینسل کر دیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''لیکن سر آج تو آپ کا......''

''مس مایا جتنا کہا گیا ہے وہی کریں۔ فی الحال مجھے آپ کے مشوروں کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بارعب آواز میں بولا تو سیکرٹری اپنی ڈائری کو بند کر کے سر ہلا کر رہ گئی۔

''جی بہتر سر......'' وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔

''یو مے گو ناؤ۔'' اجازت ملتے ہی وہ باہر کی جانب بڑھی۔

اپنی آفس چیئر پر بیٹھتے ہوئے، ہاتھوں میں پکڑے پیپر ویٹ کو گھماتے ہوئے دیوار پر سامنے لگی پینٹنگ کو وہ بغور دیکھ رہا تھا۔ مگر سوچ کی سوئی اب بھی حبا میں اٹکی ہوئی تھی۔ اس کی ڈارک براؤن آنکھیں شدتِ ضبط کے باعث سرخ ہو رہی تھیں۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے کوٹ کی جیب سے موبائل نکالا اور حبا کا نمبر ملانے لگا۔ مگر کئی بار کی کوشش کے باوجود بھی اس کی کال اٹینڈ نہ ہو سکی۔

''آئی تھنک اس کی کلاس ہو رہی ہے۔'' یہ سوچ کر اس نے سیل فون رکھ دیا مگر بار، بار کال کرنے پر اس کا فون ریسیو نہ ہوا تو اسے تشویش ہونے لگی۔

''حبا فری ہو کر مجھ سے بات کرنا۔'' اس نے میسج لکھ کر اسے سینڈ کر دیا۔

''میں آپ سے بات نہیں کرنا چاہتی، مجھے ڈسٹرب مت کریں۔'' فوراً ہی اسے حبا کا جواب موصول ہوا، جسے پڑھ کر وہ ششدر رہ گیا۔

''اسے ہو کیا گیا ہے...... یہ کیوں کر رہی ہے ایسا؟'' سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھٹ رہا تھا مگر کوئی سرا اس کے ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔

☆☆☆

ست روی سے چلتا ہوا وہ لاؤنج میں داخل ہوا تھا۔ ہاتھ میں پکڑا کوٹ کندھے پر لٹکائے ہوئے وہ اندر کی جانب بڑھ رہا تھا۔

''سکندر!'' امی کی آواز سن کر وہ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ ''میں نے کہا تھا ناں کہ آج جلدی واپس آنا، آپ پھر بھی......'' بات ادھوری چھوڑ کر وہ اسے دیکھنے لگی تھیں۔

''آئی ایم سوری امی، ایکچوئیلی آج بہت بزی ڈے تھا تو میں بھول گیا......'' وہ دھیرے سے چلتا ہوا ان کے پاس آیا اور آہستگی سے ان کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا۔

''سکندر کوئی ٹینشن ہے تو مجھ سے شیئر کرو، آخر مسئلہ کیا ہے...... صبح بھی بغیر کوئی بات کیے اور بغیر ناشتا کیے نکل گئے۔ پھر میری بات بھی بھول گئے۔'' وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے نیم دراز تھا۔ ان کی بات سن کر ایک دم محتاط ہو کر سیدھا ہو بیٹھا۔

''ایسا کچھ بھی نہیں ہے، آپ کو تو میرے حوالے سے کوئی نہ کوئی فکر لگی رہتی ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ بشاشت سے بولا۔

''شیور؟'' انہوں نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

''یس! آف کورس امی...... اور ایک دفعہ پھر سوری...... کل جلدی آجاؤں گا آفس سے اور آپ کو چچا جان کی طرف لے جاؤں گا۔'' ان کا دھیان خود سے ہٹانے کے لیے وہ بات بدل کر بولا۔

''اوکے...... اب تم فریش ہو جاؤ، میں چائے بنواتی ہوں۔'' وہ اٹھ کر چل دیا مگر اب وہ خود کو ریلیکس اور فٹ شو کرنے کے لیے نارمل روٹین کی طرح وہاں سے اپنے کمرے میں گیا۔ انہیں وہ پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

''حبا آر یو آن یور سینسز......؟'' فارینہ حیرت و بے یقینی کے ملے جلے جذبات کا شکار ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔

''یس......'' اس نے بالوں میں اٹکے ہوئے بلیک سن گلاسز اتار کر آنکھوں پر لگا لیے۔ دونوں کا رخ لائبریری کی طرف تھا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا یار۔'' فارینہ اب بھی اس کی بات ماننے سے انکاری تھی۔

''میں تمہیں یقین دلانا ضروری سمجھتی بھی نہیں......'' وہ بے نیازی سے بولی۔

''آئی مین...... تم نے سکندر حیات کو صاف، صاف بول دیا کہ تم اس سے شادی نہیں کرنا چاہتیں...... آئی تھنک تم نے بہت غلط کیا حبا۔'' وہ سخت حیرت میں تھی۔

''فارینہ، میں نے جو کیا بالکل ٹھیک کیا۔ میں تو سکندر حیات سے کبھی بات بھی نہیں کرنا چاہتی اور شادی...... اونہہ امپاسبل......'' وہ نخوت سے سر جھٹک کر بولی۔

''بٹ جہاں تک میری نالج ہے اور مجھے جہاں تک یاد آتا ہے تو حبا احمد تو سکندر حیات سے محبت کرتی تھی ناں......؟'' وہ استہزائیہ انداز میں بولی تو حبا کا بگڑا موڈ مزید بگڑ گیا۔

''فارینہ میں اس ٹاپک پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتی اور تمہارا احسان ہوگا اگر تم مجھ سے دوبارہ یہ بات نہ کرو۔''

''اوکے، اوکے...... ریلیکس یار، تم یہ بتاؤ کہ سر ذیشان کا اسائنمنٹ بنا لیا؟'' اس کے موڈ کو بگڑتے دیکھ کر فارینہ نے فوراً بات ہی بدل ڈالی۔

''نہیں۔'' مختصر جواب آیا۔

''حبا۔'' فارینہ نے اس کا بازو پکڑ کر ہلایا۔ ''اپنا موڈ ٹھیک کرو، مجھے ٹینشن ہو رہی ہے پلیز......''

''فارینہ......!'' وہ بولی تو اس کی آواز میں کرب نمایاں تھا۔

''حبا...... کیا ہوا۔'' فارینہ پریشان ہو گئی۔ فوراً اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک قدرے پُرسکون گوشے میں جا کر بیٹھ گئی۔ ''اب بتاؤ پرابلم کیا ہے؟''

''فارینہ میں......'' اس کی آواز بھرا گئی۔ ''میں سکندر کے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' اس کی آنکھوں سے ٹپ، ٹپ آنسو گرنے لگے۔

''فارینہ وہ مجھے چھوڑ دیں گے، وہ مجھے چھوڑ رہے ہیں...... میں کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میں بہت ٹینشن میں ہوں۔'' فارینہ نے اسے ٹشو دیا، وہ فوراً آنسو پونچھنے لگی اور دھیرے، دھیرے سب کچھ بتانے لگی۔ فارینہ ہمہ تن گوش تھی۔

☆☆☆

اوائل فروری کی شامیں بے حد اداس گزر رہی تھیں۔ اس کے اور سکندر کے درمیان ناراضی ہنوز برقرار تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے شاور لے کر نکلی تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کی کھلے گھیر والی فراک اور چوڑی دار پاجامہ پہن رکھا تھا۔ اسٹریپ میں کٹے ہوئے خوب صورت بال شانوں پر بکھرے تھے۔ اردگرد کے ماحول سے...... بے نیاز وہ ٹیرس پر کھڑی تھی۔ اس کی نظریں آسمان کی وسعتوں میں اڑتے ہوئے پرندوں پر تھیں، جو دن بھر کی اڑان کے بعد تھکن سے چور ہو کر اپنے گھونسلوں کو واپس لوٹ رہے تھے۔

''آپ برہم ہی سہی، بات تو کرلیں ہم سے
کچھ نہ کہنے سے محبت کا گماں ہوتا ہے''

وہ گمبھیر لہجے میں شعر پڑھتے ہولے سے اس کے پہلو میں آ کھڑا ہوا تھا۔ وہ بالکل بھی نہیں چونکی تھی کیونکہ اس کی آمد کا پتا اس کے دلفریب کلون کی مہک نے چند

سکندر پہلے ہی دے دیا تھا۔

''یہاں اکیلی کیوں کھڑی ہو، نیچے آؤ سب کے ساتھ بیٹھو۔'' سکندر حیات اپنائیت سے بولا۔ وہ خاموش رہی، اس کی بات پر ایک بوجھل اور تھکی ہوئی سانس فضا کے سپرد کرتے ہوئے وہ اب سامنے لان میں موجود درختوں کو بغور دیکھ رہی تھی۔

''کیا اس قدر خفا ہو کہ میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں۔'' وہ گویا ہوا۔

''میں کسی سے خفا نہیں ہوں۔'' وہ بولی تو اس کے لہجے سے اجنبیت عیاں تھی۔

''یہ دھوکا تم کسے دے رہی ہو، مجھے یا خود کو؟''

''دھوکا تو قسمت نے میرے ساتھ کیا ہے۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں ہولے سے بولی۔

لیکن اس کی بات سکندر سن چکا تھا۔

''کم آن یار...... کوئی دھوکا نہیں ہوا تمہارے ساتھ، سب لوگ تمہیں بہت چاہتے ہیں۔ تم سے جڑے رشتوں کو تمہاری بہت فکر ہے۔'' اس کی بات پر حبا احمد کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔ جسے سکندر حیات سے چھپانے کی خاطر وہ رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اس شخص کو نہیں بتانا چاہتی تھی کہ اسے کیا بات رُلا رہی ہے۔

''حبا، یو نو کہ ہماری شادی کی ڈیٹ فکس ہو چکی ہے۔ کارڈ بٹ گئے ہیں، سب ارینجمنٹ ہو گئی ہے لیکن اگر تمہیں یہ پروپوزل قبول نہیں ہے تو میں اب بھی کچھ کر سکتا ہوں مگر میری ایک شرط ہے۔'' وہ اس کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا اور بغور اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی اسی کو دیکھ رہی تھی۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے، تھکا ماندہ سورج اب سونے کو بیتاب تھا۔ سکندر حیات مبہوت اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ وہ مضمحل و اداس ہونے کی وجہ سے اور بھی حسین دکھائی دے رہی تھی۔

''کیسی شرط؟'' وہ نظریں چرا کر بولی، اس پل اسے سکندر سے عجیب سا خوف محسوس ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں کچھ کہتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ جانے وہ کیا فیصلہ کرنے لگا تھا۔

''تم مجھے اس انکار اور ناراضی کی وجہ بتاؤ، آئی پرامس یو میں سب کچھ ختم کروا دوں گا۔'' سکندر کی بات پر اس کے دل نے ایک بیٹ مس کی تھی۔ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے وہ واپس مڑی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر سرعت سے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ حبا ششدر رہ گئی۔

''کیا تم کسی اور کو......'' دانستہ بات ادھوری چھوڑ کر وہ اسے دیکھنے لگا۔

''میں کسی بھی بات کے لیے آپ کی پابند نہیں ہوں اور نہ جواب دہ......'' وہ تند و ترش لہجے میں بولی گویا اس کی بات سخت بری محسوس ہوئی ہو۔

''ڈونٹ وری، پابند تو ہم آپ کو کرنے جا رہے ہیں، فی الحال آپ مجھے تو نہیں صائمہ آنٹی کو جواب دہ ضرور ہیں، جو بہت پریشان ہیں آپ کی خاموشی سے۔'' وہ اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ سے نرم سا دباؤ ڈال کر بولا۔

''میرے اور میری ماما کے پرسنل میٹر میں آپ انٹرفیئر نہ ہی کریں تو بہتر ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں آپ کو پچھتانا پڑے۔'' اسے ہکا بکا چھوڑ کر ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑوا کر وہ اندر کی جانب بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

''حبا آج یونیورسٹی مت جاؤ، تمہاری جو شاپنگ رہ گئی ہے وہ تم آج میرے ساتھ چل کر مکمل کر لو۔'' اسے ہاتھ میں فائل تھامے، شولڈر پہ بیگ لٹکائے نکلتے ہوئے دیکھ کر وہ ٹوکے بنا نہ رہ سکیں۔

''سوری ماما...... شاپنگ میں ٹائم برباد کرنے سے بہتر ہے میں اپنے لیکچرز لے لوں۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ آپی اپنی شادی کے روز بھی یونیورسٹی جائیں گی۔'' یہ دانی تھا۔

"تم اپنی چونچ بند رکھو۔" وہ اسے گھورنے لگی۔

"ڈانٹ لو بچو! جب پاکستان کا انڈیا کے ساتھ میچ ہوا کرے گا اور تم آنسو بہاؤ گی اور سکندر بھائی تمہارا مذاق اڑائیں گے ناں تب ہماری یاد آئے گی اور قدر کا اندازہ ہوگا۔" اس سے بڑے سفیان نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"بس تم لوگ ہو جاؤ فضول باتوں پر شروع......" امی نے ڈانٹا تو وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو حبا ضرور ان دونوں کو منہ چڑاتی مگر اس وقت خاموش کھڑی تھی۔

"ناشتا تو کرو......ایسے خالی معدے سے پڑھائی کیا خاک ہوتی ہے۔" ان کے لہجے سے ممتا جھلک رہی تھی، جسے محسوس کر کے وہ اداس ہو گئی۔

"ماما میں یونیورسٹی میں کچھ کھا لوں گی اور شاپنگ آپ خود ہی کر لیں، مجھے سب کچھ پسند آجائے گا۔" وہ چلی گئی تو ماما، پاپا کو دیکھنے لگیں جو اخبار کی سرخیوں میں گم تھے۔

"بہت بے پروا ہوتی جا رہی ہے حبا، احمد آپ ہی کچھ سمجھائیں اسے۔" ماما اس کے لیے بہت فکر مند تھیں۔

"شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا، میری بیٹی بہت سمجھدار ہے۔" اخبار کا صفحہ پلٹتے ہوئے انہوں نے کافی کا کپ اٹھایا جو ماما نے اُن کے سامنے رکھا تھا۔

"سکندر جتنا سلجھا ہوا ہے اور ترتیب نظر آتی ہے اس کی لائف میں، یہ اتنی ہی بے پروائی دکھا رہی ہے۔ اب بھلا یہی دیکھ لیں کہ شاپنگ پر جانا تھا اور یہ چل پڑی یونیورسٹی۔"

وہ حبا کی طرف سے کافی فکر مند تھیں۔

"ڈونٹ وری! میں کہوں گا اسے وہ میری بات ضرور مان لے گی۔" وہ مان بھرے لہجے میں بولے۔

"آپ آج ہی اس سے بات کیجیے گا۔" وہ جھٹ سے بولیں۔

"اوکے......!" انہوں نے اخبار لپیٹ کر ایک سائڈ پر رکھا، کافی کا آخری سپ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ "صائمہ اسٹڈی ٹیبل پر جو بلیو فائل رکھی ہے مجھے وہ لا دیں۔" اچانک یاد آنے پر وہ بولے تھے۔ وہ اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ دانیال اور سفیان جلدی سے ناشتا ختم کرنے لگے۔

☆☆☆

بڑی سہانی رات تھی، آسمان پر ستارے بکھرے ہوئے تھے، سامنے لان میں موجود درختوں کے پتے آہستہ آہستہ سرسرا رہے تھے، ہوا نرم اور سبک تھی۔ اسے کمرے میں گھٹن محسوس ہوئی تو نکل کر ٹیرس پر آگئی اور کھلے آسمان کے نیچے گہری، گہری سانسیں لے کر فضا میں رچی بہار کی خوشبو کو محسوس کرنے لگی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے موبائل پر ایس ایم ایس کی بپ ہوئی۔ اس نے خیالوں کی دنیا سے موڑ کاٹا اور حال میں لوٹ آئی۔

"اسے ہم چھوڑ دیں لیکن بس اک چھوٹی سی الجھن ہے
سنا ہے دل سے دھڑکن کی جدائی موت ہوتی ہے"

آج اس گھر میں اس کی آخری رات تھی، وہ سکندر حیات سے شدید نفرت محسوس کر رہی تھی۔ ان لمحوں میں اس کا اتنا معنی خیز میسج اسے تپا گیا تھا۔

"سکندر حیات میں تمہیں بھی ایسے ہی بے سکون کروں گی جیسے کہ تم نے مجھے کیا ہے۔" وہ اس وقت خود کو بے بسی کی انتہاؤں پر محسوس کر رہی تھی۔ اس نے رات ٹیرس پر کھڑے، کھڑے ہی گزاری تھی۔ آسمان کے کناروں پر سفیدی جھانکنے لگی تو وہ پلٹ کر کمرے میں آگئی۔

☆☆☆

شہر کے بہترین پارلر سے اسے تیار کروایا گیا تھا۔ دلہن بن کر اس پر ٹوٹ کر روپ آیا تھا۔ چہرے پر موجود اداسی نے مزید حسین بنا دیا تھا۔ وہ کزنز اور فارینہ کے ساتھ چلتی ہوئی اسٹیج کی طرف آرہی تھی۔ ایک دم نظر اوپر اٹھی، سامنے وہ سب کزنز اور دوستوں کے درمیان راجا اندر بنا بیٹھا تھا۔ خوش گپیوں میں مصروف وہ ان کی کسی بات پر مسکرا رہا تھا۔

"میرا سکون لوٹ کر خود قہقہے لگا رہا ہے۔" وہ

نفرت سے سوچ کر رہ گئی۔ اس کی نظروں کے ارتکاز کو محسوس کر کے اس نے اچانک اُدھر دیکھا تھا۔ حبا احمد کی آنکھوں میں غصے اور نفرت کے علاوہ اسے بغاوت کا عزم اور سرکشی بھی نظر آئی۔ اسے لا کر اس کے برابر میں بٹھا دیا گیا تھا۔

نکاح نامے پر سائن کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ اس کے ہاتھوں کی لرزش سکندر حیات سے مخفی نہ تھی۔ اچانک اس کے سر پر کسی کا ہاتھ آ کر ٹھہر گیا تھا۔ اس نے سرعت سے سر اوپر اٹھایا۔

''پاپا!'' اس کے لبوں نے بے آواز جنبش کی۔ انہوں نے ہولے سے سر ہلا کر آنکھوں کے اشارے سے اسے سائن کرنے کو کہا تھا۔ اور پھر اس نے سائن کر دیے...... ہر طرف مبارک سلامت کا شور تھا۔ اس کے علاوہ سب ہی خوش تھے۔

''حبا اپنا موڈ ٹھیک کر و یار...... سکندر بھائی اتنے ہینڈسم اور اچھے ہیں، سب تمہارا وہم ہے۔'' فارینہ نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''میں ہار گئی فارینہ......'' آنسو پیتے ہوئے وہ دھیمی آواز میں بولی۔

''فارگیٹ اٹ یار، اینڈ بلیو می سکندر حیات...... ویسا بندہ بالکل نہیں ہے جیسا تم اسے سمجھ رہی ہو۔'' سب کے ساتھ ملنے کے بعد سکندر دوبارہ اس کے پہلو میں بیٹھ گیا تھا۔ وہ نامحسوس انداز میں تھوڑا سا پرے کو کھسکنے لگی مگر غضب یہ ہوا کہ سکندر اس کے دوپٹے کے پلو پر بیٹھ چکا تھا۔ اسے شدید کوفت کا احساس ہوا۔

''میں تو دودھ نہیں پیتا۔'' لڑکیاں خوب صورتی سے سجایا ہوا گلاس جو کہ دودھ سے بھرا ہوا تھا لے کر اسٹیج پر آئیں، جب وہ شرارت آمیز سنجیدگی سے بولا۔

''یہ تو چیٹنگ ہے، بے ایمانی ہے۔'' لڑکیاں چلّانے لگیں۔ وہ بیٹھا دلکشی سے مسکرا رہا تھا، دوسری طرف سب لڑکے بھی اس کی اس حرکت پر خوش ہو رہے تھے۔

''نہ پئیں دودھ، دودھ پلائی تو دیں ناں۔'' صوفیہ خالہ کی بیٹی عفیفہ آگے ہو کر بولی۔

''ارے...... پیسے کس چیز کے بھئی، جب میں نے دودھ ہی نہیں پیا۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ ''چلیں ہم آپ کو جوس پلا دیتے ہیں۔'' یہ فیاض ماموں کی بیٹی روما تھی۔

''یعنی کہ آپ لوگ مجھے کچھ نہ کچھ ضرور پلائیں گے، لائیں میں دودھ ہی پی لیتا ہوں۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر گلاس پکڑ لیا۔ ''مگر میری ایک شرط ہے۔''

''کیا......؟'' سب لڑکیاں یک زبان ہو کر بولیں۔

''ایک اور اسٹرا لے آئیں، حبا بھی میرے ساتھ یہ دودھ پی کر دکھائے...... اور اس کے بعد آپ لوگ جتنی دودھ پلائی مانگیں گی، میں دوں گا۔'' فوراً سے دوسرا اسٹرا آ گیا تھا۔ حبا کا غصے سے برا حال تھا۔ اسے سکندر حیات کی سب حرکتیں ڈراما لگ رہی تھیں۔

''حبا دودھ پی لو......'' سب اسے کہہ رہی تھیں مگر وہ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اب لڑکے، لڑکیوں کا خوب ریکارڈ لگا رہے تھے...... بیچاری لڑکیاں غصے میں تھیں۔

''ارے، یہ، یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟'' سکندر کی حیرانی میں ڈوبی الجھن آمیز آواز ابھری تو نادانستگی میں اس نے بھی سر اٹھا کر دیکھا۔

''دیکھیں! یہ جوتا واپس کریں۔'' سکندر کا دوست ہاتھ آگے کرتے ہوئے بولا جبکہ سکندر حیات خاموش بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اس کی نظریں شریری فارینہ پر جمی تھیں جو موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کا جوتا ہتھیا چکی تھی اور اب فاتحانہ نظروں سے لڑکوں کو دیکھ رہی تھی۔

''اسے کہتے ہیں، تو سیر تو میں سوا سیر......'' لڑکیوں میں سے کوئی بولی تھی۔

''یار تو یہ میرا جوتا پہن لے مگر ان چورنیوں کو پیسے نہیں دینے۔'' یہ سکندر کا دوست کاشف تھا۔

''چور کسے کہا آپ نے؟'' وہ تلملاتے ہوئے بولی۔

''آپ کو......'' جواب میں وہ بھی اسے غصہ

دلانے والے انداز میں بولا۔

"لیو اٹ یار، ڈونٹ ٹیک اٹ پرسنل......"

سکندر نے کاشف کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش کروا دیا۔ پھر اس نے اچھی خاصی رقم لڑکیوں کو دی تھی۔

والدین کی دعاؤں اور بھائیوں کی محبت کے سائے میں وہ رخصت ہوئی تھی۔ گاڑی میں اس کے بیٹھتے ہی سکندر حیات بھی اس کے برابر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ ایک تھکا اور خاموش آنسو اس کی بائیں آنکھ سے نکل کر کسی راز کی طرح سینے میں جذب ہو گیا تھا۔

☆☆☆

وہ سرمستی کے عالم میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا تھا۔ اس کی آنکھیں خمار آلود تھیں، حبا کو پالینے کا نشہ اسے ایک تازگی بخش گیا تھا۔

"پہلے ہمارا نیگ دیں پھر اندر جائیں۔" اس کے بیڈروم کا دروازہ گھیرے اس کی کزنز کھڑی تھیں۔

"یار آج تو دن ہی برا ہے، سارے شہر میں ڈاکو گھوم رہے ہیں، مجھے تو پہلے ہی اچھا خاصا لوٹ لیا گیا ہے، اب آپ لوگ رحم کرو۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔

"ہمیں ہمارا حصہ دیں، ورنہ بھابی کے دیدار سے محروم رہیں گے۔" فائزہ بولی۔

"ایسا ہے تم لوگ آج اپنی بھابی کے پاس سو جاؤ، میں تو ویسے بھی بہت تھکا ہوا ہوں ریسٹ کرنا چاہتا ہوں۔" اس کی چالاکی پر سب ہنس دیں۔

"دیکھ لیں سکندر بھائی، آپ کی مسز نے اتنا ڈھیروں زیور پہنا ہوا ہے، ہم لوگ ڈاکو ہیں، اتار لیں گے۔" شازمہ بولی۔ رات کافی سے زیادہ گزر گئی تھی اسے حبا کے بگڑے موڈ کا بھی اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا۔ اس لیے انہیں نیگ دے کر فارغ کیا اور بیڈ روم میں آ گیا...... مگر حبا کہیں نہ تھی۔ نہ بیڈ پر، واش روم، ڈریسنگ روم میں ہر جگہ ڈھونڈ لیا۔

"حبا!" گھبرا کر وہ اسے آوازیں دینے لگا۔

"میرے اور میری ماما کے پرسنل میٹر میں آپ انٹرفیئر نہ ہی کریں تو بہتر ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں آپ کو پچھتانا پڑے۔" اس کی کہی گئی بات یاد آنے پر وہ کسی نامعلوم خوف کے زیر اثر تھرا کر رہ گیا۔

"مائی گاڈ......!" اچانک وہ اسے ٹیرس پر کھڑی نظر آ گئی تھی۔ "تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔" وہ تیر کی سی تیزی سے اس کے پاس آیا۔ وہ ہنوز خاموش کھڑی تھی۔

"آج تو بہت تھک گئے یار......" وہ دوستانہ انداز میں بولا۔ مگر جواب ندارد......

"کیا ساری رات اِدھر ہی کھڑے رہنے کا ارادہ ہے؟" وہ استفسار کرنے لگا۔

"حبا کیا تم اب بھی مجھ سے خفا......"

"مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی ہے۔" غصے سے کہہ کر وہ کمرے میں آ گئی تھی۔

سکندر بھی اس کے پیچھے آیا تھا۔ وہ کمرے کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔

"اچھا ختم کرو لڑائی اور میری بات سنو......" وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے بیڈ کی طرف لے جانے لگا۔ جب اس نے اس کا ہاتھ بہت زور سے جھٹکا اور غصے سے پھنکاری۔

"لڑائی تو اب شروع ہوئی ہے، پہلے تو جو بھی ہوا وہ آپ نے کیا مگر اب میں ہرگز خاموش نہیں رہوں گی۔" اپنے حلیے سے بے نیاز، وقت کا احساس کیے بغیر وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دھمکیاں دے رہی تھی۔

"حبا تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتیں۔" وہ احتجاجاً بولا تھا۔

"جیسا آپ نے میرے ساتھ کیا، میں بھی آپ کے ساتھ ویسا ہی کروں گی۔" وہ سرکشی سے بولی۔

"مجھے تو صرف اتنا پتا ہے کہ میں نے تم سے دل کی گہرائیوں سے محبت کی ہے، اتنا تو میں جانتا ہوں کہ کہیں نہ کہیں غلط فہمی ضرور ہے لیکن اگر تم مجھے کچھ نہیں بتانا چاہتیں تو ایز یو وش......" وہ ڈریسنگ روم میں گھس گیا چینج کر کے نکلا تو اسے وہیں کھڑے پایا۔

"چینج کرو اور سو جاؤ، لڑائی جھگڑے کے لیے عمر

پڑی ہے۔'' اسے کوئی بھی جواب دیے بغیر وہ چینج کرنے چلی گئی۔ واپس آئی تو اسے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے سوچوں میں مستغرق پایا۔ مگر وہ سر جھٹک کر آگے بڑھی اور بیڈ سے تکیہ اٹھا کر واپس مڑنے لگی۔ جب اس کا ہاتھ سکندر کے مضبوط ہاتھ میں آگیا۔

''ہاتھ چھوڑیں میرا۔'' وہ غصے سے پھنکاری، مقابل پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

''چھوڑنے کے لیے نہیں پکڑا۔'' وہ ذو معنی لہجے میں بولا۔

''میں کہتی ہوں میرا ہاتھ چھوڑ دیں، ورنہ......'' وہ غیظ کی انتہاؤں پر تھی۔

''ورنہ......؟'' اسے ہلکا سا جھٹکا دیا نتیجے کے طور پر وہ اس کے پہلو میں آگری، وہ ڈائریکٹ اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی جہاں جیت کے نشے کے ساتھ شرارت ناچ رہی تھی۔

''اچھے بچوں کی طرح اِدھر بیڈ پر ہی سو جاؤ ورنہ مجھے تمہارا علاج کرنا پڑے گا۔'' آخر میں اس نے دھمکی دی جو کارگر ثابت ہوئی۔

''آئی ہیٹ یو، ہیٹ یو سکندر ......'' نمکین پانی سے بھری آنکھوں کے ساتھ وہ اسے دیکھ کر بولی۔

''بٹ آئی لو یو مسز سکندر......'' وہ جذب سے بولا۔

''آپ کو تو محبت کے ہجے بھی نہیں معلوم، آپ وحشی ہیں، درندے ہیں۔'' تکیے میں منہ دے کر وہ پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی، اس کی کلائی سکندر کی مضبوط اور سخت گرفت کی وجہ سے سرخ پڑ چکی تھی جسے وہ برابر سہلا رہی تھی۔ اس کے رونے سے سکندر پشیمان ہونے لگا۔

باہر ہوا نرم اور پُر سکون تھی۔ اس میں بہار کے پھولوں کی مہک تھی، چاند کمرے میں موجود کھڑکی کے پیچھے سے ابھر رہا تھا۔ اس کی چاندنی شبنم سے بھیگے درختوں پر پڑ رہی تھی۔ رات مسکرا رہی تھی مگر ان دونوں کا دل افسردہ تھا۔

☆☆☆

ولیمہ ریسپشن کے بعد وہ ماما، پاپا کے ساتھ گھر چلی گئی تھی۔ دو دن بعد اسے لینے سکندر آیا تو اسے سامنے دیکھ کر اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔

''کیسی ہو؟'' گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے پوچھا مگر جواب ندارد۔

''مجھے مس کیا تھا؟'' وہ آگے کو جھک کر شریر لہجے میں بولا۔

''اس قدر خفا کیوں ہو؟ وجہ تو بتاؤ۔'' وہ ایک مرتبہ پھر الجھ گیا...... وہ بے پروائی سے کھڑکی سے باہر بھاگتے دوڑتے مناظر کو دیکھ رہی تھی۔

''مسز میں آپ سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔'' ایک بھرپور نظر اس پر ڈال کر اب وہ سامنے ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہا تھا۔

''آپ خاموش بیٹھے رہیں، ورنہ میں گاڑی سے نیچے چھلانگ لگا دوں گی۔'' وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولی۔

''ہاہاہا......'' سکندر کا قہقہہ جاندار تھا۔ ''محترمہ گاڑی ہے مینار پاکستان نہیں جس کے اوپر سے کود کر آپ جان دینے چلی ہیں۔'' اس کی دھمکی سے وہ بالکل بھی متاثر نہیں ہوا، الٹا اس کا مذاق اڑانے لگا۔ ''اور ایسی غلطی کرنا بھی مت کیونکہ ایک آدھ ٹانگ تو آپ کی ضرور ٹوٹے گی اور میں آپ کو اٹھا کر اِدھر اُدھر......''۔

''بس......'' اس نے اسٹیئرنگ پر زور سے ہاتھ مارا۔ سکندر کے ہاتھوں سے اسٹیئرنگ وہیل پل بھر کو نکل گیا۔ گاڑی کسی کشتی کی طرح جھومنے اور ڈولنے لگی مگر سکندر نے فوراً قابو پا لیا۔

''یہ کیا بے وقوفی ہے حیا...... کنٹرول یور سیلف، لوگ متوجہ ہورہے ہیں۔'' باقی کا تمام راستہ خاموشی سے کٹا، سکندر نے دوبارہ کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ بھی خاموش تھی گھر آکر وہ تو اپنے روم میں چلا گیا، یہ تائی ماں کے پاس لاؤنج میں ہی بیٹھ گئی۔

''بیٹا گھر میں سب خیریت تھی، صائمہ اور بچے ٹھیک ہیں؟'' وہ ان سب کی خیریت معلوم کرنے لگیں۔

''جی تائی اماں!'' اس نے مختصر جواب دیا، وہ اس وقت خوب صورت کامدار ساڑی پہنے ہوئے تھی، خوب صورت سلکی بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ہلکے پھلکے میک اپ اور نفیس جیولری میں وہ بے حد حسین دکھائی دے رہی تھی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے سکندر پل بھر کو ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

''حیا مجھے تمہیں کچھ بتانا تھا۔'' انہوں نے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

بالآخر انہیں سینٹرل ٹیبل پر پڑا ہوا لفافہ نظر آگیا۔ جس اٹھا کر انہوں نے حیا کی گود میں رکھ دیا، وہ انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''دراصل سکندر کی خالہ شادی میں نہیں آسکی ہیں، اب انہوں نے آسٹریلیا سے ٹکٹ بھجوائے ہیں، تم دونوں کی دعوت کرنا چاہتی ہیں، میں نے سوچا اسی بہانے تم لوگ گھوم پھر بھی لینا۔'' انہوں نے محبت سے اس کا گال تھپتھپایا جبکہ وہ ہونقوں کی طرح ان کے منہ کو تک رہی تھی۔ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا جواب دے۔

''کیا راز و نیاز ہورہے ہیں ساس بہو میں؟'' وہ سب کچھ سن چکا تھا مگر جان بوجھ کر انجان بن رہا تھا۔ ٹی وی آن کر کے وہ عین حیا کے سامنے صوفے پر نیم دراز ہو چکا تھا۔

''میں اسے سمجھا رہی تھی کہ شوہر کو کیسے قابو کرتے ہیں۔'' وہ اسے چھیڑنے لگیں۔

''ہاہا......'' اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''امی آپ کو کیا پتا میں تو پہلے ہی ان کے قابو میں ہوں۔ ان کے حسن اور معصومیت کے جال میں پھنس گیا ہوں۔'' وہ اتنا آؤٹ اسپوکن تھا حیا کو بالکل اندازہ نہ تھا۔ وہ شرم سے سر جھکا کر رہ گئی۔

''واللہ یہ سادگی۔'' وہ ہولے سے بڑبڑایا، اس کی نظریں اٹھیں، وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے سٹپٹا کر نظریں پھیر لیں، وہ ہنس دیا۔

''سکندر میری حیا سے بات ہوگئی ہے۔ اسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میرا خیال ہے تم لوگ پیکنگ وغیرہ کرلو۔'' ان کے کہنے پر اس نے سعادت مندی سے سر جھکایا اور ایک نگاہ حیا پر ڈالی جس کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا تو دوسرا جا رہا تھا۔

☆☆☆

وہ سکندر سے بات کرنے کو بے چین تھی مگر اسے موقع نہیں مل رہا تھا۔ ڈنر کے بعد وہ پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا اور ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ اسے سکندر کی چالاکی پر بہت غصہ آرہا تھا۔

''السلام علیکم......'' تھک ہار کر وہ کھڑکی میں جا

کھڑی ہوئی۔ اچانک وہ اس کے کان کے قریب بولا۔
جواب میں اس نے خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورا۔

''کہاں تھے آپ اب تک؟'' وہ صوفے پر بیٹھا شوز اتار رہا تھا۔ پل بھر کو اس کے ہاتھ رکے۔ اب وہ حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''خالص بیویوں والا سوال کیا ہے یار......'' اب وہ اٹھ کھڑا ہوا اور شرٹ کے بٹن کھولنے لگا۔ ''ذرا میرا نائٹ ڈریس تو نکال دو۔''

''ملازمہ نہیں ہوں میں آپ کی۔'' وہ غصے سے پھنکاری۔ اُدھر کوئی اثر نہیں تھا۔

''بیوی تو ہو ناں......!'' وہ اس کے مقابل آ کھڑا ہوا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''بیوی بھی نہیں ہوں، میں آپ کی...... کچھ بھی نہیں لگتے آپ میرے۔'' اس کی آنکھوں میں دیکھ کر وہ بے خوفی سے بولی۔

''اچھا۔ تو پھر رات کے اس وقت میرے کمرے میں کیا کر رہی ہو؟'' اس کے طنز میں ڈوبے اس سوال پر اس کی نظریں پل بھر کو جھکی تھیں...... اپنے شانے سے اس کا ہاتھ آہستگی سے ہٹا کر وہ صوفے پر جا بیٹھی۔

''جہنم میں جاؤ......'' وہ زیرِ لب بڑبڑائی مگر اس کے لبوں کی بے آواز جنبش کو وہ خوب سمجھ گیا تھا۔

''اب تو ڈیئر وائف جہاں بھی جاؤں گا آپ کو ساتھ لے جاؤں گا۔'' وہ اس کے ساتھ آ کر بیٹھ گیا۔

''بٹ کیپ اٹ ان یور مائنڈ میں آپ کے ساتھ آسٹریلیا کسی قیمت پر نہیں جاؤں گی۔''

''یہ تو تم ماما سے کہو کیونکہ اس پروگرام سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے، نہ ہی میں کچھ کر سکتا ہوں۔'' اس نے بات ماننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

''میں ان سے نہیں کہہ سکتی...... پلیز آپ انہیں منع کر دیں۔ کسی طرح بھی ایکسکیوز کر لیں مگر میں...... میں نہیں جانا چاہتی۔'' اس کے حلق میں آنسوؤں کا گولہ سا پھنس گیا تھا۔

''او کے! جسٹ ریلیکس...... میں بات کروں گا امی سے۔'' اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی دیکھ کر اس کا

**یہ دل**

پگھلنے لگا ہے یہ دل میرا اب تو
خدارا کوئی اس کو آ کر سنبھالو
عجب بے سکونی کا عالم ہوا ہے
یہ پتھر کے بت ان کو مٹی میں ڈھالو
شکستہ گرے ہیں جو راہوں میں دیکھو
جو ممکن ہو تم ان کو آ کر اٹھا لو
مجھے اپنے عقل و ہنر پہ یقیں ہے
میری ذات کو چاہے جتنا اچھالو

آسیہ شاہین، چوآسیدن شاہ (چکوال)

دل بے چین ہوا اٹھا تھا۔

''اچھا کہا ناں کہ منع کر دوں گا، اب رونا تو بند کرو۔'' وہ نظریں چراتے ہوئے بولا اور پھر چینج کرنے چلا گیا۔ واپس آیا تو وہ کمرے میں موجود نہیں تھی۔ ابھی وہ اس کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ وہ کافی کا بھاپ اڑاتا مگ اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوئی۔

''یہ کافی پی لیں۔'' وہ بستر پر آنکھیں موندے نیم دراز تھا جب اس کی آواز سن کر آنکھیں کھولیں اور خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات کا شکار ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

''یہ کافی!'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکی، سکندر نے مگ پکڑ لیا۔

''ہوں، بٹرنگ۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور کراؤن سے ٹیک لگا لی اور ایک بھرپور نظر اس پر ڈال کر سوچنے لگا۔

''یہیں بیٹھ جاؤ میرے پاس۔'' وہ واپس مڑنے لگی تھی جب سکندر اس کی کلائی کو اپنی مضبوط گرفت میں لیتے ہوئے بولا۔ ناچار اسے بیٹھنا پڑا۔

''تمہیں پتا ہے کہ تم بہت انوسینٹ ہو۔'' وہ جو کلائی میں پڑی چوڑیوں سے کھیل رہی تھی اس کی آواز سن کر سر اوپر اٹھایا اور پھر فوراً زاویۂ نظر بدل کر سامنے کھڑکی کے پار دیکھنے لگی۔

''ساڑی میں تم بہت دلکش لگ رہی تھیں، کبھی،

بھی پہن لیا کرو۔'' وہ پھر گویا ہوا، وہ اب بھی خاموش تھی۔ ''حبا ایک بات پوچھوں؟'' الفاظ کو ترتیب دیتے ہوئے وہ سوالیہ نگاہیں اس پر گاڑے ہوئے تھے۔

''جی......'' وہ بس اتنا ہی بول پائی۔

''تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو ناں...... بالکل ویسے ہی جیسے میں تم سے کرتا ہوں۔'' وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ حبا کا ہاتھ اس کی گرفت میں تھا، وہ اس کی کلائی میں پڑی کانچ کی چوڑیوں سے کھیل رہا تھا۔

''ہاں، میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں، آپ کے بغیر زندگی کا تصور میرے لیے سوہانِ روح ہے، میں آپ کو آپ سے بھی زیادہ چاہتی ہوں۔'' وہ سوچ کر رہ گئی، سکندر اس کے چہرے کے تاثرات کو مسلسل نوٹ کر رہا تھا جو بات وہ زباں سے نہیں کہہ پائی اس کی آنکھوں نے کہہ ڈالی، دفعتاً اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔

''مجھے نیند آرہی ہے۔'' وہ ہاتھ چھڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک دم اس پر بیزاری اور اجنبیت طاری ہوگئی تھی۔

اس کی جانب سے رخ موڑے وہ سکڑی سمٹی لیٹی ہوئی تھی۔ لائٹ آف کر کے وہ بھی لیٹ گیا تھا۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ وہ ابھی تک نہیں سویا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بھی جاگ رہی ہے۔

''آخر پرابلم کیا ہے اس کے ساتھ، کیا چیز ہے جو اسے میرے قریب آنے سے روکتی ہے۔'' سوچ، سوچ کر دماغ شل ہو رہا تھا مگر کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

☆☆☆

سکندر نے امی کو منع کر دیا تھا کہ وہ لوگ آسٹریلیا نہیں جائیں گے۔

''بیٹا آپا خفا ہوں گی۔'' وہ اسے سمجھانے لگیں۔

''امی خالہ پہلے ہم سے تو پوچھ لیتیں۔ حبا کے ایگزامز ہونے والے ہیں، ایسے میں بھلا ہم کیسے جاسکتے ہیں۔'' اس نے بات بنائی۔

''اوہ بیٹا، یہ بات حبا خود مجھ سے کہہ دیتی۔''

''وہ کہہ رہی تھی کہ آپ کے سامنے انکار کرتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔''

''اس میں برا لگنے والی کیا بات ہے۔ بے شک اس کی اسٹڈیز ہر چیز سے زیادہ ضروری ہیں۔'' اتنی آسانی سے بات بن جانے پر سکندر نے سکون کی سانس لی اور حیران تو حبا بھی تھی کہ سکندر نے اس کی بات مان کیسے لی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آج اس کے ساتھ اس کے دوست کی طرف سے دی جانے والی پارٹی میں جارہی تھی۔

''تم ساڑی پہن کر جاؤ گی۔'' اسے حکم صادر کر کے وہ چلتا بنا۔ پہلے تو اسے غصہ آیا مگر پھر یہ سوچ کر کہ کہیں ناراض ہو کر وہ اپنی بات سے مکر ہی نہیں جائے، اس کی مرضی کے مطابق تیار ہوگئی۔

''چلیں؟'' وہ کوٹ کے بٹن بند کرتا ہوا مصروف سے انداز میں اندر آیا مگر اسے دیکھ کر وہیں رک گیا۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی لپ اسٹک لگا رہی تھی۔ بلیک ساڑی جس کا سلور کا مدار بارڈر تھا اس پر خوب جچ رہی تھی۔ لپ اسٹک رکھ کر اس نے برش اٹھالیا اور بالوں میں پھیرنے کے بعد ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ کر بولی۔

''جی چلیں......'' وہ اس کے پاس آکر رکی، اس کے وجود سے دھیمی سی مہک اٹھ رہی تھی۔ سب کچھ اسے پاگل کر دینے کو کافی تھا۔

''آپ واقعی بہت کیوٹ ہیں، سکندر بھائی ٹھیک ہی آپ کی تعریف کرتے تھے۔'' سکندر کے ایک دوست کی بیوی کی بات پر وہ ہولے سے مسکرا دی مگر اندر سے وہ حیران تھی کہ سکندر اسے اتنی اہمیت کب دیتا تھا۔

''پڑھتی ہیں آپ......؟ ایک دفعہ سکندر بھائی بتا رہے تھے۔'' سوال آیا۔

''جی......!'' وہ مختصر جواب دے کر رہ گئی۔

''اچھا کیا پڑھ رہی ہیں؟'' وہ مزید پوچھنے لگی۔

''میں ایم بی اے کر رہی ہوں۔'' وہ اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے بولی۔

''ارے، دیکھنے میں تو آپ بہت چھوٹی لگتی ہیں۔'' وہ بے یقینی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''لگتی نہیں بلکہ یہ ہیں ہی چھوٹی۔'' سکندر بھی اس دوران وہاں آگیا اور گفتگو میں شریک ہوگیا۔
''سکندر بھائی آپ کی وائف واقعی بہت خوب صورت اور اچھی ہیں۔'' وہ اس سے امپریسڈ تھی۔
''تھینکس......!'' وہ بشاشت سے مسکرایا۔
''بھابی اب ہمیں اجازت دیں۔''
''اتنی جلدی......'' محسن بھی وہیں آگیا تھا۔
''ہاں رات بھی زیادہ ہورہی ہے۔ امی انتظار کررہی ہوں گی۔'' ان لوگوں سے رخصت ہوکر اس کا ہاتھ تھام کر وہ گاڑی تک لایا تھا۔
''کیسی تھی پارٹی؟'' گاڑی کو سڑک پر ڈالتے ہوئے وہ پوچھنے لگا۔
''ٹھیک تھی۔''
''مطلب کہ اچھی نہیں تھی......'' احتیاط سے موڑ کاٹتے ہوئے وہ بولا۔
''سنیں، آپ مجھے ماما کی طرف چھوڑ دیں۔'' اس کی یہ فرمائش سکندر کو بالکل پسند نہیں آئی تھی۔
''اس وقت مناسب نہیں ہے انہیں تنگ کرنا پھر کبھی چلی جانا۔'' اس نے سمجھایا۔
''وہ میرے پاپا کا گھر ہے، وہاں کسی بھی وقت جانا میرے لیے نامناسب نہیں ہے۔'' وہ جھٹ بولی۔
''حبا...... میں تم کو صبح لے جاؤں گا پرامس......'' وہ آج اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ سکندر اسے خود سے دور نہیں کرنا چاہتا تھا۔
''صبح نہیں، مجھے ابھی جانا ہے۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔
''ضد مت کرو، کہہ دیا کہ ابھی نہیں جانا۔'' اس کا لہجہ استحقاق سے بھرپور تھا۔
''اگر وہاں نہیں جانا تو میں آپ کے گھر بھی نہیں جاؤں گی۔ مجھے یہیں اتار دیں۔''
''تنگ مت کرو، ورنہ میں امی سے کہہ دوں گا کہ ہم آسٹریلیا جانے کے لیے تیار ہیں۔'' وہ مصنوعی خفگی سے بولا۔

''آپ مجھے بلیک میل کررہے ہیں؟'' وہ صدمے سے دوچار تھی۔
''نہیں، میں تمہیں ڈرا رہا ہوں۔'' وہ صاف گوئی سے بولا۔
''آپ بہت برے ہیں۔'' وہ دلگرفتہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ سکندر اسے اذیت پہنچانے کے لیے ایسا کررہا ہے۔
''آپ بہت اچھی ہیں۔'' وہ برجستہ بولا تھا۔ وہ غصے کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

☆☆☆

''کیا ہورہا ہے؟'' وہ آفس سے آیا تھا، حبا کمرے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔
''جو ہورہا ہے وہ آپ کو نظر.... آرہا ہے۔'' وہ تیکھے پن سے بولی۔
''ہاہاہا...... آتے ہی گولہ باری شروع......'' وہ چینج کرکے آیا تھا اور اب ڈریسنگ کے سامنے کھڑا بال بنارہا تھا۔ پرفیوم اسپرے کرنے کے بعد وہ اس کے پاس آیا تھا۔
''اچھی بیویاں مسکرا کر شوہر کا استقبال کرتی ہیں۔ پھر انہیں چائے، پانی پوچھتی ہیں۔'' وہ مدبرانہ انداز سے بولا۔
'' جو اچھی ہوتی ہوں گی اور بیویاں ہوتی ہوں گی، نہ میں اچھی ہوں اور نہ بیوی......''
''اچھا..تو پھر کس حیثیت سے یہاں رہ رہی ہو؟'' وہ ابرو چڑھا کر بولا۔
''میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ بات ختم کرتے ہوئے بولی۔
''گڈ، شوہر سے بحث کرنی بھی نہیں چاہیے، چلو آج ڈنر باہر کرتے ہیں۔'' اس کی کتابیں سمیٹ کر وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھڑا کرتے ہوئے بولا۔
''مجھے آپ کے ساتھ کہیں نہیں جانا۔'' وہ دو ٹوک انداز میں بولی۔
''کیوں بھئی......؟'' اس کی نظر.. کتابوں کے

نیچے جھانکتی نیلی جلد والی ڈائری پر پڑی تھی۔

''پلیز......! مجھے تنگ مت کریں، میرے سر میں شدید درد ہے۔'' وہ رو دینے کو تھی۔

''اوہ آئی ایم سوری......درد کیوں ہے؟'' وہ اسے شانوں سے تھام کر بیڈ تک لایا اسے بٹھا کر خود باہر نکل گیا۔

''حبا!'' وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور لب ہولے، ہولے کپکپا رہے تھے۔ اس کے پکارنے پر جلدی سے سیدھی ہوگئی اور شانوں پر دوپٹا درست کرنے لگی۔

''آر یو اوکے؟'' وہ بے حد پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

''لو یہ چائے پیو اور ٹیبلٹ کھا کر سو جاؤ۔ سر درد ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس نے کپ حبا کو پکڑایا۔ اس نے پہلے پانی کے ساتھ گولی کھائی اور پھر چائے کے سپ لینے لگی۔ وہ اس کے بالکل پاس بیٹھا تھا۔

''اب تم لیٹ جاؤ اور سونے کی کوشش کرو۔'' چائے پی کر وہ خاموشی سے لیٹ گئی۔ سکندر نے اس کے اوپر کمبل درست کیا۔

''لاؤ تمہارا سر دبا دوں۔'' وہ اس کے سرہانے جا بیٹھا اور سر دبانے لگا۔

''سکندر نہیں......'' وہ ایک دم پیچھے ہٹی، اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ سراسیمہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''میں اب ٹھیک ہوں۔'' وہ کمزور لہجے میں بولی۔

''خاک ٹھیک ہو، بالکل بھی اپنا خیال نہیں رکھتی ہو۔'' وہ مصنوعی خفگی سے بولا۔ اس کا لمس بھی اس کے لہجے کی طرح نرم تھا۔ حبا کی آنکھ لگ گئی۔ رات کا پچھلا پہر تھا جب اس کی آنکھ کھلی۔

''اوہ مائی گاڈ......'' وہ حیران و پریشان تھی، سکندر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا، بایاں ہاتھ اس کے ماتھے پر تھا۔ نہ جانے کب اس کا سر دباتے، دباتے وہ سو گیا تھا۔ اسے شرمندگی نے آن گھیرا۔

''سکندر......!'' اس نے اپنا ہاتھ اپنے ماتھے پر دھرے اس کے ہاتھ پر رکھ کر ہولے سے آواز دی۔

''سکندر اٹھیں......'' وہ ایک بار پھر بولی۔

''حبا......'' وہ جلدی سے سیدھا ہوا۔ ''تم ٹھیک ہو ناں......؟''

''جی......!'' سکندر کا ہاتھ اب بھی اس کے ماتھے پر تھا۔ ''آپ ایزی ہو کر لیٹ جائیں۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

''اوکے ڈیئر......!'' وہ کہہ کر... ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔ آفس سے آتے ہی وہ حبا کی وجہ سے پریشان ہو گیا تھا، اسے چینج کرنے کا بھی ہوش نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لائٹ آف کر کے بیڈ پر ہی سو گیا تھا۔ حبا نے رات جاگ کر گزاری تھی۔ اس کا دل عجیب طرح سے اداس تھا۔

☆☆☆

آج کل آسٹریلیا سے سکندر کی کزن آئی ہوئی تھی۔ آج کل سکندر کا زیادہ وقت اسی کے ساتھ گزر رہا تھا۔ آج تو دونوں نے حد کر دی تھی، شام کو سکندر کی آفس سے واپسی پر آؤٹنگ کے لیے نکلے تھے اور اب تک واپس نہیں آئے تھے۔

''کہیں کوئی حادثہ تو نہیں ہو گیا۔'' یہ بات سوچتے ہوئے بھی اس کا دل کانپ جاتا۔

''یا اللہ! سکندر کو اپنے حفظ و امان میں رکھنا۔'' جیسے، جیسے وقت گزر رہا تھا اس کے ہاتھ پیر بے جان ہو رہے تھے۔ تائی ماں اور تایا ابا سو رہے تھے۔ اس کی ٹینشن سے بری حالت تھی۔ پونے ایک بجے وہ لوگ واپس آئے تھے۔ تھکا ہارا سکندر آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو اسے جاگتا دیکھ کر ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ اسی کو گھور رہی تھی۔

''یاد آ گیا آپ کو کہ یہ آپ کا گھر ہے؟'' اس نے طنز کا تیر چھوڑا۔

''آئی ایم سوری...... میں کچھ لیٹ ہو گیا۔'' وہ شرمندگی سے وضاحت کرنے لگا۔

''کچھ لیٹ......؟'' اس نے ایک نظر وال کلاک

پڑ ڈالی۔ ''ٹائم دیکھا ہے آپ نے؟''
''کہا ناں کہ سمیعہ کو شاپنگ کرنی تھی اور......''
''کسے بے وقوف بنا رہے ہیں آپ؟ شاپنگ میں کیا اتنی دیر لگتی ہے؟'' وہ غصے سے بولی۔
''کہنا کیا چاہتی ہو تم؟'' وہ اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔
''اب اگر وہ لڑکی آپ کے ساتھ نظر آئی تو میں اسے شوٹ کر دوں گی۔'' وہ پھٹ پڑی تھی جبکہ سکندر حیران تھا۔
''محبت میں تو لوگ شیئر نہیں کرتے، نفرت میں یہ انوکھی مثال قائم کر رہی ہو تم۔''
''میں آپ کو وارن کر رہی ہوں کہ اگر......'' اسی وقت دروازہ کھلا اس کی بات بیچ میں ہی رہ گئی۔ سامنے سمیعہ کھڑی تھی۔
''کیا آپ کو نہیں معلوم کہ کسی کے روم میں آنے سے پہلے ناک کیا جاتا ہے؟'' وہ ناگواری سے بولی۔
''ایکچوئیلی سکندر نے مجھے شاپنگ کروائی تھی تو یہ کچھ چیزیں میں نے تمہارے لیے بھی خریدی تھیں، وہی دینے آئی ہوں۔'' اس کی بات کو محسوس کیے بغیر وہ بولی۔
''بہت شکریہ آپ کا... مجھے کچھ نہیں چاہیے۔'' وہ روکھائی سے بولی۔
سکندر نے اسے تنبیہی نظروں سے دیکھا مگر وہ نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔
''آپ اب جائیں یہاں سے۔'' وہ تند و تیز لہجے میں بولی۔
''سکندر تم میری وجہ سے اسے کچھ مت کہنا پلیز......!'' وہ واپس پلٹتے ہوئے بولی، سکندر خاموش کھڑا تھا۔
''کسی خوش فہمی میں مت رہیے گا، سکندر نے آج تک مجھے کبھی نہیں ڈانٹا......'' اس لڑکی کی ہر حرکت اور بات اسے سخت بری محسوس ہو رہی تھی۔
''حبا......'' سمیعہ کے جاتے ہی سکندر اس کے پاس آیا تھا اور اس کو شانوں سے تھام کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔
''آپ تو مجھ سے بات بھی مت کریں۔'' اس کی آنکھیں پانیوں سے بھرنے لگی تھیں۔ اس کے ہاتھ جھٹک کر وہ صوفے پر جا بیٹھی تھی۔
''حبا وہ ہماری مہمان ہے۔'' وہ فوراً اس کے پیچھے آ گیا تھا۔
''وہ مہمان ہے، آپ تو نہیں...... آدھی رات تک اسے لے کر جانے کہاں، کہاں کی سیریں کر کے آ رہے ہیں، ایک فون ہی کر دیتے کم از کم میں اتنی پریشان تو نہ ہوتی۔'' وہ آنسو پیتے ہوئے بولی۔
''سیل کی بیٹری لو تھی، آف ہو گیا تھا۔'' وہ شرمندہ تھا۔
''یوں کہیں ناں کہ سمیعہ کی موجودگی میں آپ کسی اور سے بات بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔'' وہ کسی طور اس کی وضاحتیں ماننے کو تیار نہیں تھی۔
''دفع کرو سمیعہ کو، صرف اپنی اور میری بات کرو۔'' وہ زچ ہونے لگا۔
''آپ مجھ سے بات نہ کریں۔'' وہ رخ موڑ کر بیٹھ گئی۔
''اچھا! تو پھر کس سے کروں؟'' اس نے فوراً سوال کیا۔
''سمیعہ سے۔'' وہ جل کر بولی۔
''ہاہا...... تم سمیعہ سے جیلس ہو؟'' وہ لطف لیتے ہوئے بولا۔
جواب دینے کے بجائے وہ تیزی سے وہاں سے اٹھی تھی اور کھٹاک سے لائٹ آف کر کے لیٹ گئی۔ سکندر اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ، پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

☆☆☆

''سنیے۔'' وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ آئینے کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا جب اچانک پیچھے اس کی شبیہ ابھری۔
''سنائیں......؟'' وہ ایڑیوں پر گھوم کر اس کے

سامنے کھڑا ہو گیا۔
''مجھے آج ماما کی طرف ڈراپ کر دیں، بہت دن ہوئے میں نہیں گئی وہاں۔'' کسی قسم کی زیبائش و آرائش سے پاک اس کا سادہ اور معصوم چہرہ سکندر کو بہت بھلا لگا تھا۔
''ابھی تو آفس سے لیٹ ہو رہا ہوں، واپس آ کر میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔'' وہ کلون اسپرے کرنے لگا۔
''آپ جلدی نہیں آئیں گے، مجھے معلوم ہے۔'' بے یقینی اس کے لب و لہجے سے عیاں تھی۔
''آئی پرامس میں آ جاؤں گا۔'' اس نے اسپرے کا رخ اس کی سمت کر کے اچھا خاصا اسپرے کر دیا تھا۔ برا سا منہ بناتے ہوئے وہ وہاں سے ہٹ گئی تھی۔
سکندر کے جانے کے بعد اس نے پیکنگ کی اور تائی اماں کے پاس آ گئی۔ کافی دیر ان سے باتیں کرتی رہی۔
''تائی اماں میں کچھ دن کے لیے ماما کی طرف جا رہی ہوں۔''
''ہاں، بیٹا ضرور جاؤ، وہ سب تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔'' تائی اماں ہمیشہ اسے سکندر کی طرح اپنی اولاد ہی سمجھتی تھیں۔ ''صائمہ شکوہ کر رہی تھیں کہ حبا بہت کم آتی ہے ملنے۔'' وہ تیار ہو کر سب کے ساتھ چائے پینے نیچے آ گئی۔ شام کا وقت تھا۔ سمیعہ بھی ان لوگوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔
''کہیں جا رہی ہو تم؟'' وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔
''جی......!'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
''اوہ! اچھا۔'' وہ ہونٹ سکوڑ کر طنز سے مسکرائی۔ کم از کم حبا کو تو ایسا ہی محسوس ہوا۔ مگر وجہ سمجھنے سے وہ قاصر تھی۔ سمیعہ کی موجودگی اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی وہ اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ سکندر آنے والا تھا، وہ بار، بار گھڑی دیکھنے لگی۔

☆☆☆

''ہیلو...... س...... س...... کندر۔'' بہ مشکل اس کے لبوں سے ادا ہوا۔
''ہیلو...... ! سمیعہ کیا ہوا؟ آر یو اوکے......؟'' وہ گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بہ مشکل بولا۔
''نن...... نہیں، آئی ایم ناٹ فیلنگ ویل۔'' وہ رونے لگی۔
''اوکے ...... جسٹ ریلیکس...... میں تمہارے پاس آ رہا ہوں، میں گھر آ رہا ہوں۔'' وہ تیزی سے بولا۔
''نن...... نہیں، میں گھر پر نہیں ہوں۔'' وہ جھٹ سے بولی۔
''کیا مطلب...... تم کہاں ہو؟'' وہ مزید پریشان ہوا تھا۔
''میں تمہارے آفس کے باہر ہوں۔''
''کیا...... اچھا ٹھہرو، میں آ رہا ہوں۔ اوکے ویٹ...... میں ابھی آتا ہوں۔'' اس کی مزید بات سنے بغیر وہ کرسی کی پشت سے کوٹ اتار کر جلدی سے باہر کی جانب بڑھا تھا۔ اسے یوں عجلت میں باہر نکلتا دیکھ کر ورکرز نے حیران نظروں سے دیکھا تھا۔
''سمیعہ کیا ہوا؟'' وہ اس کے ساتھ اب گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا۔
''سکندر......!'' اسے دیکھتے ہی وہ دھواں دھار رونے لگی تھی۔ ''سکندر مجھے پتا نہیں کیا ہو رہا ہے۔ میرا سر درد سے پھٹ رہا ہے۔ پلیز مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔'' وہ اپنے سر کو ہولے، ہولے سامنے ڈیش بورڈ پر مار رہی تھی۔
''ڈونٹ بی سلی سمیعہ......! کنٹرول یور سیلف...... میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتا ہوں۔'' اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اس کی پیشانی پر تفکر کی لکیروں کا گہرا جال بچھا ہوا تھا۔ جبکہ سمیعہ کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک اور لبوں پر زہر خند مسکراہٹ دوڑ رہی تھی۔

☆☆☆

شام نے اپنے پر سمیٹ لیے تھے۔ سیاہ رات بال بکھرائے دھرتی کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ غصے

سے حبا کا برا حال تھا۔ وہ بیڈ پر اوندھی لیٹی زارو قطار رو رہی تھی۔ ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح اس کے ذہن میں چمکا تھا۔ وہ فوراً اٹھ بیٹھی۔

''سفیان بھائی اس وقت آپ کہاں ہیں؟'' اس کا فون گیا تو سفیان کلب میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

''ایکسکیوز می ......!'' وہ وہاں سے اٹھ کر کچھ فاصلے پر جا کھڑا ہوا۔

''میں گھر سے باہر ہوں گڑیا...... خیریت......؟'' اس نے ایک محتاط نظر دوستوں کی سمت ڈالی۔

''آپ سب مجھے بہت یاد آرہے ہیں۔'' اس کے منہ سے سسکاری نکل گئی۔

''حبا میری جان کیا ہوا؟'' وہ بے چین ہوا تھا۔

''سکندر بھائی کہاں ہیں؟''

''وہ گھر پر نہیں ہیں، آپ پلیز مجھے آکر لے جائیں پلیز......!'' وہ منت کرنے لگی۔

''جسٹ ریلیکس! میں ابھی آرہا ہوں۔'' اسے تسلی دے کر فون بند کر دیا۔

''میں اتنی گئی گزری نہیں ہوں سکندر...... کبھی میرے پیرنٹس اور بھائیوں سے میری امپورٹنس پوچھیں تو آپ کو پتا چلے کہ میں کیا ہوں۔'' وہ روئے جا رہی تھی۔

''حبا۔'' سفیان بہت ریش ڈرائیونگ کر کے پہنچا تھا اس کے پاس۔ ''سب ٹھیک تو ہے ناں......'' وہ کافی فکر مند دکھائی دے رہا تھا۔

''جی......!'' وہ اس کے ساتھ نیچے آئی تھی۔

''تائی اماں میں سفیان بھائی کے ساتھ جا رہی ہوں، سکندر بتا رہے تھے کہ انہیں کچھ دیر ہو جائے گی۔'' جانے سے پہلے وہ ان کو بتانے آئی تھی۔

''یہ لڑکا بھی حد کرتا ہے، روز بروز بے ترتیب ہوتا جا رہا ہے، حبا بیٹا تم کھینچتی کیوں نہیں اسے۔'' انہیں سکندر کا دیر تک گھر سے غائب رہنا بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔

''خیر تم جاؤ۔'' وہ خاموشی سے وہاں سے آگئی۔

سفیان بہت خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ تمام راستہ ایسے ہی کٹا۔

☆☆☆

''ہرا...... حبا آپی آئی ہیں۔'' اسے دیکھتے ہی دانی نے پُرجوش نعرہ لگایا۔ وہ لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ ریموٹ اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ IPL دیکھ رہا تھا۔

''ارے حبا......!'' ماما اسے دیکھ کر خوشگوار حیرت میں مبتلا ہوئیں۔ ''یوں اچانک آگئیں۔ بتایا ہوتا تو میں کھانے پر خاص اہتمام کرتی۔'' اسے گلے لگا کر رخسار چوم کر محبت سے بولیں۔ اس کا دل دکھی ہونے لگا ماما سے مل کر۔

''میں نے سوچا آپ کو سرپرائز دیا جائے۔'' وہ بشاشت سے مسکرائی۔

''سکندر کدھر ہے، اس کے ساتھ نہیں آئیں تم؟'' اس کے پیچھے نظر دوڑائی۔

''ماما، یہ میرے ساتھ آئی ہے۔'' سفیان اس کا سامان اٹھا کر اندر داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ ماما کے سوال پر حبا کے چہرے پر ایک تاریک سایہ لہرا گیا تھا۔

''ایکچوئیلی میں اُدھر سے گزر رہا تھا اس سے ملنے چلا گیا۔ یہ ہم سب کے لیے اداس تھی اس لیے ساتھ لے آیا۔'' اس نے مزید بات بنائی۔

''چلو یہ تو بہت اچھا کیا، کیا سکندر کو بتایا ہے؟'' وہ پھر پوچھنے لگیں۔

''جی ماما، میں نے فون پر انہیں بتا دیا تھا۔'' اب کی بار حبا بولی۔

''گڈ...... اب ذرا آرام سے کچھ دن یہاں میرے پاس رہنا۔'' انہوں نے ایک مرتبہ پھر اس کی پیشانی چومی تھی۔ ''تم فریش ہو جاؤ۔ تمہارے پاپا بھی بس آتے ہوں گے۔ میں ذرا کچن دیکھ لوں، جلدی سے تمہاری کوئی فیورٹ ڈش بنوالوں۔'' وہ بہت خوش تھیں۔

اس کی ضرورت نہیں ہے ماما...... جو پہلے سے بنا ہے میں بھی وہی کھا لوں گی۔'' حالانکہ دل تو کچھ بھی

# پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

| | | | |
|---|---|---|---|
| عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عُشنا کوثر سردار | اشفاق احمد |
| نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی |
| فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایتُ اللّٰہ التمش |
| قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابر راجہ | ہاشم ندیم |
| نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | مُمتاز مُفتی |
| نگہت عبدُاللّٰہ | سباس گُل | عنیزہ سید | مُستنصر حُسین |
| رضیہ بٹ | رُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیمُ الحق |
| رفعت سراج | اُمِ مریم | نایاب جیلانی | ایماے راحت |

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دستر خوان، مصالحہ میگزین

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

''آپی! جلدی فریش ہو کر آئیں میچ دیکھتے ہیں مل کر۔'' دانی کے کہنے پر وہ مسکرا اٹھی۔ محبت سے اس کے بال بگاڑ کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔

اس کا روم آج بھی ویسے ہی صاف ستھرا تھا۔ جیسے شادی سے پہلے رہتا تھا۔ ہر چیز قرینے اور سلیقے سے اپنی جگہ پر موجود تھی۔ بہت سی پرانی یادوں کی چنگاریاں وقت کی راکھ تلے دبی نظر آئیں۔ اس کا دل اداس ہونے لگا۔ سر جھٹک کر وہ وارڈ روب کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

تھکے، تھکے قدم اٹھاتا ہوا وہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔ لائٹ آف تھی اور اندر کافی سناٹا تھا۔

''حبا!'' اس نے سوئچ بورڈ پر ہاتھ مارا، کمرا جگمگا اٹھا۔ ''حبا......'' وہ کہیں نظر نہیں آئی تو گھبرا کر اسے آوازیں دینے لگا۔

''آپ جلدی نہیں آئیں گے، مجھے معلوم ہے۔'' اس کے ذہن میں جھماکا ہوا تھا۔

''او مائی گاڈ...... کتنا برا کیا میں نے اس کے ساتھ۔'' وہ سارے گھر میں اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔

''گویا وہ اکیلی ہی چلی گئی مگر کیسے؟'' وہ مایوس ہو کر واپس کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔

''میں وعدہ کرنے کے باوجود ٹائم پر گھر نہیں آیا...... یقیناً وہ بہت روئی ہو گی۔'' وہ بے چینی سے کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا۔

''سکندر......!'' سمیعہ نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا تھا۔ وہ اندر ہی اندر کھول کر رہ گیا۔

''میں اندر آ جاؤں؟'' وہ اجازت طلب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کوئی کام ہے؟'' بیزاریت سے بولا۔

''کھانا نہیں کھاؤ گے؟'' اب وہ اندر داخل ہو چکی تھی۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''کافی تو چلے گی ناں......؟'' وہ بخشنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھی مگر سکندر کا موڈ بھی آف تھا۔

''سمیعہ! آئی ڈونٹ نیڈ اینی تھنگ...... مجھے صرف ریسٹ کرنا ہے۔'' اس کی طرف دیکھے بغیر وہ ڈریسنگ روم میں گھس گیا۔

''کب تک میری محبت سے نظریں چراؤ گے سکندر، ایک نہ ایک دن تمہیں میری طرف آنا ہی ہو گا۔'' ڈریسنگ روم کے بند دروازے کو مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

سکندر باہر آیا، اسے وہاں نہ پا کر سکون کی سانس لی۔ موبائل نکال کر وہ حبا کا نمبر ملانے لگا۔

☆☆☆

''آج تو بھئی عید ہو گئی، ہماری بیٹی ہمارے سامنے بیٹھی ہے۔'' پاپا اسے دیکھ کر بے حد خوش تھے۔ یہی حال ماما، سفیان اور دانیال کا بھی تھا۔

''پاپا آپ کو پتا ہے کہ آپی اب کافی دن اِدھر رہیں گی؟'' یہ دانی تھا۔

''نہیں بھئی، مجھے تو نہیں پتا تھا۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''آپی اب میرے ساتھ مل کر کرکٹ میچ بھی دیکھیں گی ناں؟'' دانی پروگرام ترتیب دے رہا تھا۔ وہ مسکرا دی۔

''ضرور...... کیوں نہیں۔'' کھانے کے بعد اس نے سب کو کافی بنا کر پلائی اور لاؤنج میں بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف ہو گئی۔ اس رات بہت دیر تک محفل جمی رہی، وہ اٹھ کر اپنے روم میں آئی، سیل چیک کیا تو سکندر کی بے شمار مسڈ کالز تھیں۔ کئی میسجز بھی تھے۔

''اونہہ...... دھوکے باز شخص......'' اس نے سیل فون ایک طرف ڈال دیا۔ اسی وقت اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

''یس......''

''تم سو تو نہیں رہی تھیں۔ میں نے ڈسٹرب تو نہیں کیا؟'' یہ سفیان بھائی تھے۔

"نو، نو...... اٹس او کے! آپ آئیں نہ، میں تو ابھی جاگ ہی رہی تھی۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سفیان اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

"حبا......" کچھ دیر بعد سفیان نے مخاطب کیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا، بولی کچھ نہیں۔ "کیا تم مجھ پر اعتبار کرتی ہو؟" اس کے سوال پر وہ جان گئی تھی کہ وہ کیا بات کرنے جا رہا ہے۔

"آف کورس بھائی۔" وہ اتنا ہی کہہ پائی۔

"کیا تمہارا سکندر بھائی سے کوئی جھگڑا ہوا ہے؟" وہ لفظوں کو تولتے ہوئے بولا۔

"نہیں......" اس کا سر جھک گیا تھا، آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔

"حبا......! اگر یا کوئی بات ہے تو مجھ سے شیئر کرو، چھپاؤ مت، میں تمہارا بھائی ہی نہیں دوست بھی ہوں۔" وہ اپنائیت سے بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے بھائی اور نہ ہی میرا ان سے کوئی جھگڑا ہوا ہے۔" آنسوؤں کو پیچھے دھکیلتے ہوئے سر اٹھا کر وہ اعتماد کے ساتھ بولی تھی مگر سفیان نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں اس کے لب و لہجے اور الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔

"او کے! اگر ایسی کوئی بات خدانخواستہ کبھی ہو تو مجھے ضرور بتانا۔ تم اکیلی نہیں ہو، ہم سب تمہارے ساتھ ہیں اور تم ہمارے لیے بہت اہم ہو۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر باہر نکل گیا۔

"آئی ہیٹ یو سکندر...... تمہاری دھوکے بازی کی وجہ سے میرا پیارا بھائی اتنا اپ سیٹ ہو گیا ہے، میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔" سکندر کی کال کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا تھا۔ ساری رات نہ وہ خود سویا تھا، نہ اسے سونے دیا۔

☆☆☆

"حبا......" نیند میں اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اسے آوازیں دے رہا ہو، ایک ہاتھ اس کی پیشانی پر آ کر ٹھہر گیا تھا۔

"سکندر!" وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی تھی، وہ عین اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ رتجگے کی وجہ سے آنکھیں سرخ تھیں اور ان میں گلابی ڈورے پڑے تھے۔

"چلو...... میں تمہیں لینے آیا ہوں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے لگا۔

"مجھے آپ کے ساتھ کہیں نہیں جانا......" وہ درشتی سے بولی۔

"آئی نو، تم مجھ سے بہت خفا ہو اور تمہیں ہونا بھی چاہیے۔ مگر میں گھر جا کر تمہیں تمام بات بتا دوں گا۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ "کل شام اچانک سمیعہ......"

"بھاڑ میں جائے سمیعہ......" اس نے درشتی سے اس کی بات کاٹی تھی۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے اور نہ کچھ سننا ہے، آپ پلیز یہاں سے جائیں۔" اس کے لہجے میں شدید اہانت اور توہین تھی۔

"میں تمہیں لیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

"او کے...... پھر میں یہاں سے چلی جاتی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی، سکندر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا وہ دھم سے بیڈ پر گری۔

"بی ہیو یور سیلف سکندر صاحب......! یہ آپ کا بیڈ روم نہیں، میرے پاپا کا گھر ہے، آپ کی کوئی زیادتی میں ہرگز برداشت نہیں کروں گی۔" اس نے انگلی اٹھا کر جیسے خبردار کیا۔

"اگر تم میری بات نہیں سنو گی تو پرابلم کیسے حل ہو گی؟" وہ پریشان ہو رہا تھا۔

"میں کسی پرابلم میں نہیں ہوں۔ البتہ آپ کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے تو اپنے گھر جا کر حل کریں، مجھے تنگ مت کریں۔" روکھائی سے بولی۔

"میں مانتا ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے مگر میں تم سے سوری بول رہا ہوں ناں، تم صرف ایک بار مجھے معاف کر دو، آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔" اسے حبا سے اتنے

شدید ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔

''آپ کو سوری کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اب بھی آپ کے گھر نہیں جانا ہے۔'' وہ ہنوز سنجیدہ تھی۔

''ابھی اگر تم میرے ساتھ نہ گئیں تو I swear میں کبھی دوبارہ تمہیں لینے نہیں آؤں گا۔'' اپنی طرف سے اس نے بہت بڑی بات کی تھی مگر وہ استہزائیہ انداز میں ہنس دی۔

''یہ تو آپ کا بہت احسان ہوگا مجھ پر۔'' اس کی بات پر وہ بے یقینی سے اسے دیکھے گیا۔

''اوکے مسز سکندر! میری محبت کو میری کمزوری سمجھ کر مجھے جھٹک رہی ہو...... اب نہیں آؤں گا تمہارے سامنے لیکن یاد رکھنا تم بھی ایسے ہی میرے لیے تڑپو گی جیسے میں تمہارے لیے......'' ایک آخری نظر اس پر ڈال کر وہ باہر نکل گیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تک ہلنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

اس کے ایگزامز کا شیڈول جاری ہو گیا تھا، وہ پڑھائی میں مصروف ہو گئی۔ چاہتے ہوئے بھی وہ سکندر کے خیال سے دامن نہ چھڑا سکی۔ سکندر نے دوبارہ اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ لاشعوری طور پر وہ اس کی منتظر رہنے لگی تھی، کبھی کبھی لگتا کہ سارا قصور اس کا اپنا ہے سکندر تو اول روز سے اس کے ساتھ فیئر تھا مگر دوسرے ہی لمحے وہ بدظن ہو جاتی۔

''حبا بہت کمزور ہو گئی ہو، آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں۔ اپنا بالکل بھی خیال نہیں رکھتی ہو۔'' ماما نے اسے ٹوکا تھا۔ وہ اسے دونوں بیٹوں سے زیادہ چاہتی تھیں۔

''وہ ماما ایگزامز کی بہت ٹینشن ہے مجھے۔'' اس نے فوراً بات بنائی۔

''یہ کیسے ایگزامز ہیں کہ صحت ہی تباہ کر لو، سکندر بھی ناراض ہوگا مجھ سے کہ میری بیوی کا بالکل خیال نہیں رکھا آپ نے۔'' اس دشمنِ جاں کے ذکر پر دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی، میٹھا، میٹھا درد ہونے لگا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں ماما، آپ کو وہم ہو گیا ہے۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔

''بالکل وہم نہیں ہوا...... اگر ایسے ہی کرو گی تو سکندر سے کہوں گی تمہیں آ کر لے جائے، وہ تو فون کر کر کے مجھے بار، بار یہی کہتا ہے تمہارا خیال رکھوں۔'' ان کی بات پر اس نے چونک کر انہیں دیکھا تھا۔

''حبا تم اداس ہو تو فون کر کے سکندر کو بلوا لو...... یہ کیا فضول سی بات تم نے اسے کہہ دی کہ ایگزامز کے دنوں میں یہاں نہ آئے۔'' وہ محبت سے بولیں۔

''نہیں ماما، میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس نے سر جھکایا تو اس حرکت پر ماما مسکرا کر رہ گئیں۔

☆☆☆

جب سے حبا گئی تھی اس کا گھر میں آنے کو دل ہی نہیں کرتا تھا۔ وہ آفس سے نکل کر بے مقصد ادھر اُدھر گھومتا رہتا، سمیعہ اس سے مایوس ہو کر واپس آسٹریلیا چلی گئی تھی۔ آج اسے حبا بہت زیادہ یاد آ رہی تھی۔ وہ آفس سے نکل کر بہت دیر ادھر اُدھر گھومتا رہا، آخر کار گھر واپس آ گیا۔ حبا کے بغیر گھر اسے کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ آج تو دل بری طرح اداس تھا۔ بادلِ ناخواستہ وہ اپنے روم میں آیا تھا۔ دور سے ہی کوٹ کو صوفے پر اچھال کر وہ بیڈ پر گر گیا تھا۔ امی، ابو عمرے کے لیے گئے ہوئے تھے۔

''حبا! پلیز واپس آ جاؤ۔'' وہ اسے آوازیں دے رہا تھا۔ ایک دم وہ اٹھا اور دیوار گیر الماری میں سے شادی کی تصویریں ڈھونڈنے لگا۔ بہت دیر وہ انہیں دیکھتا رہا۔

البم واپس رکھتے ہوئے اس کی نظر حبا کی اس ڈائری پر پڑی جو اس نے اکثر اس کے پاس دیکھی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ڈائری اٹھا لی۔ وہ واپس بیڈ تک آیا تھا۔ بیٹھ کر اس نے ڈائری کھول لی تھی۔

''کیا مجھے اسے پڑھنا چاہیے؟'' اس کے اندر سے آواز ابھری تھی۔ ''ہاں شاید اسی طرح اس مسئلے کا کوئی سرا ہاتھ آ جائے۔'' وہ سر جھٹک کر صفحے پلٹنے لگا۔

زیادہ تر شعر ہی لکھے ہوئے تھے۔ ہر شعر کے نیچے تاریخ بھی درج تھی۔ جس سے پتا چل رہا تھا کہ ڈائری ان کی شادی سے پہلے کی ہے مگر بعد میں بھی استعمال ہوتی رہی ہے۔ صفحے پلٹتے ہوئے اچانک ایک تصویر اس کی گود میں آگری تھی۔ اس نے احتیاط سے اسے اٹھالیا تھا۔ تصویر کی پشت اس کے سامنے تھی جس پر ایک شعر لکھا تھا۔ وہ فوٹو گراف پلٹے بغیر شعر پڑھنے لگا۔

"اتنا کچھ تو ہوتا ہے
تم بھی میرے ہو جاتے"

انتہائی معنی خیز شعر تھا۔ "تو کیا حیا کسی اور کو......"

"نہیں، نہیں امپاسبل......" وہ خود کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ کپکپاتے ہاتھوں اور بے ترتیب ہوتی دھڑکنوں کے ساتھ اس نے تصویر پلٹ دی تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ وہ بے یقینی سے تصویر دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

گھر کے تمام افراد کسی پارٹی میں گئے ہوئے تھے۔ وہ آج آخری پیپر دے کر آئی تھی۔ اسے بھی ساتھ چلنے کو کہا گیا مگر وہ ٹال گئی۔

"ماما آج سکندر مجھے لینے آرہے ہیں۔" کہنے کو تو کہہ دیا مگر اب سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔

شام کا وقت تھا، ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی، آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا سرسراتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ پورے گھر پر خاموشی کا راج تھا۔ کمرے میں ملگجا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس کا دل بری طرح سے اداس تھا۔ اندر کے بڑھتے شور سے گھبرا کر وہ ٹیرس پر نکل آئی۔ بادل زور سے گرجے اور تیز بارش شروع ہوگئی۔

"سکندر نے بھی مجھے بھلا دیا۔ ماما، پاپا میری پروا کیے بغیر چلے گئے۔ میں کس قدر اکیلی ہوگئی ہوں۔" وہ سخت قنوطی ہو رہی تھی۔ آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر باہر رخساروں پر پھسل رہے تھے۔ تیز بارش کی بوچھاڑ سے وہ گیلی ہو رہی تھی، اسے اس بات کی مطلق پروا نہ تھی۔

## سلام

یا رحمت اللعالمین آپؐ کو میرا سلام
آپؐ کے در پر کھڑی ہوں آپؐ کو میرا سلام
ہے کرم یہ آپؐ کا مجھ کو بلایا آپؐ نے
پا پیادہ اب کھڑی ہوں آپؐ کو میرا سلام
نعت پڑھنے آئی ہوں حدِ ادب معلوم ہے
چپکے، چپکے پڑھ رہی ہوں آپؐ کو میرا سلام
دید کی ہے آرزو دل میں ہے آپؐ ہی کا نور
صبح ہو یا شام ہو بس آپؐ کو میرا سلام
آپؐ کی رحمت بہت ہے آپؐ کی حرمت بہت
خوش نصیبی میری پہنچا آپؐ کو میرا سلام

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی
مرسلہ: انجم گلزار، کراچی

اس کے پیچھے کچھ آہٹ ہوئی مگر وہ پتھر کے بت کے مانند ساکت کھڑی تھی۔

"بارش میں بھیگ رہی ہو حیا! اندر آجاؤ۔" کسی نے اسے مضبوط حصار میں لے کر کان میں سرگوشی کی تھی۔

"سکندر......!" وہ برستی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی اسی کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں بے حد قریب کھڑے تھے۔ حیا کو اس قربت کا احساس نہ تھا مگر سکندر پر ایک نشے کی سی کیفیت طاری تھی۔

"تم رو رہی تھیں؟" سکندر نے اس کے رخسار پر پھسلتے آنسو کو انگلی کی پور پر ٹکا کر غور سے دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

"آپ کہاں تھے؟ اب تک کہاں تھے سکندر؟ مجھے لینے کیوں نہیں آئے، میں...... میں بہت اکیلی ہوگئی تھی......" اس کے سوال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے وہ ٹوٹے لہجے میں بولی۔ اس کی ایک، ایک ادا سکندر کے لوحِ دل پر نقش ہو رہی تھی۔

"تم مجھ سے ناراض ہو حیا؟" اس نے حیا سے پوچھا۔

"میں آپ سے ناراض نہیں ہوں، میں آپ

سے ناراض ہو ہی نہیں سکتی۔ بس آپ مجھ سے وعدہ کریں، اب کبھی مجھے تنہا نہیں چھوڑیں گے۔'' اس نے تو گویا اسے مژدۂ جانفزا سنا دیا تھا، وہ بے یقینی سے اسے دیکھے گیا۔

''میں تمہیں کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گا...... پرامس......'' وہ فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر بولا۔ اس کے شانے سے سر ٹکا کر کھڑی وہ ہولے، ہولے کانپ رہی تھی۔ اچانک بادل زور سے گرجا، بجلی کڑک کر سارے ماحول کو روشن اور ہولناک بنا گئی۔ وہ تڑپ کر ایک جھٹکے سے الگ ہوئی تھی۔

''حبا!'' وہ کمرے میں جا کر صوفے پر بیٹھ گئی تھی، سکندر اس کے پیچھے بھاگا وہ خاموش بیٹھی کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہی تھی۔

''حبا میں تم تمہیں لینے آیا ہوں۔'' اس نے گفتگو کا آغاز کیا تو وہ ہنوز خاموش تھی۔

''حبا......!'' سکندر نے اسے شانے سے پکڑ کر ہلایا۔ حبا کی آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی۔

''آپ نے مجھ سے شادی کیوں کی جبکہ آپ مجھے پسند بھی نہیں کرتے تھے۔ ہماری آپس میں انڈر اسٹینڈنگ بھی نہیں تھی۔'' بے دردی سے گالوں پر پھسلتے آنسوؤں کو رگڑ کر وہ بولی تو سکندر ششدر رہ گیا۔

''واٹ؟'' وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا تھا۔ ''تمہیں میرے کس فعل سے ایسا لگا کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا؟'' وہ ابھی تک شاکڈ تھا۔

''آپ جو ہمیشہ میرا مذاق اڑاتے، ماما سے مجھے ڈانٹ پڑواتے، ہر بات میں میری مخالفت کرتے تھے۔ صرف مجھے نیچا دکھانے کے لیے...... مجھ سے شادی کیوں کی؟'' وہ بولتی گئی، ہر راز سے پردہ اٹھتا گیا، سکندر خاموشی سے اس کے الزامات سن رہا تھا۔

''تمہیں پتا ہے محبتوں میں فاصلے کب پیدا ہوتے ہیں؟'' وہ بغور اس کے چہرے کو دیکھ کر بولا تھا۔ جہاں اس وقت شکست و ریخت کا عمل جاری تھا۔ ''جب ناراضی اور بدگمانی میں پیدا ہونے والے سوالوں کے جواب انسان خود ہی تلاش کرلے۔'' متاسف نظروں سے اسے دیکھ کر وہ مزید گویا ہوا تھا۔

''آپ ثابت کریں، آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔''

''پہلے تم یہ ثابت کرو کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں۔'' وہ برجستہ بولا تھا۔

''ڈیئر محبت تو آپ اپنی گواہی ہوتی ہے، تم لاکھ منہ سے انکار کرو، کیا مجھے تمہاری آنکھوں میں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔'' اسے شانے سے تھام کر اس کا رخ اپنی جانب موڑا تھا۔

''میری آنکھوں میں دیکھو، کیا یہاں تمہیں اپنا عکس دکھائی نہیں دیتا؟'' اس نے غور سے دیکھا، شیو ہلکی، ہلکی بڑھی ہوئی تھی، آنکھوں میں ایک عکس سا جھلملا رہا تھا اور وہ پہلے سے کچھ کمزور ہو گیا تھا۔

''اور سمیعہ......'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی نوکِ زبان پر یہ نام آ گیا تھا۔

''ہاہاہا......'' سکندر کا قہقہہ جاندار تھا۔ ''تم تو کہتی ہو کہ مجھ سے محبت نہیں کرتیں۔'' وہ محظوظ ہو رہا تھا۔

''خوش فہمی ہے جناب کی۔'' وہ جھینپ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ سکندر ابھی اس کے پیچھے آیا تھا۔

''خوش فہمی نہیں یقین ہے مابدولت کو، ثبوت میرے پاس ہے۔'' اس نے کوٹ کی جیب سے تصویر نکال کر حبا کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔

''سکندر......!'' راز فاش ہو جانے پر وہ جھنجلاہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر تصویر لینا چاہی مگر مقابل پوری طرح ہوشیار تھا، جلدی سے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ خفت کے مارے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔

''اتنا کچھ تو ہوتا ہے
تم بھی میرے ہو جاتے''

سکندر نے مسکراتے ہوئے بڑی ادا سے شعر پڑھا۔

''سکندر پلیز......بس کریں۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔

"اب گھر چلیں؟" تصویر کو واپس کوٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے وہ بولا...... وہ سامنے لان میں موجود درختوں کی شاخوں اور پتوں کو بغور دیکھ رہی تھی۔

"ماما وغیرہ کو آلینے دیں، سب سے مل کر جاؤں گی۔" اپنا سر ہولے سے اس کے شانے سے ٹکا کر وہ بولی۔ خود سپردگی کا یہ انداز سکندر کو بہت بھایا۔

بہت مل لیا سب سے......بس اب تو مجھ ہی سے ملو۔" مسکراہٹ دبا کر ذومعنی لہجے میں بولا، اس نے سرعت سے سر اوپر اٹھایا۔

"بہت برے ہیں آپ۔" وہ بھی خفیف سا مسکرائی۔

"ہاں! ہوں تو۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

☆☆☆

بادل چھٹ گئے تھے، آسمان صاف تھا، ہر شے دھلی دھلائی اور نکھری معلوم ہو رہی تھی۔ سامنے لان میں موجود پھول، پودے، پتے، گھاس اور ہر چیز ان کے ملن پر مسکرا رہی تھی اور ہوا کانوں میں سرگوشیاں کرتی ہوئی مبارک باد دے رہی تھی۔

اس نے ماما کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ سکندر کے ساتھ اپنے گھر جا رہی ہے۔

"ابھی کچھ دیر پہلے جو اتنا شاندار میرا استقبال کیا ہے تو سچ بتاؤں یہ میری توقع کے بالکل برعکس تھا۔" اس کے چہرے پر غیر معمولی شگفتگی نظر آ رہی تھی، اندازِ گفتگو میں بھی دل آویز شیرینی تھی۔ "آج کا دن بہت اچھا ثابت ہوا میرے لیے اور اگر مجھے پہلے علم ہو جاتا کہ تم اتنا مس کر رہی ہو مجھے تو میں آنے میں اتنی دیر نہ کرتا۔" گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے وہ شرارت آمیز سنجیدگی سے بولا۔

"اب آپ چھیڑ رہے ہیں مجھے......" اس نے اسے مصنوعی خفگی سے گھورا۔

"ارے نہیں یار، میں تو خوش ہو رہا ہوں۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"آئی ایم سوری سکندر......" اب کی بار وہ شرمندہ نظر آ رہی تھی۔

"سوری فار واٹ؟" وہ جان کر انجان بن رہا تھا۔

"میری سب غلطیوں اور بدتمیزیوں کے لیے......ایکسٹریملی ویری سوری۔" وہ سر جھکا کر بولی۔

"اٹس اوکے......لیکن ایک شرط پر معافی ملے گی۔" ونڈ اسکرین سے نظریں ہٹا کر اس نے پل بھر کو اس کے شرمندہ چہرے کو دیکھا۔

"کیا؟ کیسی شرط......؟" اس نے فوراً سر اوپر اٹھایا۔

"آئندہ کوئی فضول بات لے کر تم مجھ سے خفا نہیں ہو گی۔ میری کوئی بات بری لگے تو دل میں رکھنے کے بجائے مجھے بتاؤ گی اور......" وہ پل بھر کو رکا۔

"اور......" حبا سے انتظار کرنا مشکل ہو گیا۔

"اور پاکستان کو میچ ہارتے دیکھ کر روؤ گی نہیں۔" وہ شریر ہوا۔

"سکندر......" وہ زور سے چلائی۔

"ہاہاہا......" اس نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ "کہو قبول ہے؟"

"نہیں۔" وہ منہ پھلا کر جھٹ سے بولی۔

"حبا کھیل کو کھیل ہی سمجھنا چاہیے نہ کہ جنگ...... میچ ہارنے سے پاکستان کی انسلٹ نہیں ہوتی، نہ کوئی نقصان اگر ہماری انسلٹ ہوتی ہے تو کچھ نادان پاکستانیوں کی فضول حرکتوں سے......میچ کی ہار، جیت کو اتنا جذباتی مسئلہ مت بنایا کرو۔"

"شاید آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔" وہ کافی حد تک قائل ہو چکی تھی۔

"ویسے میرے پاس تمہارے لیے ایک گڈ نیوز ہے۔" اس نے احتیاط سے موڑ کاٹا تھا۔

"کیا؟" وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

"پاکستان پڑوسی ملک کے خلاف سیریز جیت کر کپ لایا ہے۔"

"کب؟ مجھے کیوں نہیں بتایا کسی نے؟" وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"جی اور اگر آپ کو کوئی بتاتا تب بھی فرق نہیں پڑنا تھا۔ آپ تو ہماری جدائی میں آٹھ، آٹھ آنسو

بہار ہی تھیں۔‘‘
’’بہت زیادہ خوش فہم نہیں ہیں آپ؟‘‘ اس کی شرارت کو بھانپ کر وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بولی۔
’’خوش فہم نہیں، مجھے اپنی محبت پر پورا یقین تھا، یہ تو جانتا تھا کہ یہ پاگل لڑکی بھی مجھے چاہتی ہے مگر تمہاری ناراضی کی وجہ میری سمجھ سے باہر تھی۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ تم اتنی چھوٹی سی بات کی وجہ سے اتنا خوب صورت وقت ضائع کر رہی ہو تو کبھی ایسے نہ کرنے دیتا۔‘‘
’’میں آپ سے سوری کہہ چکی ہوں سکندر......‘‘ وہ شرمندہ ہوئی۔
’’میرا مقصد تمہیں شرمندہ کرنا نہیں تھا۔‘‘ اس نے ایک نظر اس کے شرمندہ چہرے پر ڈالی۔ ’’دنیا میں کوئی بھی انسان پرفیکٹ نہیں ہوتا، ذرا سی بات کو بہت بڑی بات بنا کر رشتوں کو خراب کرنا یا توڑنے کی بات کرنا درست نہیں۔ میری کوئی بات اچھی لگے تو چاہے کسی اور کو بتاتی رہنا مگر میری جو بات بری لگے وہ صرف مجھے ہی بتانا...... سمجھیں۔‘‘ اس نے سکندر سے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ ایسا ہی کرے گی۔ اپنے گھر واپس آ کر وہ بہت خوش تھی۔ کمرے کی ایک، ایک چیز کو سکندر نے ویسے ہی سلیقے سے رکھا ہوا تھا جیسے اس کے جانے سے پہلے تھیں۔ اس سے کچھ فاصلے پر وہ بے خبر سو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہرا سکون اور طمانیت واضح تھی۔

☆☆☆

چھٹی کا دن تھا اور سکندر ابھی سو کر نہیں اٹھا تھا۔ اس نے بھی جگانا مناسب خیال نہ کیا اور لان میں آ گئی۔ پودوں اور گملوں سے خشک پتے صاف کروائے، شاخوں کی تراش خراش کروائی انہیں پانی دیا۔ کل کی بارش کی وجہ سے لان دھل کر نکھر گیا تھا۔ تھوڑی سی محنت سے اس نے اسے نئی رونق اور تازگی بخش دی تھی۔ شاخوں پر ننھی، ننھی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر اسے خوشی ہوئی۔ اچانک اس کی نظر اوپر اٹھی تھی، سکندر کھڑکی میں کھڑا اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس سے نظریں ملتے ہی وہ مسکرا دیا۔
’’گڈ مارننگ!‘‘ وہ فوراً نیچے آیا تھا۔
’’گڈ مارننگ......!‘‘ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔
’’مسز یہ آپ صبح، صبح کن ایکٹوٹیز میں بزی ہو گئی ہیں، ہماری خدمت کا کوئی سامان کریں۔ اچھا سا تیار ہو کر آئیں، یہ کیا آپ مٹی سے ہاتھ پاؤں خراب کر رہی ہیں۔‘‘
’’آپ فریش ہو کر آ جائیں...... میں ناشتا بناتی ہوں آپ کے لیے۔‘‘ ایک پھول کو ہاتھ سے چھوتے ہوئے بولی جو ابھی مکمل کھلا نہیں تھا اور بے حد خوب صورت لگ رہا تھا۔
’’آپ میرے کپڑے نکال دیں......‘‘ اس کے شانے پر ٹھوڑی ٹکا کر آگے جھک کر پھول توڑا اور اس کے بالوں میں ٹکا دیا۔ حبا نے بہت آرام سے اپنے مٹی سے بھرے ہاتھ اس کے چہرے پر مل دیے۔
’’حبا......‘‘ وہ زور سے چلایا۔
’’ہاہا......‘‘ وہ جلدی سے دور ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ ’’ٹھیک، صبح تنگ کریں گے تو یہی کچھ کروں گی ناں۔‘‘ وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی اور وہ اس کی ہنسی کی جلترنگ میں کھو گیا۔
’’چلیں...... اب فریش ہو جائیں میں کپڑے نکال دیتی ہوں۔‘‘ اس کا بازو پکڑ کر اندر کی طرف جانے لگی۔
’’بہت چالاک ہو گئی ہو تم......‘‘ وہ اسے مصنوعی خفگی سے گھورتے ہوئے بولا۔
’’آپ سے پھر بھی کم ہوں۔‘‘ وہ دوبدو بولی تھی، جواب میں اس نے ایک مسکراتی نظر اس کے... پُرسکون، چمکتے دمکتے چہرے پر ڈالی، سکندر کے لیے اس کا یہ روپ بہت انوکھا اور پیارا تھا۔ آج کی صبح ہر دن سے زیادہ روشن اور خوشگوار تھی اور اس کے لبوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ رقصاں تھی۔

اختر شجاعت

# درود شریف...... حکمِ الٰہی

تمام تعریف اس اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس نے اپنے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے ہم پر وہ احسان فرمایا جو نہ گزشتہ امتوں پر کیا اور نہ پہلے لوگوں پر......

اے اللہ......! تو رحمت نازل فرما محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ان کی آل پر جو تیری وحی کے امانت دار، تمام مخلوقات میں تیرے برگزیدہ، تیرے بندوں میں پسندیدہ، رحمت کے پیشوا اور برکت کا سرچشمہ ہیں۔

انسانی زندگی کو انسانیت کے بلند ترین اوصاف سے معمور بنانا ہمارے پروردگار کا اہم مقصد ہے جس کے لیے انبیا مبعوث ہوئے، کتابیں نازل ہوئیں اور شریعتیں مقرر ہوئیں اور پھر اللہ رب العزت نے اپنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس دنیا میں اس پوری کائنات کے لیے رحمت اللعالمین بنا کر بھیجا...... درود و سلام ہو نبی برحق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر......

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "بے شک مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو اُن کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے انہیں پاک وصاف کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔ یقیناً یہ سب اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔" (سورۂ آل عمران)

اللہ سبحان وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک ایک لاکھ سے زیادہ انبیا مبعوث فرمائے لیکن ان سب معصومین کی تشریف آوری پر احسان نہیں جتایا...... ہاں...... ہاں اگر احسان جتایا تو صرف اور صرف حضور اکرم سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری پر...... اس لیے کہ ان کے نور کو سب سے پہلے تخلیق کیا...... جن کی خاطر یہ ساری کائنات سجائی جن کی نگاہوں کے صدقے میں خانۂ کعبہ کو مسلمانوں کا قبلہ بنایا...... جن پر قرآن پاک نازل کیا...... جن کو رویت باری تعالیٰ سے مشرف فرمایا گیا...... جن کو اس کائنات کے لیے رحمت اللعالمین بنا کر بھیجا۔ جن کو اخلاق کی بلندیوں پر فائز کیا۔ شفاعت عظمیٰ پر فائز کر کے مقام محمود عطا کیا گیا جن کے صدقے میں نماز، روزہ، حج عطا ہوا۔ اس لیے احسان جتایا کہ اس کائنات کا ذرہ، ذرہ اللہ تعالیٰ کے محبوب کا ذکر کرے۔ حق تعالیٰ شانہ نے قرآن پاک میں بہت سے احکامات ارشاد فرمائے...... نماز، روزہ، حج وغیرہ...... اور بہت سے انبیائے کرام کی توصیفیں اور تعریفیں بھی فرمائیں، ان کے بہت سے اعزاز واکرام بھی فرمائے۔

حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو فرشتوں کو حکم فرمایا کہ ان کو سجدہ کیا جائے لیکن کسی حکم یا کسی اعزاز واکرام میں یہ نہیں فرمایا کہ میں بھی یہ کام کرتا ہوں تم بھی کرو...... یہ اعزاز صرف سید الکونین فخر عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

"اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اس نبی پر رحمت بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود بھیجو اور خوب سلام بھی بھیجتے رہا کرو۔" (سورۂ احزاب، 56)

اور یہ اعزاز واکرام جو اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم کو عطا فرمایا ہے اس اعزاز سے بہت بڑھا ہوا ہے جو کہ حضرت آدم کو فرشتوں سے سجدہ کرا کے عطا فرمایا تھا۔

درود کے لغوی معنی دعا و سلام کے ہیں۔ وہ دعا اور سلام جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پڑھا جائے۔

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو حکم دیا کہ تم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود و سلام بھیجو جس طرح کہ میں اور میرے فرشتے ان پر درود سلام بھیجتے ہیں یعنی حضورؐ پر درود بھیجنے والے تین 1، اللہ تعالیٰ 2، فرشتے اور 3، اہلِ ایمان ہیں...... حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کا درود بھیجنا...... اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کی تعریف کرتا ہے اور آپؐ کا نام بلند کرتا ہے آپؐ پر اپنی رحمتوں کی بارش فرماتا ہے...... آپؐ کے درجات میں اضافہ فرماتا ہے...... فرشتوں کی طرف سے آپ پر درود کا مطلب یہ ہے کہ فرشتے آپؐ کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ آپ کو اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب عطا فرمائے۔ اہلِ ایمان کی طرف سے درود بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں حضور کی شان بلند و بالا کرنے کی التجا ہے...... یعنی اہلِ ایمان پر واضح کیا گیا ہے کہ جب میں اپنے محبوب برکات کا نزول کرتا ہوں اور میرے فرشتے ان کی شان میں تعریف کرتے ہیں تو اے ایمان والو تم بھی میرے محبوب کی تعریف کرو......

لیکن ہم اعترافِ عجز کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اللھم صل...... یعنی اے اللہ تو ہی اپنے محبوب کی شان اور قدر و منزلت کو صحیح جانتا ہے اس لیے تو ہی ہماری طرف سے اپنے محبوب پر صلوٰۃ بھیج جو اُن کی شان شایان ہو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود شریف پڑھنا واجب ہے ایسے ہی نماز کے آخری قعدہ میں درود شریف کا پڑھنا واجب ہے اس کے ترک کرنے سے نماز نہ ہوگی اور اگر کسی مجلس میں حضور پاکؐ کا نام نامی بار، بار آئے تو ایک مرتبہ درود پڑھنے سے فریضہ ادا ہو جائے گا لیکن ہر بار نام لینے یا سننے پر درود شریف پڑھنا مستحب ہے۔

☆☆☆

درود پاک ایک انمول نعمت ہے۔ جس کی فضیلت بے پناہ ہے، ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ جس نے مجھ پر ایک بار درود پاک پڑھا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں بھیجتا ہے اور اس کے دس گناہ معاف کر دیتا ہے اور اس کے دس درجات بلند کر دیتا ہے۔

☆حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز وہ شخص میرے سب سے قریب ہوگا جس نے مجھ پر اکثر درود پاک پڑھا ہوگا۔

☆حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ جو شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایک بار درود پاک پڑھے اس پر اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے ستر رحمتیں نازل فرماتے ہیں۔

☆حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے دن بھر میں مجھ پر ہزار بار درود پاک پڑھا وہ مرے گا نہیں جب تک کہ وہ جنت میں اپنی آرام گاہ نہ دیکھ لے۔

☆حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا کہ میں دربارِ نبوت میں حاضر تھا اور میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی...... یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آپؐ پر کثرت سے درود پڑھنا چاہتا ہوں تو میں کتنا درود پڑھوں؟ تو آپؐ نے فرمایا۔ جتنا چاہے پڑھ لیا کرو...... میں نے عرض کیا کہ اپنی فرصت کا چوتھا حصہ پڑھ لیا کروں تو فرمایا کہ جتنا چاہے پڑھ لیا کرو اور اس سے بھی زیادہ پڑھے تو تیرے لیے بہتر ہے میں نے عرض کی کہ میں وظائف کا نصف وقت درود پاک میں لگا دیا کروں...... فرمایا...... تیری مرضی...... اگر تو اس سے بھی زیادہ پڑھے تو تیرے لیے بہتر ہے۔ میں نے عرض کی کہ تو دو تہائی کر دوں...... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تجھے اختیار ہے اگر اور اس سے بڑھا دے تو تیرے لیے زیادہ بہتر ہے، میں نے عرض کیا کہ یا رسولؐ پھر میں..... اپنے سارے وقت کو آپ کے درود کے لیے مقرر کرتا ہوں...... تب حضور اقدسؐ نے فرمایا...... ''تو اس صورت میں تیرے سارے فکروں کی کفایت کی جائے گی اور تیرے گناہ بھی معاف کر دیے جائیں گے۔''

☆ایک اور جگہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''مجھ پر کثرت سے درود بھیجا کرو اس لیے کہ قبر

میں ابتدائً تم سے میرے بارے میں سوال کیا جائے گا۔“
ایک اور حدیث نبویؐ میں نقل ہے کہ مجھ پر درود بھیجنا قیامت کے دن پل صراط کے اندھیرے میں نور ہے اور جو یہ چاہے کہ اس کے اعمال بہت بڑی ترازو میں تلیں تو اس کو چاہیے کہ مجھ پر کثرت سے درود بھیجا کرے۔

☆ آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا...... جو مجھ پر درود کی کثرت کرے گا وہ عرش کے سائے میں ہوگا۔

☆ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا...... جو مجھ پر ایک دفعہ درود بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دس دفعہ درود بھیجتا ہے اور جو مجھ پر دس دفعہ درود بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر سو مرتبہ درود بھیجتا ہے اور جو سو مرتبہ درود بھیجتا ہے اللہ جل شانہ اس کی پیشانی پر لکھ دیتے ہیں کہ یہ شخص نفاق سے بری ہے اور جہنم سے بھی بری ہے اور قیامت کے دن شہیدوں کے ساتھ اس کا حشر فرمائیں گے۔

☆☆☆

کثرتِ درود کی تعریف کیا ہے؟ اس کی وضاحت کے لیے میں چند بزرگوں کے اقوال پیش کر رہی ہوں کہ جو معتبر کتب سے کثرتِ درود کی تعریف میں نقل کیے گئے ہیں۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کثرتِ درود کی تعریف میں فرماتے ہیں۔

”روزانہ ایک ہزار مرتبہ درود شریف ضرور پڑھیں...... ورنہ پانچ سو پر اکتفا کریں۔“ علامہ سخاویؒ نے قوت القلوب سے نقل کیا ہے کہ ”کثرت کی کم سے کم مقدار تین سو مرتبہ ہے۔“

بعض بزرگوں نے روزانہ تین سو اور بعض نے نماز فجر اور نماز عصر کے بعد دو دو سو پڑھنے کو فرمایا ہے...... شیخ عبدالحقؒ مزید فرماتے ہیں کہ ”روزانہ کم از کم سو بار درود وسلام پڑھنا چاہیے۔“

ویسے تو یہ حقیقت ہے کہ کروڑوں سال کی عمر بھی درود وسلام کے لیے ناکافی ہے۔ علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں کہ درود شریف دعا کے اول میں درمیان میں اور آخر میں ہونا چاہیے۔ دعا کی ابتدا اللہ تعالیٰ کی شان کی حمد وثنا پھر حضور اقدسؐ پر درود سے ہونی چاہیے اور اسی طرح اس پر ختم بھی ہونا چاہیے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے حضور اکرم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ ”تمہارا مجھ پر درود پڑھنا تمہاری دعاؤں کی حفاظت کرنے والا ہے، تمہارے رب کی رضا کا سبب ہے۔“

”قیامت میں کسی مومن کی نیکیاں کم وزن ہو جائیں گی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک پرچہ سرِ انگشت کے برابر نکال کر میزان میں رکھ دیں گے جس سے نیکیوں کا پلہ وزنی ہو جائے گا...... وہ مومن کہے گا میرے ماں، باپ آپؐ پر قربان ہو جائیں، آپ کون ہیں آپ کی صورت اور سیرت کیسی اچھی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمائیں گے میں تیرا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں اور یہ درود شریف ہے جو تو نے مجھ پر پڑھا تھا میں نے تیری حاجت کے وقت اس کو ادا کر دیا۔“ (سبحان اللہ)

☆☆☆

ایک غریب شخص تھا جس پر پانچ سو روپے کا قرضہ تھا...... اسے ایک رات سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواب میں زیارت ہوئی۔ اس نے آپ کی خدمت میں اپنی پریشانی عرض کی...... آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا...... ”تم ابوالحسن کیسائیؒ کے پاس جاؤ اور میری طرف سے اس سے کہو کہ وہ تمہیں پانچ سو درہم دے دے۔ وہ نیشا پور میں ایک سخی مرد ہے۔ ہر سال دس ہزار غریبوں کو کپڑے دیتا ہے، وہ اگر تم سے کوئی نشانی طلب کرے تو کہہ دینا کہ تم ہر روز دربارِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سو بار درود پاک کا تحفہ پیش کرتے ہو مگر کل تم نے وہ درود پاک نہیں پڑھا۔

وہ شخص بیدار ہوا اور ابوالحسن کیسائیؒ کے پاس پہنچ گیا اور اپنا حالِ زار بیان کیا ساتھ ہی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام بھی سنایا...... تو حضرت ابوالحسن کیسائیؒ یہ سنتے ہی وجد میں آ گئے اور دربار الٰہی میں سجدہ شکر ادا کیا...... اے میرے بھائی! اے میرے اور میرے

اللہ کے درمیان ایک راز تھا دوسرا اس راز سے واقف نہ تھا...... واقعی کل میں درود پاک پڑھنے سے محروم رہا تھا...... پھر ابوالحسن کیسائیؒ نے اپنے غلام کو حکم دیا کہ پانچ سو کے بجائے دو ہزار پانچ سو درہم دے دو...... پھر کہا اے بھائی! پانچ سو درہم سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے پیغام اور بشارت لانے کا شکرانہ ہے اور یہ دو ہزار درہم آپ کے یہاں قدم رنجہ فرمانے کا نذرانہ ہے......مزید کہا کہ آئندہ جب کبھی کوئی ضرورت پیش آئے تو میرے پاس ضرور تشریف لایا کریں۔

☆☆☆

کتاب دلائل الخیرات کے عظیم مصنف شیخ ابو عبداللہ محمد بن سلیمان الجزولیؒ کی زندگی کا یہ واقعہ جو دلائل الخیرات کی وجہ تالیف بنا مشہور ہے کہ آپؒ کو ایک بار دورانِ سفر وضو کے لیے پانی کی ضرورت تھی اور ڈول اور رسی کے نہ ہونے کی وجہ سے سخت پریشان تھے، ایک لڑکی نے آپ کا حال دیکھا تو دریافت کیا کہ کیا مسئلہ ہے آپؒ نے ڈول اور رسی کی بابت بتایا تب وہ لڑکی کنویں کے قریب آئی اور اس نے کنویں کے اندر اپنا لعابِ دہن گرا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہی کنویں کا پانی کناروں تک ابل آیا...... آپ سخت حیران ہوئے اور لڑکی سے اس کی وجہ دریافت کی...... اس نے کہا...... حضرت یہ برکت ہے درود شریف کی...... آپؒ کے دل کو یہ بات بھاگئی اور پھر آپؒ نے مشہور کتاب دلائل الخیرات تالیف کی...... جو بکثرت پڑھی جاتی ہے۔

آپؒ کے وصال کے 77 سال کے بعد آپ کے جسم مبارک کو سوس سے مراکش منتقل کیا۔ جب آپ کو آپ کی قبر سے نکالا گیا تو آپ کا جسم بالکل تر و تازہ تھا زمین نے آپؒ پر کوئی اثر نہیں کیا تھا، آپ کی داڑھی مبارک اور سر کے بال ایسے تھے جیسے آج ہی کسی حجام نے حجامت بنائی ہو۔ آپ کا مزارِ مبارک مراکش میں ہے، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آپ کے بکثرت درود پڑھنے سے آپ کی قبر سے کستوری کی خوشبو آتی ہے۔

☆☆☆

ایک عورت امام حضرت حسن بصریؒ کے پاس آئی اور عرض کیا کہ میری بیٹی کا انتقال ہو گیا، میری یہ تمنا ہے کہ میں اس کو خواب میں دیکھوں...... حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا۔ عشا کی نماز کے بعد چار رکعت نماز نفل پڑھ اور اس کے بعد لیٹ جا اور سوتے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود پڑھتی رہ...... اس نے ایسا ہی کیا...... ماں نے دیکھا کہ لڑکی سخت عذاب میں ہے...... تارکول کا لباس اس پر ہے، دونوں ہاتھ اس کے جکڑے ہوئے ہیں اور اس کے پاؤں آگ کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے یعنی بندھے ہوئے ہیں۔

صبح ہوتے ہی وہ عورت حضرت حسن بصریؒ کے پاس گئی اور تمام بات آپ کو بتائی۔ آپؒ نے فرمایا اس لڑکی کی طرف سے صدقہ کر شاید اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے تیری لڑکی کو معاف فرما دے۔ اگلے دن حضرت حسن بصریؒ نے خواب میں دیکھا کہ جنت کا ایک باغ ہے اور اس میں ایک بہت اونچا درخت ہے اور اس پر ایک بہت نہایت حسین و جمیل خوب صورت لڑکی بیٹھی ہے، اس کے سر پر ایک نور کا تاج ہے وہ کہنے لگی۔ حضرت آپ نے مجھے پہچانا......؟ آپؒ نے فرمایا۔ نہیں میں نے تو نہیں پہچانا...... کہنے لگی میں وہی لڑکی ہوں میری والدہ آپ کے پاس آئی تھیں۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا۔ مگر تیری ماں نے جو تیرا حال بتایا تھا وہ بالکل اس کے برعکس ہے جو میں دیکھ رہا ہوں۔ اس لڑکی نے کہا میری حالت وہی تھی جو ماں نے بیان کی تھی۔ پھر یہ مرتبہ کیسے حاصل ہوا؟ اس نے کہا کہ ہم ستر ہزار آدمی اسی عذاب میں مبتلا تھے جو میری ماں نے آپؒ سے بیان کیا۔ اس دوران ایک بزرگ کا گزر ہمارے قبرستان پر ہوا۔ انہوں نے ایک دفعہ درود شریف پڑھ کر اس کا ثواب ہم سب کو پہنچا دیا...... ان کا درود اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسا قبول ہوا کہ اس کی برکت سے ہم سب اس عذاب سے آزاد کر دیے گئے۔

☆☆☆

بنی اسرائیل میں ایک شخص جو کہ نہایت گناہ گار اور مجرم تھا اس نے سو سال یا دو سو سال فسق و فجور میں گزار دیے جب وہ مرا تو لوگوں نے اسے گھسیٹ کر کوڑا کرکٹ کی جگہ ڈال دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی۔

''اے پیارے کلیم! ہمارا ایک بندہ فوت ہو گیا ہے اور بنی اسرائیل نے اسے گندگی میں پھینک دیا ہے آپ اپنی قوم کو حکم دیں کہ وہ اسے وہاں سے اٹھائیں تجہیز و تکفین کر کے آپ اس کا جنازہ پڑھیں...... اور لوگوں کو بھی جنازہ پڑھنے کے لیے کہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب وہاں پہنچے تو اس میت کو دیکھ کر پہچان لیا تعمیل حکم کے بعد عرض کی۔ ''یا اللہ! یہ مشہور ترین مجرم تھا تو بجائے سزا کے یہ اس عنایت کا حقدار کیسے ہوا؟ فرمان آیا کہ بے شک یہ بہت بڑی سزا و عذاب کا مستحق تھا لیکن اس نے ایک دن تو رات مبارکہ کھولی اور اس میں میرے حبیب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام پاک لکھا ہوا دیکھا تو محبت سے اسے بوسہ دیا اور درود پاک پڑھا...... تو اس نام کی تعظیم کرنے کی وجہ سے میں نے اس کے سارے گناہ معاف کر دیے۔

اللہ اکبر......

☆☆☆

حضرت شیخ ابوالحسن بن حارث لیثیؒ جو کہ پابند شریعت اور درود شریف کی کثرت کرنے والے بزرگ تھے۔ فرماتے ہیں کہ مجھ پر گردش کے دن آ گئے فقر و تنگ دستی یہاں تک بڑھی کہ فاقے کی نوبت آ گئی اور اسی عالم فاقہ مستی میں عید کی رات آ گئی...... میں پریشان تھا کہ صبح عید کا دن ہے بچوں کے لیے نہ کوئی نئے کپڑے اور نہ کوئی کھانے پینے کی چیزیں...... ابھی رات کی چند گھڑیاں گزری ہوں گی کسی نے دروازے پر دستک دی جب میں نے دروازہ کھولا تو ہاتھوں میں قندیلیں اٹھائے کچھ لوگ دروازے پر کھڑے ہیں میں بے حد پریشان تھا کہ نہ جانے اس وقت یہ لوگ کیوں آئے ہیں؟ کہ ان میں سے ایک خوش پوش شخص جو کہ اس علاقے کا رئیس تھا آگے بڑھا اور اس نے بتایا کہ الحمدللہ ابھی ابھی میں سو رہا تھا کہ میری قسمت کا ستارہ چمک اٹھا کیا دیکھتا ہوں کہ شہنشاہ کونین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غریب خانے پر تشریف لائے ہیں اور مجھ سے فرما رہے ہیں ابوالحسن اور اس کے بچے بڑی تنگ دستی اور فقر و فاقے کے دن گزار رہے ہیں...... تجھے اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ دے رکھا ہے جا...... اور جا کر ان کی خدمت کر...... اس کے بچوں کے کپڑے بھی ساتھ لیتا جا...... اور کچھ خرچ بھی دے آنا کہ وہ اچھے طریقے سے عید کر سکیں...... اور خوش ہو جائیں...... یہ کچھ سامان عید قبول فرمائیں۔ میں درزی کو بھی ساتھ لیتا آیا ہوں آپ بچوں کو بلالیں تاکہ ان کے لباس کا ناپ لے کر ان کے کپڑے تیار کر دیے جائیں...... پھر رئیس نے درزیوں کو حکم دیا کہ پہلے بچوں کے کپڑے تیار کرو بعد میں بڑوں کے...... لہٰذا صبح ہونے سے پہلے، پہلے سب کچھ تیار ہو گیا اور صبح گھر والوں نے خوشی، خوشی عید منائی...... سبحان اللہ......!

☆☆☆

حضرت عمر فاروقؓ سے بھی حضور کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ ''میرے اوپر روشن رات (جمعہ کی شب) اور روشن دن (جمعہ کا دن) میں کثرت سے درود بھیجا کرو اس لیے کہ تمہارا درود مجھ پر پیش ہوتا ہے تو میں تمہارے لیے دعا و استغفار کرتا ہوں۔'' ایک اور حدیث مبارکہ میں درود ابراہیمی کے لیے کہا کہ پڑھا کرو...... حضور اقدس کا ارشاد ہے کہ مجھ پر درود پڑھنا پل صراط پر گزرنے کے وقت نور ہے۔ اور جو شخص جمعہ کے دن 80 دفعہ مجھ پر درود بھیجے اس کے 80 سال کے گناہ معاف کر دیے جائیں۔''

☆☆☆

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ مثنوی شریف میں فرماتے ہیں ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شہد کی مکھی سے دریافت فرمایا...... کہ ''تو شہد کیسے بناتی ہے؟'' اس نے عرض کیا کہ ''یا حبیب اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم ہم چمن میں جا کر ہر قسم کے پھولوں کا رس چوستے ہیں پھر وہ رس اپنے منہ میں لیے ہوئے چھتوں میں آجاتے ہیں اور وہاں اگل دیتے ہیں، وہی شہد ہے۔“ آپ نے ارشاد فرمایا...... ”کہ پھولوں کے رس تو پھیکے ہوتے ہیں اور شہد میٹھا...... یہ تو بتاؤ کہ شہد میں مٹھاس کہاں سے آتی ہے؟“ مکھی نے عرض کیا۔ ”ہمیں قدرت نے سکھادیا ہے کہ چمن سے چھتے تک راستے بھر آپ پر درود شریف پڑھتی ہوئی آتی ہیں شہد کی یہ لذت اور مٹھاس اس درود پاک کی ہی برکت سے ہے۔“

حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”جو شخص مجھ پر ایک بار درود پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس درود شریف پڑھنے والے کے سانس سے ایک سفید بادل پیدا فرماتے ہیں کہ پھر اسے برسنے کا حکم دیتا ہے جب وہ برستا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ زمین پر برسنے والے ہر قطرے سے سونا پیدا فرماتا ہے اور پہاڑ پر گرنے والے ہر قطرے سے چاندی پیدا فرماتا ہے اور کافر پر گرنے والے ہر قطرے کی برکت سے اس کو ایمان کی دولت نصیب فرماتا ہے۔“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”جسے یہ بات پسند ہو کہ اللہ عزوجل سے اس حال میں ملے کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو تو اسے چاہیے کہ مجھ پر بکثرت درود شریف پڑھا کرے۔ آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا...... ”جسے کوئی سخت حاجت درپیش ہو اسے چاہیے کہ مجھ پر کثرت سے درود شریف پڑھے کیونکہ یہ مصائب وآلام کو دور کردیتا ہے اور روزی میں برکت اور حاجات کو پورا کرتا ہے۔“

☆☆☆

حضرت امام مالکؒ جنہوں نے نو سو سے زیادہ تابعین اور مشائخ وعلما سے علم دین حاصل کیا جنہوں نے اپنے ہاتھ سے ایک لاکھ احادیث تحریر فرمائیں...... ان کی کوئی رات ایسی نہیں گزرتی تھی جس میں ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت نصیب نہ ہوتی ہو...... آپؒ کے پاس جب کوئی طالب حدیث رسولؐ سننے آتا تو آپؒ بڑا اہتمام فرماتے...... محبوب کی باتیں محبوب کا ادب سنیے اور حاضری کا سلیقہ سیکھیے۔

آپؒ پہلے غسل فرماتے، خوشبو لگاتے، نئے کپڑے پہنتے عمامہ باندھتے، چادر سر مبارک پر رکھتے، ان کے لیے ایک تخت بچھایا جاتا اس وقت باہر تشریف لاتے اور نہایت خضوع وخشوع سے اس پر جلوس فرماتے اور جب تک حدیث بیان فرماتے اگر بتی سلگاتے اور اس تخت پر صرف اسی وقت بیٹھتے تھے جب حدیث بیان کرنی ہوتی...... پوچھا گیا کہ آپؒ اس قدر اہتمام کیوں فرماتے ہیں؟ تب حضرت امام مالکؒ نے فرمایا۔ ”مجھے تعظیم رسول سے پیار ہے میں بغیر وضو اور سکون ووقار کے حدیث بیان نہیں کرتا۔

تو محبت خود بخود ادب سکھاتی ہے۔ وہ محبوب کی خامیاں تلاش نہیں کرتی تو اللہ عزوجل نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنا محبوب بنایا ہمارے لیے نمونہ بنایا...... جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی جس نے آپ سے محبت کی اس نے اللہ سے محبت کی...... مقصود و مطلوب آپ کی محبت واطاعت اور جس نے آپ کی اطاعت کی وہ اللہ کا محبوب بن گیا...... ایسا ممکن ہی نہیں کہ آپ کسی کے محبوب کو ناپسند کریں اور وہ آپ سے الفت رکھتے ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جلیل القدر تابعی ہیں اور خلیفہ ہیں شام سے مدینہ منورہ کو خاص قاصد بھیجتے تھے کہ ان کی طرف سے روضہ شریف پر حاضر ہوکر سلام عرض کرتے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت سے یہ نقل کیا ہے کہ ”اللہ جل شانہ کے کچھ فرشتے زمین پر پھرتے رہتے ہیں جو میری امت کا درود مجھ تک پہنچاتے رہتے ہیں۔“

حضرت امام حسنؓ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے ”تم جہاں کہیں ہو مجھ پر درود پڑھتے رہا کرو بے شک تمہارا درود میرے پاس پہنچتا رہتا ہے۔“ حضرت عمار بن یاسرؓ نے حضور کا یہ فرمان نقل

کیا ہے کہ ''اللہ جل شانہ نے ایک فرشتہ میری قبر پر مقرر کر رکھا ہے جس کو ساری مخلوق کی باتیں سننے کی قدرت عطا فرما رکھی ہے پس جو شخص بھی مجھ پر قیامت تک درود بھیجتا رہے گا، وہ فرشتہ مجھ کو اس کا اور اس کے باپ کا نام لے کر درود پہنچاتا رہتا ہے کہ فلاں شخص جو فلاں کا بیٹا ہے اس نے آپ پر درود بھیجا ہے۔''

حضرت ابو ہریرہؓ حضور اقدسؐ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ ''جو شخص میرے اوپر میری قبر مبارک کے قریب درود بھیجتا ہے میں اس کو خود سنتا ہوں اور جو درود دور سے بھیجا جاتا ہے وہ مجھ تک پہنچا دیا جاتا ہے۔'' حضرت ابراہیم بن شیبانؒ کہتے ہیں کہ میں حج سے فارغ ہوا اور مدینہ منورہ حاضر ہوا میں نے قبر شریف کے پاس جا کر سلام عرض کیا تو میں نے حجرہ شریف کے اندر وعلیکم السلام کی آواز سنی۔

☆☆☆

علامہ سخاویؒ نے ان وعیدوں کو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذکر مبارک کے وقت درود شریف نہ پڑھنے پر وارد ہوتی ہیں مختصر الفاظ میں جمع کیا ہے...... وہ کہتے ہیں کہ ایسے شخص پر ہلاکت کی بد دعا ہے...... اور شقاوت کے حاصل ہونے کی خبر ہے...... جنت کا راستہ بھول جانے کی اور جہنم میں داخل ہونے کی...... اور یہ کہ وہ شخص ظالم ہے اور سب سے زیادہ بخیل ہے جو شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود نہ پڑھے اس کا دین سالم نہیں...... اور یہ کہ وہ چہرۂ انور کی زیارت نہ کر سکے گا۔

حضرت امام حسینؓ سے بھی حضور اقدسؐ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ ''بخیل ہے وہ شخص جس کے سامنے میرا ذکر ہوا اور وہ مجھے پر درود نہ بھیجے۔''

شیخ ابن حجر مکیؒ نے نقل کیا ہے کہ ایک شخص صرف صلی اللہ علیہ وآلہ پر اکتفا کرتا تھا وسلم نہ لکھتا تھا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو خواب میں ارشاد فرمایا ''تو اپنے آپ کو چالیس نیکیوں سے کیوں محروم رکھتا ہے یعنی وسلم میں چار حرف ہیں ہر حرف پر ایک نیکی اور ہر نیکی پر دس گنا ثواب...... لہٰذا وسلم میں چالیس نیکیاں ہوئیں۔''

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر مبارک خلفائے راشدین نے کیا...... صحابہ کرام نے کیا تابعین نے کیا تبع تابعین نے کیا...... عرفا نے کیا صلحا نے کہا کہ ان کا ذکر محبوب اور مقصود رب اللعالمین ہے تو آپ بھی کثرت سے درود سلام پڑھیے کہ درود پاک پڑھنا حکم الٰہی ہے سبب قبولیتِ دعا ہے باب جنت پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قرب نصیب ہوگا...... تمام پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے تمام حاجات کی تکمیل کے لیے کافی ہے۔ درود پاک گناہوں کا کفارہ ہے صدقہ کا قائم مقام ہے...... درود شریف سے مصیبتیں ٹلتی ہیں، بیماریوں سے شفا حاصل ہوتی ہے...... خوف دور ہوتا ہے ظلم سے نجات حاصل ہوتی ہے اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے برکتیں حاصل ہوتی ہیں، قیامت کی ہولناکیوں سے نجات حاصل ہوتی ہے۔ سکرات، موت میں آسانی ہوتی ہے، تنگ دستی دور ہوتی ہے۔ عظیم ترین سعادت یہ ہے کہ درود شریف پڑھنے والے کا نام نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں پیش کیا جاتا ہے...... اور خوش نصیبوں کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دیدار نصیب ہوتا ہے...... غرضیکہ درود پاک کے اس قدر زیادہ فضائل ہیں کہ مضمون کی طوالت کے باعث تحریر نہیں کر رہی ہوں۔ بس اللہ رب العزت سے دعا گو ہوں کہ وہ ہم سب کو ہمارے پیارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کثرت سے درود شریف پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

**نوٹ**

قارئینِ کرام محترمہ اختر شجاعت بے حد مستند اور قابلِ احترام شخصیات کی کئی، کئی جلدوں پر مشتمل تصانیف سے اس مضمون کے لیے استفادہ کرتی ہیں۔

## باتیں بہار و خزاں کی

زندگی رات دن کی گردش ہے
کچھ خزاں کی ہے کچھ بہار کی بات

ہم ہمیشہ ہی سے کچھ نہ کچھ نیا اور دلچسپ کرتے چلے آئے ہیں سو آج بھی ایک مختصر مگر جامع سوالنامہ حاضرِ خدمت ہے تاکہ آپ کی اپنی شخصیت کے بھی کچھ نہاں پہلو سب کے سامنے آئیں اور آپ کے ذاتی افکار، خیالات اور تجربات سے ہم سب بھی آگاہ ہوں اور لطف بھی اٹھائیں۔ امید ہے آپ کو یہ چھوٹا سلسلہ بہت پسند آئے گا۔

سوالات حاضرِ خدمت ہیں۔

### ماہ نور عنبر مغل، راول پنڈی

1۔ خواتین اپنے علم و ہنر کے ذریعے کسی اچھے مقام کو پانے کی کوشش کریں۔ میرے خیال میں اس کا تعلق تربیت سے ہے کہ کوئی اپنے دائرہ کار میں رہ کر کس طرح اچھے افعال اور اچھے اخلاق سے ہی اپنے آپ کو پُراثر بنا سکتا ہے۔ تو پھر باکردار ہونا پہلی ترجیح ہوگی پُراثر بننے کی اور بااخلاق ہونا دوسری......

2۔ میں ایک کھلنڈری اور بے پروا سی طبیعت کی لڑکی تھی...... لیکن جب میری ماما کی طبیعت بگڑنے لگی اور جس دن مجھے پتا چلا کہ میری پیاری ماما کو ذیابیطس جیسا موذی مرض لاحق ہوگیا ہے تو میں ایک ذمے داری اٹھانے والی اور خیال رکھنے والی بیٹی میں تبدیل ہوگئی اور آج یہ عالم ہے کہ میرے دھیان فکر خیال ہر چیز میں میری ماما چھائی رہتی ہیں۔ وہ مجھے نہ بھی بلائیں تو میرا سارا دھیان ان پر رہتا ہے۔ میں ان کی ہر چھوٹی بڑی ضرورت کا خیال رکھتی ہوں۔ اور آج اس خیال رکھنے کے عمل نے مجھے یہ فائدہ بھی دیا کہ میں پورا گھر سنبھال رہی ہوں...... ماما کو کچھ نہیں کرنے دیتی...... الحمدللہ......

3۔ پاکیزہ کے تمام ہی سلسلے ویسے تو مجھے پسند ہیں، خاص طور پر افسانے اور ناول پسند ہیں۔ لیکن رومینٹک نہیں...... بلکہ سماجی موضوعات پر بنی وہ کہانیاں جو قاری کو کسی پیغام کے ساتھ ملیں۔ سطحی طرز کی افسانیت بیزار کُن ہوتی ہے۔ جہاں تک اس جواب کا تعلق ہے کہ کون سا سلسلہ شروع ہونا چاہیے تو میں چاہتی ہوں کہ ہم جیسی طالبات کے لیے کوئی انٹرویو کا سلسلہ ہو۔ جس میں ہم خالصتاً اپنے تعلیمی تجربات پہ بات کرسکیں اور تعلیم کی عمومی معلومات آپس میں بانٹ سکیں۔ یا اپنے کالج، یونیورسٹی کے دلچسپ قصے لگانے کا کوئی سلسلہ ہو۔

4۔ میں اپنی پیاری، پیاری مصنفات سے یہ کہنا چاہوں گی کہ وہ بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ مگر میری خواہش یہ ہے کہ دینی اور معاشرتی مسائل پر کہانیاں لکھیں......اور قلم میں زیادہ بے باکی سے پرہیز کریں۔ (معذرت کے ساتھ) جس طرح کی کہانیاں انجم آنٹی کی ہوتی ہیں، بس ویسا لکھیں، گم شدہ محبت میری بہت پسندیدہ تحریر ہے۔ سادہ اور نفیس تحریر...... دلکش پیرائے میں لکھی ہوئی۔

5۔ میں مصنفہ طیبہ عنبر مغل کی بیٹی ہوں، راول پنڈی سے تعلق ہے۔ پورا نام ماہ نور عنبر مغل ہے۔ بی ایس سی کررہی ہوں فاطمہ جناح یونیورسٹی سے۔ سیکھنے کے عمل میں طفلِ مکتب ہوں۔ خود بھی مصنفہ ہوں مگر اپنے کالج کے میگزین میں اردو اور انگلش دونوں زبانوں میں میری تحریریں چھپ چکی ہیں۔

### ظل شاہین......رحیم یار خان

1۔ شخصیت پُراثر تب ہی ہوسکتی ہے جب ہمارا ظاہر و باطن اجلا ہو اور یہ تب ہی ممکن ہوسکتا ہے جب ہم احکامِ خداوندی اور سنت نبویؐ کے راستے پر مستقل مزاجی سے گامزن رہیں حقوق اللہ اور حقوق العباد پوری طرح ادا کرنے کی کوشش کریں اور اعلیٰ اخلاق کی خوبی خود میں پیدا کرلیں تو باقی تمام خوبیاں آپ کی ذات میں خود بخود آجائیں گی کیونکہ اخلاق و محبت ہی وہ ہتھیار ہے جس سے ہم ہر شے تسخیر کرسکتے ہیں۔

2۔ اس واقعے یا اس لمحے کو پہلی بار کسی سے شیئر کررہی ہوں۔ چھوٹی سی تھی غالباً نو دس برس کی عمر میں ٹائیفائیڈ ہوا ایک ڈیڑھ ماہ اس بیماری میں مبتلا رہی ہر وقت

1۔ روز و شب کے اس گزرتے گورکھ دھندے میں خواتین اپنی شخصیت کو کیسے پر اثر بنا سکتی ہیں، آپ کا مشورہ اپنے تجربے کے حوالے سے.....

2۔ آپ کی زندگی کا کوئی دلچسپ قصہ، واقعہ یا لمحہ جس نے آپ کے فکر و خیال کا رخ موڑ دیا۔

3۔ پاکیزہ کے مختلف سلسلے کیوں پسند ہیں؟ اور آپ کون سا ایسا سلسلہ شروع کرنا چاہیں گی جو سب کو پسند بھی آئے؟

4۔ پاکیزہ مصنفات سے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں......کوئی دل کی بات؟

5۔ اپنے تعارف کو دو جملوں یا دو اشعار میں بیان کیجیے۔

آپ کے قیمتی خیالات کا انتظار رہے گا۔ آپ چاہیں تو اپنی تصویر بھی ارسال کر سکتی ہیں۔

بستر پر لیٹے لیٹے بہت بوریت اور طبیعت اداس ہو گئی، تمام کھیل کود ختم ہو گئے جس کی میں بے حد شوقین تھی۔ (خصوصاً سائیکل چلانا) ایسے میں اللہ تعالیٰ کو اپنا سچا مددگار، مسیحا اور دوست بنا کر دعا کی اور عہد کیا کہ اللہ میاں جی میں جلدی سے ٹھیک ہو جاؤں تو ہمیشہ آپ کی نماز پڑھوں گی بس جی پھر الحمدللہ، الحمدللہ زندگی میں کبھی نماز کی ادائیگی میں غفلت و کوتاہی نہیں برتی، اللہ کریم مجھ گنہگار و عاجز کی یہ ٹوٹی پھوٹی نمازیں قبول فرمائے۔ اللہ رب العزت مجھ حقیر گناہ گار کی عبادت قبول فرمائے، آمین۔

3۔ سوال یہ ہونا چاہیے تھا کہ پاکیزہ اور اس کے سلسلے کیوں پسند ہیں۔ سب سے پہلے تو میں یہ کہوں گی کہ رسالوں کی دنیا میں پاکیزہ ایک منفرد اور بھاری رسالہ ہے۔ اس کی انفرادیت اس کے مستقل سلسلوں میں پنہاں ہے۔ اس وقت دین کی باتیں، شمع ہدایت اور روحانی مشورے نہایت عمدگی سے ذہنی و روحانی بالیدگی کا سامان مہیا کر رہے ہیں۔ جبکہ ذکیہ آنٹی کا یادوں کی مالا جیسا لازوال سلسلہ جس کے مثبت اثرات میرے خیال میں ہر قاری پر مرتب ہوئے۔ ہم ان کی بتائی ہوئی بہت سی باتوں پر عمل کرنے کی بھی مکمل کوشش کرتے ہیں اور انشاء اللہ کرتے رہیں گے۔ اس کے علاوہ پاکیزہ ڈائری میں حمد یہ کلام کے علاوہ بہترین اقوال اور کام کی باتیں ہوتی ہیں، کبھی شاعری بھی اچھی مل جاتی ہے۔ نزہت اصغر کے انٹرویو اور شائستہ زریں کے سروے ہماری دلچسپی اور معلومات کا سامان لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ نزہت اصغر اور رضوانہ پرنس کے سوالات... مدِ مقابل شخصیت کو مدِ نظر رکھ کر نہایت دلچسپ اور معلوماتی ہوتے ہیں۔ ہومیو کلینک کی افادیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ جبکہ جلترنگ پاکیزہ کی جان ہے۔ اور بہنوں کی محفل ایک ایسا گھر ہے جس کی سربراہ انجم باجی ہیں اور انہوں نے اپنے خوب صورت طرزِ عمل اور اپنے اعلیٰ اخلاق کی بدولت اس گھر کے تمام افراد کو محبت و خلوص کی لڑی سے باندھا ہوا ہے۔ اللہ پاک سب کو سلامت رکھے، آمین۔ اور ہاں انجم باجی کی ایک بہترین کاوش اداریہ جو ہر ماہ بہترین موضوع پر ہوتا ہے نہایت سادگی سے بڑی سے بڑی بات اس انداز میں کرتی ہیں کہ دل میں اتر جاتی ہے۔ نیا سلسلہ تو جناب کلاسیکی ادب سے ہر ماہ شاہکار افسانہ لگائیں تو مہربانی اور شاعری کا معیار بہتر کریں میرا انتخاب دوبارہ شروع کر دیں۔

4۔ پاکیزہ مصنفات میں سب سے پہلے اپنی انجم باجی سے کچھ کہنا چاہوں گی کہ آپ کی تحریریں تو پاکیزہ کی آن بان اور شان ہیں ہی آپ کی مشفق اور محبت کرنے والی ذات ہم قارئین پاکیزہ کے لیے گراں قدر سرمایہ ہے۔ یہ آپ کی شخصیت کا ہی اعجاز ہے جو ہم دو دہائیوں سے پاکیزہ سے وابستہ ہیں۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے...... پاکیزہ کے افسانوں کی اچھی بات یہ ہے کہ مصنفات صرف رومینٹک ازم کو ہی نہیں بلکہ زندگی کے تمام مسائل اور کرنٹ افیئرز کو بھی احاطۂ تحریر میں لا رہی ہیں، یہ ایک مثبت عمل ہے، اس کے علاوہ مصنفات دیہی زندگی اور وہاں کی ثقافت و تہذیب کو بھی زیادہ سے زیادہ ایسے افسانوں کا موضوع بنائیں۔

5۔ میں نے زندگی کے ہر معاملے میں سادگی کو ترجیح دی ہے ہمیشہ اپنی ذات سے بڑھ کر دوسروں کی بھلائی کا سوچا ہے اور یہ چیز یہ سوچ بھی مجھے سکون دیتی ہے۔ یہ شعر میرے خیالات، میری فطرت کی تفسیر ہے۔

اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں اس جہاں میں
ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا

# وطن سے محبت اور قیامِ امن میں خواتین کا کردار؟

## شائستہ زریں

معزز قارئین! السلام علیکم......! 2016ء بھی رخصت ہونے کو ہے۔ گزشتہ کئی برسوں سے وطن میں بدامنی کی فضا ہے۔ بے حد تکلیف ہوتی ہے یہ سوچ کر کہ سالِ رواں بھی وطن پر دہشت گردی، بے امنی اور نفرت کے مہیب سائے پھیلے رہے۔ ہر چند کہ محبِ وطن شہریوں نے نفرتوں کی دہکتی آگ کو سرد کرنے کے لیے محبت کے پھول کھلائے۔ امن کی شمعیں جلانے کی ہر ممکن کوشش کی، ذرائع ابلاغ نے بھی اپنا مؤثر عملی کردار ادا کیا لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ اگرچہ اس پر قابو پانے کے لیے مخلصین کاوشِ پیہم کر رہے ہیں۔ کسی نے کہا کہ یہ ملک اور اس کے عوام سدھرنے والے نہیں آپ ناحق سروے کر کے اپنا وقت برباد کرتی ہیں۔ جواباً عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں مایوس ہونے والوں کو گمراہ قرار دیا ہے۔ اول تو یہ کہ مایوسی میری سرشت میں نہیں دیگر یہ کہ طبعاً میں بہت خوش امید واقع ہوئی ہوں۔ ممتاز صحافی، دانشور اور شاعر احفاظ الرحمن صاحب نے کیا خوب کہا کہ

ہم رہیں نہ رہیں
پھول جیسے مہکتے ہوئے لفظ
زندہ رہیں
پیار کی چاہ میں مسکراتے ہوئے لفظ
زندہ رہیں
نفرتوں کو مٹانے کی دُھن میں مگن لفظ
زندہ رہیں
امن کی آرزو آدمیت کے سینے میں زندہ رہے
سو میں نے بھی اپنی سی کوشش کی اور سالِ نو سے

ایک مرتبہ پھر امیدیں باندھ لیں اور اس سفر میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی خواتین کو بھی شامل کر کے ان سے معلوم کیا کہ ”وطن میں بھڑکتے نفرت کے شعلوں کو بجھانے اور امن و امان قائم کرنے میں آپ اپنا کردار کس طرح ادا کریں گی؟“

### بلقیس جمال
### (بزرگ گھریلو خاتون)

میں نے اپنی عملی زندگی کے طویل عرصے میں یہ مشاہدہ کیا ہے کہ جب ہم اپنے فرائض اور ذمے داریوں سے غفلت برتنے لگتے ہیں تو زندگی کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ وطن میں جاری دہشت گردی اسی بات کا ثبوت ہے۔ ایک ماں ہونے کے ناتے میں اپنی اولاد پر کڑی نظر رکھتی ہوں کہ وہ کسی غیر قانونی یا غیر اخلاقی سرگرمیوں میں ملوث نہ ہو۔ میرا خیال ہے کہ



اگر تمام مائیں اسی اصول پر عمل کریں تو امن دشمنوں کو دہشت گرد دستیاب ہی نہیں ہوں گے۔

## نسیم نازش

### (شاعرہ، انکم ٹیکس انسپکٹر)

میں ایک شاعرہ ہوں اور میرا رشتہ قلم اور لفظ سے ہے۔ میں امن کے لیے نظمیں لکھتی ہوں۔ جنگ اور دہشت گردی کے خلاف اشعار لکھتی ہوں۔ امن اور محبت کا پیغام پہنچانے میں ایک شاعرہ یہی فریضہ انجام دے سکتی ہے۔ حال ہی میں میری نظموں کی کتاب ’’ابھی سورج نہیں نکلا‘‘ شائع ہوئی ہے۔ میری یہ نظموں کی کتاب نفرت، جنگ اور دہشت گردی کے خلاف اعلانِ



جنگ ہے۔ میری ایک نظم ’’نئی دنیا‘‘ ملاحظہ کیجیے۔

دراڑیں پڑ رہی ہیں ظلم کی دیوار کے اندر
سمٹتے جا رہے ہیں جبر کے سائے
یہی وہ خواب ہیں جن سے میرے آبا کی آنکھیں
جگمگاتی تھیں
مجھے رستہ دکھاتی تھیں
ابھی لیکن بہت لمبی مسافت ہے
مصائب کا سمندر راہ میں ہے
کئی سفاک دشمن تاک میں ہیں
زبانی اس کے دعوے ہیں جن کو
وہی تو چاہتے ہیں جنگ کے شعلے
کبھی بجھنے نہ پائیں
کہ اس کے واسطے یہ سارا عالم
اسلحے کی ایک منڈی ہے
اگر دنیا میں قائم امن ہو جائے
تو ان کا اسلحہ کیسے بکے گا
مگر اب جنگ سے انکار ہوتا جا رہا ہے
بشر بیدار ہوتا جا رہا ہے
ہزاروں سال کی تاریخ شاہد ہے
محبت سا فلک پر کوئی ستارہ نہیں ہے
کہ خوابِ امن جنگوں سے ہارا نہیں ہے

## شاہین برنی

### (وائس چیئر پرسن انصار برنی ٹرسٹ انٹرنیشنل)

جب انسان کسی قوم کا فرد بنتا ہے تو وہ سرزمین اسے اپنی اولاد بنا لیتی ہے اور وہ اولاد اپنے وطن کو ماں کا درجہ بلکہ ماں سے بھی زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ وطن ماں کا درجہ اور قوم ماں کی کوکھ سے جنم لینے والی اولاد کا درجہ پا لیتی ہے۔ اس طرح پوری قوم بلاتفریقِ رنگ و نسل اس ماں کی اولاد بن جاتے ہیں۔ جب قوم ہوتی ہے اس میں نفرت کے شعلے جنم نہیں لے سکتے، نفرت



کے شعلے اسی وقت جنم لیتے ہیں جب کوئی گروہ قوم سے نکل کر رہتی دنیا تک رہنے والی ماں کے لیے قبر کھودنا شروع کردیتا ہے۔ انصار برنی ٹرسٹ پاکستان کو اس درجے پر دیکھتا ہے جہاں اس دھرتی پر لاکھوں مائیں اور اولادیں قربان کی جاسکتی ہیں۔ اور پاک وطن سے جنم لینے والی کوئی بھی اولاد وطن میں نفرت کے شعلے بھڑکانے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ میں یہ سمجھتی ہوں کہ بھڑکتے نفرت کے شعلے وہاں جنم لیتے ہیں جہاں قوم مردار ہوجائے اور الحمدللہ بحیثیت پاکستانی میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ ہم زندہ قوم ہیں، پائندہ قوم ہیں۔ ہم سب کی ہے پہچان، ہم سب کا پاکستان۔ کہ اس پرچم کے سائے تلے ہم اسی مٹی کی اولاد اور ایک قوم ہیں۔ غیر ملکی طاقتیں میری قوم کو کہیں شیعہ کہیں سنی کہیں وہابی کہیں اہلِ حدیث تو کہیں پنجابی، پختون، مہاجر، سندھی، سرائیکی میں بانٹنے کی کوشش کرتی ہیں۔ میرے نزدیک سندھ' پنجاب' کے پی کے اور بلوچستان ایک ماں کی اولاد ہیں۔ جن کی ماں صرف پاکستان ہے۔ پاکستان کے چار بچے چار صوبے ہیں لیکن ان کی رگوں میں دوڑنے والا خون صرف ان کی ماں پاکستان کی امانت ہے اور یہی میرا اور انصار برنی ٹرسٹ کا کردار ہے کہ ہم اپنی قوم کو زندہ قوموں کی طرح متحد رکھیں نفرت کی آگ کے شعلے خود بجھ جائیں گے۔

## افسر سلطانہ

**(اسسٹنٹ پروفیسر سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی۔ قلمکار)**

کسی بھی ملک یا قوم کے لیے امن وامان سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ بحیثیت پاکستانی تو سب دامے درمے سخنے اسے قائم ودائم رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں لیکن ایک معلم اور ایک قلمکار پر بھاری ذمے داری اس لیے عائد ہوتی ہے کہ یہ دونوں افراد بے حسی کے زمرے میں نہیں آتے۔ ان کا دل ہر اس تکلیف پر تڑپتا اور سسکتا ہے جو اُن کے سامنے اپنی بھیانک تصور لیے آموجود ہوتی ہے۔ میں سمجھتی ہوں تربیت صرف گھر ہی میں نہیں ہوتی، تعلیمی ادارے بھی اس میں بھرپور کردار ادا کرتے ہیں۔ لیکچر شروع کرنے سے پہلے میں کم ازکم پانچ منٹ سبجیکٹ سے ہٹ کر تمام بچوں کو امن وامان کے فقدان کے ہولناک نتائج سے آگاہ کرتی ہوں۔ میری کلاس میں تمام قومیت کے بچے ہوتے ہیں۔ ایک کوشش یہ بھی ہوتی ہے کہ ان میں تعصب نہ پھیلے۔ اس کے لیے میری عملی کوشش ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ نمبر دیتے وقت میرٹ کا بے حد خیال رکھتی ہوں کیونکہ میرے خیال میں بعض اوقات محرومیاں بھی تو جوان نسل کو برائیوں کی سمت ڈال دیتی ہیں جس سے امن وامان کو نقصان ہوسکتا ہے۔ چونکہ میں کئی برسوں سے لکھ نہیں پائی ہوں۔ شاید آپ کے حافظے میں سب موجود نہ ہو، بحیثیت قلمکار میرے بہت



سے افسانے اسی موضوع پر لکھے گئے۔ ہیں۔ قلم کی حرمت ہر لکھنے والے سے تقاضا کرتی ہے کہ اس خطے میں رہنے والے ہر بڑے بچے کے ہاتھوں میں امن کی فاختائیں تھما کر محبت، ہمدردی اور انسانیت کے چراغ جلائے رکھیں۔ اس وطن کو اللہ رب العالمین اپنی رحمتوں کے سائے میں سکون اور عافیت عطا فرمائے۔

(الٰہی آمین)

## صباحت احسان

**(میزبان حالاتِ حاضرہ پی ٹی وی کراچی مرکز)**

پاک وطن میں بھڑکتی نفرتوں کی وجہ میرے مطابق لسانیات ہے جو کہ ہمارے ملک کے شاطر سیاستدانوں نے معصوم عوام کے دلوں میں بو دی ہے۔عوام کبھی کسی کی اور کبھی کسی کی باتوں میں آکر اپنے ہی بھائیوں کے خلاف ہو چکے ہیں۔بحیثیت میزبان حالاتِ حاضرہ میں یہی سمجھتی ہوں اور میری کوشش بھی یہی ہوتی ہے کہ سب سے پہلے میں سامنے والے کو انسان سمجھوں۔اپنے بچوں کو بھی یہی سمجھاتی ہو کہ انسان کو انسان سمجھ کر ٹریٹ کرو۔یہ نہیں کہ یہ سنی ہے، یہ شیعہ، یہ سندھی ہے کہ پنجابی، ہم سب پاکستانی ہیں اور اگر ہم آپس میں ہی تفرقہ رکھیں گے تو دشمن ہم کو چت کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔میری کوشش ہوتی ہے کہ اپنے لفظوں، اپنے پروگرام اور اپنے پیغامات میں صرف اسی بات پر روشنی ڈالوں کہ خود کو اور



دوسروں کو پہلے مسلمان اور پھر پاکستانی سمجھیں اور یہ سوچیں کہ ہم سب کو اپنے گھر میں چھپے ہوئے اس اصل دشمن کو نکالنا ہے جس نے ہم تمام پاکستانی بہن بھائیوں کو گمراہ کر کے مارنے اور مرنے پر مجبور کر دیا ہے اور اگر ہم نے ایسا کر لیا تو اپنے وطن میں بھڑکتی نفرت کی آگ بجھا کر امن و امان قائم کرنے میں ایک دن ہم ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔انشاءاللہ

## عامرہ شاھد

**(ھیڈ آف کونٹینٹ A.PLUS TV)**

بحیثیت ماں میں سمجھتی ہوں کہ سب سے پہلے تو اپنے گھر سے شروعات کرنی چاہیے۔نفرت، دشمنیاں اور دل میں تعصب رکھنا یہ تمام برے افعال بچے گھر اور ماں سے سیکھتے ہیں کہ ان کا گھر میں زیادہ تر وقت ماں کے ساتھ گزرتا ہے اور وہ ماں کی ذہنی رسائی کے ساتھ بڑے ہوتے ہیں اگر ماں کسی بھی مسلک، طبقے یا صوبے کے خلاف نفرت کا اظہار کرے تو بچے وہ





سیکھ لیتے ہیں بالخصوص ساس نندوں کے جھگڑے بچوں کے دل میں دادی، پھپھیوں کے خلاف نفرت بٹھانا۔اگر ماں ان تمام باتوں سے دور رہے گی۔بچوں کو فراخدلی، ذہنی وسعت، برداشت، باہم چیزیں بانٹنا، حسنِ سلوک ماں سکھائے گی تو بچہ اچھا انسان بن کر سامنے آئے گا۔نفرت کے شعلے بجھیں گے تو معاشرے میں امن و امان بھی قائم ہوگا اور یہ کام ماؤں کو انفرادی سطح پر کرنا ہے۔اور میں اپنا

یہ فرض خوش اسلوبی سے نباہ رہی ہوں اور انشاءاللہ نباہتی رہی ہوں گی۔

## گلناز نواب
### (صحافی)

اختلاف رائے کو برداشت کرنے یا دوسروں کا نقطۂ نظر سمجھنے میں ناکامی دراصل نفرت کو جنم دیتی ہے۔ ہم اپنے اندر اختلاف رائے کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کر کے، دوسروں کا مؤقف پوری توجہ و ہمدردی سے سن کر اور سمجھ کر ہی نفرت کی آگ کو مزید بھڑکنے سے روک سکتے ہیں۔



ہمیں گالم گلوچ کے بجائے مکالمے کو فروغ دینا ہوگا۔ اپنا عقیدہ نہ چھوڑیں اور دوسرے کے عقیدے کو نہ چھیڑیں کی پالیسی اپنا کر مثبت سماجی رویے کو اور روابط کو فروغ دیا جا سکتا ہے جو بالآخر نفرتوں اور کدورتوں میں کمی کا سبب بنتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں اگر نفرت پر قابو پالیا جائے تو پھر قیامِ امن کی منزل آسان ہوجاتی ہے۔ ہمیں فرائض کی ادائیگی اور حقوق کی فراہمی میں توازن قائم کرنا ہوگا کہ زندگی صرف حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد ہی کا نام نہیں بلکہ اپنے فرائض مکمل طور پر اور صدقِ دل سے ادا کرنا بھی ضروری ہوتا ہے اور الحمدللہ میں اپنے قلم کے توسط سے اس ضمن میں اپنا کردار ادا کرنے کی بھرپور کوشش کرتی ہوں۔

## ایمن راشد
### (طالبہ میڈیکل کالج)

بچپن ہی سے وطن سے ملک دشمن عناصر کے خاتمے کی دعا مانگ رہی ہوں۔ اب جبکہ میں میڈیکل کی طالبہ ہوں عمر کے اضافے کے ساتھ ساتھ یہ شعور اجاگر ہوا کہ دوسروں کے ٹھیک ہونے کا انتظار کرنے کے بجائے ہمیں خود کو ٹھیک کرنا ہوگا جب ہم ایک اکائی کے طور پر خود ٹھیک ہوں گے تو معاشرہ ٹھیک ہو جائے گا۔ منافرت پھیلانے والوں کو دوش دینے کے بجائے ہمیں محبت کے پیغام کو عام کرنا ہوگا۔ جب میں خود انسانیت کا مظاہرہ کروں گی، ہل جل کر رہوں گی تو لوگ متاثر ہو کر میرے ساتھ چلیں گے ناں اور پھر ہم سب مل کر کوشش کریں گے کہ دلوں سے نفرتوں کا زہر نکال پھینکیں۔ جب دل میں محبت کے چراغ جلیں گے تو نہ دشمنیاں ہوں گی اور نہ ہی امن وامان



متاثر ہوگا۔ ہم سب مل کر وطن سے محبت کر کے اس کی شان بڑھائیں گے کہ...

ہے رشکِ چمن تیرا غنچہ رکھتا ہے عجب خوشبوئے وفا
یہ بوئے وفا مہکے گی سدا ہم تجھ سے وعدہ کرتے ہیں
تیری بات بڑھے تیری آن بڑھے تیرا کام بڑھے تیری شان بڑھے
تقدیر ہماری نکھرتی ہے جب تیرے گیسو سنورتے ہیں

## حرا تبسم

**(طالبہ اسلامک مشن یونیورسٹی)**

دنیا میں امن قائم کرنے کے لیے سب سے پہلے تو مجھے خود باعمل بننا پڑتا ہے۔ چونکہ پہلا قدم اٹھانا شرط ہے جب میں خود باعمل بن کر ہدایت کے راستے پر چلوں گی تب ہی اوروں کو بھی اس راہ پر چلانے میں کامیاب ہوسکوں گی اور اس کے لیے میں قرآنی تعلیمات کو عام کرتی ہوں۔ لوگ جب قرآنی احکام کو مضبوطی سے پکڑ کر اللہ کے اس فرمان پر کہ ”اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور تفرقے میں نہ پڑو“ پر عمل کریں گے تو معاشرہ اپنے آپ ہی امن کا گہوارہ بن جائے گا۔ اللہ مجھ سمیت سب کو محبت اور امن کی راہ پر چلائے، آمین۔

عزیز قارئین!

محبت اور امن کے قیام کے ضمن میں سروے میں شریک مختلف عمروں اور شعبوں کی خواتین کی عملی کاوشیں لائقِ تحسین ہیں۔ یہ عمل جہدِ مسلسل کا متقاضی ہے۔ وطنِ عزیز کو نفرت اور دہشت گردی سے پاک رکھنے کے لیے ہم سب کو اپنا، اپنا کردار منصفی اور مخلصی سے ادا کرنا ہے۔ انشاء اللہ ہمارے خوابوں کو روشن تعبیر دیتی وطنِ پاک سے محبت اور امن کے دیے جلانے کی خوش رنگ ساعت ضرور آئے گی۔ عذرا باجی، انجم باجی، نزہت اصغر، آمنہ حماد، ادارے کے دیگر ارکان اور میری جانب سے آپ سب کو نیا سال مبارک ہو۔

خدا کرے کہ نیا سال ہی مبارک ہو
خدا کرے کہ مصائب ٹلیں وطن سے اب
وہ لوگ آج جو نفرت کے بیج بوتے ہیں
خدا کرے کہ محبت کریں چمن سے اب
(آمین)

☆☆☆



شاعرہ یاسمین کنول ”پسرور“ اپنے شعری مجموعے کی تقریبِ رونمائی میں ڈاکٹر منور ہاشمی سے شیلڈ لیتے ہوئے، یہ تقریب 22 اکتوبر 2016ء کو اسلام آباد کے ایک مقامی ہوٹل میں منعقد کی گئی تھی، جس میں ادب کے مداحوں نے بھرپور شرکت کی۔

## غزل

جانے کیوں مجھ پاس رہتی ہیں
دل کی گلیاں اداس رہتی ہیں
دوریاں ہیں مگر ملال نہیں
تیری یادیں جو پاس رہتی ہیں
کون سا غم ہے اب بتا بھی دو
کیوں یہ آنکھ اداس رہتی ہیں
خوب صورت سی ہستیوں کے بغیر
ساری گلیاں اداس رہتی ہیں
شادمانی، مسرتیں، خوشیاں
اب کہاں کس کے پاس رہتی ہیں
گھر بسانے کو اپنی بیٹی کا
مائیں اکثر اداس رہتی ہیں
بیٹیاں تو پرایا دھن ہیں بھی
کب یہ ماؤں کے پاس رہتی ہیں
اتنے لوگوں کے اس ہجوم میں بھی
محفلیں کیوں اداس رہتی ہیں
میں نے دیکھا نہیں ہے خوشیوں کو
ہاں کہیں آس پاس رہتی ہیں
ایسی یادیں ہیں بے شمار کنول
دل کے جو آس پاس رہتی ہیں

# شادی کا احوال

## قاری بہنیں

## شینا کی شادی

### تحریر: ناہید حیات، آسٹریلیا

کچھ سال پہلے جب ہم نئے نئے پرتھ (آسٹریلیا) میں آئے تھے تو وحیدہ اور ہم لوگ قریب قریب رہتے تھے۔ میرے بچے چھوٹے تھے اور ہر وقت ان کی طرف آتے جاتے رہتے تھے۔ اب ہمارا گھر ذرا دور ہے مگر دل آج بھی قریب ہے۔ شینا (جس کا اصل نام سنبلہ ہے) نے فارمیسی میں ڈگری لی ہے جاب کرتی ہے معین کے چار بچوں میں یہ سب سے بڑی ہے اور بیٹوں سے بڑھ کر ماں باپ کا ساتھ دیا ہے۔ ہارون (شینا کا دولھا) دبئی میں جاب کرتا ہے اور اس کے ماں، باپ ملتان میں ہوتے ہیں، جیسے ہی ہارون کا ویزا لگا تھا شینا اور ہارون کی شادی کی باقاعدہ ڈیٹ فکس ہوگئی یعنی 24 جولائی۔

ہم سب فرینڈز ان کے گھر گئے تاکہ فنکشنز کی تفصیلات طے کرلی جائیں...... میں ایک نوٹ بک ساتھ لے کر گئی تھی کیونکہ مجھے ہر کام لکھ کر کرنے کی عادت ہے۔ 22 جولائی کو مہندی اور 24 کو شادی تھی تو پہلی ڈھولکی ہم نے ہفتہ 16 جولائی کو رکھی تاکہ سب کو ریسٹ مل جائے کیونکہ یہاں زیادہ تر کام ہم نے خود ہی کرنے ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے ڈھولکی کا مینیو بنایا کھانا ہم نے سادہ ہی رکھا۔ سو ڈھولکی پر کھانے کے بجائے زیادہ زور (فن) پر دیا گیا۔ دو سالن اور سادہ چاول رکھے وہ بھی قریبی دوستوں نے آپس میں بانٹ لیے۔ میرے حصے میں صرف سلاد آیا۔ پھر مہمانوں کی لسٹ بنائی...... اس میں میری فرینڈز، وحیدہ کی فرینڈز، میری فرینڈز کی فرینڈز، میری بہن کی فرینڈز لسٹ چالیس پچاس سے ہوتی ہوتی اتی تک جا پہنچی مجھے جگہ کی فکر ہوئی مگر ایسے موقع پر ہم ہمیشہ کہتے ہیں۔ ”جگہ دل میں ہونی چاہیے۔“ ایسے فنکشن چونکہ بہت کم ہوتے ہیں تو لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا اور یقین کریں کتنے ہی ایسے لوگ تھے جو وحیدہ لوگوں کو جانتے ہی نہیں تھے۔ شرکت کرنے اور ہاتھ بٹانے کو تیار تھے۔

رمضان کا مبارک مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ وحیدہ نے سب کے گھر جا کر شادی کے کارڈ دیے اور میں نے viber پر ڈھولکی نام سے گروپ بنا کر سب کو انوائٹ کیا۔ فنکشن خالصتاً خواتین کا تھا مگر جو ڈرائیو نہیں کرسکتیں یا دور رہتی ہیں ان کے لیے خصوصی رعایت تھی کہ اپنے میاں کے ساتھ آجائیں۔ سوان مردوں کے لیے دوسری دوست ثمینہ کی طرف انتظام تھا۔

جیسے ہی شادی طے ہوئی سب کو یہ فکر کہ پہنا کیا جائے؟ سو سب مل کر بازار چلے گئے۔ بڑی، بڑی دکانیں، اونچی اونچی برینڈز اور ایک سے بڑھ کر ایک، جوڑا چوز کرنا مشکل ہوگیا بڑی مشکل سے ایک سوٹ پسند آہی گیا اس کے لیے بھاؤ تاؤ کرنے لگے اور...... جناب آنکھ کھل گئی...... بھئی یہاں یہ سہولت کہاں؟ کوئی بھی موقع ہو اپنی الماری ہی کھنگالنی پڑتی ہے۔ پاکستان سے بھلے سوٹ کیس کے سوٹ کیس بھر کر لائیں مجال ہے جو موقع پر کچھ ڈھنگ کا مل جائے...... آخر ایک گرین سا سوٹ نکل ہی آیا جو شیریں نے گفٹ کیا تھا۔

27 ویں رمضان کو نکاح تھا جو چند لوگوں کی موجودگی میں گھر پر ہی ہوا...... ہارون اور اس کا بھائی پہنچ چکے تھے مگر والدین نے بعد میں آنا تھا۔ شینا نے سفید کڑھائی والا سوٹ اور سرخ ستاروں والا دوپٹا اوڑھ رکھا تھا اور سادہ سی بہت پیاری لگ رہی تھی۔ ظہر کے بعد نکاح تھا اس کے بعد سب نے مل کر افطاری بنائی اور مل کر کھائی۔ شادی کی تیاریوں میں عید خاموشی سے آئی اور گزر گئی۔

میری اپنی بیٹی تو ہے نہیں سو میری درخواست پہ فرینڈز کی بیٹیوں نے ڈانس تیار کیے...... ڈھولکی سے ہفتہ پہلے ہم روز ناہید (میری ہی ہم نام دوست) یا شبینہ (میری انڈین دوست) کے گھر اکٹھے ہوتے۔ بچیاں ڈانس پریکٹس کرتیں ہم ڈھولکی پر گانے گاتے خوب رونق لگتی۔ یہ علیحدہ بات کہ جن کے گھر شادی تھی وہاں راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

اگلا مرحلہ ڈیکوریشن کا تھا مجھے اپنے بازار بہت یاد

آئے لڑیوں کی دکانیں، پھول اور ہر طرح کی سجاوٹ کی چیزیں کیسی وافر ہیں اور سستی بھی...... یہاں تو بہت مشکل ہوگی۔ ہاں کرسمس ٹائم ہوتا تو الگ بات تھی...... خیر کچھ میں نے ڈھونڈ لیا اور کچھ شبینہ کے گھر سے نکل آیا۔ میرے بیک یارڈ میں پرانا سا جھولا پڑا تھا۔ جس کا رنگ روپ اڑ چکا تھا۔ اسے میں نے پھولوں کی لڑیوں اور اپنے جہیز کے دوپٹوں سے اس طرح سجا دیا کہ وہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ ڈیکوریشن کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک اور مسئلہ درپیش ہوا۔ ہم کب سے اپنے گھر کے فرنٹ اور بیک کا فرش پکا کروانا چاہ رہے تھے سب مرحلے طے ہوتے ہوتے یہ ٹائم آگیا کہ جب ڈھولکی میں پندرہ دن رہتے تھے تو ہمارے گھر کے آگے اینٹیں ہی اینٹیں پڑی تھیں۔ مستری نے یقین دلایا کہ وقت پر کام ختم ہو جائے گا اور اس نے کوشش بھی کی۔

16 جولائی کی صبح بڑی مصروف تھی...... میں نے سجاوٹ کو آخری ٹچ دیا...... دلہن کے لیے جھولا تیار تھا۔ ڈائننگ ٹیبل کو گیراج میں رکھا ٹیبل ٹینس کو بیک یارڈ میں اور یوں لاؤنج ڈائننگ اور گیسٹ روم ملا کر اتنی جگہ بن گئی کہ گزارہ ہو جائے۔ فرش پر پیلی اور سبز چادریں بچھائیں اور ڈھیر ساری اصلی اور نقلی موم بتیاں مختلف جگہوں پر رکھیں۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا شدید بارشوں کی وجہ سے مستری کام ختم نہ کرسکا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ ڈرائیو وے اور باقی جگہ پر تو کام ہوگیا مگر داخلی دروازے کے عین سامنے کھدی ہوئی زمین کیا نرا کیچڑ ہی تھا بارش نے بھی کہ آج ہی برسنا ہے۔ وہ تو ہاتھ جھاڑ کر چلتا بنا ہم نے فاصلے، فاصلے سے کچھ اینٹیں رکھ کر گزرنے کا رستہ بنایا اور اندر پرانا تولیا بچھا دیا اور سب کو میسج بھیج دیا کہ

انہی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

وائبر زندہ باد کہ ایک وقت میں اسی لوگوں تک بات پہنچ گئی۔ ہمسایوں کو بھی پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس دن ہمارے گھر دیر تک ہلا گلا ہوگا (کہیں یہاں کے قانون کے مطابق) پولیس نہ بلالیں۔

شام پانچ بجے قریبی فرینڈز آگئیں تو صاحب کو کھانا دے کر مردوں کی طرف روانہ کیا۔ تقریباً سب نے ہی وقت کی پابندی کی۔ سب کے آنے کے بعد دلہن شبینا کو سرخ دوپٹے کے سائے تلے باہر لے کر آئے۔ اس نے لیمن کلر کا فراک اور چوڑی دار پاجامہ پہن رکھا تھا۔ تھوڑا سا فوٹو سیشن ہوا پھر ڈھولکی سنبھالی گئی۔ ڈھولکی بھی ایک نہیں دو، دو، میری بہن صائمہ نے میری فرینڈ طاہرہ کو چیلنج کیا ہوا تھا تو یہ جہلم بمقابلہ ہری پور تھا۔ دونوں کی وائبر پہ بھی کافی نوک جھونک چلتی رہی جس نے سب میں ایکسائٹمنٹ بھر دی تھی۔

گانوں کا دورانیہ کافی دیر تک چلا۔ دونوں ٹیمیں باری، باری گانے گاتی رہیں۔ مقابلہ بغیر ہار جیت کے ختم ہوگیا کیونکہ کھانے کا ٹائم ہوگیا تھا۔ سب نے مل کر کھانا لگایا۔ مجھے صرف سلاد بنانا تھا وہ بھی میں بھول گئی جلدی سے سلاد کی چیزیں سلمٰی اور ثاقبہ کو دیں جنہوں نے کھانا گرم ہونے تک بنا دیا۔

کھانے سے فارغ ہوکر ڈانس کے لیے جگہ بنائی۔ باقی سب کرسیوں اور فرش پر جہاں جگہ ملی بیٹھ گئے اسپیکر اور میوزک سیٹ کیا اور ساتھ ہی اعلان کردیا کہ کوئی بھی ڈانس کی تصویر یا ویڈیو نہیں بنائے گا۔ بلکہ لڑکیوں کی ماؤں نے کڑی نگاہ رکھی۔ آغاز چھوٹی بچیوں سوہا، ساوی اور منہا کے ڈانس سے ہوا پھر بڑی بچیوں عنیزہ، عائشہ، عمارہ، شہیرہ اور ایمن نے اپنا کمال دکھایا۔ زارا اور مہک کا بھی الگ سے آئٹم تھا۔ سب نے صرف چار دنوں میں تیاری کی تھی اور بہت زبردست کی تھی۔ سب لگ بھی بہت پیاری رہی تھیں۔ اس کے بعد ہم نے لڈی ڈالی اور سب کو کھینچ کھانچ کر پنڈال میں لائے۔ کئی چھپے رستم نکلے کئیوں نے اپنے کب کے چھپے ارمان نکالے اور کئیوں کے پوشیدہ جوہر کھل کھل کر سامنے آئے۔ دیر تک یہ ہلا گلا چلتا رہا خیر سے خواتین کا جوش ختم ہونے میں ہی نہیں آرہا تھا کو جب تک مرد لینے نہیں آگئے۔ آہستہ، آہستہ سب رخصت ہوگئے صرف قریبی دوستیں رہ گئیں۔ ایک نے جھاڑو پکڑا، دوسری برتن دھونے لگی اور باقی سب نے مل کر سمیٹا سمٹائی کی اور تھوڑی دیر میں ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے یہاں کچھ ہوا ہی نہیں...... اور یوں یہ کامیاب تقریب اختتام کو پہنچی...... مہندی اور شادی ہفتے بعد تھی اس لیے ریسٹ کا موقع مل گیا۔ اس ہفتے کے دوران وحیدہ نے اپنے گھر ڈھولکی رکھی۔ جس میں آس پاس کی فرینڈز آجاتی تھیں میں بھی ایک دو بار ہوآئی۔ (دولہا) ہارون کے والدین بھی آچکے تھے۔

مہندی کا فنکشن ہال میں تھا۔ یہ بھی صرف خواتین کا فنکشن تھا۔ ہال کی ڈیکوریشن عابدہ اور عالیہ نے کی تھی اور کیا خوب کی تھی۔ شبینا کو اس کی بہن عائشہ اور سلمٰی لے کر آئیں آج اس نے سبز غرارہ اور پیلا کرتا پہن رکھا تھا بہت اچھی لگ رہی تھی۔ پہلے ڈھولکی پر کچھ گیت گائے گئے اگرچہ یہاں بھی ڈھولکیاں موجود تھیں مگر چونکہ بہت سارے لوگ

جو میرے گھر میں تھے۔ یہاں موجود نہیں تھے اس لیے ایک ڈھولکی پہ ہی مل کر گالیا۔ پھر کھانا کھایا گیا حلوا پوری کباب چنے وغیرہ تھے حلوا، وحید نے خود بنایا تھا باقی کیٹرنگ کروائی۔ ہمارے مطلب کی کیٹرنگ کی سہولت بھی کچھ عرصے سے ہی میسر ہے ورنہ میں نے ایسی شادیاں بھی اٹینڈ کی ہیں جہاں پوری شادی کا کھانا خواتین خود ہی مل جل کر بناتی تھیں۔ کھانے کے بعد مہندی کی رسم ہوئی اور آخر میں دولھا اس کی امی اور بھائی سے ڈانس کروایا۔ اس طرح یہ تقریب بھی بخیر وخوبی انجام پائی۔

ایک دن بعد شادی کا فنکشن تھا...... اس کے لیے ہال اور اسٹیج کو پروفیشنل سے بنوایا گیا...... عورتوں اور مردوں کا الگ انتظام تھا تاکہ سب کھل کر تیار ہوسکیں کیونکہ بہت سی خواتین حجاب کرتی ہیں خود دلہن بھی حجاب کرتی ہے۔ سب مہمان پہنچ گئے تو دلہن کو لایا گیا۔ شینا نے آج ٹی پنک لہنگا پہن رکھا تھا اور بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ دولھا کے گھر سے صرف اس کے والدین اور بھائی ہی آئے تھے۔ اس لیے بارات والا کوئی سین نہیں تھا۔ اس فنکشن کے لیے بھی کیٹرنگ کروائی گئی۔ کھانے میں بہت ورائٹی تھی اور مزیدار بھی تھا۔ کھانے کے بعد دولھا کو لایا گیا۔ نیگ کی رسمیں ہوئیں چونکہ وہ تھے ہی تین لوگ اس لیے کچھ خواتین ان کی طرف سے ہوگئیں۔ خوب بحث ومباحثے کے بعد پانچ سوڈالرز پر سب متفق ہوگئے...... دولھا، دلہن کے والد بھی آگئے۔ دونوں فیملیز کے ساتھ فوٹوز ہوئے اور آخر میں سب کی دعاؤں کے سائے میں رخصتی ہوئی۔

وحیدہ کے گھر کا ماحول بہت روایتی اور خالص پاکستانی ہے، شادی میں بھی انہوں نے اپنے علاقے کی سب رسمیں کی...... شادی کے تیسرے دن مکلاوے اور دسویں دن گوگیوں کی رسم میں بھی قریبی دوستوں کو بلایا۔

قارئین یہ شادی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ولیمہ ہونا باقی ہے جو ملتان میں ہوگا کب ہوگا؟ جب شینا کو چھٹی ملے گی...... ہارون مستقل یہاں آچکا ہے اور دونوں بہت خوش ہیں۔ اللہ انہیں ہمیشہ خوش رکھے، آمین۔

## شادی میرے فہد کی

**تحریر: نگہت غفار، کراچی**

الحمد للہ خدا کے فضل وکرم سے چوتھی بہو کی آمد پر میں آپ سب کو اپنی خوشیوں میں شامل کرنا چاہتی ہوں۔ ویسے تو یہ پانچویں بہو ہوتی مگر فہد سے بڑے زبیر ابھی باقی ہیں۔

صبا کی آمد ڈرامائی انداز میں ہوئی۔ ایک روز اس نے مجھے دیکھا کہ میں اس کی امی کے پاس ہی دوسری بہو کی بری سلوانے گئی تھی تب اس نے دل میں سوچا کاش یہ میری ساس ہوتیں اور میری بری میں یہ شرارے لائی ہوتیں (یہ بعد میں مجھے معلوم ہوا) وہ گھڑی قبولیت کی تھی اور ایک بار میں جب حلیمہ (صبا کی امی) سے ملنے ان کے گھر گئی تب صبا دلہن کو تیار کررہی تھی (صبا بیوٹیشن ہے) حلیمہ بھابی کی آواز پر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو والہانہ انداز میں میری طرف لپکی اللہ آپ کہاں چلی گئی تھیں آپ ہمیں بہت یاد آتی



بارات کے دن دولھا اپنی پیاری دلہن صبا کے ہمراہ

تھیں۔ سچ آپ کو دیکھ کر بہت خوشی ہورہی ہے وہ مجھ سے بری طرح لپٹی ہوئی تھی میں نے اس کا ماتھا چوما اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں۔ بیٹا میں نے ٹیچنگ سے ریٹائرمنٹ لے لی ہے اسی وجہ سے ادھر بہت کم گزر ہوتا ہے خیر میں گھر آگئی اور گھر آکر میں نے ذکر کیا اور اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ اگر زبیر کے لیے صبا کا رشتہ مانگ لوں تو بچوں نے سیریس نہیں لیا میں بھی خاموش ہوگئی۔

میری نواسی منال' صبا سے بیوٹی کورس کے سلسلے میں جاتی تھی۔ اس نے ایک روز صبا سے کہا آپی...... آپ

میری مامی بن جائیں صبا نے مسکرا کر مناہل کی طرف دیکھا اور بولی اچھا ٹھیک ہے اور تب ہی مناہل نے اپنے موبائل پر فہد اور زبیر کی تصویر دکھائی صبا نے فہد کے حق میں فیصلہ دیا اب یہاں سے شازیہ، امبر (میری بیٹیاں) اور مناہل نے بھاگ دوڑ شروع کی کہ امی آپ جائیں آنٹی سے بات کریں میں نے کہا۔ ارے ایسے کیسے ہاں کردوں...... پہلے استخارہ وغیرہ کرواؤں گی پھر...... ہی فیصلہ ہوگا...... الحمد للہ مفتی صاحب سے معلوم کیا اور یوں سب نے ہاں کردی پہلے انگجمنٹ کی تقریب ماشاء اللہ سے بخیر وخوبی انجام پائی۔

صبا کی چھوٹی بہن جس کی شادی ہو چکی تھی اسے



تقریب ولیمہ کی خوشی چہروں پر لیے فہد اور صبا

جب حلیمہ بھابی نے فہد سے رشتے کے بارے میں سکھر فون کیا تو وہ خوشی اور مسرت سے ماں سے بولی امی جی آپ فوراً ہاں کریں سچ میں امی مجھے بہت خوشی ہو رہی میری آپی کو مس نگہت کے گھر جانا ہے...... بہت ہی اچھے لوگ ہیں امی جی فوراً بات طے کردیں دیر بالکل نہ کریں...... اس وجہ سے جلد ہی منگنی کی رسم ادا کی گئی مجھے بھی بے حد خوشی ہو رہی تھی کہ حلیمہ بھابی جیسی پُرخلوص، ملنسار محبت کرنے والی عزت دینے والی پیاری ہستی میری سمدھن بن رہی ہیں اور مجھے اتنا پیار کرنے والی سادی سی لڑکی بے حد سمجھدار جس نے اپنے والد کے انتقال کے بعد گھر کو سنبھالا بہن کی شادی کی ہر عید تہوار پر بہن، بہنوئی اور بھانجے کو ڈھیروں تحائف بھیجتی...... صبا بہت پیار کرنے والی ہر ایک کا خیال رکھنے والی اور احترام کرنے والی لڑکی ہے اللہ تعالیٰ ساری زندگی اسے ایسا ہی رکھے۔ میرا بیٹا سب سے چھوٹا مگر ہر رتبے اور رشتے کا خیال رکھنے والا، انتظامی صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے اس میں گھر میں یا عزیز و اقارب میں کوئی تقریب ہو...... وہاں فہد کا ہونا ضروری ہے اللہ تعالیٰ اس جوڑی کو قیامت تک اسی طرح شاد و آباد اور اچھا رکھے (آمین ثم آمین)

فنکشن کچھ اس طرح تھے۔

31 اگست۔ مایوں، مہندی

2 ستمبر 2016ء کو شادی

اور 5 ستمبر کو ولیمہ تھا۔

تمام خریداری، جیولری، ٹیلرنگ، پارلر...... یہ سب شازیہ اور امبر کی زمے داری تھی۔ گھر میں مہمانوں کی خاطر مدارات یہ ذمّے داری، دوسرے نمبر کی بہو طیبہ کی تھی۔ ہال...... گاڑیاں (سب تقریبات کی) کھانا، دوستوں کی ذمّے داری اور دوسرے نمبر کے عبید کو کارڈ بانٹنے کی ذمّے داری دی گئی تھی۔ دعائیں دینے کی ذمّے داری اور دولھا پر اور باقی لوگوں پر دم کرنے کی ذمّے داری میری تھی کیونکہ منہاج کی شادی میں اس پر دم کرنے کی ذمّے داری میں نے خود ہی خوش اسلوبی سے انجام دی۔ میرا خیال ہے کہ فہد سے زیادہ میں نے منہاج پر دم کیا تھا۔

فہد کو سلامی میں انگوٹھی، اور گھڑی ملی اور صبا کو نیگ میں نقد رقم، گولڈ کے گفٹ ملے جس میں انگلی پکڑائی، جوتا چھپائی اور دودھ پلائی نیگ تھا۔ دروازہ روکنے کی رسم پر بہنوں شازیہ، امبر کو گولڈ کے لاکٹ ملے۔ مجھے بھی فہد نے گولڈ کا لاکٹ دیا۔

یوں میرے سب سے چھوٹے چہیتے بیٹے فہد کی شادی اللہ کے حکم اور مدد سے بخیر وخوبی انجام پائی۔

الحمد للہ میں اپنے رب کی شکر گزار ہوں اس نے میری لاج رکھ لی۔ آپ تمام بہنوں سے دعاؤں کی طلب گار ہوں کہ اللہ اتنی مہلت اور دے دے کہ زبیر کی بھی شادی کردوں۔

میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جتنی بھی بچیاں اپنے گھروں میں بیٹھی ہیں رب کریم جلد سے جلد ان کو نیک اور شریف شوہر اور اچھا سسرال ملے۔ (آمین ثم آمین)



# بہنوں کی محفل

مدیرہ

☆عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ......!

☆حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانہ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا...... اللہ پاک آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور اپنے خزانہ غیب سے وہ سب کچھ عطا فرمائے جو آپ کے حق میں بہتر ہو...... یاالٰہی دونوں جہاں میں ازل سے ابد تک سب کی خیر ہو اور تو ہم سے ہمیشہ راضی رہے...... الٰہی آمین۔

☆☆☆

☆پیاری بہنو! 2017ء کے پہلے شمارے کے ساتھ حاضر ہوں۔ آپ سب کو نیا عیسوی سال مبارک ہو...... بات کچھ زیادہ پرانی نہیں ہے...... شاید چند سال پہلے تک...... نئے سال کی آمد دل میں ایک خوشی سی بھر دیا کرتی تھی۔ جیسے اچانک ہی زندگی میں ایک قوسِ قزح سی شامل ہو جائے گی جو رنگ بیتے سال میں نہیں تھے...... وہ اس سال ضرور ہوں گے بلکہ زندگی بھی اپنا پیراہن تبدیل کرے گی اور نیا سال نئے جذبے، نئے رنگ اور نئی روشنی بھی لائے گا گزشتہ سال جو بیتا سو بیتا...... (آہ) جاتے، جاتے دسمبر بھی دل لہو لہو کر گیا......

آج کا ادیب ماحول سے سب سے پہلے متاثر ہوتا ہے اور ہماری بدقسمتی ہے کہ عالم اسلام بھی تفکرات اور پریشانیوں کی زد میں ہے سالِ گزشتہ پر (اگر اپنے ملک کے حوالے سے) ایک نظر ڈالیں تو کسی بھی ہم وطن کے لیے اجتماعی طور پر خوشیوں کا سال ثابت نہیں ہوا۔ حکومت اور اپوزیشن کی کھینچا تانی نے عوام کو پریشانی کا سال بنائے رکھا۔ بہتان، دشنام طرازیاں، تہمتیں، ہرزہ سرائی اور مناقشتیں سارا سال سر اٹھائے رہیں۔ میں سب سے اچھا اور دوسرے سب غلط کا نظریہ گھر سے نکل کر ایوانوں تک میں پھیل گیا...... نیا سال کچھ لائے نہ لائے نئی امیدیں تو بہرحال ضرور لے کر آتا ہے اور اسی امید کے سہارے میں 2017ء کو امن کے نام سے منسوب کروں گی اور دعا مانگوں گی یاالٰہی یہ سال ہم سب کے لیے امن و آشتی کا سال ہو...... اور سب کی جانیں سلامت رہیں...... غذا، پانی اور دوسری سہولیات زندگی کی ضرورت تو اس وقت پڑتی ہے...... جب زندگی ہو اللہ آپ سب کو خیر و عافیت کے ساتھ سلامت رکھے...... اپنے گھر میں، گھر سے باہر بھی اور سفر میں بھی (آمین ثم آمین)

## محترمہ عذرا رسول کا پیغام

"پیاری بہنو! آپ سب کو نیا عیسوی سال بے حد مبارک ہو دلی دعا ہے 2017ء آپ سب کی خوشیوں کا سال ہو...... اور دکھ کی کوئی پرچھائیں بھی آپ کی زندگی میں نہ آئے...... آمین۔ الحمد للہ پاکیزہ کا معیار مسلسل بڑھ رہا ہے اور میری دعا ہے کہ 2017ء میں بھی آپ کی تحریریں ہمارے قارئین کے لیے آگاہی کا درجہ حاصل کریں...... مجھے دلی خوشی ہے کہ سینئر مصنفات کے ساتھ، ساتھ ہماری نئی مصنفات بھی بڑے اچھے موضوعات پر افسانے لکھ رہی ہیں۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی ہم سب کی فیورٹ رائٹر ہیں اور آپ آئندہ ماہ سے ان کا ایک نیا سلسلہ اللہ جل جلالہ اور اس کا نور کے حوالے سے پڑھیں گی۔ پاکیزہ کے سالگرہ نمبرز جو اپریل اور مئی کے شمارے ہوتے ہیں ان کی تیاری کا کام بھی شروع ہو گیا ہے۔ اس میں اپنی شرکت یقینی بنانے کے لیے آپ اپنی خوب صورت ترین تحریریں اور مراسلات ارسال کریں اور اپنے موضوعات میں ندرت اور دلکشی کا ہمیشہ خیال رکھیں...... میں آپ کی کامیابیوں کے لیے ہمیشہ دعا گو رہوں گی۔"

پیاری بہنو! سرگرمیوں اور اپنے کھٹے میٹھے خطوط پر نظر ڈالنے سے پہلے صرف ایک بار درودِ ابراہیمی پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے۔ (ابھی پڑھ لیں) اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالم اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔

## مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆مورخہ بیس دسمبر کو سن سیٹ کلب ڈی ایچ اے میں محترمہ عذرا رسول کی جانب سے مصنفات اور اپنی قریبی دوستوں

کے اعزاز میں ایک ہائی ٹی کا اہتمام کیا گیا..... جس میں رفعت سراج، عطیہ عمر، رضوانہ پرنس، صبیحہ شاہ، عقیلہ حق، اختر شجاعت، ناہید فاطمہ حسنین، ہما بیگ، ڈاکٹر ممتاز ضیا، رضوانہ منظر، نزہت اصغر، آمنہ حماد موجود تھیں۔ اس تقریب کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں ذیشان رسول اور ڈاکٹر فاطمہ ذیشان نے بھی شرکت کی۔ عذرا رسول کی چھوٹی بہن بھی موجود تھیں اور بی بی سی کی ڈراما رائٹر فرح بھی اپنی دوست رضوانہ پرنس کے ساتھ آئی تھیں اور رائٹرز سے مل رہی تھیں۔ شائستہ اعجاز، یاسمین رشید اور حمیرا بھی پوری تقریب میں ان تھیں۔ بعد ازاں پُر تکلف ہائی ٹی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے سب مہمان اپنے، اپنے گھروں کو لوٹے..... مگر سب کی زبان پر ایک ہی بات تھی عذرا کے بیٹے ذیشان رسول اور ان کی بہو ڈاکٹر فاطمہ ذیشان پہلے سے بھی زیادہ پیارے لگ رہے تھے۔ (ماشاء اللہ) اور پیاری بہنو! اس پُر مسرت تقریب کی تصاویر انشاء اللہ اگلے ماہ ملاحظہ کیجیے گا۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز طلعت، کراچی کے بیٹے کی شادی خوب دھوم دھام سے ہوئی، جس میں امریکا سے بھی مہمان شرکت کے لیے آئے۔ (مبارک باد)

☆ معروف شاعرہ ناہید عزمی کا پہلا مجموعۂ کلام، پوروں پر آسمان شائع ہو گیا ہے۔ جس میں ان کی غزلوں اور نظموں کا خوب صورت انتخاب موجود ہے۔ کتاب کا انتساب والدین کے نام ہے۔ ناہید اپنی شاعری کے بارے میں کہتی ہیں۔ ”مجھے میرے فریم میں رکھ کر پڑھا جائے تو شاید آپ کو میری شاعری میں کچھ مل جائے، لیکن اگر آپ نے فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، زہرہ نگاہ، کشور ناہید اور ادا جعفری کے مقابل رکھ کر مجھے پڑھا تو یقیناً مایوسی ہو گی“ لیکن کتاب کے مطالعے کے بعد میں یہ بات بہ احسن کہہ سکتی ہوں کہ ناہید کی مختصر نظمیں اپنے اندر کہانیاں سموئے ہوئے ہیں اور وہ کافی حد تک پروین شاکر سے مشابہ بھی ہیں..... اس خوب صورت کتاب کی قیمت صرف تین سو پچاس روپے ہیں جسے علی زبیر پبلی کیشن نے شائع کیا ہے۔ رابطے کے لیے فون 03008202093-02135247804۔

☆ مصنفہ صائمہ اکرم چوہدری، اسلام آباد گزشتہ دنوں کراچی آئیں..... اور اب ماشاء اللہ عمرے کی ادائیگی کے لیے سعودی عرب گئی ہوئی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ شاعرہ فریدہ جاوید فری، لاہور کو کاروانِ ادب فیصل آباد کی جانب سے چوتھا ایوارڈ ان کی شاعری کے حوالے سے دیا گیا ہے۔ (مبارک باد)

☆ شاعرہ یاسمین کنول، پسرور کی کتاب آنکھ میں سمندر کی تقریب رونمائی گزشتہ دنوں بزم تخلیق و تحقیق بارہ کہو اسلام آباد کے زیر اہتمام ہوئی۔ مہمانِ اعزازی ڈاکٹر منور ہاشمی اور مہمان خصوصی عائشہ مسعود ملک تھیں۔ مقررین نے شاعرہ کو ایک سادہ مزاج شاعرہ قرار دیا اور آخر میں یاسمین کنول کو ایک یادگاری شیلڈ پیش کی گئی۔ (مبارکاں)

☆ اس ماہ قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کی جانب ایک بہت خوب صورت کتاب موصول ہوئی ہے جس کا نام ہے۔ عہدِ راحیل شریف، پاک فوج کے کارہائے نمایاں جس کے مصنف ندیم نظر ہیں جنہوں نے درحقیقت پاک فوج کے کارہائے نمایاں کو مرتب کیا ہے۔ افواج پاکستان کے کارہائے نمایاں پر لکھے گئے کالموں پر مبنی یہ کتاب اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ یہ ہمارے فوجیوں اور ہمارے سپہ سالار کا حق ہے کہ انہیں سلیوٹ کیا جائے۔ جسے پوری قوم کا اجتماعی جذبہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ رابطے کے لیے فون نمبر 03000515101۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ذکیہ ایوب، کراچی کی طبیعت اتنی زیادہ خراب ہوئی کہ انہیں اسپتال میں انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں داخل ہونا پڑا..... اب وہ گھر آ گئی ہیں۔ (اللہ آپ کو کلی صحت دے)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار تسنیم ماپارا، کراچی کے ہاں پیاری سی نواسی ہوئی ہے۔ (ماشاء اللہ، مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ نگینہ ضیا نگش، کراچی اس ماہ اسٹریٹ کرائم کی زد میں آ گئیں اور اپنے موبائل اور پرس سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری سدرہ گل، فیصل آباد کے پیارا سا بیٹا ہوا ہے۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی اور مشہور پامسٹ نزہت رضوی کی پیاری بیٹی اوصاف فاطمہ ڈامبر کی شادی کراچی میں خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ (مبارک باد)

☆معروف شاعرہ سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا کی ذہین ترین بیٹی حورعین نے کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیے ہیں۔ بہترین مقررہ بھی ہیں اور تین سال سے کینگرو میتھس .... ایوارڈ لے رہی ہیں۔

☆گزشتہ دنوں پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار صبا نور کے بھائی آصف کی شادی رابعہ ملک سے لیّہ میں انجام پائی۔ صبا کے حوالے سے دوسری نیوز یہ ہے کہ ان کا ایک پیارا سا بھانجا تولد ہوا ہے، جس کا نام علی رکھا گیا ہے۔ (مبارک باد)

☆گزشتہ دنوں مستقل تبصرہ نگار رخسانہ ناصر کی لاڈلی پوتی حورعین کی پہلی سالگرہ خوب دھوم دھام سے منائی گئی۔

## دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆پاکیزہ کی مستقل قاری شہلا ظفر شدید بیمار ہیں۔

☆پاکیزہ کی مصنفہ صائمہ سید، کراچی کے والد سید اعجاز احمد کو بھی آپ کی دعاؤں کی بہت ضرورت ہے۔

☆تبصرہ نگار اور شاعرہ اینہ عندلیب، سلانوالی ان دنوں شدید بیمار ہیں۔

☆شاعرہ فریدہ جاوید فری، لاہور کی طبیعت ناساز ہے۔

پاکیزہ کی مستقل قاری فریدہ سجاد، کراچی کے کینیڈا میں مقیم بھائی کو کینسر ہوگیا ہے۔

پاکیزہ کی مستقل قاری مسز ستارہ شیخ، سندھ ان دنوں شدید علیل ہیں۔

☆مصنفہ پروین عذرا نشنہ، کراچی بے حد بیمار ہیں۔

☆فرح عاکف اور ماہین فاطمہ، کراچی بسترِ علالت پر ہیں۔

## انتقالِ پُرملال

☆پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار صفیہ بیگم، لالہ موسیٰ کی مامی جان زرینہ بیگم انتقال کرگئیں۔

☆پاکیزہ سے وابستہ نزہت اصغر کے بہنوئی یسین رضا، لندن کی اس ماہ پہلی برسی ہے۔

☆پاکیزہ کی شاعرہ رفعت مبین رفی، امریکا کی والدہ گزشتہ دنوں پاکستان میں انتقال کرگئیں۔

☆چترال سے اسلام آباد جانے والے جہاز میں معروف نعت خواں جنید جمشید سمیت 45 افراد جہاز گرنے کے سبب شہید ہوگئے۔

نوٹ: تمام مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کے ساتھ صرف تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کریں۔

☆☆☆

◄اور یہ پہلا خط رضوانہ پرنس کا کراچی سے۔ ”میں نے عذرا رسول اور انجم انصار کے کہنے پر اپنے پیارے بھائی سلیم کے انتقال پر چند بے ربط پیراگراف لکھ بھیجے تھے کہ دل کی حالت تو ابھی تک ایسی ہے کہ نہ تو صبر آرہا ہے اور نہ ہی میں اپنے دل کی بات صحیح طرح سے لکھ پاتی ہوں۔ شاید قلم میں بھی سکت نہیں رہی ہے...... بہرحال سلیم کی یاد میں شائع ہونے والے مضمون کو پڑھ کر جس طرح میرے عزیزوں، دوستوں اور قارئین پاکیزہ نے مجھ سے رابطہ کیا اور میری دل جوئی کی اس کا میں واقعی شکریہ ادا نہیں کرسکتی۔ نیلوفر عباسی کا امریکا سے فون آیا......اور میرے اس دکھ میں شریک ہوئیں......اور بھی بہت سے نام ہیں جن کا میں فرداً فرداً شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں مگر انجم ایک بات ضرور کہوں گی ......دوستوں اور عزیزوں کی تسلی آمیز باتیں یقیناً ایک مرہم کا درجہ رکھتی ہیں، اللہ میرے پیارے بھائی سلیم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور مجھے اور میری فیملی کے ہر فرد کو یہ صدمہ جھیلنے کی سکت دے۔ آمین، ثم آمین......“

(پیاری رضوانہ اللہ تمہیں تمہارے سب پیاروں سمیت ہمیشہ خوش و خرم رکھے......اس ماہ تمہارا مضمون پڑھ کر بہت سی بہنوں کے میرے پاس فون آئے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کے دکھ بھی تازہ ہوگئے اور وہ ہر، ہر سطر پڑھ کر بے حد روئی ہیں)

◄شاہینہ مبارک، ہالہ سے ”تازہ شمارہ اچھا لگا......سرورق بھی اچھا ہے۔ سب سے پہلے گم شدہ محبت کی قسط پڑھی...... صبا کو کریلے پسند تھے اس لیے اس کی زندگی میں کڑوا کریلا آگیا ہے...... آنٹی آپ ناول کی اختتامی سطریں اس طرح کی لکھتی ہیں کہ مجھے پورے مہینے یہ بے چینی سی لگی رہتی ہے کہ اب کیا ہوگا...... مجھے شہلا کی کہانی بھی اچھی لگ رہی ہے کہ اس ٹائپ کی لڑکیاں ہمیں بہت زیادہ نظر آتی ہیں...... جنہیں اپنا ہر عمل صحیح نظر آتا ہے...... مگر ایسے لوگوں کے ساتھ عموماً بہت برا ہوتا ہے۔ پاکیزہ

ڈائری بھی عظمیٰ باجی کی اچھی لگی...... مگر وہ کب اپنے چٹ پٹے افسانے کے ساتھ آرہی ہیں......؟ اپنی پاکیزہ بہنوں کو ایک آزمودہ نسخہ کان کے درد کے فوری آرام کے لیے بتارہی ہوں، اول و آخر درود شریف کے درمیان تین مرتبہ سورہ القریش پڑھ کر کان میں دم کردیں۔ فوری افاقہ ہوگا۔'' (تبصرے کے لیے شکریہ اور نسخے کے لیے جزاک اللہ)

✥ صفیہ بیگم، لالہ موسیٰ سے۔ ''پورا کا پورا ہی پاکیزہ بہت اچھا ہے مگر میں اپنی عادت سے مجبور ہو کر سب سے پہلے بہنوں کی محفل پڑھا کرتی ہوں اور سب کی خیریت سے واقف ہوجاتی ہوں۔ آپ کا ناول بھی بہت اچھا ہے۔ عظمیٰ کہاں غائب ہیں۔ (اپنے بچوں کے مڈٹرم امتحانوں میں مصروف ہیں) رضوانہ پرنس کا مضمون پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آگئے۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

✥ نجمہ سلطانہ، ملتان سے۔ ''میں پاکیزہ کی بہت پرانی قاری ہوں اور اس کو ایک طویل عرصے سے باقاعدگی سے پڑھ رہی ہوں۔ آپ کی تحریریں ہمیشہ سبق آموز ہوتی ہیں۔ جن سے قاری ہمیشہ بہت کچھ سیکھتا ہے۔ پاکیزہ کی بہنوں کی محفل مجھے بے حد پسند ہے۔ (نجمہ بہن اس محفل میں خوش آمدید...... اب پاکیزہ کے افسانے اور ناولوں کے بارے میں اپنی بھرپور رائے دیں تو مجھے خوشی ہوگی)

✥ سمیرا حمید فاروق، کراچی سے۔ ''اس ماہ پاکیزہ میں زیادہ افسانے پڑھنے کو ملے اور جو بہت اچھے بھی لگے۔ رفعت سراج کے ناول کی قسط اس ماہ پسند آئی۔ آپ کا ناول بھی پڑھ رہی ہوں۔ پڑھ کر مزہ آرہا ہے، نگہت سیما کے انٹرویو کا دوسرا حصہ بھی بہت عمدہ رہا...... رضوانہ پرنس نے تو رُلا ڈالا...... بہنیں اپنے بھائیوں سے بے حد محبت کیا کرتی ہیں، ہاجرہ ریحان، ہالہ احمد، سلمیٰ غزل، نورعین، فرحین اظفر، میمونہ صدف کی تحریریں خصوصی طور پر پسند آئیں۔'' (شکریہ)

✥ رخسانہ ناصر، کراچی سے۔ ''جلترنگ میں خوب صورت مقولہ نے ہنسنے پر مجبور کردیا...... واقعی شوہر حضرات بھی کیا چیز ہوتے ہیں اور جناب میمونہ صدف نے تو میرا دل ہی نکال لیا۔ وہی تو ہے پڑھ کر بلکہ پڑھنے کے دوران ہی بھل بھل آنسو گر رہے تھے پڑھنے کے بعد تو ہچکیاں بندھ گئیں۔ انجم دراصل میری بڑی بیٹی کی شادی کو آٹھ سال ہوگئے اولاد کی نعمت سے محروم ہے۔ بس اسی دکھ کو آپ سے شیئر کرنے کے لیے خط لکھنے بیٹھ گئی امید ہے آپ بھی میری پیاری بیٹی نازش علینہ کے لیے ضرور خصوصی دعا کریں گی۔ (جی ضرور) اور اس مرتبہ سب نے عظمیٰ کے واپس آنے کا اصرار کیا ہے میں بھی ان میں شامل ہوں کہ کب اپنی تحریر لے کر حاضر ہوں گی۔ انجم گزرے سال میں اللہ نے مجھ کو بھی عمرے کی سعادت نصیب فرمائی ہے اوروں کو دیکھ کر مجھے بھی شوق ہوا ہے احوال لکھنے کا آپ نوک پلک سنوار کر رسالے میں جگہ دے دیجیے بولیں اجازت ہے۔'' (آپ دلچسپ انداز میں لکھنے کی کوشش کیجیے میں اسے سنوار لوں گی)

✥ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ ''2016ء کا آخری شمارہ دلکش سرورق سے سجا پاکیزہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ آپ کا اداریہ گفتگو کے موضوع پر تھا واقعی آج کل ایسا ہی ہو رہا ہے۔ نگہت سیما اور حنا نقوی کے انٹرویو پسند آئے۔ سلسلے وار ناولز اور منی ناول اور مکمل ناول تو اچھے جارہے ہیں ان کے علاوہ افسانوں میں سزا، میری جیسی، سفید پوش، پہلی محبت پسند آئے۔ ناظمہ شاہین، ساجدہ ظفر، لائبہ کائنات، کوثر خالد، شبنم کنول کے اشعار، ثمینہ وحید، نگینہ ضیا بخش، تمنی قندیل کے سوالات پسند آئے۔ تہمینہ داؤد کو پہلی انٹری دینے پر خوش آمدید...... ہماری دعا ہے کہ صائمہ سید کے والد فریدہ جاوید فری، امینہ عندلیب، شہلا ظفر، ذکیہ ایوب، عنیزہ سید کے والد کو اللہ تعالیٰ تندرستی عطا فرمائے اور فصیحہ آصف خان کے ماموں کو اور عالیہ کو جنت میں جگہ ملے۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

✥ ارم کمال، فیصل آباد سے۔ ''سب سے پہلے اپنا موسٹ فیورٹ گم شدہ محبت پڑھا۔ ماشاء اللہ سے ٹاپ پر جارہا ہے کہانی میں ٹرننگ پوائنٹ آگیا ہے۔ یہ کہاں بچیں کہ دل ہے میں ساحل اور زارا کی کھٹی میٹھی لڑائی بھرپور مزہ دے گئی۔ جبکہ پرنس اور لیڈی صوفیہ کی کیمسٹری بھی خوب جارہی ہے۔ تیسرا-ن حیدر نے ماتا کا ایک الگ ہی رنگ دکھایا۔ واقعی اصل پیار تو اولاد سے یہی ہے کہ اس کی آخرت کی فکر کی جائے۔ ام طیفور کی ہنستا منع ہے۔ ہنس ہنس کر بے حال ہوگئے۔ پُر بہار اور شگفتہ تحریر تھی ایسی تحریریں زندگی میں آکسیجن کا کام دیتی ہیں، ام طیفور بہت خوب۔ دل ناداں میں نشا نے معظم کی بولتی بند کروادی، مردوں کو بہت اچھا زناٹے دار سبق دیا۔ سنہری دھوپ میں برستی بارش کا پہلا حصہ پڑھ کر دل و دماغ بھر سا گیا۔ آدھی صدی بعد پڑھ کر کئی تانیے اعصاب سن ہو کر رہ گئے۔ عورت کی اس درجہ بے بسی مجھے تو بالکل پسند نہیں آئی۔ ان کو عادت ہے بھول جانے کی، شائستہ زریں کا سروے بہت ہی دلچسپ رہا۔ گو کہ میں سروے میں شامل نہیں تھی لیکن ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں اپنے میاں صاحب کے ساتھ موٹر

سائیکل پر جا رہی تھی کہ اچانک رکشے والے کی سائیڈ لگنے سے میں سڑک پر گر گئی اور میاں صاحب موٹر سائیکل آگے لے گئے انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ میں گر گئی جب میرے اطراف لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہوا تو یہ دیکھنے کے لیے موٹر سائیکل سے اترے کہ دیکھوں کیا ہوا ہے اور جب مجھ پر نظر پڑی تو کہنے لگے تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو کیسے گریں؟ مجھے بتایا نہیں وغیرہ، وغیرہ...... بہنوں کی محفل ہمارا ہائیڈ پارک ہے۔" (بالکل جب ہی تو ہماری بہنیں اپنے، اپنے میاں کی مہارت سے بائیک چلانے کی روداد تک بتا دیتی ہیں)

لائبہ خان، لاہور سے۔ "آپ کے پازیٹو رسپانس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں ایک اور تحریر ارسال کر رہی ہوں۔ امید ہے کہ آپ کو پسند آئے گی۔ (جی بالکل پسند آگئی ہے) اداریے میں ہمیشہ آپ کی باتیں سوچ کے نئے در کھولتی ہے۔ آپ نے ٹھیک کہا کہ اندازِ گفتگو بہت امپورٹنٹ ہے۔ کبھی تو کچھ لوگ بات کریں تو دل میں گھر کر لیتے ہیں اور کچھ لوگ دل سے اتر جاتے ہیں۔ اختر شجاعت صاحب اور قیصرہ حیات پر مجھے اکثر رشک آتا ہے کہ اللہ ان دونوں کے ذریعے ہر ماہ ہمیں علم و ہدایت کے کتنے درخشاں موتی عطا کرتا ہے۔ آپ کا جلترنگ مہینے بھر کی تھکن اتارنے کے لیے کافی ہے۔ فون اسٹینڈ کی گم شدہ پنسل تو گویا میرے گھر کا قصہ ہے۔ ہاہاہا...... منتخب غزلیں دونوں کمال تھیں۔ (شکریہ) آخر کو اتنے بڑے نام اور وہ بھی دونوں میرے فیورٹ، بڑے بھائی سی ایس ایس کر رہے تھے جب تو ان کا سبجیکٹ اردو لٹریچر تھا...... اکثر غالب کے اشعار پڑھتے تو مجھے ان کا ردھم اور نغمگی بہت متاثر کرتی۔ تب میں میٹرک میں تھی تو بار، بار معانی پوچھتی بھائی سے اور بالآخریوں غالب کی بڑا عرصہ فین رہی۔ (آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کی اپنی آواز یا نغمگی اور ردھم کیسا ہے) افسانوں میں ہاجرہ ریحان کا فریب ٹاپ آف دالسٹ رہا۔ کم جگہ پر زیادہ بات کہنے کا فن جانتی ہیں وہ...... بھرم اور میری جیسی دونوں ہی مختلف انداز میں لکھے ایک ہی سبق دیتے اچھے افسانے تھے۔ یادیں خوشبو کی، میں حنا دیہ نے ایک بہت کامن بات جو ہم اکثر کرتے ہیں کا دوسرا پہلو خوب صورت انداز میں اجاگر کیا۔ سفید پوش بھی ہلکی پھلکی تحریر تھی۔ نگہت سیما کے انٹرویو نے دل باغ، باغ کر دیا۔" (نوازش)

یاسمین کنول، پسرور سے۔ "پاکیزہ کا منفرد سرورق پسند آیا۔ منفرد اس لحاظ سے کہ ماڈل کا انداز بڑا سادہ تھا اور بالوں کا اسٹائل بھی سادہ تھا تاہم دیکھنے میں خوب صورت و دلکش...... بلاوا آہی گیا رفیعہ ابدالی نے بڑے خوب صورت انداز میں اپنے روحانی سفر کو قلم بند کیا۔ اللہ تعالیٰ سب کو توفیق بخشے۔ (آمین) آدھی صدی بعد نسرین جمیل سیال کی خوب صورت تحریر بہت اچھی لگی۔ افسانوں میں ماں کی لاڈلی پسند آیا۔ شمع ہدایت واقعی شمع ہدایت ہے پڑھ کر روح میں تازگی محسوس ہوتی ہے اور برائیاں ختم کر کے اچھائیاں زندگی میں لانے کو دل کرتا ہے۔ اختر شجاعت زندہ باد...... دین کی باتیں بھی یہی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ رضوانہ پرنس کی تحریر پڑھائی کے حوالے سے متاثر کن رہی اللہ تعالیٰ انہیں صبر جمیل بخشے، آمین ثم آمین۔ خونی رشتوں کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا یہ کبھی نہیں بھولتے...... وہ آئے بزم میں نگہت سیما سے ملاقات اچھی رہی۔ افسانوں میں پہلی محبت، سفید پوش اور کھیل کھیل میں، نے متاثر کیا۔ جلترنگ نے متاثر کیا۔" (شکریہ)

شمیم فضل خالق، پشاور سے۔ "اس بار پاکیزہ گل رخ کی دسترس سے بچائے رکھا کہ تبصرہ بھیج سکوں۔ یوں تبصرہ حاضر ہے۔ گم شدہ محبت، زبردست جا رہا ہے۔ ہر قسط کے بعد اگلی قسط کا انتظار رہتا ہے۔ ثمینہ عظمت علی کا فیصلہ اچھی کہانی تھی۔ دانیہ کا فیصلہ ایک دانشمندانہ فیصلہ تھا۔ سحر ساجد کے ناولٹ کا دوسرا حصہ بھی اپنے اندر سموئے رکھنے کے قابل تھا اب تیسرے حصے کا انتظار ہے۔ قانتہ رابعہ کی عزت دار بے حد اچھی کہانی تھی۔ واقعی ایک چھوٹی سی بات یا عادت زندگی کی خوشیوں پر کیسے اثر انداز ہوتی ہے یہ اس کہانی میں کھل کر بتایا گیا اور یقیناً اس کہانی سے بہت سوں کو سبق ملے گا...... ہما بیگ نے اچھا لکھا۔ عورت کی زندگی کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔ مریم جہانگیر کا نائلہ آپی پسند آیا۔ رفعت سراج، یہ کہاں بچیں کہ دل ہے کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں مل رہے۔ ویل ڈن دوست، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ...... تسنیم منیر علوی کے آداب جاں سوزی کا اینڈ بہت پسند آیا...... شیریں حیدر کی میری ماں ایسی تحریر تھی جس کے بارے میں لکھا جا سکتا ہے کہ یہ شیریں کا ہی کمال ہے ایسی زندہ تحریر لکھنا...... سیڑھی واقعی اوپر اور نیچے دونوں طرف لے جاتی ہے لیکن لوگ سیڑھی کو صرف اوپر جانے کے لیے استعمال کرنے کا نام دیتے ہیں، ہاجرہ ریحان نے ایک اہم بات کی نشاندہی کی ہے۔ سیمار رضا ردا کا ہم کو عبث بدنام کیا۔ زبردست تحریر ہے۔ ام طیفور کا ہنسنا منع ہے، زبردست تحریر تھی۔ اس دور میں ہونٹوں پر مسکراہٹ لانا آسان بات نہیں بہت ثواب کمایا تم نے ام طیفور خوش رہو ہمیشہ...... دل ناداں ایک اچھی سی تحریر تھی۔ نسرین جمیل سیال کا ناول آدھی صدی بعد...... جس نے ذرا بھی مزہ نہیں دیا اگر اس میں کوئی چیز دلچسپ تھی تو وہ طلعت محمود کے پرانے گانے

تھے جو مجھے بھی بہت پسند ہیں۔ فاطمہ چوہدری کا ناولٹ اور کائنات غزل کی تحریریں سوسو تھیں۔ نگہت سیما کے انٹرویو نے مزہ دیا۔ عظمٰی آفاق، تمہارے قلم نے یہ شوخیاں کیا اپنی ماں سے چرائی ہیں۔ زبردست تحریر اور انداز تحریر...... خدا قلم کو ہمیشہ چلتا رکھے۔ جلترنگ کا یہ ٹاپک زبردست اور حالات کے مطابق تھا۔" (تم نے جو اتنی اچھی کتاب لکھی ہے اس کو خود بھی اپلائی کرو ناں، ہاں جو تم نے چار کتب مجھے بھیجی ہیں وہ میں نے آفس بھجوادی ہیں اور بزم پاکیزہ کے انعام یافتگان کو بھیج دی جائیں گی)

☜ سمیرا بنت یوسف، کراچی سے۔ "میں پڑھائی میں بزی رہتی ہوں اس لیے محفل میں آنے میں ٹائم لگا معذرت آنٹی جی...... پاکیزہ کی ڈائری اور میں اکثر گنگناتی ہوں کا سلسلہ بہت اچھا لگتا ہے۔ میرے لیے یہ بہت خوشی کی بات ہے آپ نے میرا شعر شائع کردیا۔ آپ کا دل سے شکریہ...... ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی آنٹی کو سلام رب پاک ان کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین۔" (اس محفل میں خوش آمدید...... اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے)

☜ فرح انیس، کراچی سے۔ "پہلی بار پاکیزہ کی محفل میں شرکت کررہی ہوں اس امید کے ساتھ کہ میری حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ (جی ضرور) آپ کا شمارہ بہت اچھا ہے۔ اور میں چاہتی ہوں کہ میں بھی اچھے شمارے کا حصہ بنوں۔ زندگی نے وفا کی تو انشاء اللہ اگلے ماہ ملاقات ہوگی اپنا بہت خیال رکھیے گا۔" (خوش آمدید...... میں آپ کی حوصلہ افزائی کرنے کی پوری کوشش کروں گی)

☜ رفعت مبین رفی، امریکا سے۔ "میں چار سال سے یہاں ہوں مگر ہر ماہ باقاعدگی سے پاکیزہ پڑھ رہی ہوں اور بے حد نوازش کہ میں نے جو آپ کو اپنی تحریریں ارسال کی تھیں آپ ان میں سے وقتاً فوقتاً لگاتی رہتی ہیں۔ میری بہن ہاجرہ خاتون جو یہیں رہتی ہیں وہ بھی آپ کی زبردست فین ہیں۔ اداریہ، روحانی مشورے ایسے سلسلے ہیں جو دل ودماغ کی بہار ہیں ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی تحریروں کے بھی ہم فین ہیں۔ تمام مصنفات اور بہنوں کی محفل کے اراکین کو ہمارا سلام پہنچادیں۔" (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

☜ قانتہ رابعہ، گوجرہ سے۔ "کل بازار جانا ہوا تو پاکیزہ لیا...... افسانہ دیکھ کر آپ کے لیے شکریہ اور اپنے لیے دعا کے الفاظ بھی تھے۔ ربنا تقبل منا...... اگر اس کی بارگاہ میں بھی قبول نہ ہوا تو سب بیکار...... ابھی نگہت سیما کے انٹرویو پر نظر ڈالی اور جلترنگ پڑھا ہے دونوں ہی خوب ہیں کہ انسانوں کے مسائل اور عادات پر مشتمل ہیں۔" (پسندیدگی کا شکریہ)

☜ فصیحہ آصف خان، ملتان سے۔ "سادہ مگر پُروقار سرورق نظروں کو بھایا۔ آج کل کے سرما کی مدھم وخنک دھوپ میں پاکیزہ کا ساتھ کیسی مدہوشی کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ یہ کوئی ہم سے پوچھے۔ آپ کی باتیں ہمیشہ کی طرح پُراثر اور مفید رہیں۔ دینی بہترین باتیں پڑھنے کے بعد گم شدہ محبت کی آخری سطروں میں آخرکار حارث کے دل میں گم شدہ محبت کی تلاش ہوگئی۔ جملے اور برجستہ انداز نے دل موہ لیا...... ساجد سے کسی بھی پاگل پن کی امید کی جاسکتی ہے۔ ندیم اور صبا کا جوڑ بھی طے ہونے کو ہے۔ بہرحال تحریر مسکراہٹیں لانے میں کامیاب ٹھہری اور یہ وصف آپ کو خوب ملا ہے۔ ثمینہ کا فیصلہ مجھے درست معلوم ہوا۔ ماہم کی جواں مرگی پر افسوس ہوا، پر زندگی اس کا نام ہے سحر ساجد کی من جانب لازم اک نئے موضوع پر لکھی گئی اچھوتی کہانی ہے جس میں معلومات کا اک خزانہ ہے۔ اف یہاں پر مجیب عالم کی وفات کی جو تصویر کشی کی گئی، میری آنکھیں بھرآئیں اس پر موی کا ردعمل بہت دل دکھا، ہنیا کا جواب نہیں...... پل میں تولہ پل میں ماشہ، مستقل مزاجی نہ ہو تو مستقبل داؤ پر لگ جاتا ہے۔ سحر ساجد کامیاب ٹھہریں۔ عزت دار، قانتہ رابعہ نے خوب لکھی، بعض لوگ طلاق کو مذاق سمجھتے ہوئے میاں، بیوی کی حیثیت سے زندگی گزارتے رہتے ہیں۔ کاش اس کہانی سے کوئی تو سبق حاصل کرلے۔ رفعت سراج کی تحریر پہ کہاں پہنچیں، بہت دلکشی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ یہ ان کے قلم کا کمال ہے کہ ان کی ہر تحریر دل میں جگہ بنالیتی ہے۔ آداب جاں سوزی کے اختتام نے ہلا کر رکھ دیا۔ کہاں تو پہلی بیوی کی یاد آکاس بیل بن گئی اور کہاں اسے گلے سے اتار پھینکا۔ شیریں حیدر نے ایک حب الوطن خاتون کی کہانی لکھ کر ممتا کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اتنی طاقت وہمت ہر عورت میں کہاں۔ ام طیفور نے کہا کہ ہنسنا منع ہے۔ ارے واہ یہاں تو قہقہے بلند ہوتے رہے۔ بہت عرصے بعد آئیں اور چھا گئیں۔" (تبصرے کا شکریہ)

☜ طاہرہ، خوشاب سے۔ "پاکیزہ سے عجیب سا رشتہ محسوس ہوتا ہے اور آپ کی وجہ سے تو پاکیزہ اک مہربان ماں کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ میں اک لڑکی سے ملی وہ لڑکی بہت آزاد خیال تھی اور طلاق بھی ہوچکی تھی اسی وجہ سے .... پھر وہ مجھے دوسال بعد ملی تو اس نے حجاب لیا ہوا تھا اور گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا، نماز پابندی سے پڑھنے لگی تھی تو میں نے تبدیلی کی وجہ پوچھی تو آنٹی اس نے آپ کا نام لیا کہ پاکیزہ کے توسط سے انجم آنٹی سے بات ہوئی اور میں نے ہر وہ کام چھوڑ دیا جو جہنم کی طرف لے

جاتا۔ سلام ہے آپ کو آنٹی۔ خدا آپ کو سلامت رکھے کہ آپ تو ہم جیسوں کے لیے ماں ہیں دوست ہیں مشکل وقت میں آسرا سا محسوس ہوتا ہے آپ کے دل سے میری بیٹی بھی بڑی ہوگئی ہے اس کے رشتے کے لیے دعا کیجیے گا کیونکہ آپ نے مجھے کہا تھا کہ بیٹی کی جلدی شادی کر دینا، سسرال والے ناراض ہیں وہ میرے شوہر کو کہتے تھے کہ پرائی اولاد تم کیوں پال رہے ہو تو انہوں نے کہا کہ خدا پال رہا ہے تو بس اپنی آخرت سنوارنے کی لالچ میں یہ سب کر رہا ہوں۔ آنٹی آپ مدرسے کے فنڈ کا بھی چھاپ دیں جو بہنیں حصہ ڈال سکتی ہوں گی اس کارِ خیر میں تو رابطہ کر لیں گی۔" (بیٹا ہم اس محفل میں کسی کے نمبر شائع نہیں کرتے...... اگر کسی نے آپ کا نمبر مانگا تو میں دے دوں گی)

☆ جینا، کراچی سے۔ "پاکیزہ سے میرا رشتہ بہت پرانا ہے۔ درمیان میں ایک لمبا عرصہ اس سے دور رہی نہ پڑھنے کی مہلت تھی نہ لکھنے کی اس سارے عرصے کو بھی افسانے کی شکل میں قلمبند کر دوں گی آپ کی باتیں بہت سے لوگوں کے زخموں پر ایسے مرہم کا کام کرتی ہیں جو کسی میڈیکل اسٹور پر نہیں ملتا اللہ تعالیٰ آپ کو اچھی صحت سے سلامت رکھے۔ اکتوبر کا رسالہ میری بہن نے تحفے میں دیا تو اس سے جڑی پرانی یادیں بھی ساتھ چل پڑیں ابھی آدھا پڑھا تھا دل چاہا پھر سے لکھوں۔" (اس محفل میں خوش آمدید...... اب آپ باقاعدگی سے اس محفل میں شرکت کیجیے...... ہاں ابھی آپ کا افسانہ نہیں پڑھا)

☆ تسنیم کوثر، کراچی سے۔ "پیارا سا ناولٹ سنہری دھوپ میں برستی بارش ہلکا پھلکا معصوم سا لگا لیکن اگر اس کا عنوان باربی ڈول ہوتا تو واللہ مزہ آجاتا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ اور سلمیٰ غزل کی پہلی محبت و دلکش ترین پیاری سی اسٹوری دل میں گھر کر گئی۔ مصنفہ مبارک باد کی مستحق ہیں۔ ہم کو عبث بدنام کیا ناول اچھا جا رہا ہے مگر اس میں پیچ و خم بہت ہیں کہانی سہل ہو تو پڑھنے میں مزہ آتا ہے۔ وہی تو ہے میمونہ صدف نے بہت، بہت اچھا لکھا ہے۔ اللہ پر توکل رکھنے والوں کو اللہ کبھی مایوس نہیں کرتا ہے اور فرحین اظفر نے اپنا ناول ایک ذرا سی لغزش میں کیا جان ڈالی ہے۔ کتنی نصیحت آمیز کہانی لکھی ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ حقیقت سے قریب تر لکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو نیک ہدایت عطا فرمائے۔ من جانباز م بہتر ہوتا جا رہا ہے۔ جلترنگ تو پاکیزہ کی شان ہے اس کے علاوہ باقی تمام سلسلے بہت اچھے لگتے ہیں۔ خاص کر بہنوں کی محفل میں تو بہت دل لگتا ہے۔" (نوازش)

☆ زینت عبدالصمد، میرپور ساکرو سے۔ "بڑے پیارے نقوش والی سادہ سی لڑکی کی خوب صورت سی تصویر سے سجا دسمبر کا ٹائٹل مرے سامنے ہے کلو دو کلو جیولری لادی ہوئی ماڈلز کے مقابلے میں یہ سرورق نظروں کو تراوٹ بخش رہا ہے۔ تنزیلہ زاہرہ افضل، چھوٹی میں بہت بڑی بات کہہ گئیں۔ اگر اللہ پاک کسی میں کوئی کمی رکھ دے تو اس میں اس کا کیا قصور...... غزالہ کی اتنی حساس طبیعت کہ یہ واقعہ جان ہی لے گیا پڑھ کر بڑا دکھ ہوا۔ اک ذرا سی لغزش، فرحین اظفر بہت اچھی سوچ لے کر آئیں۔ یونہی تو نہیں عورت کو آبگینے کہا گیا۔ سفید پوش رفاقت صاحبہ کی یہ تحریر کچھ خاص متاثر نہ کر سکی۔ نہ جانے کیوں ڈراما، ڈراما سی لگی۔ کھیل کھیل میں نزہت نعیم ازدواجی زندگی میں زوجین کے مابین ہونے والے مسائل اور جھگڑوں کا بڑا خوب صورت حل لے کر آئیں۔ ہاجرہ ریحان کا فریب ایک غلط فہمی پر مشتمل یہ افسانہ مرکزی کردار کا خود سے فرض کر لینے کی عادت کے سبب زندگی کا کتنا خوب صورت عرصہ جلتے کڑھتے کسی ناکردہ گناہ کے بوجھ کے زیرِ اثر گھٹ گھٹ کر گزرا مگر...... نگہت سیما سے ملاقات سیر حاصل رہی...... شیریں حیدر کے بعد ان کا انٹرویو زبردست رہا...... رضوانہ پرنس صاحبہ کا دکھ ایسا ہے جس کا غم تا عمر رلائے گا۔ اللہ پاک انہیں صبرِ جمیل عطا فرمائے کہ خونی رشتوں کی ابدی جدائی انسان کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ (بالکل) گم شدہ محبت بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے ہر قسط میں ایک نیا سسپنس دلچسپی کو بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ کہانی کا ٹوئسٹ قاری کو پکڑ کے بلکہ جکڑ کے رکھتا ہے۔ سنبل کی سزا بھی اچھی لگی۔ عام روایتی سے اینڈ کے بجائے مصنفہ نے کہانی کو ایک نیا رخ دیا۔" (شکریہ)

☆ کوثر خالد، جڑانوالہ سے۔ "مجھے کچھ کہنا ہے، بھئی آپ کی بات پر کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ لہٰذا آمین، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی پھولوں سا لہجہ عنایت کرے۔ ہماری آواز سے دوستوں کے علاوہ سب خائف رہتے ہیں۔ گم شدہ محبت، محبت تو قربانی مانگتی ہے۔ عامر کی محبت تو خوفزدہ کر گئی۔ یہ کہاں بھیجیں تاریخی کہانی بڑی سہانی، وہی تو ہے...... میرے یقین کا منبع اللہ وحدہ، من جانباز م پر اسرار آدم، یہ عشق ہے جاناں...... فلمی کہانی، سنہری دھوپ، برستی بارش، قسمت کے اتار چڑھاؤ...... اک ذرا سی لغزش، استغفر اللہ...... ہم کو عبث بدنام کیا؟ الجھنوں بھرا سفر، میری جیسی، کہیں نہ ہو کوئی نہ ہو۔ ہالہ کا قلم اثر انگیز رہا...... بھرم، خدا سب کا رکھے...... سفید پوش، جیت گیا...... سزا، سنبل نام پڑھ کر سوچا...... کیا

ہماری سنبل ملک......مگر خطوط سے پتا چلا...... سنبل لاہور، الگ ہی ہیں۔ یادیں خوشبو سی، کر بھلا ہو بھلا......خوش قسمت پتے کی بات......فریب، عجب داستان، چھوٹی ہمارے معاشرے کا افسوسناک المیہ......چھوٹیوں کی چھوٹوں سے شادی کر دینی چاہیے۔ کھیل کھیل میں ڈراما، پہلی محبت، باوفا محبت، قربانی کا مجسمہ، شمع ہدایت، شمع بزم ہدایت پہ لاکھوں سلام......وہ آئے بزم میں۔ زمین مہکی چمن چہکا......پاکیزہ مہمان، ان کی شباہت و مسکراہٹ ہماری باجی نصرت جیسی لگی۔ کیا دردانہ بٹ کی بیٹی ہے (جی نہیں) دین کی باتیں، ہمارا ایمان، بہنوں کی محفل...... پھولوں کی ڈالی مگر غم کے کانٹوں سمیت......کاش سب کی زندگی بہاروں جیسی ہو۔ (آمین) پاکیزہ ڈائری کاش اس میں صرف حمد و نعت ہو تو زندگی مسکرا اٹھے۔ آپی میری حمد و نعت کی کتاب چھپ گئی ہے۔ کیا آپ کو ملی نہیں؟" (ابھی تو نہیں ملی منفرد تبصرے کا شکریہ)

✿ فہمی فردوس، گوجرانوالہ سے۔" آپ نے بہنوں کی محفل میں میرے نئے ناول کرب محبت کو بڑے خوب صورت الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ آپ نے میرے لیے پاکیزہ کی مصنفہ کے الفاظ لکھے...... پڑھ کر دلی خوشی ہوئی۔ آپ کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی سے میں یہاں تک پہنچی ہوں۔ اگر آپ میرا ساتھ اسی طرح دیتی رہیں تو اگلی منزلیں بھی سر کرتی جاؤں گی......آپ کی ذات میرے لیے شجر سایہ دار کی طرح ہے...... آپ سے بات کر کے دلی سکون ملتا ہے۔ شادیوں کا سیزن ہے، اکٹھی پانچ چھ شادیوں نے یلغار کر دی ہے۔ (ہر شہر میں یہی حال ہے) آپ کا ناول گم شدہ محبت کی تازہ ترین قسط پڑھی۔ کہانی ایک نئے موڑ پر آ گئی ہے۔ دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے۔" (جی ضرور)

✿ فریدہ فریؔ، لاہور سے۔" اس ماہ سب کے ناول ناولٹ اور افسانے بہترین لگے پاکیزہ ڈائری میں اپنی غزل ڈھونڈتی رہی مگر وہ اندر کے صفحات پر لگی تھی بے حد شکریہ...... سب سے پہلے آپ کے ناول کی قسط پڑھی۔ پڑھ کر بے حد مزہ آ رہا ہے۔ افسانوں میں میری جیسی، بھرم، سفید پوش، کھیل کھیل میں بہترین تحریریں تھیں ناولٹ سب بیسٹ لگے تو قیر ہاشمی صاحبہ ہم اس لیے آگے نکل گئے ہیں کہ ہم ہر ماہ حاضری لگواتے ہیں پاکیزہ میں پاکیزہ تو ہمارا فیورٹ ہے۔ رضوانہ پرنس کے بھائی کی وفات کا بے حد افسوس ہے۔ جس طرح انہوں نے لکھا میرا شہزادہ، میرا بھائی...... پڑھ کر بے حد غم زدہ ہو گئی۔ (رضوانہ نے بھی روتے ہوئے لکھا تھا)۔ بھائی تو بہنوں کا مان ہوتے ہیں میرے بھی دو بھائی بچھڑ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے بھائی کو جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین۔" (اللہ سب کے بھائیوں کو سلامت رکھے۔ مختصر تبصرے کا شکریہ)

پیاری بہنو! بہنوں کی محفل کے صفحات کا کوٹا ختم ہوا...... آیئے پہلے درود پاک پڑھتے ہیں اور پھر وحدہ لاشریک کی بارگاہ میں دعا مانگتے ہیں۔ یا اللہ، یا رحمٰن، یا رحیم، اے کریم یا اللہ...... ہمارے اور اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ساری امت کے سارے گناہوں کو معاف فرما دے اور ہمارے تمام گناہوں کو نیکیوں میں بدل دے۔ اے پاک پروردگار موت سے پہلے ہماری مغفرت فرما اور موت کے وقت ہم پر رحم فرما اور موت کے بعد ہمیں عذاب نہ دینا اور قیامت کے روز بغیر حساب کتاب لیے ہمارا نامۂ اعمال ہمارے داہنے ہاتھ میں دینا...... بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ اے سب سے بڑھ کر رحم کرنے والے اے سلامتی دینے والے ہمیں ہر قسم کے شرور سے بچا...... ارضی و سماوی آفات سے بچا...... ناری قوتوں سے بچا...... لاعلاج بیماریوں اور جان لیوا پریشانیوں سے بچا...... یا اللہ ہمیں خیر عطا فرما۔ اور ہمیں ہمیشہ عافیت والی زندگی عطا فرمانا تاکہ ہم تیرے دین کو ساری دنیا میں پہنچا سکیں اور تو ہم سے ہمیشہ راضی رہے۔ (آمین ثم آمین)

یا مجیبُ، یا مجیبُ، یا مجیبُ (آخر میں ایک بار پھر درود ابراہیمی پڑھ لیں۔)

دعا گو
آپ کی اپنی باجی
انجم انصار

**پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا**

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.c فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500
فون نمبر 021-35804200 , 021-35386783,021-35802552 EXT 107,118



# پاکیزہ ڈائری
عظمیٰ آفاق سعید

## حمدِ باری تعالیٰ

ہر ایک شے سے الگ شے ہے آرزو تیری
کہ مہر و ماہ کو ہر پل ہے جستجو تیری
تیرے اثر سے نکل کر کوئی کہاں جائے
کہ کائنات میں خوشبو ہے چار سو تیری
تیرا کرم ہے کہ بہار آشنا ہی رہتی ہے
ہمارے واسطے دنیائے رنگ و بو تیری
مری زباں کو دے جو حوصلہ تو میری زباں
تمام عمر کرے صرف گفتگو تیری
متاعِ زیست تری آرزو کو سمجھا تیری
سو کام آئی ہمیشہ ہی آرزو تیری

شاعر: رحمان خاور
مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

## نعت رسول مقبولؐ

میرے آقا مرے سرکار مدینے والے
مجھ کو کب آپؐ بلائیں گے مدینے والے
ایک آہٹ پہ گماں تھا کوئی قاصد آیا
اپنے قدموں میں بٹھالیں گے مدینے والے
آپؐ کی خوشبو سے مہکا ہوا سارا عالم
اپنی خوشبو میں چھپالیں گے مدینے والے
عشق دریا ہے تو دریا میں ڈبو دیں مجھ کو
آپؐ جو ہیں میرے پتوار مدینے والے
عشق کی راہ میں کانٹے بھی بہت ہوتے ہیں
آزمائش بھی ہے ہر آن مدینے والے
صبر اور شکر کو گر ساتھ لگا کر رکھوں
چین سکھ ملتا ہے ہر آن مدینے والے
اشک آنکھوں سے بہے میں نے مگر روک لیے
کوئی جذبوں کو نہ سمجھے گا مدینے والے
خوف جب، جب بھی مری روح میں بس جائے گا
کالی کملی میں چھپالیں گے مدینے والے
ہاتھ خالی ہیں مرے اور گنہگار بہت
رحمتیں لوٹنے آؤں گی مدینے والے
کوئی لمحہ نہیں ایسا کہ نہ ہوں سوچ میں آپؐ
کیسے کٹ پائے گی فرقت میں مدینے والے
بخشوانے کا ہے وعدہ تو یہ وعدہ ہے بہت
ہے یہ احسان پہ احسان مدینے والے
آپؐ کا سایہ نہیں پڑتا تھا سب نے دیکھا
آپؐ کے سائے تلے ہم ہیں مدینے والے
آپؐ پر نعت لکھوں دل نے کہا ہے مجھ سے
آپؐ پر جان بھی قربان مدینے والے

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی

## روشنی...... روشنی

آمدِ مصطفیٰؐ کی روشنی روشنی
سب جہاں کو ملی ہے نئی زندگی
آپ کیا آئے ظلمت بھی چھٹ گئی
نسل انساں نے پائی ہے اب آگہی
شعبۂ زیست سارے شفا پا گئے
اسوۂ مصطفیٰؐ زندگی زندگی
بھیجوں ان پر ہزاروں درود و سلام
جن کے دم سے یہ دنیا منور ہوئی
جس گھڑی میرے لب پر وہ نام آگیا
ہر طرف چھا گئی روشنی روشنی
راہ بھٹکے ہوؤں کو ملا راستہ
کامیاب و منور ہوئی زندگی
مخفی بے عمل ہو اگر با عمل
زندگی ہو فقط روشنی روشنی

شاعرہ: فریدہ ہاشمی مخفی، کراچی

## ستارے جھلملاتے ہیں

نبی تشریف لاتے ہیں
ستارے جھلملاتے ہیں
میرے آقاؐ کی آمد سے
گلوں میں رنگ آتے ہیں
فضائیں گنگناتی ہیں
نظارے جھوم جاتے ہیں

شاعرہ: ثمینہ کوکب، جہلم

## حدیث نبوی

☆ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ جس آدمی کی نیت آخرت کی تیاری کی ہو اللہ تعالیٰ اس کا دل غنی کر دیتا ہے اور اس کی پریشانیاں سمیٹ دیتا ہے اور دنیا ذلیل ہو کر خود ہی اس کے پاس آجاتی ہے اور جس شخص کی نیت دنیا کمانے کی ہو اللہ تعالیٰ اس کی آنکھوں میں بھوک پیدا کر دیتا ہے یعنی جتنا بھی انہیں مل جائے وہ سیر نہیں ہوتے' اس کے کاموں کو اس طرح بکھیر دیتا ہے کہ وہ ان ہی میں الجھا رہتا ہے اور اسے ملتا وہی کچھ ہے، جو پہلے سے اس کے مقدر میں لکھا ہے۔

مرسلہ: ظل شاہین، رحیم یار خان

## دعا

مجھے بخش دے
میری لغزشوں کے واسطے
مجھے نواز دے
اپنی رحمتوں کے واسطے
مجھے سکون دے
اپنے نبیؐ کے واسطے
مجھے عطا کر
دل کے سکون کے راستے

شاعرہ: صائمہ سید، کراچی

## وہی تو ہے

مجھے بہت برا لگتا ہے جب میری سوچ پہ شک کیا جائے، میری زبان سے نکلنے والے الفاظ کو جھوٹا سمجھا جائے لیکن پھر یہ سوچ کے پُرسکون ہو جاتی ہوں کہ میری نیت سے میرا رب تو واقف ہے ناں...... وہ میرے دل کی حالت خوب جانتا ہے۔ پھر مجھے لوگوں کی پروا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میرا بہترین دوست میرا راز داں میرا اللہ ہے۔ وہ جو رب ہے ناں...... وہی تو سب کچھ ہے۔

از: لاریب، چونیاں

## زندگی

ایک جوکر نے لوگوں کو ایک لطیفہ سنایا لوگ بہت زیادہ ہنسے اس نے وہ لطیفہ پھر سنایا تو کم لوگ ہنسے...... اس نے پھر وہی سنایا تو کوئی بھی نہیں ہنسا تو پھر اس نے ایک بہت خوب صورت بات کہی......

''اگر تم ایک خوشی کو لے کر بار، بار خوش نہیں ہو سکتے تو پھر ایک غم کو لے کر بار، بار پریشان کیوں ہوتے ہو...... زندگی زخموں سے بھری ہے وقت کو مرہم بنانا سیکھو، موت سے تو ہارنا ہی ہے، زندگی سے تو جیتنا سیکھو۔''

از: ناظمہ شاہین اعوان، واہ کینٹ

## سماجی مسئلہ

ایک شخص نے اپنے دوست سے مشورہ کیا۔''یار میں اپنے محلے کی ایک لڑکی کو روزانہ کالج تک چھوڑنے جاتا ہوں، ٹرانسپورٹ کی ہڑتال ہو تو اسے اپنی بائیک پر لے کر جاتا ہوں، اس کا کالج بیگ اٹھا کر چلتا ہوں، اسے گرمی لگے تو روزانہ کسی قریبی کیفے میں لے کر کولڈ ڈرنک پلاتا ہوں، اس کا دل گھبرائے تو چھوٹی موٹی شاپنگ بھی کروا دیتا ہوں۔ اس کی ہر سالگرہ تو کیا اپنی کلاس میں فرسٹ آنے پر اس کو تحفہ تک دیا کرتا ہوں...... کیا خیال ہے، اب مجھے اس سے شادی کی درخواست کر دینی چاہیے۔''

''بس، بس بہت ہو چکا۔'' دوست نے غصے میں کہا۔ ''تم نے اس کے ساتھ جتنا تعاون کرنا تھا کر چکے...... اب ہمیں بھی خدمت کا موقع دو۔''

از: حمیرا عندلیب گل...... گوجرانوالہ

## دردناک دسمبر

بچے اسکول جائیں اور مسافر سفر پر جائیں
اور پھر لوٹ کر کبھی واپس نہ آئیں
یا اللہ! پھر ایسے دردناک دسمبر کبھی نہ آئیں
آمین۔

از: زرین زبیر کوٹھاری، کراچی

## غزل

اپنے دل کا حال سنانا بھول گئی
کیا تھی دل کی بات بتانا بھول گئی
تجھ کو دیکھا تو یہ آنکھیں چھلک گئیں
اور انکھیوں سے نیر بہانا بھول گئی
جن گلیوں میں تیرا آنا جانا تھا
ان گلیوں میں آنا جانا بھول گئی
میں تو اب بھی ہجر کی لمبی راتوں میں
آنکھوں میں سب خواب سجانا بھول گئی
بھول گئے تم دیس پرائے بھول گئے
میں بھی تیری آس لگانا بھول گئی
جانے کس کی یاد میں سب کچھ کھو بیٹھی
کس کو کھونا کس کو پانا بھول گئی
آج فریدہ فری اس نے آنا تھا
بالوں میں بھی پھول لگانا بھول گئی

شاعرہ: فریدہ فری، لاہور

## صبح نئی شام نئی

آسمان بدلا ہے نہ بدلی ہے ابھی تک یہ زمیں
ہندسے ہی کا بدلنا، کوئی جدت تو نہیں
اگلے برسوں کی طرح ہوں گے قرینے تیرے
کسے معلوم نہیں بارہ مہینے تیرے
تیرا اس دہر میں کچھ کھوئے گا کچھ پائے گا
اپنی معیار بسر کر کے چلا جائے گا
تو نیا ہے تو دکھا، صبح نئی، شام نئی
ورنہ ان آنکھوں نے دیکھے ہیں نئے سال کئی

مرسلہ: طیبہ عنصر مغل، راولپنڈی

## خصوصی پیشکش

کائنات بنانے والے کی طرف سے شاندار آفر...... جنت میں خوب صورت پلاٹ بک کرانے کا سنہری موقع، انتہائی آسان شرائط پر بیٹھ توبہ سے ایڈوانس بکنگ کروائیں اور پھر روزانہ پانچ نمازوں کی قسط جمع کرواتے جائیں۔ کارنر پلاٹ کے لیے رمضان مبارک کے روزے رکھیں اور بہترین تعمیرات کے لیے دل کھول کر زکوٰۃ وخیرات دیں اس کے علاوہ بہترین باغ وبہار کے لیے حج کی سعادت حاصل کریں۔ مزید خوب صورتی کے لیے تہجد کا اہتمام کریں۔

جلدی کیجیے...... یہ پیشکش صرف آپ کی زندگی تک محدود ہے۔

از: ارم کمال، فیصل آباد

## میں اور تو

گیلی مٹی، سوندھی خوشبو
کالے بادل، میں اور تو
تیز ہوائیں، بکھرے گیسو
اڑتے پنچھی، میں اور تو
بہتے جھرنے، سبزہ ہر سو
اونچے پربت، میں اور تو
گیت سناتی، کوئل کوکو
گرتی بوندیں، میں اور تو

شاعرہ: عالیہ ضیا، کراچی

## ہری مرچیں

1۔ خالی ڈگری تو ایک ایسا بے مراد سا کاغذ ہے جو ہلدی اور مرچ باندھنے کے کام ہی آسکتا ہے جب تک اسے مکروفریب، سفارش، رشوت اور خوشامد کے پر لگا کر بے ضمیری کی پھونک نہ ماری جائے۔ یہ کاغذ نہیں اڑتا۔

2۔ اگر آپ اپنی تمام مصیبتیں بھول جانا چاہتے ہیں تو اپنے سائز سے ایک نمبر کم کا جوتا پہن کر لمبی سیر کو نکل جائیں۔

انتخاب: ماہ زیب، چونیاں



# جلترنگ

انجم انصار

## نیا سال مبارک!

پیاری لاڈو

"میری پیاری معصومہ ثمینہ

تمہیں ڈھیر ساری سالِ نو کی مبارک باد......

نیو ائیر کارڈز بھیجنے کا رواج اب ختم ہو گیا ہے۔اب انٹرنیٹ پر ہی خطوط اور کارڈ کا سلسلہ جاری رہتا ہے......مگر تم چونکہ انٹرنیٹ کی نعمت سے محروم ہو اور تمہارے ساتھ، ساتھ پروین، حرا اور دیگر بہت سی بہنوں کا اصرار تھا کہ بھابی کو اپنی نند کے خط کا جواب ضرور دینا چاہیے تو اس وجہ سے ہی چند باتیں لکھ رہی ہوں...... کہ سمجھنے والوں کے لیے تھوڑا ہی کافی ہوتا ہے......اور دیگر لوگوں کے لیے زیادہ بھی کم ہوتا ہے۔

تم نے لکھا ہے کہ تمہاری باتوں کو میں امتحان سمجھوں اور اس میں پوزیشن لا کر دکھاؤں...... تو پیاری لاڈو...... میرا تعلیمی کیریئر ایم اے تک محیط ہے......ساتویں جماعت میں پورے اسکول میں ٹاپ کیا تھا...... پھر اماں نے بھائی کی منگنی اسکول کی پرنسپل کی بیٹی سے توڑ دی تھی......تو ظاہر ہے کہ آٹھویں جماعت کے رزلٹ میں انہوں نے میرا دل جلانا ہی تھا......خیر ہمت نہ ہار کر میں نے دو سال بعد نویں اور دسویں کا اکٹھا امتحان دیا مگر اس پرنسپل کے بھائی امتحانی کا پیاں چیک کرتے تھے وہاں بھی انہوں نے مجھ سے اپنا بدلہ نکالا...... اور یہی سب کچھ انٹر، بی اے اور ایم اے کے امتحانوں میں ہوا...... کہ میں امتحان دیتی رہی مگر نہ تو ان فسادی لوگوں نے داخلہ فیس جمع ہونے دی اور نہ ہی پاس ہونے دیا گیا......تم خود ہی سمجھ سکتی ہو کہ میری زندگی میں امتحان کی کیا اہمیت ہے؟ زندگی کے کسی بھی امتحان میں، میں کیونکر فیل ہو سکتی ہوں یا میرے مقابلے میں کوئی دوسرا شخص کیسے پوزیشن لے سکتا ہے......؟ معاف کرنا ثمینہ......آج جو تم اپنے بھائی کی امارت کے قصے بیان کر کے نڈھال ہوتی جا رہی ہو......اور مجھ پر طنز کے پتھر مار رہی ہو......تو ایک بات کان کھول کر سن لو...... جب میری شادی ہوئی تھی تو تمہارے بھیا کی اوقات دو کوڑی کی تھی......آفس جاتے تھے تو بس کے پیچھے بھاگ کر ڈنڈا پکڑ کر جھولتے جھالتے بس میں داخل ہوتے تھے......آج اگر ہمارے کار پورچ میں نئے ماڈل کی چار گاڑیاں کھڑی ہیں تو وہ سب میری قسمت کی ہیں...... میرے آنے کے بعد تمہارے بھائی نے مٹی کو بھی ہاتھ لگایا تو وہ سونا بن گئی......تو تمہیں نظر تو نہیں لگانی چاہیے......ویسے ہی میرا خون بہت ہلکا ہے...... جب، جب تم میرے گھر آئیں مجھے ایسی نظر لگی کہ تمہارے جانے کے بعد میں دو، دو دن بستر پر پڑی رہی...... لیٹے، لیٹے ہی ناشتا، کھانا کھاتی رہی......اٹھنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی......ایک مرتبہ تمہاری اماں جب میرے کمرے میں داخل ہوئیں۔اس وقت میں اپنے دل کی بے کلی ایک فلم دیکھ کر ختم کرنے کی کوشش کر رہی تھی......ان کی شکل دیکھ کر جو چکر آیا تو ان کا ہاتھ پکڑ کر بستر پر ڈھے گئی......وہ تو خیر نیچے گر گئی تھیں...... اور خواہ مخواہ ہائے وائے کر کے نخرے دکھاتی رہیں...... قالین پر گر کے بھی بھلا کسی کے چوٹ لگا کرتی ہے......مگر پرانی عورتوں کو تماشا بنانے اور

تماشے کرنے کی عادت ہوتی ہے...... خیر مجھے کیا۔
ہاں بھئی...... اگر تمہاری اور تمہارے میاں کی رال میرا گھر... دیکھ کر گرا کرتی ہے تو تم دونوں "رال بند" باندھ لیا کرو...... یوں بھی سیانے کہتے ہیں ہمیشہ اپنے سے نیچے دیکھنا چاہیے۔
تم اپنے خاندان کی اپنی ہم عمر کزنز کو دیکھو کیسے چھوٹے، چھوٹے سے کابک میں ہنسی خوشی رہا کرتی ہیں...... یوں بھی میں نے اپنے میاں جانی کو یہ بات اچھی طرح سمجھا رکھی ہے کہ جو پیسہ اپنے گھر اور اپنے بیوی بچوں پر خرچ کیا جائے وہ پیسے کا صحیح مصرف ہوتا ہے۔
ہم کو کسی بھڑنے تو نہیں کاٹا جو لاکھوں روپے آپ کے گھر کو سیٹ کرنے میں لگا دیں گے...... یوں بھی بعض لوگ ساری زندگی ہی اپ سیٹ رہتے ہیں...... کل کو میں دو ہزار گز کی کوٹھی میں چلی جاؤں گی...... تو تم میری دوسری چیزیں دیکھ کر ہلکا کرنا...... یوں بھی حرص خوری تو تم ہمیشہ کی ہو...... اور شکر کرنے کی توفیق تمہیں کبھی ہوتی نہیں......
ہم نے اپنا پرانا روم کولر تمہیں دے دیا...... تمہیں تو اس خوشی میں ہمارے ہاں دس مرتبہ کھانا پکا کر بھیجنا چاہیے تھا...... دراصل یہ روم کولر ہمارا خانساماں ہم سے مانگ رہا تھا...... اور تمہارے بھائی نے میرے کہنے پر تمہیں دے دیا...... اور ہمارا خانساماں ناراض ہو کر چلا گیا...... (تمہیں روم کولر دے کر میں نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑا مارا تھا) جب تک دوسرا خانساماں نہیں ملا...... ہمارے ہاں مستقلاً ہوٹل سے کھانا آیا...... مگر تمہیں اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ ہمارے ہاں کھانا پیک کروا کے بھیج دیتیں...... دراصل تم ان بہنوں میں سے ہو جو صرف حق لینا جانتی ہیں...... مگر تمہیں اتنا علم نہیں ہے کہ ہر حق کے ساتھ ایک فرض بھی کھڑا ہوتا ہے...... مگر تمہاری بلا سے۔
بھئی تمہارا شوہر ہمارے روم کولر کو کتا کہے یا بلی...... ہمیں اس سے فرق نہیں پڑتا...... اگر تمہاری اس میں بھاری بے عزتی ہو رہی ہے تو ہمیں واپس کر دو...... کسی کباڑی کو دے دیں گے تو ہمیں دو تین ہزار ہی مل جائیں گے...... ہمارا کچھ فائدہ ہی ہو جائے گا۔
ہاں لاڈو...... تمہارا صرف ایک ہی بھائی تو نہیں ہے ناں جو سارا نزلہ مجھ پر ہی گرتا ہے، دوسرے بھی تو بھائی ہیں جن کی شاطر بیویاں تمہیں منہ تک لگانا پسند نہیں کرتیں مگر تمہیں ان سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوتی...... وہ لنڈے کے کپڑے، چادریں، کمبل، دبئی کا ٹیگ لگا کر تمہیں دے دیتی ہیں تو تم ان کی احسان مند رہتی ہو...... مجھے تو تمہارے گھر آ کر ان کپڑوں کے ایک مخصوص بھبکے سے ہی پتا چل گیا تھا کہ وہ کہاں سے آتے ہیں؟
بعض نندیں ساری زندگی اپنی بھاوجوں کو دیکھ کر کلسا کرتی ہیں...... تمہارا شمار بھی انہی میں ہوتا ہے...... اچھا ہے کلس، کلس کر تم سوکھ رہی ہو...... تم جس سراپا کو اپنی اسمارٹ نیس کا نام دیتی ہو...... وہ سب میری وجہ سے ہے...... مجھے تو ہنسی آتی ہے...... یہ سوچ کر اگر کبھی میں نے فارم ہاؤس خرید لیا اور تمہیں وہاں لے گئی تو تم تو ایک ہچکی لے کر ختم ہو جاؤ گی کہ چلا پا تو تم پر ختم ہے...... اور ایسا میں ہرگز نہیں چاہوں گی...... (کہ کبھی اپنے فارم ہاؤس پر تمہیں لے کر جاؤں) دراصل جب کوئی شخص اچھا مکان بناتا ہے یا اسے اچھی طرح سیٹ کرتا ہے، اس کا دل چاہتا ہے کہ اسے دیکھ کر لوگ واہ واہ کے نعرے لگائیں...... اس کی سلیقہ مندی کی داد دیں......! اب ہم عصر لوگ تو تعریف کرنے میں انتہائی بخیل ہوتے ہیں...... !ہمارے گھر کی اچھی چیزیں دیکھ کر بھی ایسے بن جاتے ہیں جیسے اسے دیکھ کر نہ تو انہیں اچنبھا ہوا اور نہ ہی انہیں وہ متاثر کر سکی...... یہ غریب ہی رشتے دار ہوتے ہیں

جو واہ، واہ کے ڈونگرے برساتے ہیں......؟

تم نے میرے گھر کے پائدان تک کی تعریف کی...... اس سے ظاہر ہے کہ تمہیں میرے گھر کی ہر چیز کتنی اچھی لگی ہوگی......؟ اب جہاں تک ہوتا ہے اپنی چیزوں کا صدقہ اتار کر تمہیں دیتے ہی رہتے ہیں مگر تمہاری نیت نہیں بھرتی تو ہم کیا کریں...... یوں بھی غریب نندیں زیادہ تر (سب نہیں) نیت خراب ہی ہوتی ہیں......اب اس میں تمہارا ابھی اتنا قصور نہیں ہے اس لیے اپنا دل میلا نہ کرو...... کہ یہ خراب ہو گیا تو لاکھوں میں اس کی صفائی ہوتی ہے......

تمہارے لیے تو خوشی کی بات یہ ہونی چاہیے کہ تم اپنے حلقۂ احباب میں تو فخر سے ہمارا ذکر کیا کرو......اور لوگوں کو فخر سے بتایا کرو...... کہ تمہارے بڑے بھائی، بھابی اور ان کے بچے کس طرح رہتے ہیں......؟ کیا کھاتے ہیں...... (سارے اچھے ہوٹلوں کے نام یاد کر لو)

کن اسکولوں میں پڑھتے ہیں......؟ (ان کے بچے)

تب تمہارا حلقۂ احباب...... تمہیں ایسی نظروں سے دیکھے گا...... جس میں تمہارے لیے عزت ہی عزت ہوگی......اور یہی عزت و توقیر تمہاری اس سال کا تحفہ ہے...... ہماری طرف سے (اس نئے سال کا) اسے دعاؤں کے ساتھ قبول کرو......

**فقط تمہاری**

**بھابی صاحبہ......"**

## مسکراہیں

بڑی آپا نے بڑے ملال بھرے لہجے میں کہا۔

"مجھے تو پتا ہی نہیں لگتا کب کون سا فیشن آیا اور کب گیا میں تو ہمیشہ ایک ہی طرح کے کپڑے پہنا کرتی ہوں قمیص اونچی ہو جائے تو مجھے پروا نہیں ہوتی لمبی ہو جائے تو پتا نہیں چلتا۔"

"یہ تو اچھی بات ہے...آپ خواہ مخواہ ایسے مسئلے پر پریشان ہیں جو آپ کے لیے مسئلہ ہی نہیں ہے۔" میں ہنسی۔

"پہلے تو واقعی یہ مسئلہ نہیں تھا مگر اب کچھ عرصے سے میں یہ بات نوٹ کر رہی ہوں کہ کہیں بھی جاؤں یہ جملے میرے کانوں میں پڑنے لگے ہیں۔" "یہ جمیلہ بیگم کس دنیا میں رہتی ہیں، انہیں یہ تک نہیں پتا ہے کہ آج کل کس قسم کے کپڑے ان ہیں اور کس قسم کے آؤٹ۔" آپا نے خاصا کھسیا کر کہا۔

"یہ کام کوئی مشکل تھوڑی ہے آپ اپنے خاندان کے لوگوں کو غور سے دیکھ لیا کریں خاصی معلومات مل جایا کرے گی۔"

"کیا کہہ رہی ہو نمی! اپنے خاندان کے لوگوں کے رہن سہن یا ان کے کپڑوں سے بھی کیا نئے فیشن کا اندازہ ہوتا ہے؟"

"ہاں، آپا! اچھا خاصا ہوتا ہے، آپ کی بڑی نند کی چھوٹی بیٹی جب بھی آتی ہے اس کے سینے پر تتلی کڑھی ہوتی ہے تو کبھی مرغا پر پھیلا رہا ہوتا ہے اور وہ اپنی کڑھائی کے جادو دکھانے کے لیے دوپٹا اپنی گود میں رکھ کر بیٹھتی ہے۔"

"مگر ہم تو تتلیاں کاڑھ کر کپڑے نہیں پہن سکتے ناں۔" وہ دلبرداشتہ ہو کر بولیں۔

"مگر آپ کو معلوم تو ہوگئی ناں تتلی والی عورتوں کو دیکھ کر آپ یہ تو کہہ سکتی ہیں کہ تمہاری تتلی چنگا ڈر لگ رہی ہے۔"

"ہاں! یہ اچھی بات بتائی تم نے۔"

"دوسرے کے فیشن کو ملیا میٹ کرنے کا نام بھی نئے پن کے زمرے میں آتا ہے جو چیز آپ نے اپنائی ہے اس کی تعریف اتنی زیادہ کریں کہ دوسرے کا دماغ خراب ہو جائے اور نوبت یہ آ جائے کہ وہ بکتا بکتا، اپنے بال نوچتا ہوا آپ کے سامنے سے اٹھ جائے، تب آپ صرف مسکرا دیں۔"

☆☆☆



# میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆حوریہ علی......کھوڑ پکا

عجب قحط پڑا اب کے سال اشکوں کا
کہ آنکھ تر نہ ہوئی خون میں نہا کر بھی

☆ایمان چوہدری......فیصل آباد

ایک اور اینٹ گر گئی دیوارِ حیات سے
نادان کہہ رہا ہے نیا سال مبارک

☆سنبل ملک......شاہدرہ

پہلے بارش پھر مست ہوا اور اب اس کی یادِ مسلسل
اے ماہ جنوری تو، تو دسمبر سے بھی ظالم نکلا

☆مہرین ضیا بخش......کراچی

میں تو خود اپنے لیے بھی اجنبی سا بن گیا
تو بتا مجھ سے جدا ہو کر تجھے کیسا لگا

☆تسنیم کوثر......کراچی

کتنی تسکین ہے وابستہ تیرے نام کے ساتھ
نیند کانٹوں پہ بھی آجاتی ہے آرام کے ساتھ

☆جمیلہ لوہی......بلوچستان

رہتے ہیں سدا چاند بھی سورج بھی سفر میں
شاید یہ بھی محبوب کا گھر ڈھونڈ رہے ہیں

☆ناظمہ شاہین......واہ کینٹ

اِک یہی آس ہی کافی ہے میرے جینے میں
دل نہیں آپ دھڑکتے ہیں مرے سینے میں
تجھ سے جو گھاؤ ملے دل سے لگا لیتے ہیں
کتنی لذت ہے تیری ذات کے غم پینے میں

☆کوثر خالد......جڑانوالہ

من کی اچھائیاں مشروط نہیں ہیں اس سے
نہ کر اندازہ تو اے دوست اجلے لباس سے

☆عالیہ زاہد......لاہور

سنا تھا درد کا احساس تو اپنوں کو ہوتا ہے
مگر جب درد دیں اپنے تو غیروں سے گلہ کیا ہو

☆خوشبو نور محمد......کراچی

دسمبر آگیا اور چھا گیا تھا ابر کا موسم
تجھے خوشبو کسی کی یاد نے دل بھر کے تڑپایا

☆ماریہ فراز......لاہور

تو تو سرمایۂ ہستی ہے تیرا ذکر ہی کیا
ہم تو دشمن کو بھی اے دوست دعا دیتے ہیں

☆نگہت غفار......کراچی

بہت اداس لگی ریت خشک ہوتے ہوئے
پھر ایک لہر نے آکر کنارہ تازہ کیا
تمہارے ہجر کی صورت بحال ہونے لگی
گزر کے ابر نے جونہی ستارہ تازہ کیا

☆فرزانہ اعوان......لندن

یہ غم نہیں ہے کہ ہر جذبہ پامال ہوا
بس اِک جدائی کا اس کی بہت ملال ہوا

☆مسز فرح امجد......لاہور

ابھی تو ہم ملے تھے اور بچھڑ بھی گئے
مل کے بچھڑنا کہیں تمہاری عادت تو نہیں

☆لاریب......چونیاں

میری نفرت کی حد تھی کہ میں خاموش اٹھ آیا
وگرنہ کہاں تھا بس میں کسی کی بات کو سہنا
مقدر کیا چیز ہے آخر کوئی بھی تو نہیں سمجھا
کسی کی ہتھکڑی ہے یہ، کسی کے ہاتھ کا گہنا

☆ماہ زیب......چونیاں

دوریوں نے مٹا دیے جو بھی تھے قربتوں کے رنگ
اب تو میری ہر سانس میں رنگ تیری طلب کا ہے
اِک ذرا سی بات پر بدلی تھی جب تیری نظر
تجھ کو خبر نہیں مگر دل میرا اداس تب کا ہے

☆عرشیہ جنید......کراچی

ہوا کے رخ پر چراغِ الفت کی لو بڑھا کر چلا گیا
اِک دیے سے وہ نہ جانے کتنے دیے جلا کر چلا گیا
ابھی ابھی تو عذابِ سفر سے نکلا تھا میں
یہ کون پھر انہی رستوں میں ہاتھ چھڑا کر چلا گیا

☆سز خدیجہ جمیل، لاہور

اس الجھن کو شب بھر سوچنا اور جاگتے رہنا
وسائل سے جواں بیٹی کے قد کو ناپتے رہنا

☆کرن کمال......کراچی

صاف کہہ دو اگر جگہ ہے کوئی
فیصلہ، فاصلے سے بہتر ہے

☆جبین نیاز......ملتان

ذرا سی بات کہنے کا سلیقہ سیکھ لو تم بھی
اِدھر تم بات کرتے ہو اُدھر دل ٹوٹ جاتا ہے

☆عروسہ شہوار......ڈی آئی خان

ہم تسلیم کرتے ہیں، ہمیں فرصت نہیں ملتی
مگر جب یاد کرتے ہیں، زمانہ بھول جاتے ہیں

☆فرح طاہر قریشی......ملتان

کسی سے کوئی ناتا یا تو ہم جوڑا نہیں کرتے
ملا لیں ہاتھ تو پھر عمر بھر چھوڑا نہیں کرتے
ہمیں معلوم ہے ہر جیت بالآخر ہماری ہے
سو ہم وقتی شکستوں پر یہ دل تھوڑا نہیں کرتے

☆ارم......فیصل آباد

میرے لفظوں پر حاوی ہے تمہارے ہجر کا موسم
میری غزلیں، میری نظمیں، میرے اشعار روتے ہیں
دسمبر کی حسین شامیں زمیں پہ جب اترتی ہیں
میرے چھوٹے سے کمرے میں تیرے اقرار روتے ہیں

☆یاسمین کنول......پسرور

اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

☆ارم کمال......فیصل آباد

دلوں میں پھول اگائیں نئی محبت کے
کدورتوں کو دلوں سے مٹائیں اب کے برس
کچھ کرو اب کے بہاروں کا ایسا استقبال
بہاریں آئیں تو آ کر نہ جائیں اب کے برس

☆لائبہ کائنات......نیوکیمپس

جلتے صحرا میں اگائے جن کے ہاتھوں نے شجر
کیا غضب ہے آج خود ہی جل رہے ہیں اس دھوپ میں

☆زرینہ مشتاق......منڈی بہاؤالدین

میں پربتوں سے لڑتا رہا اور چند لوگ
گیلی زمین کو کھود کر فرہاد بن گئے

☆نفیسہ حسین......اسلام آباد

حیرت نہ کیجیے یہ اصولِ تضاد ہے
دھوکا وہیں پہ ہوگا جہاں اعتماد ہو

☆حوریہ جمیل......لاہور

ہر اِک شام نئے خواب اس پہ کاڑھیں گے
ہمارے ہاتھ اگر ان کی شال آ جائے
انہی دنوں وہ میرے ساتھ چائے پیتا تھا
کہیں سے کاش میرا پچھلا سال آ جائے

☆☆☆

# منتخب غزلیں

جنوری شعروادب کی دو مشہور و معروف شخصیات احمد فراز اور واصف علی واصف کی پیدائش کا مہینہ ہے بلکہ آخر الذکر شخصیت کی وفات کا بھی یہی ماہ ہے۔سو اسی مناسبت سے ان مقبول شعراء کا خوب صورت کلام حاضر ہے۔

دل گرفتہ ہی سہی بزم سجالی جائے
یادِ جاناں سے کوئی شام نہ خالی جائے
رفتہ رفتہ یہی زنداں میں بدل جاتے ہیں
اب کسی شہر کی بنیاد نہ ڈالی جائے
مصحف رخ ہے کسی کا کہ بیاضِ حافظ
ایسے چہرے سے کبھی فال نکالی جائے
وہ مروّت سے ملا ہے تو جھکا دوں گردن
میرے دشمن کا کوئی وار نہ خالی جائے
بے نوا شہر کا سایہ ہے مرے دل پہ فراز
کس طرح سے مری آشفتہ خیالی جائے

کلام: احمد فراز
(12 جنوری 1931ء۔25 اگست 2008ء)

بدلے ہوئے حالات سے ڈر جاتا ہوں اکثر
شیرازۂ ملت ہوں ، بکھر جاتا ہوں اکثر
میں ایسا سفینہ ہوں کہ ساحل کی صدا پر
طوفان کے سینے میں اُتر جاتا ہوں اکثر
میں موت کو پاتا ہوں کبھی زیرِ کفِ پا
ہستی کے گماں سے بھی گزر جاتا ہوں اکثر
مرنے کی گھڑی آئے تو میں زیست کا طالب
جینے کا تقاضا ہو تو مر جاتا ہوں اکثر
رہتا ہوں اکیلا میں بھری دنیا میں واصف
لے نام مرا کوئی تو ڈر جاتا ہوں اکثر

کلام: واصف علی واصف
(15 جنوری 1929ء۔18 جنوری 1993ء)




خوش ذائقوں کو پسند کرنے والی پیاری بہنو! جان ہے تو جہان ہے۔ اگر صحت ہوگی تو ہم زندگی خوش وخرم گزار سکیں گے اور صحت کا تعلق ہماری غذا سے ہے۔ آج کل مختلف قسم کی بیماریاں وجود میں آچکی ہیں اور ان کو دواؤں سے زیادہ آپ اپنی غذا سے کنٹرول کر سکتے ہیں۔ جیسے روزمرہ کی غذا پر توجہ دے کر اپنی غذا میں سبزیوں کا استعمال کریں۔ تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ امراضِ قلب، کینسر، جوڑوں کا درد، ورم، گٹھیا کا مرض، دمے، کھانسی، نزلہ اور مختلف امراض، مچھلی اور اس کے تیل کے استعمال سے دور ہوتے ہیں، بچوں کو مچھلی ضرور کھلائیں۔ مچھلی جسم میں قوت مدافعت بڑھاتی ہے۔ ذہن کو تیز کرتی ہے، آنکھوں کی روشنی بڑھاتی ہے، مچھلی اور اس کا تیل استعمال کرنے سے عام لوگ موذی بیماریوں سے اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں۔ مچھلی کے ساتھ، ساتھ پھل اور سبزیاں بھی استعمال کریں۔ اپنی صحت کا خیال رکھیں اور یاد رکھیں کہ صحت کا راستہ آپ کے کچن سے ہو کر جاتا ہے۔ کچن کو اپنا کلینک بنائیں اور فائدہ اٹھائیں۔ جہاں تک ہو سکے سمندری غذا خصوصاً مچھلی کا استعمال کریں۔

## جھینگا مچھلی تلی ہوئی

اشیا: جھینگا، آدھا کلو۔ درمیانے سائز کا۔ میدہ، ایک پیالی۔ کارن فلو، چار چمچ۔ نمک، ایک چمچ۔ لال مرچ، پسی ایک چمچ۔ اوریگانو، ایک چمچ۔ چائنیز نمک، ایک چمچ۔ سرکہ، ایک چمچ۔ پانی، حسبِ ضرورت۔

ترکیب: جھینگا مچھلی کو نمک اور سرکے سے دھولیں اور میدہ اور کارن فلور میں تمام مسالے سرکے سمیت شامل کر دیں اور پانی میں گھول لیں۔ اتنا گاڑھا جیسے پکوڑے کا بیسن بنایا جاتا ہے اب اس میں جھینگا شامل کر دیں۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد تل لیں۔ پکوڑوں کی شکل میں یا الگ الگ جھینگے اور املی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

مرسلہ: مسز ثمینہ اختر، کراچی

## دم پخت مچھلی

اشیا: موسم سرما ہو اور مچھلی نہ کھائی جائے ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ کچھ علاقوں میں تو سارا سال مچھلی کھائی جاتی ہے بہر حال آپ کو آسان سی ترکیب مچھلی بنانے کی بتاتے ہیں۔ مچھلی اگر چھوٹی والی ثابت ہوں یا چھوٹی پامفریٹ جو عرفِ عام میں پاپلیٹ کہلاتی ہے تو اچھا ہے۔ اس کے سینے پیٹ اور سر کی آلائش وغیرہ صاف کر لیں پھر اسے سرکہ اور نمک لگا کر رکھ دیں۔ آدھے گھنٹے جالی میں رکھیں اب اس پر مسالا لگائیں، مسالا جو بھی آپ کو پسند ہو۔ ویسے تو خالی نمک اور کالی مرچ مکمل مسالا ہے مگر آپ اس میں لہسن پیسٹ ذرا سی ہلدی، اور پسا ہوا زیرہ بھی چھڑک کر الٹ پلٹ کر کے رکھ سکتے ہیں۔ خیر اب ایک ٹن فوائل یا المونیم فوائل لیں اور مچھلی اس پر اچھی طرح لپیٹ کر رکھ دیں۔

پریشر کوکر کو چولہے پر تھوڑا گرم کریں پھر اس میں ایک کپ پانی ڈال کر ایک اسٹینڈ یا کوئی ایسا برتن رکھیں اس پر یہ لپٹی ہوئی مچھلی ایسے رکھیں کہ پیندے سے اوپر رہے۔ کُکر بند کر دیں اور ہلکی آنچ پر تیس سے چالیس منٹ پکائیں پھر احتیاط سے کُکر کھولیں مچھلی تیار ہوگی۔ ڈائیٹ کانشس خواتین کے لیے یہ ترکیب بہترین ہے...... اس کے ساتھ کوئی سی بھی سلاد بھی کھا سکتی ہیں۔

مرسلہ: کائنات عبدالحلیم، میرپور خاص

## چکن ہاٹ گارلک سوس

اشیاء: چکن (بون لیس)، ایک پاؤ۔ چھوٹے ٹکڑوں میں۔ کارن فلور، دو کھانے کے چمچ۔ ہری مرچ، چار عدد۔ (باریک کٹی ہوئی) ہری پیاز، تین عدد۔ (کٹی ہوئی) سویا ساس، ڈیڑھ چائے کا چمچ۔ کیچپ، دو کھانے کے چمچ۔ چلی ساس، دو کھانے کے چمچ لہسن کا پیسٹ، دو کھانے کے چمچ۔ پسی ہوئی کالی مرچ، آدھا چائے کا چمچ۔ اجینو موتو، آدھا چائے کا چمچ۔ چاول ابلے ہوئے، حسبِ ضرورت۔ کوکنگ آئل، دو پیالی۔

ترکیب: سب سے پہلے چکن پر کارن فلور چھڑکیں اور اسے کوکنگ آئل میں فرائی کر کے گولڈن براؤن ہونے پر نکال لیں۔ اس کے بعد چوکور شملہ مرچ، باریک کٹی ہوئی۔ سبز مرچ اور ہری پیاز کو چار کھانے کے چمچ کوکنگ آئل میں فرائی کریں پھر اس میں اجینو موتو، کالی مرچ، کارن فلور، سویا ساس، کیچپ، چلی سوس، لہسن کا پیسٹ اور دو کپ پانی ملا دیں اور پکنے دیں۔ ابلنے پر فرائی کی ہوئی چکن بھی شامل کرلیں اور گاڑھا ہونے تک پکائیں۔ تیاری پر اسے ابلے ہوئے چاولوں کے ساتھ گرما گرم پیش کریں لیجیے مزیدار چکن ہاٹ گارلک سوس تیار ہے۔

مرسلہ: جبیں نیاز، ملتان

## قیمہ میتھی پنیر کے ساتھ

اشیاء: قیمہ آدھا کلو، میتھی کا ساگ، ایک کلو۔ ادرک و لہسن کا پیسٹ، ڈیڑھ چائے کا چمچ۔ ہلدی، آدھا چائے کا چمچ۔ ٹماٹر، پاؤ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ پسی لال مرچ، ایک چمچ۔ ثابت لال مرچ، چھ عدد۔ پیاز ایک عدد (بڑی) پنیر، ایک کپ (کدوکش کرلیں) ہری مرچ، پانچ عدد۔ (کتری ہوئی) ہرا دھنیا، تھوڑا سا (کترا ہوا) کوکنگ آئل، حسبِ ضرورت۔

ترکیب: ایک دیگچی میں ..... کوکنگ آئل ڈال کر گرم کریں اور اس میں پیاز ڈال کر ہلکی سنہری کرلیں۔ اس میں ادرک لہسن کا پیسٹ ڈال کر بھونیں اور پھر ٹماٹر، ہلدی، نمک اور پسی ہوئی لال مرچ کے علاوہ ثابت لال مرچ ڈال کر پانچ منٹ تک مزید بھون لیں۔ مسالا بھن جانے پر خوشبو آنے لگے تو اس میں قیمہ ڈال کر ایک کپ پانی ملا لیں اور گلنے کے لیے چھوڑ دیں (اگر مرغی کا قیمہ ہو تو پانی نہ ڈالیں) قیمہ گلنے پر پانی خشک کرتے ہوئے اسے اچھی طرح بھونیں۔ باریک کٹی ہوئی میتھی اچھی طرح دھو کر قیمے میں شامل کردیں اور دھیمی آنچ پر دس سے پندرہ منٹ تک پکائیں۔ میتھی گل جانے پر اس میں پنیر مکس کردیں اور ہری مرچ، ہرا دھنیا چھڑک کر پیش کریں۔

مرسلہ: حنا اقبال..... کراچی

## گاجر کھیر

اشیاء: گاجر 1/2 کلو۔ دودھ، دو کلو۔ کھویا، پاؤ۔ چینی، آدھا کلو۔ (زیادہ میٹھا کھانے والے مقدار بڑھا بھی سکتے ہیں) بادام پستے، حسبِ ضرورت۔ پسا کھوپرا، آدھی پیالی۔ الائچی، دو سے چار عدد۔

ترکیب: ایک برتن میں دودھ پکنے رکھ دیں۔ ہلکی آنچ پر کہ وہ ......... دو کلو کا ڈیڑھ کلو رہ جائے ساتھ میں الائچی بھی ڈال دیں۔ گاجر کو کدوکش کر کے اس کے ہی پانی میں خوب گلائیں اور پھر پیس لیں، اب پکے دودھ میں گاجر اور پسا ہوا کھوپرا اور چینی ڈال کر پکنے رکھ دیں۔ چمچ چلاتی رہیں، جب کھیر آپ کے حساب سے گاڑھی ہونے لگے تو اتار لیں اور سروِنگ ڈشز میں ڈال لیں پھر اس پر بادام، پستے باریک کاٹ کر سجاوٹ کردیں۔ یہ گرم اور فریج میں ٹھنڈی کر کے دونوں طریقوں سے کھائی جائے گی۔ نہایت آسان ترکیب ہے۔

مرسلہ: سنبل اعوان، لاہور

☆☆☆



# بزمِ پاکیزہ — پاکیزہ بہنیں

## پہلا انعام یافتہ سوال

☆ سنبل ملک اعوان...... شاہدرہ، لاہور

سوال: کچھ لوگ بات بعد میں ......بکواس پہلے شروع کردیتے ہیں، کیوں؟

جواب: یہ بھی دوسروں کو دبانے کا ایک طریقہ ہے۔

## دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ نجمہ اصغر...... کراچی

سوال: تم محبت خرید لائے ہو
پہلے گھر میں عذاب کیا کم تھے
باجی اس شعر میں محبت سے کیا مراد ہے؟

جواب: نیا موبائل بھی ہوسکتا ہے اور ناپسندیدہ مہمانوں کی آمد کی طرف بھی اشارہ ہے۔

☆ ایمی...... یو اے ای

سوال:
ہم نے ترکِ تعلق میں پہل کی کہ فراز
وہ چاہتا تھا مگر حوصلہ نہ تھا اس کا
(باجی...... ذرا جواب تشریح میں دیں تو جانوں)

جواب: جب آپ نے اصل حقیقت بھانپ ہی لی تھی تو جو کیا وہ صحیح کیا...... بلکہ آپ کو کسی قسم کا ملال بھی نہیں ہونا چاہیے۔

☆ فرخندہ جعفری...... گجرات

سوال: امیر کس کو کہتے ہیں؟

جواب: امیری یہ نہیں ہے کہ سامان زیادہ ہو بلکہ امیری یہ ہے کہ دل غنی ہو...... ورنہ اکثر امیروں کے دل تو فقیروں سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔

☆ نرگس نسیم...... صابہ موہڑہ

سوال: آج کل نہ کوئی چھوٹے کو دیکھتا ہے اور نہ بڑے کو...... بلکہ ہر شخص دوسرے کو بے عزت کر کے اپنے آپ کو سورما سمجھتا ہے...... کیوں......؟

جواب: صرف اتنی سی بات یاد رکھیں بے ادبی کرنے سے بدنصیبی آیا کرتی ہے اور کسی کو بے عزت کر کے کبھی کوئی سورما نہیں بنا کرتا۔

☆ شبنم کنول...... گاؤں پاپا نگری

سوال: بدزبانی، بدکلامی اور فحش گوئی کو اپنانے والے لوگ کیسے ہوتے ہیں؟

جواب: ایسے لوگ نہ صرف اپنا وقار تباہ کرتے ہیں بلکہ ان کی بھی توہین کرتے ہیں جنہوں نے آپ کی تربیت کی ہے۔

☆ پروین افضل شاہین...... بہاول نگر

سوال: دل کا درد کب سر کا درد بن جاتا ہے؟

جواب: سر کا درد تو ہفتہ وار جزو زندگی ہے اور دل کا درد تو کوئی بھی غیر متوقع خبر سن کر یا دیکھ کر ہوجاتا ہے۔ پشاور اسکول کے بچوں پر جب حملہ ہوا تھا...... تو یہ درد آنکھوں تک سے بہتا رہا تھا۔

☆ منور شہزادی...... گوجرانوالہ

سوال: اب لوگوں میں محبت، ہمدردی اور مروت کم کیوں ہونے لگی ہے؟

جواب: جب دین سے دوری ہو تو ایسی ہی بیماریاں پھیل جاتی ہیں۔

☆ انیسہ...... کراچی

سوال: اسپتال جانے والی سڑک پر ہر وقت رش کیوں رہتا ہے؟

جواب: بیمار سڑک پر روانی تیز کیسے ہوسکتی ہے۔

☆غزالہ......کراچی
سوال: لوگ کہتے ہیں محبت سے پہلے خوشامد ضروری ہے......کیا واقعی؟
جواب: نہیں...... بلکہ عزت ضروری ہے۔
☆ثمینہ ناز......سندھ
سوال: میں ایک ماں ہوں...... بتایئے میں کیا خواب دیکھتی ہوں۔
جواب: یہی کہ اللہ میرے ملک میں بے حساب رزق دے کہ میرے بچے اور ہر ماں کے بچے رزق کمانے کے لیے اپنے ملک سے باہر کبھی نہ جائیں......اور ہمارے ملک میں ہمیشہ امن اور انصاف کا بول بالا رہے۔
☆شہلا نواز......لاہور
سوال: کہتے ہیں لمبے قد والوں کی عقل ٹخنوں میں ہوتی ہے تو چھوٹے قد والوں کی عقل کہاں ہوتی ہے؟
جواب: چھوٹے قد والوں کے لیے تو بہت سی باتیں منسوب ہیں کہ وہ زمین سے اوپر کم ہوتے ہیں اور نیچے زیادہ ہوتے ہیں......اس لحاظ سے ان کی عقل ایڑی میں ہوتی ہے۔
☆صالحہ کوثر اللہ رکھا......جڑانوالہ
سوال: آپی لوگ بار، بار تعریف کر کے مکر کیوں جاتے ہیں؟
جواب: ایسے لوگ کسی کی تعریف بھی اپنی کسی غرض سے کرتے ہیں......ان کو عرفِ عام میں مکار کہا جاتا ہے، ان کی کسی بات پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔
☆حمنیٰ قندیل......کمالیہ
سوال: ٹھنڈی ہوائیں، سہانا موسم، چھم چھم برستی بارش......ایسے میں دل کیا کہتا ہے؟
جواب: اگر میں اپنی بات کروں......تو گرما گرم چائے یا کافی کے ساتھ کسی اچھی کتاب کا مطالعہ یا اپنے بچوں سے باتیں یا پھر اپنی پوتیوں اور بہو کے ساتھ لوڈو کا گیم جو ویسے بھی ہر دوسرے دن ہوتا ہے۔
☆ارم کمال......فیصل آباد
سوال: کہتے ہیں کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں؟
جواب: اپنی، اپنی ہمت اور حیثیت کی بات ہے، رکھنے والے تو چار بھی رکھ سکتے ہیں۔
☆ہادیہ احمد......میرپور آزاد کشمیر
سوال: ذوقِ گویائی تو ہے پر تاب گویائی کہاں
لفظ خود آ کر میرے ہونٹوں پر تالے ہو گئے
جواب: اب ان تالوں کو زبان کی چابی سے کھولو
ورنہ تالا توڑ دو...... یہ لفظ ہی تو ہیں
جو سب مکڑی کے جالے ہو گئے
☆صائمہ سجاد بنگش......کوہاٹ
سوال: وہ ہمیشہ مجھ سے کہتے ہیں آپ سے مل کر خوشی ہوئی؟ تو بتایئے......ان کی یہ بات سن کر میں کیا سوچتی ہوں؟
جواب:
کوئی کرتا ہے پیار بھری بات تو ہم
شہر کے شہر پھولوں سے سجا دیتے ہیں
☆کوثر خالد......فیصل آباد
سوال: آپی، محبتوں کے گل اگاتا ہوں تو کیا کرنا پڑتا ہے؟
جواب: برداشت۔
☆مسز خدیجہ جمیل......لاہور
سوال: کامیاب محبت اور ناکام محبت کے کیا نتائج ہوتے ہیں؟
جواب: کامیاب محبت کا فوری نتیجہ شادی اور پھر بچے اور ناکام محبت میں لمبی جدائیاں اور وقت گزرنے کے بعد......سب ہی اپنے، اپنے گھروں میں ہنسی خوشی رہنے لگتے ہیں۔
☆ماہ زیب......چونیاں
سوال: اگر سیاست دان عوام کو فریب دینا چھوڑ دیں اور جھوٹے وعدے بھی نہ کریں تو؟
جواب: ہم یقیناً آگے بڑھنے کا سوچ سکتے ہیں۔
☆☆☆

# حسن نکھار یے

منہ جبیں

س: میری جلد چکنی ہے اور دانے بھی بہت ہیں اس کا کوئی گھریلو علاج بتائیں۔ اس کے علاوہ سر کے بالوں کی خشکی کا بھی اگر کوئی سستا سا نسخہ ہو۔

حمیرا قدسیہ........کراچی

ج: چکنی جلد کی صفائی کا خیال رکھا جائے تو یہ جلد کی تمام اقسام میں سب سے زیادہ دیر پا قسم ہے یعنی چکنی جلد پہ جھریاں بہت دیر میں اور مشکل سے ہی پڑتی ہیں لیکن اگر صفائی کا خیال نہ رکھا جائے تو یقیناً اس پر دانے اور کیل مہاسے بھی تمام اقسام کے مقابلے میں سب سے جلدی نکلتے ہیں۔ ماسک کا استعمال عموماً بیس سے پچیس سال کی عمر میں شروع کیا جاتا ہے کیونکہ بیس سال کے بعد خود جلد کی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ جلد میں غدود ہوتے ہیں جو ایک طرح کا روغن خارج کرتے ہیں جسے Sebum کہا جاتا ہے۔ اگر جلد کے غدود زیادہ مقدار میں Sebum خارج کریں تو جلد چکنی یا روغنی ہوتی ہے۔ روغن کی زائد مقدار جو خارج ہوتی ہے وہ کیل مہاسوں کا سبب بھی بنتی ہے اس لیے جلد کی صفائی بے حد ضروری ہے۔ یہ کام آپ گھریلو ابٹن کے ذریعے کرسکتی ہیں۔ ہفتے میں دو دفعہ کھانے کے تین چمچے جو کے آٹے میں دودھ کی اتنی مقدار ملائیے کہ اس کا گاڑھا پیسٹ بن جائے۔ (ابٹن کی طرح) اس میں ایک چٹکی خالص پسی ہوئی ہلدی ملا دیں اور پھر چہرے پر مَل کر اتاریں۔ جس طرح عام طور پر ابٹن استعمال ہوتا ہے۔ اگر آپ کو اصلی نیم کے پتے آسانی سے دستیاب ہوں تو انہیں پانی میں جوش دے کر پانی کو ٹھنڈا کریں اور اس سے منہ دھوئیں ایک مہینے سے بھی کم عرصے میں آپ کو فائدہ محسوس ہوگا۔ نیم کے پانی سے ہی بال دھوئیں۔ یہ بالوں کے لیے بھی مفید ہے اور اس سے خشکی جاتی رہتی ہے۔ آپ کسی ماہر جلد کو بھی ضرور دکھالیں۔

## چند بہترین نسخے

## آپ سب کے لیے

### پلکوں کو دراز کرنے کے لیے

گرم دودھ لیں اور کسی فلالین کے کپڑے کو اس گرم دودھ میں ڈال کر آنکھوں پر رکھ دیں۔ جب اس کی گرمائش ختم ہو جائے تو اس عمل کو بار بار کریں مگر چار بار سے زیادہ نہیں۔ اس سے پلکوں کی نشوونما ہوگی اور وہ خوبصورت دکھائی دیں گی۔ اس کے علاوہ کیسٹر آئل یا زیتون کا تیل انگلی کی پور کی مدد سے رات کو لگائیں۔

### رنگ سرخ و سفید کرنے کے لیے

کھلے منہ کے برتن میں پودینے کی پتیاں ابال لیں اور پھر اس ڈھکن اتار کر کھلی جگہ رکھ دیں۔ پھر چائے کا چوتھائی کپ ہر صبح نہار منہ استعمال کریں۔ بہت جلد آپ کی رنگت سرخ و سفید ہو جائے گی۔

### کیل و مہاسے ختم کیجیے

پہلے یہ معلوم کریں کہ یہ گرمی یا خشکی سے ہیں یا پھر تری سے، اور تب علاج کی طرف آئیے۔ یعنی اپنی جلد کی قسم آپ کو خود پتا ہو۔ یہ گرمی سے ہیں تو صبح نہار منہ ایک سرد گلاس باسی پانی اور لیموں کا شربت لیجیے اور دن بھر زیادہ سے زیادہ پانی پیجیے۔ مسالے دار اشیا ہرگز استعمال نہ کریں اور اگر کیل مہاسے خشکی کے باعث ہوں تو رات سونے سے قبل چہرے پر دودھ کی بالائی ملیں عرق گلاب کے ساتھ اور اگر کیل مہاسے چکنائی سے ہوں تو پھٹکری پانی میں بھگو کر رکھ لیجیے اور دن میں تین چار بار اس کا پانی منہ پر لگائیے۔ کیل مہاسے اس عمل سے ختم ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆



# روحانی مشورے

ادارہ

نئے سال کا خوب صورت تحفہ آپ سب کے لیے

قارئین کرام! ایک خوب صورت تحفہ میں آپ کو دے رہی ہوں اور میری یہ دلی خواہش ہے کہ اسے آپ آگے تک پہنچائیں...... یعنی آپ جس سے ملیں اس تک یہ بات پہنچائیں......

اس کے لیے ایک چھوٹی سی کاپی اور پنسل آپ کو اپنے سرہانے رکھنی ہوگی یا اگر آپ زیادہ تر سفر میں رہتے ہیں تو بیگ میں بھی رکھ سکتے ہیں۔ روزانہ اپنی کاپی میں تاریخ ڈال کر لکھیں کہ آج آپ نے کتنی بار درود شریف پڑھا ہے۔ سب سے مختصر درود شریف صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ اگر آپ دس تسبیح روزانہ پڑھ لیتے ہیں تو کاپی پر لکھیں آج ایک ہزار بار درود پڑھ لیا ہے۔ یعنی ہر روز کا درود شریف کا مجموعہ گزشتہ دن کے درود شریف میں جمع کر کے لکھنا ہوگا۔ روزانہ دس تسبیح پڑھنا تو کوئی مشکل ہے ہی نہیں...... بہت سی خواتین آرام سے درود شریف پڑھ رہی ہیں اور بعض بچیاں تو روزانہ بیس ہزار تک پڑھ لیتی ہیں، جب بہت تیزی سے درود شریف پڑھا جانے لگے تو آپ سمجھ جایئے گا کہ آپ کے ساتھ فرشتے بھی شریک ہو گئے ہیں۔ (سبحان اللہ) کاپی میں درج کرنے سے پڑھنے کی تحریک زیادہ ہوتی ہے اور جب یہ تعداد لاکھوں میں ہونے لگے تو انشاء اللہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت بھی ضرور نصیب ہوگی اور آپ کی پریشانیوں کے بادل بھی چھٹ جائیں گے اور آپ کو دلی طمانیت اور سکون حاصل ہوگا۔ تو آیئے اس نیک کام میں میرے شریک بن جائیں...... اللہ تعالیٰ درود شریف کی برکت سے ہم سب کو دونوں جہان میں عزت و توقیر عطا فرمائے، آمین۔

## اچھا رشتہ ملنے کے لیے دعائیں

جوان ہونے کے بعد لڑکے، لڑکیوں کو یہ دعا مانگنی چاہیے جس میں اچھے اور نیک رشتے کا ملنا اور عافیت کے ساتھ زندگی گزارنا طلب کیا گیا ہے۔ دعا کے اوّل و آخر تین مرتبہ درود ابراہیمی پڑھیں۔ پھر یہ دعا پڑھیں۔

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا (سورۃ الفرقان آیت ۷۴)

”اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے دل کا چین اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرما اور ہمیں پرہیز گاروں کا امام بنا......“

اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو اپنے خالص بندوں کی دعا فرمایا ہے۔ یہ دعا ہر مرد و زن کو تمام زندگی مانگنی چاہیے۔ یہ بہت ہی مبارک دعا ہے۔

اس طرح لڑکیاں اپنے لیے نیک شوہر ملنے کی بھی دعا کریں۔

مثلاً اے اللہ......! مجھے ایسا شوہر عطا فرما جو دیندار ہو اور میرے لیے بھی دینی لحاظ سے معاون اور مددگار ہو...... نرم دل ہو، نیک بیوی کی قدر کرنے والا ہو...... اس کے مقدر میں نیک اور صالح اولاد ہو...... دین کو دنیا میں پھیلانے اور نیک عمل کرنے کا شوق اور لگن رکھتا ہو۔ بے ایمانی، بے حیائی اور تمام شرور سے دور ہو...... اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام کی محبت اس کے دل میں سب سے زیادہ ہو...... اے اللہ! مجھے اس نیک شوہر کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک، ذریعۂ تسکین اور سرمایۂ راحت بنا۔ آمین۔

☆☆☆

ہر نماز کے بعد درود شریف کے ساتھ یہ دعا بھی مانگنی چاہیے

**یاوہاب ھب لی زوجاً صالحاً ط**

”اے بہت عطا کرنے والے! مجھے نیک شوہر

عطا فرما......"

## ہر جائز تمنا پوری ہونے کے لیے

ہر نماز کے بعد ایک تسبیح یہ دعا پڑھنے سے آپ کی ہر جائز تمنا پوری ہوگی۔

وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْۤ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ

ترجمہ: اور میں اپنے تمام کام اللہ پر چھوڑتا ہوں بے شک اللہ سب بندوں کا نگہبان ہے۔

## ناپسندیدہ مہمان گھر آجائے تو

اگر آپ کے ہاں ایسے مہمان زیادہ آتے ہیں جو آکر آپ پر طنز کرتے ہیں۔ یا قصداً آپ کی تذلیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان پر سات مرتبہ بسم اللہ شریف پڑھ کر پھونک دیں۔ وہ کوئی ایسی بات نہیں کریں گے جس سے آپ کی دل آزاری ہو۔

اگر کوئی آپ کے پیسے ہڑپ کرلے......!

بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جن پر ہم بھروسا کرتے ہیں اور انہیں قرض بھی دے دیتے ہیں اگر وہ ہمارے پیسے ہڑپ کر جائیں اور کسی صورت لوٹانے کو تیار نہیں ہوں تو ہر نماز کے بعد سو مرتبہ

اللہ الفتاح، الجامع پڑھیے

عمل کی مدت تین ماہ ہے

## طلب اولاد کی دعا

وہ تمام لوگ جو نیک اور صالح اولاد کے خواہش مند ہوں وہ یہ دعا ہر نماز کے بعد گیارہ بار پڑھا کریں اول و آخر درود شریف کے بعد۔

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ ط

## ڈھیٹ بچے

بعض بچے بہت ڈھیٹ ہوتے ہیں کسی کا کہنا ہی نہیں سنتے ہیں۔ ایسے بچوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے پہلے آپ کو ان کا دوست بننا ہوگا تاکہ وہ آپ کی جانب راغب ہوں۔

ماں، باپ اپنے بچوں کے ساتھ کھیلیں انہیں اسلامی سپہ سالاروں کی کہانیاں سنائیں اور بچوں کی باتیں اور ان کے کارنامے خود بھی شوق سے سنیں۔

اس کے ساتھ، ساتھ صبح نہار منہ بچوں کو ایک چمچی شہد پر درود ابراہیمیؑ پڑھ کر کھلائیں فجر کی نماز پڑھ کر دس تسبیح یاوُدود کی پڑھ کر پانی کے کولر یا بوتل میں پھونک دیں۔ یہ عمل روزانہ کرنا ہے اور تین ماہ تک متواتر کرنا ہے۔ کوئی حرج نہیں گھر کے سب لوگ یہی پانی پئیں...... درخت جب ٹیڑھا میڑھا بڑھنے لگتا ہے تو مالی اس کو چھانٹتا ہے کہ وہ صحیح سمت میں بڑھے اسی طرح بچوں کو بھی سرزنش کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج کے والدین اپنے بچوں سے ایسا لاڈ پیار کرتے ہیں کہ وہ ضدی اور ڈھیٹ بن جاتے ہیں اور اپنی بات ہر صورت میں پوری کرجانا چاہتے ہیں۔ اللہ سب کی اولاد کو نیک اور صالح بنائے۔ (آمین)

## غصے سے نجات کیسے حاصل ہو

آپ کے شوہر بیٹا، بھائی یا گھر میں کسی کو بھی غصہ بے حد آتا ہو...... یا ذرا، ذرا سی بات پر وہ بدزبانی کے لیے تیار ہوجاتے ہوں، ایسے تمام افراد کے لیے پانی پر ایک مرتبہ کلمہ طیبہ اور ایک مرتبہ یاوُدود پڑھ کر دم کریں اور تین سانس میں وہ یہ پانی پی لیں۔ گھر کے دوسرے افراد بھی یہ پانی پی سکتے ہیں...... گھر میں اگر بحث و مباحثہ کرنے کی عادتیں ہیں تو وہ بھی ختم ہوجائیں گی۔

## بری عادات سے نجات کے لیے

بری عادات سے نجات پانے کے لیے آپ کثرت سے یاخبیر پڑھا کریں۔ ٹی وی کم دیکھیے، اچھے دوستوں کا انتخاب کریں۔ زیادہ تر باوضو رہیں...... استغفار کی تسبیح صبح وشام پڑھیں۔ فرصت کے اوقات میں کسی کاپی پر اللہ کے اسمائے گرامی لکھیں اور پوری بسم اللہ لکھیں۔

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

### درد اور مینسز کی خرابی

**شازین اقبال.........پشاور**

مجھے تقریباً پانچ سال سے کندھوں کے درد کا مسئلہ ہے۔ میں نے بہت ڈاکٹروں کو دکھایا ہے، انگریزی اور حکیمی دونوں علاج کروائے ہیں۔ اکثر ڈاکٹر ٹیشن اور کمزوری بتاتے ہیں اور پین کلر اور ملٹی وٹامنز کی گولیاں تجویز کرتے ہیں۔ ابھی بھی میں ہفتہ وار Vitamins D3 کی گولیاں لیتی ہوں۔ صبح اٹھتے وقت اور رات کو سوتے وقت درد زیادہ ہوتا ہے۔ وینٹو جینو بام وغیرہ سے بھی مالش کرتی رہتی ہوں۔ تقریباً دو سال سے نوٹ کر رہی ہوں کہ میرے مینسز ریگولر نہیں۔ مہینوں غائب رہتے ہیں۔ میں کمزور سی ہوں لیکن اب کچھ مہینوں سے میرا پیٹ بڑھ رہا ہے۔ سب کہتے ہیں موٹی ہو رہی ہو۔ رات کو جلدی نیند نہیں آتی اور صبح بھی دیر سے اٹھتی ہوں۔

جواب۔ سب سے پہلے اپنی غذا کو متوازن بنائیں، دودھ، انڈا، گوشت، سبزی، فروٹ کا صحیح طور پر استعمال کریں۔ اپنے جسم کو صبح سویرے کی دھوپ دکھائیں۔ مختلف وٹامنز اور منرلز ہمیں غذاؤں سے مل جاتے ہیں۔ ہلکی پھلکی ورزش بھی کیا کریں۔ لیٹتے بیٹھتے اور کام کرنے کے اسٹائل کے بارے میں لکھیں۔ لیکوریا

**ٹوکن**

**برائے شوابے ہومیو کلینک**

**فروری 2017ء**

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________

پتا: ____________

____________

کی شکایت تو نہیں ہے؟ رات کو جب نیند نہیں آتی تو کیا کرتی ہیں / سوچتی ہیں؟ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Magnesium Phos Pentarkan Ptk60 ایک گولی دن میں 3 مرتبہ Rhustox-30,Calc, Carb-30, Pulsatilla-30 کے 5,5 قطرے ایک کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں، 3 ماہ بعد حال بتائیں۔

## لیکوریا اور پٹھوں میں درد

### مسز شاہین جاوید..........جھڈو

شادی کو 8 سال ہو گئے ہیں۔ یہ تکلیف شادی سے پہلے کی ہے جو پہلے کم تھی، اب زیادہ ہو گئی ہے۔ دوائیں کھا، کھا کر معدے میں بھی پرابلم ہو گئی ہے مگر لیکوریا میں فرق نہیں پڑا۔ ایک بیٹا چھ ماہ کا ہے جسے میں فیڈ کرواتی ہوں۔ میرے ہاتھوں کی انگلیاں سن ہو جاتی ہیں اور اب تو جسم کا ہر جوڑ اور ہر ہڈی درد کرتی ہے۔ خاص طور پر کہنی اور کلائی کی ہڈی اور گھٹنے اور ٹخنے کے درمیان کی ہڈی درد کرتی ہے۔ اب تو اٹھتے بیٹھتے گھٹنے سے آوازیں بھی آتی ہیں۔ گھر میں ایک پرائیوٹ اسکول چلا رہی ہوں۔ اوپر نیچے کم از کم دس چکر ہوتے ہیں اور گھر کے کام بھی کرتی ہوں۔ میں نے تقریباً تمام ٹیسٹ کروائے، ہڈیوں کے جوڑ ڈاکٹر نے کہا۔ (Vit-D، یورک ایسڈ، کیلشیم وغیرہ) ہومیوپیتھک علاج بھی کروایا مگر ان کے پرہیز میرے لیے مشکل ہوتے ہیں مگر کوشش کرتی ہوں۔ مجھے بڑی امید ہے کہ اللہ آپ کے وسیلے سے مجھے شفا عطا کرے گا۔

جواب۔ آپ نے حال مکمل نہیں لکھا۔ لیکوریا کب زیادہ ہوتا ہے۔ مینسز سے پہلے یا بعد میں۔ رنگت، جلن، خارش، بُو یہ تفصیل لکھیں۔ تاکہ صحیح دوا تجویز کی جا سکے۔ جو ٹیسٹ کروائے ہیں ان کی رپورٹس بھیجیں۔ متوازن غذا لیں۔ دودھ، انڈے اور چاول کو غذا میں شامل کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Alfalfa, Q دس قطرے آدھا گلاس پانی میں ہر کھانے کے بعد لیں۔ Calc carb.30 کے 5 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔



## بار بار انفیکشن کے لیے دوا

### عالیہ رشید..........لاہور

ماہنامہ پاکیزہ میں ہومیو کلینک کے ذریعے آپ جو بھی انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں، وہ حد درجہ قابلِ ستائش ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ میں بہت امید لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔ میرے شوہر کا پانچ سال پہلے موٹر سائیکل سے گرنے کی وجہ سے بائیں ٹانگ کی ہڈی Left femor میں فریکچر ہو گیا، سروسز ہسپتال میں آپریشن کر کے پلیٹیں ڈالی گئیں۔ یہ آپریشن کامیاب رہا اور اس کے بعد انہوں نے واکر اور بعد میں اسٹک سے چلنا شروع کیا۔ 10 ماہ تک کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ پھر بذریعہ X-ray پتا چلا کہ پلیٹوں کے اسکرو کھل رہے ہیں۔ ڈاکٹرز کی تجویز پر دوبارہ آپریشن ہوا اور اس کی جگہ مصنوعی گولا ڈالا۔ اب دو سال ہونے کو آئے ہیں۔ کچھ عرصے بعد ان کے پاؤں پر زخم (پاؤں کی اوپر والی سائیڈ) بننا شروع ہو گیا اور اس میں سے پیپ بہنے لگی۔ دواؤں سے وقتی آرام آتا اور دوا چھوڑنے سے پھر وہی حال ہو جاتا۔ شوگر نہیں ہے۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ اگر دوا کھاتے رہیں تو آرام رہتا ہے۔ دوا چھوڑتے ہیں پھر زخم بن جاتا ہے۔ تقریباً 8 ماہ ہونے کو آئے ہیں۔ میرے شوہر دوائیں کھا کھا کر تنگ آ چکے ہیں۔ بیماری کی وجہ سے بہت چڑچڑے ہو چکے ہیں۔ ان کو بواسیر کا مسئلہ بھی شروع ہو گیا ہے۔ پاخانے کے ساتھ خون بھی آتا ہے۔ ہم بہت پریشان ہیں۔ برائے کرم کوئی ایسی دوا تجویز کریں کہ انفیکشن ختم ہو جائے ہم تاعمر آپ کے شکر گزار رہیں گے۔

جواب۔ پیپ کا رنگ اور اخراج کی بُو کیسی ہے یہ

From Nature. For Health.

بھی لکھیں۔ فی الحال ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Thuja 1M کی ایک خوراک 7 قطرے آدھا کپ پانی میں دیں۔ دو دن بعد Echinacea Pentarkarn Ptk42 کے 10 قطرے ..... تین مرتبہ آدھا کپ پانی میں ڈال کر پلائیں۔ Aesculus.ptk.3 اور calendula.30 کے دس دس قطرے آدھا کپ پانی میں تین مرتبہ دیں۔ پندرہ دن بعد Silicea IM کی ایک خوراک ایک دن وقفہ کر کے دیں۔ پھر دو دن کے وقفہ کے بعد وہی تینوں ادویات شروع کروائیں اس کے 3 مہینے بعد دوبارہ حال بتائیں۔

## وزن کا بڑھنا

### سلمیٰ آصف ...........لاہور

ڈاکٹر صاحب سب سے پہلے تو آپ کے لیے بہت سی دعائیں، اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی کے ساتھ لمبی عمر دے۔ آپ ہم سب کے لیے امید کی کرن ہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ DNC کروانے کے بعد سے میرا ویٹ بڑھنا شروع ہو گیا ہے۔ پیٹ بھی بڑھ رہا ہے ٹانگوں میں درد رہتا ہے۔ میرا کھانا وغیرہ نارمل ہے، صبح کے وقت ایک کپ چائے اور سلائس، دوپہر اور رات میں روٹی سالن، چاول اور میٹھا زیادہ نہیں کھاتی پھر بھی ایسا لگتا ہے جیسے جسم پھول رہا ہو، میرے چہرے پر جھائیاں بھی ہو گئی ہیں۔ میں نے کوئی دوائی یا کریم استعمال نہیں کی۔ بہت امید کے ساتھ خط لکھ رہی ہوں۔ میرے خط کا جواب ضرور دیجیے گا آپ کی بہت شکر گزار رہوں گی۔

جواب۔ ڈی این سی کے بعد آپ کے ہارمونز میں ڈسٹربنس آئی ہے۔ وزن کی زیادتی، جھائیاں، رنگ کا کالا ہونا اس کی وجہ بن سکتی ہیں۔ مینسز کے متعلق نہیں لکھا کہ وہ صحیح ہو رہے ہیں یا نہیں اور لیکوریا کی بھی کوئی پرابلم ہے یا نہیں۔ 3 ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Calc Carb-200 کے 7 قطرے آدھا کپ پانی میں ہر ہفتہ ایک خوراک لیں۔ Fucus ves Q اور Phytolaca-e, baccis-Q روزانہ دن میں 3 مرتبہ 10,10 قطرے آدھا گلاس پانی میں جبکہ Sarsaparilla-30 کے 5 قطرے دن میں 3 مرتبہ آدھا کپ پانی میں لیں۔

## نسوانی مسئلہ

### مسز امجد ............کرور لعل عیسن

میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھ میں نسوانی حسن کی شدید کمی ہے جس کے باعث میں بہت پریشان ہوں، میری شادی ہو چکی ہے اور میری ایک بیٹی ہے جس کی عمر 3 سال ہے۔ میری شادی کو 5 سال ہو چکے ہیں۔ میرے شوہر شادی کے کچھ عرصہ بعد دبئی چلے گئے تھے پھر ایک سال بعد واپس آئے اور ایک ماہ کے بعد دوبارہ چلے گئے۔ اب وہ 3 سال سے واپس نہیں آئے۔ مجھ میں جو کمی ہے اسی وجہ سے وہ میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتے۔ دسمبر میں آئیں گے اگر مجھ میں یہ کمی باقی رہی تو وہ دوسری شادی کر لیں گے۔ میرا ایک بچہ ضائع بھی ہو چکا ہے برائے مہربانی میرے اس مسئلے کا اچھا حل تجویز کریں۔ میں آپ کی احسان مند رہوں گی اور ساری زندگی آپ کو دعائیں دوں گی۔

جواب۔ آپ نے اپنا وزن نہیں لکھا اور نہ ہی سائز۔ متوازن غذا کا استعمال کریں، ورزش کیا کریں، ذہن پُرسکون رکھیں، ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں Sabal serr.Q, Chimaphila 30, Kali Bromide 30 کے 10,10 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں تین مرتبہ لیں۔ 2 ماہ بعد دوبارہ تفصیل سے حال بتائیں۔

### بشریٰ عثمان ...........لاہور

میری چھوٹی بیٹی ڈیڑھ سال کی ہے، اس کی پیدائش کے بعد سے میرے ایام میں خرابی ہو گئی

ہے۔ ٹائم سے پہلے ہی شروع ہو جاتی ہے پھر تین چار دن کے بعد لیکوریا ... بدل جاتی ہے۔ یعنی کے دس سے بارہ دن تک ماہواری رہتی ہے۔ گالوں کی ہڈیوں پر براؤن تلکوں جیسی چھائیاں پڑ گئی ہیں۔ پچھلے کچھ سال سے مجھے نیند کم آتی ہے، بہت دیر سے آتی ہے۔ بعض اوقات ساری ساری رات نیند نہیں آتی جس کی وجہ سے آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے ہیں۔ اکثر گلا خراب رہتا ہے خاص طور پر سردیوں میں تو نزلہ زکام ختم ہی نہیں ہوتا اور ساری سردیاں گلے میں درد اور سوئی چبھنے جیسا احساس ہوتا ہے۔ برداشت کی کمی ہے، غصہ جلد آ جاتا ہے، طبیعت میں چڑچڑا پن آ گیا ہے۔ میں اپنا وزن بھی کم کرنا چاہتی ہوں مہربانی فرما کر اچھی سی دوائیں تجویز کر دیں۔

جواب۔ لیکوریا میں کوئی بُو، خارش، جلن ہوتی ہے؟ تفصیل سے لکھیں۔ غذا کو متوازن بنائیں، چہل قدمی کریں اور ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Magnesium Pentarkan Ptk-60 کی ایک گولی دن میں 3 مرتبہ، Passiflora Pentarkan Ptk-66, کے 15 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 3 مرتبہ، Sticta Pentarkan 82 کے 10 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 3 مرتبہ، Sepia-30 5,5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 3 مرتبہ، ایک ماہ بعد حال بتائیں۔

## بیٹا گوشت انڈا سبزی کھانے لگے

میرے بیٹے کی عمر 3 سال 6 ماہ ہے۔ جب سے اس نے کھانا پینا شروع کیا ہے وہ کسی قسم کا گوشت نہیں کھانا چاہتا، چکن ہو یا مٹن یا بیف بلکہ گوشت کی بُو بھی برداشت نہیں کرتا۔ انڈے کے تو قریب بھی نہیں جاتا، روٹی، چاول، دالیں اور چنے وغیرہ کھا لیتا ہے۔ کوئی سبزی بھی نہیں کھاتا۔ آپ اس کے لیے کوئی دوا تجویز کر دیں تو مہربانی ہو گی۔ میں اس کے بارے میں بہت پریشان ہوں۔

جواب۔ Sulpher 200 کی ایک خوراک ہر ہفتے پھر اس کے ایک دن کے بعد .Ferr Met 30 کے 5,5 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں۔ ایک ماہ بعد حال بتائیں۔

## وزن اور درد

### مسز پروین اختر ............ چکوال

دعا ہے اللہ پاک آپ کو خیریت سے رکھے۔ میں پاکیزہ میں آپ کا کالم بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ آپ جس قدر خلوص سے یہ کام کر رہے ہیں وہ قابلِ ستائش ہے۔ بہت امید کے ساتھ اپنا ایک مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ میرے جسم، خاص طور پر کمر اور پاؤں کی ایڑیوں میں بہت زیادہ درد ہوتا ہے۔ صبح بیدار ہونے کے بعد تو چلنا بھی محال ہوتا ہے۔ یہاں اپنے شہر سے دوائی لی تھی بقول ڈاکٹر میرا ESR بڑھا ہوا ہے مگر دوا سے رتی برابر بھی فرق نہیں پڑا۔ مجھے یہ تکلیف تقریباً ایک سال سے ہے۔ دوسرا مسئلہ وزن کا ہے۔ اپنے گھر کا سارا کام خود کرتی ہوں۔ 10 سے 12 گلاس پانی پیتی ہوں اور 5 سے 6 کپ لیموں ڈال کر سبز پتی کا قہوہ اور بیف یخنی پی رہی ہوں لیکن پچھلے 8 ماہ میں ... بالکل وزن کم نہیں ہوا ہے۔ میری خوراک بالکل نارمل ہے۔

جواب۔ آپ کی رپورٹس ہم تک نہیں پہنچیں۔ لہٰذا RA Factor, Serum Vit-D, سینڈ کریں Serum Insulin کرائیں۔ متوازن غذائیں استعمال کریں، دودھ، انڈا، سبزیاں اور پھل ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں Ruta 30, Rhustox 30 کے 5,5 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ جبکہ Calc Carb 200 ہفتہ میں ایک خوراک 5 قطرے آدھا کپ پانی میں ایک دن پہلے اور بعد کوئی دوا نہیں لیں اور اس کے بعد اوپر

# پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

| | | | |
|---|---|---|---|
| عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عُشنا کوثر سردار | اشفاق احمد |
| نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی |
| فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایت اللّٰہ التمش |
| قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابر راجہ | ہاشم ندیم |
| نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | مُمتاز مُفتی |
| نگہت عبدُاللّٰہ | سباس گُل | عنیزہ سید | مُستنصر حُسین |
| رضیہ بٹ | رُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیم الحق |
| رفعت سراج | اُمِ مریم | نایاب جیلانی | ایماے راحت |

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

بیان کردہ دوائیں لیں اور ساتھ Phytolaca e beciss کے 10،10 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔

## دمہ

### محمد سہیل نواز ............ سرگودھا

ڈاکٹر صاحب میرا معاملہ بڑا پیچیدہ ہے۔ میں جب پیدا ہوا تو اس کے تین دن بعد مجھے بخار ہوا تھا۔ مجھے بچپن میں نمونیہ ہو گیا تھا اور میں نمونیہ کا مریض ہوں۔ میری امی نے علاج کے سلسلے میں کوئی ڈاکٹر نہیں چھوڑا، میری امی مجھے سرگودھا سے کراچی تک ڈاکٹر کے پاس لے گئیں لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ نمونیہ ویسا ہی رہا۔ پھر جب مجھے شعور آیا تو میں نے کوئی ڈاکٹر اور حکیم نہیں چھوڑا۔ کراچی میں تین سے چار مہینے تک علاج کرایا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اب مجھے نمونیہ کے ساتھ شدید بلغمی کھانسی اور دمہ کا مرض بھی لاحق ہو چکا ہے۔ بلغمی کھانسی اور دمہ تقریباً 16 سال سے ہے۔ مجھے رات دن کھانسی نے تنگ کیا ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے میں سو نہیں پاتا' مجھے کھانسی شروع ہو جاتی ہے۔ تھوڑا سا تیز قدم چلتا ہوں تو میرا سانس پھولنے لگتا ہے اور سانس بند ہونے لگتا ہے۔ جسمانی لحاظ سے میں کمزور ہوں۔ تر کھانسی اور دمہ کے علاج کے لیے میری راہنمائی کریں تو زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا اور مرتے دم تک دعائیں دوں گا۔

جواب۔ میدے اور چینی سے بنی ہوئی چیزوں سے پرہیز کریں۔ گرم ٹھنڈا اور ٹھنڈا گرم نہ کریں۔ متوازن غذا کا استعمال کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Grindelia Pentarkan Ptk 51 کے 10 قطرے سادہ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں، طبیعت زیادہ خراب ہو تو جلدی جلدی لے سکتے ہیں، طبیعت سنبھلنے پر Tuberculinum 1M کی ایک خوراک لیں لیکن اس سے ایک دن پہلے اور بعد کوئی دوا نہ لیں۔ ایک دن بعد پھر سے شروع کر دیں۔ ایک ماہ بعد دوبارہ حال بتائیں۔

## دماغی الجھن

### رمیضا...... چکوال

میں پاکیزہ میں شوابے کلینک کئی سال سے پڑھ رہی ہوں۔ یہ بہت اچھا سلسلہ ہے اور ہم جیسے لوگ جو چھوٹے شہروں میں رہ رہے ہیں ان کو بہت فائدہ ہو رہا ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے ماہانہ ایام سے ایک ہفتہ پہلے لیکوریا شروع ہو جاتا ہے، ساتھ کمر اور ٹانگوں میں درد ہوتا ہے۔ لیکن مجھے دماغی اُلجھن بہت زیادہ ہے۔ کچھ فیملی کے مسئلے مسائل بھی ہیں اور کچھ سوچتی بھی بہت زیادہ ہوں۔ کھانا پینا بس نارمل ہے۔ آپ مجھے اچھی سی دوا دیں اور یہ بھی بتائیں کہ دوا کتنے عرصے کھانی ہے۔ ہمیشہ آپ کی شکر گزار رہوں گی۔

جواب:۔ اپنی پریشانی پر اللہ کی طرف راغب ہوں۔ متوازن غذا کھائیں۔ درج ذیل ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی استعمال کریں Kali.phos30 ، Bovista 30 ، Pulsatilla 30 کے 5،5 قطرے ایک کپ پانی میں دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔ Magnesium Phosphoricum Pentarkan Ptk 60 کی ایک گولی دن میں 3 مرتبہ تین ماہ تک لیں۔

☆☆☆